۷۸۶

انتساب

ہم دور حاضر کے بہترین ادیبوں کے سترّ نئے شاہکاروں کا یہ مرقع
رئیس الادب علامہ نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب
کے سی۔ آئی۔ ای۔ او بی۔ ای۔ ایل ایل ڈی نواب آف بھیکم پور
کے نام نامی پر منسوب کرتے ہیں۔

ع گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

ایڈیٹر

پیرایۂ آغاز

سالنامہ ۱۹۳۵ء

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس کی مہربانیوں اور حکمت عملیوں کی طفیل ہماری آرزوئیں اور کوششیں بروئے کار آئیں اور ایک چیز جو صرف ذہن اور خیال میں محفوظ تھی ایک زندہ ہستی کی طرح محسوس و نمودار نظر آتی ہے اور سالنامہ ۱۹۳۵ء آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ہر اختیار پیشہ، اور ہر محقق و موجد، ہر موجب، و ترقی پذیر چیز کی مخالفت اور موافقت دونوں ہوتی رہتی ہے اس لئے اگرچہ ہزار معززین نیرنگ خیال کی خریداری کے لئے سرگرم اور بیس ہزار شائقین مطالعہ کے لئے بیقرار نظر آتے ہیں۔ تو دو چار معاصر جو اس ادبی مقابلہ و موازنہ کے میدان میں بار بار شکست کھاتے ہیں نیرنگ خیال کو گرانے اور نقصان پہونچانے کے لئے اس کی ہجو کریں اور جی بھر کر گالیاں دیں تو وہ قابل معافی ہیں ہم ان کی اس دل آزار روش کے خلاف اپنے قلم کو آلودہ کرنا نہیں چاہتے ان کی ہرزہ سرائیوں کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ سالنامہ بہترین ہو اور ہر معمولی پرچہ سینکڑوں دلچسپیوں اور خوبیوں کا مرقع، پبلک کام کو پسند کرتی ہے بیہودہ لفاظی اور پروپیگنڈے سے متاثر نہیں ہوتی، نیرنگ خیال کا کام اور اس کا شاندار ریکارڈ ایک چٹان ہے جسے مخالفین کی گالی گلوچ سے ذرہ برابر نقصان نہیں پہونچ سکتا، نیرنگ خیال کو آگے بڑھنا ہے، اور سب سے آگے انشاء اللہ ہم اس آرزو کو برقرار و سلامت رکھنے میں اپنے جملہ ذرائع کو کام میں لاتے رہیں گے۔

نیرنگ خیال کی ادبی کوششوں کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے لائحہ عمل کی ہمیشہ تعریف ہوتی ہے۔ انشاء اللہ جنوری سے نیرنگ خیال میں نئے طرز کے مضامین اور نئے انداز کی چیزیں نظر آئیں گی۔ نیرنگ خیال نے اپنے لئے ہمیشہ علیحدہ راستہ بنایا ہے، اس لئے ہم نے رسالہ کو دلچسپ اور جاذب توجہ بنانے کیلئے اس میں نئی نئی رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ جنوری کا پرچہ بغور مطالعہ فرمائیے۔

نیرنگ خیال کا عید نمبر سالنامہ کے بعد بھی جب کہ کثرت کار اذہ کو خستہ کر دیتی ہے ہم نے اپنی سرگرمیوں کو برابر جاری رکھا، اور ایک خاص نمبر نکالنے کا سامان کر لیا۔ سالنامہ دسمبر کا پرچہ ہے تو عید نمبر جنوری کا پرچہ ہوگا۔ اس پرچہ کا حجم بھی سو صفحات سے زیادہ ہوگا۔ اور اس میں متعدد ملک کی تصاویر بھی ہوں گی۔ اور مضامین کے لحاظ سے تو یہ عید نمبر بعض رسائل کے سالنامہ سے بھی بہتر ہوگا۔ فہرست مضامین چند سالنامہ کے آخری حصہ میں ہے۔ نظر ڈالنے سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ عید نمبر کتنا دلچسپ اور جاذب نظر ہوگا۔

محبت کا افسانہ جنوری کے نیرنگ خیال یعنی عید نمبر سے ملک کے نامور ادیب جناب ل احمد صاحب کا لاجواب افسانہ "محبت کا افسانہ" کے عنوان سے شروع کیا جائے گا، یہ افسانہ اس طریقہ سے شائع کیا جائے گا کہ آپ اسے علیحدہ کتابی صورت میں جمع کر سکیں، اس کی قیمت دو روپے رکھی جائے گی، مگر نیرنگ خیال کے مستقل خریداروں کو یہ پرچہ کے ساتھ ہی ملتا رہے گا، اور انھیں کوئی زاید قیمت نہ خرچ کرنی پڑے گی، افسانہ کے متعلق مصنف کا نام کافی ہے مگر اس قدر ہم اضافہ کر سکتے ہیں کہ آج تک جس قدر افسانے اور ناول، ہندوستان میں شائع ہو چکے ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس قدر دلچسپ اور بلند ترین تمثیل، اور اعلیٰ ترین ادبی مذاق کا حامل نہیں ہے جتنا یہ افسانہ ہے اگر یورپ میں اس قسم کی کتاب شائع ہوتی تو کروڑوں کی تعداد فروخت ہو جاتی، انتظام کیا گیا ہے کہ یہ افسانہ پورے سال میں ختم ہو جائے۔ انشاء اللہ تعالیٰ

ہم ناظرین نیرنگ خیال سے مستدعی ہیں کہ وہ احباب کو توجہ دلائیں تاکہ وہ جنوری ۱۹۴۰ء سے مستقل خریداری قبول فرمائیں اور یہ سالنامہ بھی ساتھ ہی۔ اس کے لئے انہیں صرف للعہ دینے پڑیں گے۔ کیا یہ سودا ارزاں ترین نہیں؟

سالنامہ نیرنگ خیال کے مضامین پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے ملک کے مشہور ترین اہل قلم نے اس کے لئے مضامین لکھے ہیں۔ اور یہ بات دوسرے رسائل کو میسر نہیں۔ کاغذوں کا ایک پلندا جمع کرکے بازار میں بھیج دینا کوئی ادبی کارنامہ نہیں کہلا سکتا، اس کے لئے خاص جد وجہد اور مذاق سلیم کی ضرورت ہے۔ ہم نے درجنوں ایسے مضمون واپس کر دیئے ہیں جو معتدد ترین احباب کے قلم سے لکھے ہوئے تھے، اور ان سے بیشتر دوسرے رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ مگر ہم کیا کریں ہم اپنے ذوق اور رسالہ کے معیار کے سامنے شخصیتوں سے متاثر ہونے کے عادی نہیں۔ اور ہم خوش ہیں کہ ہمارے قلمی معاونین بھی ہماری اس روش سے ناراض نہیں ہوتے بلکہ اس کڑی تنقید کو اپنے لئے اور اپنے رسالہ کے لئے مفید سمجھتے ہیں۔

ہمیں افسوس ہے کہ دو چار ایسے اصحاب کے مضامین سالنامہ میں نظر نہیں آتے جن کے متعلق ہم نے فہرست میں ذکر کیا تھا، مگر اس کی تلافی ان نئے ناموں کے اضافہ سے ہو گئی ہے جن کا فہرست میں پہلے کوئی ذکر نہ تھا۔ گویا عوض معاوضہ گلہ ندارد!

سالنامہ کارواں کی جبری غیر حاضری

ہمارے معزز معاصر کارواں نے جو بارہ مہینوں کے بعد ایک پرچہ شائع کیا کرتا ہے، اعلان کیا ہے کہ امسال اس کا سالنامہ شائع نہیں ہوگا۔ اور اخبارات میں جو اعلان چھپایا ہے اس کی نقل درج ذیل ہے۔

سالنامہ "کارواں" اس سال شائع نہ ہوگا

افسوس ہے کہ اس سال بعض وجوہ سے سالنامہ "کارواں" کے لئے مضامین نثر و نظم کی فراہمی بوجہ احسن نہ ہو سکی اگر "کارواں" کے کارکنوں کو محض تجارتی مفاد مد نظر ہوتا، تو رطب و یابس مرتب کرکے شائع کر دیتے چونکہ "کارواں" کا مقصد جدید ادب اردو اور فنون لطیفہ کی خدمت ہے، اسلئے کارکنوں نے رسالے کی اشاعت کو معرض التوا میں ڈالنا منظور کیا، لیکن اپنے بلند پایہ معیار کو ترک کرنا پسند نہ کیا ہم اپنے محسنوں اور قدردانوں سے معذرت کرتے ہیں کہ انہیں اس سال سالنامہ "کارواں" کی مفارقت گوارا کرنی پڑے گی، انشاء اللہ بشرط زندگی سال آئندہ "کارواں" اس آب و تاب سے شائع ہوگا، کہ دوسرے رسالوں کے سالنامے تو درکنار خود "کارواں" کے پہلے نمبر بھی اس کے سامنے بے حقیقت ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس جبری تعطیل کے لئے معاونین ہمیں معاف فرمائیں گے۔

وہ اہل قلم حضرات جن کے مضامین نثر و نظم اس سال ہمیں اشاعت کی غرض سے موصول ہوئے ہیں اگر وہ چاہیں تو واپس منگوا سکتے ہیں۔

(منیجر "کارواں" چابکسواراں، لاہور)

معاصر مذکور نے اس جبری تعطیل کے لئے جو وجوہ پیش کئے ہیں، وہ مضامین نظم و نثر کی فراہمی بوجہ احسن نہ ہو سکنا ہے، سبحان اللہ پبلک کی آنکھوں میں خاک ڈالنے کی کیسی کوشش کی گئی ہے ایک رسالہ جو بلند بانگ دعویٰ کرتا ہے وہ بارہ مہینوں میں ایک پرچہ کے لئے مضمون بھی فراہم نہیں کر سکتا، اور مضمون بھی کیسے فراہم ہوں جب رسالہ نے یوپی کی سرزمین ادب کے خلاف نہایت زہریلے مضامین لکھے ہوں، اس پرچہ میں یوپی کا کوئی غیور اور خوددار اہل قلم کسی حالت میں بھی لکھنے پر تیار نہ ہوگا۔ بلکہ ہر سنجیدہ طبع ادیب ایسے پرچہ سے ضرور نفرت کرنے لگیگا۔ جہانتک ہمارا خیال ہے مضامین کی یہ فراہمی بوجہ احسن نہ ہو سکنے کا ایک باعث یوپی کے اہل قلم کا کارواں کو بائیکاٹ کرنا ہوگا۔ یوپی کے تمام اہل قلم اور رسائل نے کارواں کی اس زہریلی اور قابل اعتراض روش کو بہت بری طرح محسوس کیا تھا نہ صرف یوپی کے ادیبوں نے بلکہ ہر بہی خواہ اردو نے کارواں کے اس مکروہ پروپیگنڈے کو اچھا نہیں سمجھا، ہم یوپی کے اہل قلم حضرات کے جذبۂ خودداری کی قدر و عزت کرتے ہیں اردو کی ترقی اور نشر و اشاعت کے لئے پنجاب، یوپی، دکن اور بہار۔ بلکہ کل ہندوستان کو متحدہ کوششوں سے کام لینا چاہئے، جو اشخاص یا رسائل پنجاب یا یوپی کا سوال پیدا کرتے ہیں وہ دشمنان ادب کہلانے کے مستحق ہیں، اور ان کا بائیکاٹ اردو کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

کارواں کے کارکنوں کو چاہئے کہ اگر آئندہ کبھی وہ اپنا کوئی پرچہ شائع کر سکیں تو اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں یوپی کے اہل قلم سے معافی چاہیں۔

کارواں نے اپنے اس اعلان میں نقلی بھی لی ہے اور رطب و یابس کی پھبتی دوسرے رسائل پر کبھی ہے، حالانکہ تمام اہل نظر جانتے ہیں کہ کارواں کی ظاہری شان و شوکت کے علی الرغم اس کے مضامین واقعی ایک رطب و یابس مجموعہ تھے اور اسمیں تو

ہندوستان کے بعض اوسط درجہ کے رسائل سے بھی گرا ہوا تھا۔ اور اس کے بیشتر مضامین کو سالانہ والے اخباری طرز کا بتلایا تھا۔ کارکنان کارواں کیا جانیں کہ رسالہ کیسے مرتب کیا جاتا ہے۔ بھاڑے کے ٹٹوؤں سے کام لینا اور دوسروں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر چلانا کسی "معیاری رسالے" کے لئے سم قاتل کا حکم رکھتا ہے۔

اگر کارواں کے کارکن اس بات کا اعلان جو مائی ۳۵ء تک بھی کردیں کہ وہ ایک سالنامہ ۳۵ء کے آخر میں شائع کرسکیں گے تو ہم ان کے تفنن طبع کے لئے نیرنگ خیال کا ایک ایڈیشن کارواں کے نام سے شائع کردیں گے جس کی قیمت ۸/۴ ہوگی۔ اور اس میں تمام زابلستانی، افغانی، ترکستانی، مازندرانی، سیستانی اور تمام آنی حضرات کے مضامین درج ہوں گے، اور ہمارا دعویٰ ہوگا کہ وہ بہرحالت میں اس رطب ویابس پلندہ سے بہتر ہوگا جس کے دو نمونے کارواں پیش کرچکا ہے۔

ہمارا یہ شرارت آمیز اعلان شاید کارکنان کارواں کی فرسودہ طبیعتوں میں جوش عمل پیدا کردے اور وہ تہیہ کرلیں تو بارہ مہینہ کی دوڑ دھوپ سے ایک منزل اور طے کرلیں۔ یعنی دسمبر ۳۵ء میں ایک سالنامہ نکال ماریں، تو ہم سمجھیں گے کہ ہمارا لکھنا بیکار نہیں گیا۔ اور اردو کے "رطب ویابس" رسالوں میں سے ایک کا سالنامہ ۲۴ چوبیس مہینوں کے بعد شائع ہو ہی گیا۔

اس سال کارواں کی زیارت سے ہم اور ہمارے بعض دوست محروم رہے ہیں لیکن بقول کسے ذکر میرا اس سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ کسی نہ کسی طور کارواں کا ذکر تو ہو ہی گیا۔ اس کے لئے "منیجر اور پروپرائٹر" صاحب کو ہمارا ممنون ہونا چاہئے۔ کہ آخر ہم انہیں کسی نہ کسی طرح پبلسٹی دے ہی رہے ہیں اور پرانے تعلقات کو فراموش نہیں کرتے۔

اب ہم احباب نیرنگ خیال کو ایک حادثہ سے مطلع کرتے ہیں، یعنی ہمارے قلمی معاون اور ہندوستان کے مشہور شاعر حضرت اصغر گونڈوی، پچھلے دو مہینوں سے صاحب فراش ہیں، فالج کا اثر ہے مگر خدا کے فضل سے حادثہ نے نازک صورت اختیار نہیں کی اور اردو کو یتیم ہونے سے بچالیا۔ یعنی اب موصوف روبصحت ہیں خدا سے دعا ہے کہ وہ اردو کے سرپرستوں کو محفوظ و مامون رکھے اور ان کی رہنمائی سے اردو کو محروم نہ کرے۔

احباب نیرنگ خیال یہ سنکر خوش ہوں گے کہ ہندوستان کے مشہور فسانہ نگار اور جرنلسٹ اور ہمارے معاون خصوصی حضرت سید فرید جعفری اب مستقل طور پر لاہور آگئے ہیں اور عملی طور پر رسالہ کی ادارت میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگے ہیں امید ہے کہ ہمارا یہ اتحاد نیرنگ خیال کیلئے ہر طرح مفید ثابت ہوگا۔

اشتہارات کے صفحات میں آپ ایک نئے زنانہ رسالہ "لیلیٰ" کا اشتہار دیکھیں گے جو دفتر نیرنگ خیال سے میرے اور فرید جعفری صاحب کی متحدہ کوشش سے نکلیگا، پہلا پرچہ جنوری کے پہلے ہفتہ تک شائع ہوجائے گا، ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ رسالہ زنانہ جرنلزم میں اسی طرح انقلاب پیدا کرے گا، جس طرح نیرنگ خیال نے عام طور پر اردو جرنلزم میں انقلاب پیدا کیا، نئی وضع، انوکھی طرز اور زیادہ معیاری کا رسالہ ہوگا، اس رسالہ کے ذریعہ ہم ایک طرف عورتوں کی ربان میں آواز پیدا کرسکیں گے، دوسری طرف ان کی نسائیت کو بھی برقرار رکھ سکیں گے اور ان کو اثردار طریقوں سے بتائیں گے کہ ہندوستانی عورت کو تمام آزادیوں کے ساتھ بھی اپنی ہندوستانیت کو نہیں کھونا چاہئے اور اپنی نسائیت کو ہمیشہ زندہ رکھنا چاہئے۔

محترمہ وزیر بیگم صاحبہ ادیب فاضل نے کمال مہربانی سے لیلیٰ کی مدیرہ اعزازی ہونا قبول کرلیا ہے چند صفحات اسی رسالہ کے ساتھ بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوں گے اور اس کا نام کنول ہوگا، ان مختصر صفحات میں بھی ہم نے انتظام کیا ہے کہ بچوں کے لئے بہترین دلچسپی کا سامان مہیا کریں تاکہ، ماں، بیٹے، اور بیٹیاں، بھائی اور بہن سب ایک ہی رسالہ کو خرید کر محظوظ ہوسکیں۔

آپ اشتہارات کے صفحات میں "لیلیٰ" کا اشتہار پڑھئے اور پھر اپنی نصف بہتر، اپنی بہنوں اور بچوں کو لیلیٰ کا مطالعہ کرائیے۔

مضمون نگار بہنوں سے التماس ہے کہ براہ مہربانی جلد لیلیٰ کے لئے اپنے بہترین اصلاحی مضامین، فسانے اور نظمیں بھیجیں اور مضامین لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ نسوانی ضروریات کیا ہیں اور اخلاق اور اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ مضامین کا معیار اتنا بلند ضرور ہو جو ایک اعلیٰ پایہ کے نسوانی رسالے کے لئے محسوس کیا جارہا ہے۔

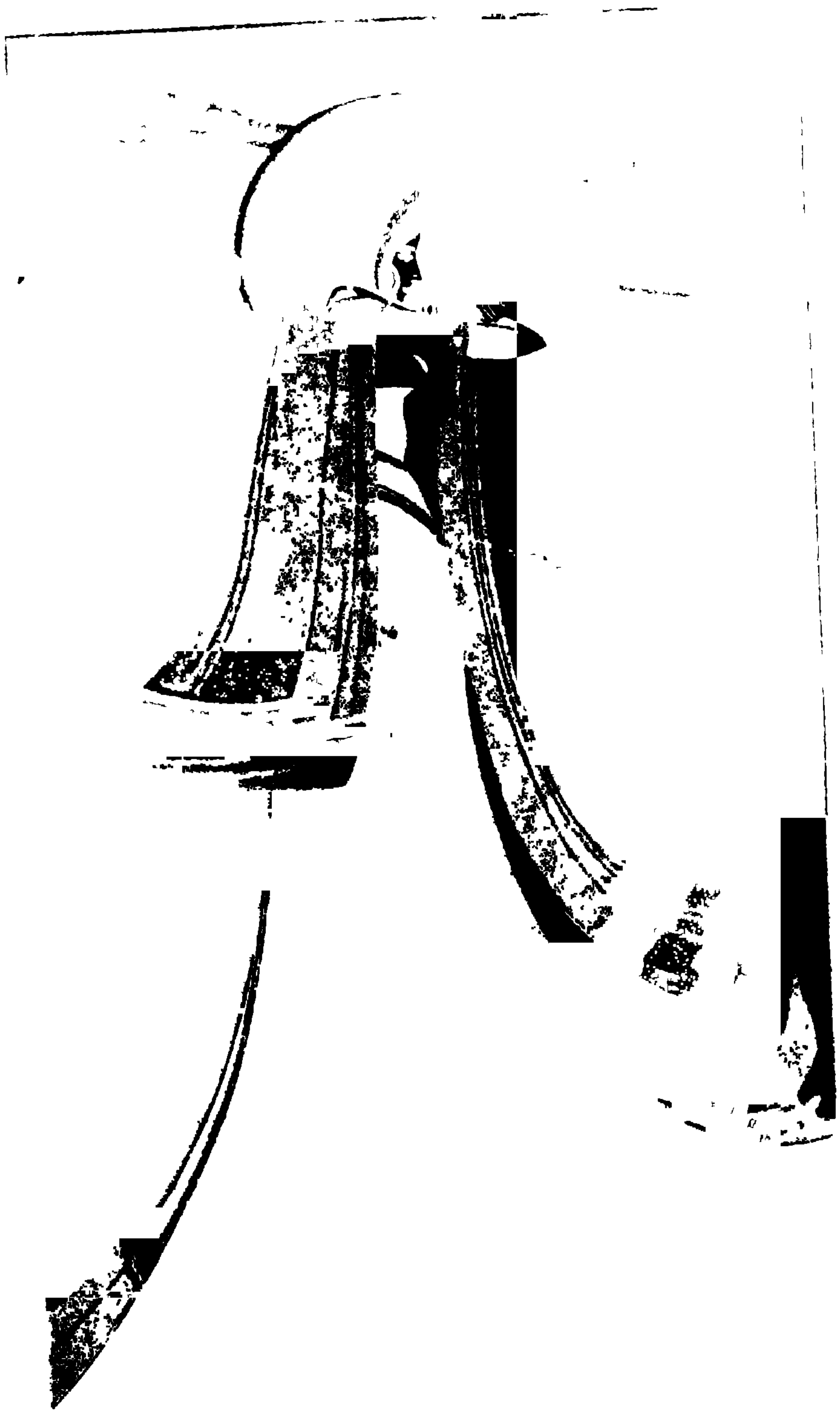
ایڈیٹر



ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ ایم اے پی ایچ ڈی



عالی جناب خان بہادر نواب احمد یار صاحب دولتانہ



پنجاب کے دو رتن

ڈاکٹر گوکل چند نارنگ اور نواب احمد یار دولتانہ

نواب احمد یار دولتانہ پنجاب کی زمیندار پارٹی کے ایک ممتاز لیڈر اور ہندو و مسلمانوں میں یکساں ہر دلعزیز ہیں۔ کونسل کے اندر اور کونسل کے باہر آپ کی سرگرمیاں صوبہ کی تعلیمی اور زراعتی ترقی کے لئے مقبول و معروف ہیں جس کام میں بھی آپ نے حصہ لیا اُسے سرگرمی اور قابلیت سے پورا کیا۔ پنجاب کی آئندہ وزارتوں میں آپ کے سپرد ایک نہ ایک قلمدان کئے جانے کی توقع کی جا رہی ہے اور اگر ایسا ہوا تو حکومت مسلمانوں کی ایک دیرینہ آرزو پوری کرے گی۔

ہندوستان کے نوابوں اور ذی مرتبت اصحاب کو روپیہ لٹانے اور عیش و عشرت سے فرصت نہیں ملتی نواب احمد یار دولتانہ کو اللہ پاک نے خاص طبیعت اور علمی ذوق دیا ہے۔ جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی محال ہے۔ آپ آرٹ اور لٹریچر کے بڑے دلدادہ ہیں۔ علم و ادب اور اردو رسائل کی سرپرستی آپ کا خاص مشغلہ ہے۔ آپ درجنوں رسائل خریدتے ہیں اور انکا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔ آپ کی لائبریری بہترین اور نادر کتابوں سے بھری پڑی ہے۔

علمی ذوق کے ساتھ خداوند تعالیٰ نے آپ کو مخیر دل اور فرشتہ سیرت بنایا ہے آپ ہر خاص و عام سے اس خلوص اور محبت سے ملتے ہیں جو صرف خلفائے راشدین کے عہد کی خصوصیت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں آپ کی حقیقی عزت کی جاتی ہے اور آپ کی قبولیت میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

جناب ڈاکٹر گوکل چند نارنگ ایم اے پی ایچ ڈی صوبہ پنجاب کے ایک وزیر کی حیثیت سے ہی متعارف نہیں۔ بلکہ آپ کو علم و فضل سے وافر حصہ ملا ہے اور آپ ایک جید عالم اور اسکالر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے عہدے کے فرائض کو حسن و خوبی کے ساتھ ادا کرنے میں آپ کو ایک اچھے منتظم افسر کا کریڈٹ مل چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ پنجاب کے مسلم پریس میں آپ کے طریق عمل کو شدید ترین نکتہ چینی کا مرکز بنایا گیا تھا۔ جس سے مسلمانوں میں مخالفت جذبات پیدا ہو گئے تھے لیکن چوہدری افضل حق صاحب نے حال ہی میں جو سوالات آپ پر کئے تھے، اور ان کے جو جوابات وزارت کی طرف سے دیئے گئے تھے ان کی روشنی میں یہ احساس پیدا ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر نارنگ صاحب کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا پورا پورا خیال ہے۔ اور آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کر چکے ہیں وہ قابل شکریہ ہے اور جو کچھ آئندہ کرنے والے ہیں وہ قابل تحسین ہوگا۔ جو لوگ ہندو اور مسلمانوں کو قریب تر لانے اور ناخوشگوار فضا کو مٹا کر باہمی تعاون اور میل جول سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم اور ملک کے سب سے بڑے محسن ہیں۔

ادارہ

فردوسی اسلام خانصاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری

کے

تازہ ترین افکارِ عالیہ

ذکر بیدادِ بتاں پیشِ خدا کیا ہوگا
زندگی میں نہ ہوا بعدِ فنا کیا ہوگا

ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے
وہ تو رہزن بھی نہیں رہنما کیا ہوگا

بادۂ تلخ کا لپکا ہے مجھے اے واعظ
خلد کی پاک شرابوں کا مزا کیا ہوگا

حسن بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر
آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہوگا

ابتدا حضرتِ ناصح کے گریباں سے ہوئی
دیکھنا جوشِ جنوں میں ابھی کیا کیا ہوگا

میں گنہگار بھی نکلا تو بہت معمولی
حشر میں اور برا حشر مرا کیا ہوگا

اپنے اللہ سے تو اس بت کو مانگ کے دیکھ
ترا نقصان بھی اے دستِ دعا کیا ہوگا

پھر کدھر جائیں گے راندے ہوئے بتخانے کے
درِ کعبہ بھی اگر وا نہ ہوا کیا ہوگا

شیخ کے دل میں تو نکلی ہیں حرم کی باتیں
ہم یہ سمجھے تھے بجز نامِ خدا کیا ہوگا

رشک نے پھونک دیا گلشنِ اردو کو حفیظ
آنسوؤں سے ترے یہ باغ ہرا کیا ہوگا

مری کوئی خطا نہیں مجھ پر خفا نہ ہو
اس بت کو دیکھ داورِ محشر خفا نہ ہو

توہینِ حسن آہ بھی ہے ضبطِ آہ بھی
دونوں طرح کہیں وہ ستمگر خفا نہ ہو

چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں
گمراہ اسلئے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو

جی سیر ہو چکا ہے شرابِ طہور سے
پیتا ہوں تاکہ ساقیِ کوثر خفا نہ ہو

او حسرتِ وصال نہ دیکھ اس طرح نہ دیکھ
او بد نظر کہیں وہ مکرر خفا نہ ہو

بے وقت بے محل کوئی مطلب نہ مدعا
یوں عرضِ حال ہو تو وہ کیونکر خفا نہ ہو

ساقی ہزار توبہ نثار اس عتاب پر
اچھا پلا پلا مجھے ساغر خفا نہ ہو

کیوں رکھ دئے تھے صاحبِ جوہر کی راہ میں
لے اب سمیٹ لے گہر و گوہر خفا نہ ہو!

اہلِ حرم پہ کھول تو دوں بتکدے کا در
لیکن یہ خوف ہے کہ وہ کافر خفا نہ ہو

اے مدعی یہ رنگ اڑانا محال ہے
دیکھ اس غزل کو جانِ ہنرور خفا نہ ہو

ڈرتا ہوں اس نزاکتِ معنی سے اے حفیظ
ایک بد مذاق فربہ سخن ور خفا نہ ہو

"یور ہائی نس"!

ایک والیۂ ریاست سے

یادِ ایام کی روشنی میں

از:۔ اختر شیرانی، ایڈیٹر "نوبہار"، لاہور

میں جب کمسن تھا اور تو اپنے سینے سے لگاتی تھی
تری ہنستی ہوئی نظروں سے مجھکو شرم آتی تھی

مچلتا تھا میں تیری گود سے باہر نکلنے کو
مگر تو اک ادائے ملتمس سے مسکراتی تھی

ترے وہ گیت ابتک گونجتے ہیں میرے کانوں میں
جنھیں میرے لئے لکھتی تھی تو اور گنگناتی تھی

سمجھ سکتا نہ تھا مفہوم، اُن گیتوں کا میں لیکن
تری اس شوخیٔ گویا سے مجھکو شرم آتی تھی

ترا وہ مخملی بستر، ابھی تک یاد ہے مجھکو
مجھے سردی کے ڈر سے جسمیں تو اکثر سلاتی تھی

وہ بستر، یاسمین بستر، سراسر عنبریں بستر
مہک سے جسکی، حورانِ جناں کو نیند آتی تھی

میں سوجاتا تھا جب رنگین دلائی اوڑھکر تیری
تو اپنے مرمریں ہاتوں سے مجھکو گدگداتی تھی

وہ تیری خوابگہ کے نیلگوں ابریشمی پردے
سرِ شام آکے نرگس جن کو چپکے سے گراتی تھی

دماغ ابتک معطر ہے تری مستانہ خوشبو سے
ترے گجروں کی کلیوں کو بھی جو بیخود بناتی تھی

ترا، مشکیں تنفس بس رہا ہے میرے ہونٹوں میں
اثر سے، جس کے اک لرزش سی لبیں تیرچاتی تھی

تری رنگین جوانی نقش ہے ابتک مرے دل پر
جو تیرے پھول سے پیکر کے اندر لہلہاتی تھی

تری وہ محفلیں آباد ہیں اب تک تصور میں
تو جن میں اپنی گڑیا سے مری شادی رچاتی تھی

تری آنکھیں، وہ مست آنکھیں، نہیں بھولیں ابھی مجھکو
کہ جن میں اک رسیلی مسکراہٹ جھلملاتی تھی

مگر اے شاہزادی! آج کچھ تجھکو خبر بھی ہے؟
کہ وہ بچہ جسے تو گود میں اپنی کھلاتی تھی

وہ شاعر ہے، کہ دنیا میں، کہانی اس کی رسوا ہے!
وہ رسوا، اُس کا دل رسوا، جوانی اس کی رسوا ہے!

اختر شیرانی

(باقی)

شباب و شیب

محبت، حسن، رعنائی، امید، ارماں، وفا کوشی
کبھی میں نے جوانی میں یہ سب الفاظ سیکھے تھے
حقیقت میں بہت دلچسپ تھا وہ دورِ مدہوشی
وہ راتیں خوب راتیں تھیں وہ دن تھے بہت اچھے
وہ سادہ دل جوانی کا فریبِ آرزو کھانا
وہ اپنی جستجو میں آپ ہی گمراہ ہو جانا

ادھر امید و ارماں کی محبت خیز رعنائی
ادھر جذبات و احساسات کا بیدار ہو جانا
ادھر برقِ جمال و حسن کا ذوقِ تپش زائی
ادھر ہوش و خرد کا در پئے آزار ہو جانا
جوانی کا جوانی کی مسلسل جستجو کرنا
وہ دل کے لاابالی مشغلے جینا کبھی مرنا

وہ ہر تازہ نفس گل کا فریبِ رنگ و بو دینا
وہ میرا ہر فریبِ رنگ و بو میں جذب ہو جانا
وہ دزدیدہ نگاہوں کا پیامِ آرزو دینا
وہ میرا ہر پیامِ آرزو میں جذب ہو جانا
مرے ہر سانس میں حسنِ محبت کی کہانی تھی
معاذ اللہ وہ سرکش جوانی کیا جوانی تھی

وہی میں ہوں، وہی میں ہوں، مگر تنہا و بیکس ہوں
نہ وہ سادہ دلی اب ہے نہ وہ عہدِ جوانی ہے
مرے احباب مجھکو کیا دکھاتے ہیں کیا دیکھوں
مری نظروں میں اس دنیا کی ہر تصویر فانی ہے
یہ تصویریں بھلا مجھ سے خراجِ عشق کیا لیں گی
مری انجام بیں نظریں مجھے کیا دیکھنے دینگی

مآل اندیش دل اب اک نئی دنیا میں رہتا ہے
وہ دنیا جس کے نظارے ہیں عنوانات خود بینی
تماشا ہے مجھے ہوش و خرد نے مل کے لوٹا ہے
نظر کی وسعتوں نے چھین لی دنیا کی رنگینی
مری غم دوستی میں اب نئے پہلو نکلتے ہیں
مسرت کی پذیرائی کو بھی آنسو نکلتے ہیں

وہ آنسو جن میں سوزِ عشق ہے سازِ محبت ہے
وہ آنسو جن میں دل کی زندگی کا رازِ پنہاں ہے
وہ آنسو جن کے ہر قطرے میں اک رازِ محبت ہے
وہ آنسو جن کے ہر قطرے میں برقِ حسن تاباں ہے
وہ آنسو جن کا ہر قطرہ حریفِ طور ہوتا ہے
سراسر برق ہوتا ہے سراپا نور ہوتا ہے

میں اس نوری فضا میں سانس لیتا ہوں ابھرتا ہوں
مری منزل وہ منزل ہے جہاں جلووں کا طوفاں ہے
میں ان برق آفریں جلووں سے کسبِ نور کرتا ہوں
مرے پہلو میں دل ہے اور دل میں برق لرزاں ہے
یہی وہ برق ہے جس کا مرے دل میں اجالا ہے
مکمل حسن تکمیلِ محبت کرنے والا ہے

اکبر حیدری

مزدور کی دیوالی

۱

آج دیوالی کی شب ہے خلق میں رقصاں ہے نور
آسماں کشتِ تبسم ہے زمیں تصویرِ طور

سوگواری سرنگوں ہے عشرتوں کا ہے دماغ
جگمگاتے ہیں ہر اک دہلیز پر زریں چراغ

رونما ہے ظلمتِ تہذیب میں حسنِ علوم
ہیں در و دیوار پر اُمڈے ہوئے برقی نجوم

ہو رہی ہے شام کی تابندگی تابندہ تر
مسکراتی ہیں منڈیریں ہنس رہے ہیں بام و در

یہ فلاؤں میں عنا ہے اور یہ پُرہول رات
ڈھونڈتے پھرتے ہوں تارے جس طرح آبِ حیات

سرمئی شب کی ردائیں نور میں ملبوس ہیں
قمقمے ہیں۔ برنج ہیں۔ قندیل ہیں۔ فانوس ہیں

یہ چراغوں کی فراوانی اندھیری رات میں
جگنوؤں کا جگمگا جیسے بھری برسات میں

لکشمی کو راستہ گھر کا دکھانے کے لئے
جا رہی ہیں دیویاں شمعیں جلانے کے لئے

۲

لیکن ایک مزدور کی دنیا تمام اندھیر ہے
آنکھ جلوؤں سے تہی دل زندگی سے سیر ہے

اک پریشاں حال دیوی صحن میں خاموش ہے
لب پہ خشکی۔ انکھڑیوں میں آنسوؤں کا جوش ہے

سینۂ نازک پہ داغِ مفلسی کھائے ہوئے
اپنے بھوکے لال کو سینے سے چمٹائے ہوئے

اس لئے بیٹھی ہے رکھے ضبط کی چھاتی پہ سِل
جل نہ جائے طفلکِ معصوم کا ننھا سا دل

گیسوئے شبگوں میں چکی پیسنے سے انتشار
پیرہن میں جا بجا پیوند، چپا در تار تار

ٹاٹ کا بستر ہے اور چکٹے ہوئے تکیے پہ گرد
دل میں انجامِ تہیدستی لبوں پر آہِ سرد

بام و در تو کیا مکاں تک میں نہیں روشن دیا
آ رہی ہے خستہ دیواروں سے جھینگر کی صدا

خوف زا تاریکیوں میں ہے مکاں کھویا ہوا!
گھر کا گھر گویا النصیبوں کی طرح سویا ہوا

آرزوؤں نے دعاؤں کا صلہ پایا نہیں
گھر کا مالک لیکے مزدوری ابھی آیا نہیں

۳

شرم اے ہندوستاں اے خود ستاؤں کے دیار
یہ تیری غیرت کا نقشہ، منصفی کا شاہکار

ترے جلوؤں میں نہاں اندوہ کے بادل بھی ہیں
ترے گلزاروں سے ملحق موت کے جنگل بھی ہیں

تری فطرت میں ریا۔ تری جبلت میں دغا
ہے ترے نغموں میں معصوموں کی فریاد و بکا

ہیں ترے فتنے شرافت کو کچلنے کے لئے
ظلم آتا ہے ترے دامن میں پلنے کے لئے

زعم ہے رفتار میں اندازِ میخواروں کا ہے
آستینوں پر مقدس خون ناداروں کا ہے

ترے نشتر مسکراتے ہیں لبِ ناسور پہ
چھاتے ہیں ترے خنجر سر مزدور پہ

کھا کے اپنی گود کے پالے ہوئے جیتا ہے تو
توڑ کر اولاد کی گردن لہو پیتا ہے تو

دیکھ اب تیرا رد یہ انقلاب انگیز ہے
یعنی یہ پیمانۂ ظلم و ستم لبریز ہے

احسان بن دانش کاندھلوی

فیبر

گالسوردی کا ایک عکس

(از ادیب شہیر جناب قاضی عبدالغفار صاحب مصنف لیلیٰ کے خطوط۔ مجنوں کی ڈائری وغیرہ)

زمانہ:- جنگ یورپ۔

مقام:- فرانسیسی محاذ جنگ کے عقب میں ایک چھوٹی سی بستی، اس بستی میں ایک کرایہ کے مکان کا معمولی کمرہ۔

وقت:- شام۔

کمرہ میں ایک نوجوان فوجی افسر اور ایک حسین لڑکی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتے ہیں۔ لڑکی آتشدان میں آگ روشن کرتی ہے، دو کرسیاں کھینچکر آتشدان کے آگے لے جاتی ہے ـــــ فوجی افسر کی طرف دیکھکر مسکراتی ہے۔ پھر دریچہ کا پردہ گرانے لگتی ہے۔ پردہ گراتے گراتے ہاتھ روک لیتی ہے اور باہر کی طرف میدان میں غروب آفتاب کا منظر دیکھنے میں محو ہو جاتی ہے ـــــ نوجوان افسر آگے بڑھکر اس کے کاندھے پر ایک انداز محبت کے ساتھ ہاتھ رکھدیتا ہے:-

"ہاں! تو تم نے بتایا نہیں، تم آخر رو کیوں رہی تھیں؟"

"رہنے بھی دو! وہ بات ہی کیا تھی۔ جو میں بتاؤں۔ غروب آفتاب کا نظارہ اکثر روح پرور ہے۔ اور جو نظارہ روح پرور ہوتا ہے وہ کبھی کبھی آنسو بھی پیدا کرتا ہے۔ اور نہیں تو یوں سمجھ لو کہ عورت کے آنسو عموماً بے معنی ہوتے ہیں!"

"یہ کیونکر؟ ایسا تو نہیں ہے۔ مجھ سے پوچھو تو میری رائے میں عورت کا رونا قانوناً ممنوع ہونا چاہئے۔ (ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ) "تلوار کے دھنی، میدان کے سورما! تمہارے لئے قانون ایک حرف بے معنی ہے۔ پھر اس کا ذکر کیا ـــــ ہنستے رہو، میں بھی ہنسوں، تم بھی ہنسو، تم اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اور کل پھر تمہیں میدان جنگ میں جانا ہے اور میں اس لئے کہ تنہا ہوں، بے یار و غمخوار، اور مجبور! ہنسنے کی کوشش نہ کروں تو روتے روتے مرجاؤں!"

"ہاں! تو رونے ہنسنے کے فلسفہ کو چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم یہاں میدان جنگ کے اس قدر قریب آکر پھنس گئیں۔ اور پھر اس تکلیف دہ اور شرمناک زندگی میں؟"

"جی ہاں کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے! ـــــ کیا تم زخمی ہو کر محاذ جنگ سے ہٹائے گئے تھے؟"

"آج ہی تو ہسپتال سے چھٹکارا ملا ہے"

"توبہ! پناہ بخدا! کیا قیامت ہے یہ جنگ! ساری دنیا کو دوزخ بنادیا"

"خدا جانے کب ختم ہوگی ـــــ یہ تو بتاؤ تم کس قوم کی لڑکی ہو۔ اور کس ملک کی رہنے والی ہو"

"میں؟ ـــــ میں؟ (کچھ گھبرا کر) بس تم یہ سمجھ لو کہ میں روسی ہوں ـــــ"

"روسی! بھلا تم کہاں سے کہاں پہونچ گئیں؟ مجھے تو آج تک کبھی کسی روسی حسینہ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ خوب ملیں آج! دنیا کس قدر تنگ ہے! (نوجوان کے گلے میں باہیں ڈال کر) "تم مجھے بہت ہی پیارے اور معقول آدمی معلوم ہونے ہو! بہت سے مرد ملتے ہیں ـــــ جوانی کے دیوانے ـــــ بے مروت سب بے پروا۔ سنگدل! پر تمہارا دل تو مجھے نرم معلوم ہوتا ہے! کیا سچ مچ تم ایسے ہی نیک خصلت ہو؟ کیا سچ مچ؟ یا یہ بھی ایک دھوکہ ہے؟ ایسے دھوکے بیسیوں خندق اور ہسپتال سے فرصت پاکر میری گود میں آتے ہیں۔ فریبی، خود غرض ـــــ سب کے سب!"

(مسکرا کر) "فریبی خود غرض ——— مرد!

بھولی بھالی چھوکری! تو نے مرد کی معنوی زندگی کا مطالعہ ہی نہیں کیا! خندقوں میں جا کر دیکھ! کس طرح موت سے کھیلتے ہوئے منہ میں ہنستے کھیلتے جاتے ہیں!" (ہنس کر) "ہنس ہنس کر موت کی گود میں جا لیٹتے ہیں! جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

(لڑکی کے رخساروں پر آہستہ سے انگلی مارتے ہوئے)

"معصوم چھوکری! تم نہیں سمجھتیں کہ جو اپنی موت سے کھیلتا ہے وہ دوسروں کی موت پر کیوں نہ ہنسے!"

"ہاں ہاں، سچ کہتے ہو ——— موت سے کھیلنے والے موت پر ہنسنے والے! (طنز سے) اچھا ہیں! کس قدر سچ کہتے ہو!"

"نہیں یقین نہیں آتا؟ ہر معرکہ میں [illegible] ہوا، اس معرکہ کو دیکھ میری پلٹن کے سپاہیوں نے [illegible] شجاعت دی جس طرح [illegible] کی [illegible] جس طرح انھوں نے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پہ رکھ لیا ——— واللہ! کیا عجیب سماں تھا!"

"مگر ——— [illegible] ——— دشمن کی فوج کے سپاہی بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھتے ہوں گے ——— وہ بھی بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھاتے ہوں گے ——— اب کوئی کیا جانے کس کی بہادری اور شجاعت حق بجانب!"

"ہاں! یہ تو ممکن ہے۔ دشمن بزدل تو نہیں ہے ——— البتہ اصلی وجہ تفوق حق و باطل کا صحیح امتیاز ہے ———"

"حق و باطل؟ حق و باطل؟ (جوش بھری آواز میں) نسبتی اصطلاحات! لغت کا فریب! زبان کا مکر! ——— حق دونوں طرف پکارا جاتا ہے! جس کو میں کہوں وہ بھی حق جس کو تم کہو وہ بھی حق! یہ تمام معیار خود ساختہ ہیں ——— سنا تم نے؟ ——— سب غلط ہیں ——— جو جیتے گا، جو زیادہ خون پی سکیگا، وہی حق پر رہے گا! ——— ———"

"کیا باؤلی باؤلی باتیں کر رہی ہے ننھی گلہری! آ! کچھ عشق و الفت کی بات کر! حق و باطل کا فیصلہ مردوں پر چھوڑ دے جن کے بازوؤں میں طاقت ہے!"

"مغرور مرد! (مسکرا کر) تم اپنی فوج میں افسر ہو نا؟ دماغ یا دل کی وجہ سے نہیں، صرف قوت بازو کی وجہ سے! تمہارا ——— تم مردوں کا تفوق [illegible] اور جسمانی ہے ——— روحانی نہیں ہے ——— نہیں ہے! ——— سمجھے تم؟"

(مسکرا کر) "حسین عورت کا زنانہ فلسفہ! حسین ہوتا ہے مگر کس قدر ہلکا

——— بے ثبات!

——— بکھر جانے دو! یہ تو بتاؤ کیا تم یہاں بالکل تنہا مقیم ہو؟ کوئی بھی تمہارا ہم وطن دوست یہاں نہیں؟"

(لڑکی کے چہرے پر [illegible] گھبراہٹ کے آثار نظر آتے ہیں ——— کچھ جھجکتی ہے، پھر دفعتاً کہتی ہے)

"[illegible] ہم وطن دوست! دوست میرے ہم وطن! [illegible] مجھے تنہائی کی فکر نہیں۔ جب [illegible] گولہ باری ہوتی رہتی ہے تو سینکڑوں [illegible] زخمیوں اور [illegible] ہوتے ہیں تو خندقوں میں [illegible] میرا گانا [illegible] سنتے ہیں [illegible] ان کے بارود [illegible] بھول جاتے ہیں ——— اگر تم جیسا کوئی افسر [illegible] تو وہ اس کمرہ میں چند گھنٹے [illegible] گزارتا ہے [illegible] صبح کو [illegible] یا طیاروں کی آواز سے گونجتی ہوتی ہے [illegible] کسی فوجی [illegible] کے اعصاب کو تسکین دیتی ہوتی ہوں [illegible] نوع انسان؟"

"اب تو تم خاصی [illegible] ہو گئی؟"

"[illegible] ——— [illegible] ——— آج بھی یہ دیکھو [illegible] مزاج [illegible] ہیں!"

(لڑکی کو پیار سے [illegible] گود میں کھینچ کر)

"لیکن یہ سنہری [illegible] تمہاری زندگی کس قدر سستی بک رہی ہے تو؟ اس قدر سستی!"

"مگر یہاں تو زندگیاں [illegible] جانیں [illegible] اس سے بھی زیادہ سستی بک رہی ہیں! بازار کا بھاؤ بہت گرا ہوا ہے ——— [illegible] تیغ زن! ایک [illegible] بارود میں بیسیوں جانیں خریدی جاتی ہیں اور فروخت کی جاتی ہیں! ———"

"بڑی حسرت ——— یہ جنگ! ——— مگر ——— بہت بڑی چیز ہے، فرض منصبی! سپاہی کسی کا دشمن نہیں۔ مگر کرے کیا ——— فرض منصبی اس کا خدا ہے ——— [illegible] اور [illegible] مطلق!! اس خدا سے روگرداں ہو نہیں سکتا! ——— [illegible] تمہارے ملک میں ——— [illegible] میں ——— تو [illegible] سنتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے عزیزوں کی بھی خیر خبر ملتی ہے!"

"عزیز" یعنی ماں، باپ، بھائی؟ —— کوئی باقی نہیں —— سب لقمۂ موت کے گھاٹ! میرا رشتہ بس اب میرے ان عاشقوں سے قائم ہے جو سامنے خندقوں میں مقیم ہیں! مگر وہ بھی برابر مرتے رہتے ہیں اور میں ہر روز بیوہ ہوتی رہتی ہوں! مگر دولہا بہت ہیں۔ شب بھر کے دولہا —— اور عقد صرف ایک آنکھ کے اشارے سے تکمیل پاتا ہے! اس لئے مجھے ماتم کرنیکا موقع ہی نہیں ملتا!

{لڑکی خوب ہنسی ہنستے ہنستے نوجوان کی گود میں لوٹ گئی —— پھر وہ یکایک سنجیدہ ہو گئی، اٹھ بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے}

"میں عروس مشترک ہوں، میں فوج کی دولہن ہوں، کوئی مجھے یاد نہیں رکھتا سب مجھے شب بھر پیار کرتے ہیں —— اور صبح کو بھول جاتے ہیں! —— خدا جانے کس دن مجھے گرفتار کر کے بند کر دیں گے، جب مجھ سے تنگ جائیں گے تو کہیں گے کہ یہ عورت تو جرمن جاسوس ہے —— پھر ایک دن صبح کو کسی دیوار سے مری کر لگی ہوگی اور دس بارہ نفل میرے سینہ پر آگ اگل رہے ہوں گے ایک لمحہ کا یہ سب تماشا ہوگا —— بس!"

"تو کیا تم جرمن ہو؟ تم تو کہتی ہو تم روسی ہو؟"

{لڑکی کی آنکھوں میں عجیب چمک ہے ہاتھوں کی مٹھیاں بند ہی ہوئی ہیں —— وہ سینہ نکالے کھڑی ہے۔}

"جرمن! ہاں جرمن! لو کہہ دیا میں نے!!

دیکھو! چہرہ بدل گیا تمہارا!! ابھی تم میرے عاشق تھے! اور ابھی اتحادی فوج کے افسر بن گئے!! عاشق سپاہی کی وردی میں غائب ہو گیا!! کس لو اپنی پیٹی! لے چلو مجھے پکڑ کے!"

{افسر گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اس کے چہرے پر وحشت برس رہی ہے}

"آہستہ! آہستہ! خدا کے لئے آہستہ! عورتوں سے مرد نہیں لڑا کرتے۔ مجھے تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ——"

"مگر فرض منصبی —— مگر، فرض منصبی! اس دیوتا کے قربان گاہ پر اس رنگین تیتری کو چڑھا دو! اپنے حب وطن کو اس عورت کے خون سے تازہ کر لو! بڑا نام ہوگا تمہارا!"

"کیا اس لئے، صرف اس لئے کہ تو بیگانہ قوم کی عورت ہے؟ یہ تو نہ ہوگا میں اتحادیوں کی فوج کا سپاہی ضرور ہوں، مگر قوم، اور وطن کے امتیازات سے آزاد ہوں، جرمنوں سے لڑتا ہوں اس لئے کہ سپاہی ہوں اور میرا فرض منصبی یہی ہے، لیکن قوم اور وطن کا تعصب میرے نزدیک انسانیت کی نفی ہے بہت ادنیٰ درجہ کی وحشیانہ بت پرستی ہے! "انسانیت" کے جھنڈے کے نیچے وطن اور قوم کے امتیازات کسی سزا کے قابل ہیں، جو جاسوس کو دیجاتی ہے۔ نہیں تم! تمہارا راز میرے دل میں محفوظ رہے گا —— مگر خدا کے لئے نقارے نہ بجا!"

"تو کیا تم انسانیت کو وطنیت پر فوقیت سمجھتے ہو؟ یہ ایمان ہے تمہارا؟ یہی ایمان ہے میرا! کیسی ذلیل ہے یہ تفریق! کیسا نفرت انگیز ہے یہ امتیاز! لعنت ہے قوم پرستوں اور وطن پرستوں پر —— لعنت ہے!! انسانیت کے دشمن!"

"لعنت ہے، بیشک لعنت ہے —— آدمیت کے منکر! —— صلیب اور مسیح اور خدا! وطن، اور قوم اور نسل! —— کچھ نہیں! کچھ بھی نہیں! دھوکہ ہے سب! فریب ہے سب! اصل ایک تھی —— مگر جغرافیہ اور تاریخ اور سیاست نے ٹکڑے کر ڈالے —— یہ کالا یہ گورا یہ بھورا یہ مشرقی یہ مغربی!! تف ہے! تف ہے!"

"تف ہے! تف ہے!"

"مگر (مسکرا کر) بھٹکی ہوئی، بہکی ہوئی چھوکری! قوم وملت کے تخیل پر تو بھی کہتی ہے تف! اور میں بھی کہتا ہوں تف! مگر —— مگر —— کچھ مقاصد ہیں جن پر ہم —— اتحادی —— ایمان رکھتے ہیں۔ اور جن کے لئے ہم لڑ رہے ہیں!"

"کیا مقاصد؟ یہ مقاصد کہ اس جنگ کے بعد دنیا کے حالات بہتر بنا دیئے جائیں گے۔ زندگی کی منزلیں انسانوں کے لئے آسان کر دی جائیں گی —— یہ مقاصد! تم یہ کہتے ہو۔ تمہارے دشمن بھی یہی کہتے ہیں۔ اور شروع سے آجتک جتنے لڑنے والے لڑے —— قوم کا نام لیکر، وطن کا نام لے کر، یا مذہب کا نام لے کر —— سب نے یہی کہا —— مگر ہوا کیا؟ دنیا بد سے بدتر ہوتی گئی اور جس کا بازو قوی تھا، حق اسی کے ساتھ رہا!! غنیمت ہے کہ ہم کو تم کو ایک دفعہ مر کے پھر واپس آنا نہیں —— بہت غنیمت ہے! ورنہ آج سے زیادہ دنیا کو بدحال پاتے ہیں!!"

(افسر کے چہرہ پر شکنیں پڑی ہوئی ہیں وہ مضطرب ٹہل رہا ہے)

"میں اب جاؤں گا —— ٹھہر نہیں سکتا —— مجھے روکو نہیں، پھر ملوں گا کسی دن فرصت میں ——"

"یہ معلوم کر کے کہ میں جرمنی ہوں تم کو مجھ سے نفرت ہو گئی کیا؟ میں نہ کہتی

تھی ———— "

"نہیں نہیں، میں نے کہہ دیا کہ وطن و قوم کے متعلق میرا دل اُن ادنیٰ جذبات اور تعصبات سے پاک ہے ———— بالکل پاک ہے! مگر مجھے شب میں کچھ قیدیوں کو لیکر جانا ہے ———— "

"قیدی؟ جرمن قیدی؟"

"ہاں، جرمن قیدی۔ کیا تمہارا کوئی عزیز بھی قید ہوا ہے؟"

{لڑکی کے چہرہ پر انتہائی دلچسپی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں}

"کیا خبر؟ لیکن یہ بتاؤ قیدیوں کی حالت کیا ہے۔ ہیں تو سب اچھی طرح؟"

یکایک مکان کی دیوار کے نیچے ایک اخبار فروخت کرنے والا لڑکا آواز لگاتا ہے:-

"شام کا تازہ پرچہ ———— اتحادیوں کی عظیم الشان فتح ———— جرمنوں کی شکست ———— دو ہزار قیدی ———— جرمن محاذ ٹوٹ گیا ————"

دونوں دروازے کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایک ایک پرچہ دونوں خریدتے ہیں اور دونوں الگ الگ کرسیوں پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو جاتے ہیں ————

نوجوان افسر کا چہرہ چمک رہا ہے۔ وہ بار بار ہر خبر کو پڑھتا ہے اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے۔ پھر اخبار پڑھتا ہے۔ پھر ٹہلنے لگتا ہے ایک دفعہ بے اختیار مسکراتا ہے۔

"کیا خوب! کیا کارنمایاں کیا ہمارے جنرل نے! واہ، کمال کر دیا! واللہ! بدمعاشوں کو کیا سزا دی ہے، یہ محاذ ٹوٹ گیا، تو پھر برلن تک راستہ صاف ہے ———— زندہ باد برطانیہ ———— زندہ باد قوم برطانوی!"

لڑکی دریچہ کے پاس کھڑی اخبار پڑھ رہی ہے، اس کا چہرہ مغموم ہے۔

"دو ہزار قیدی! اور خدا جانے کتنے مجروح اور مقتول! اے اللہ! رحم کر میری قوم پر! میرے وطن پر! خیر، خیر، ابھی کیا ہے، دیکھا جائے گا دیکھا جائے گا! ابھی میرا وطن ایسا بیدم نہیں ہوا ہے —— دیکھنا —— دیکھنا —— شیر برطانیہ کی کھال نہ کھینچ لی ہو ———— زندہ باد! جرمنی!"

دونوں اپنے اپنے زاویہ نظر سے باطل کے مقابلہ میں حق کا بول بالا کر رہے تھے! حالانکہ چند ہی منٹ پہلے یہ دونوں قوم و نسل کے امتیازات اور تعصبات سے کس قدر آزاد تھے!!

حب وطن کا فریب!!

انسانیت کی موت!!

عبدالغفار

غزل

یوں تو شہرت ہے بہت قیس کے افسانے کی
بات کچھ اور ہے اس شوخ کے دیوانے کی

آہ کیوں روتی ہے اے شمع شبستانِ حیات
زندگی لوٹ کے آئے گی نہ پروانے کی

تیرے دامن سے یہ دھبہ نہ کبھی چھوٹے گا
سرخیٔ خونِ تمنا ہے۔ کہیں جانے کی؟

چشمِ ساقی کو ہوئی آج کچھ ایسی گردش
اب ضرورت ہے نہ مینا کی نہ پیمانے کی

محملِ شوق وہ صحرا سے چلا آتا ہے
بیڑیاں کٹ گئیں شاید ترے دیوانے کی

میری اتری ہوئی صورت میرے اشکوں پہ نہ جا
ہم نشیں مجھکو اک عادت سی ہے غم کھانے کی

آرزو ہے نہ کوئی اور تمنا باقی
ایک حسرت ہے سو حسرت بھی مرجانے کی

مظفر حسین شمیم

استاذی سید جالب دہلوی

از شوکت تھانوی

السلام علیکم کہتے ہوئے ایک بزرگ یہاں پلیٹ فارم پر تشریف لائے اور ایک سادہ مگر پُرجوش تقریر کر کے ریزولیوشن کی تائید میں تقریر کرنے کے بعد پھر السلام علیکم کہتے ہوئے پلیٹ فارم سے اتر کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے ان بزرگ کی ہیئت بھی عجیب تھی۔ ترکی ٹوپی تھی جس کا پھندنا آگے ہی پڑا ہوا تھا اور ٹوپی کے نیچے سے سفید بال نکل رہے تھے۔ ... ہوئے سے چہرہ گول تھا۔ آپ تو تقریباً ... وضع کا تھا جس پر ایک ... اور ایک مشت چار انگشت کی زیادہ تر آزاد سفید داڑھی تھی گردن کے خم سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ سر گویا جھکا ہوا ہے ... کمر بھی کمان ... ہر وقت ... تھی ... شیروانی کا کالر اور کالر کے بعد والا بٹن تو باقاعدہ بند تھا ... کے تمام بٹن اور ... سب کھلے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ لہذا شیروانی کے نیچے والی بنڈی اور بنڈی کے نیچے والا کرتہ صاف نظر آ رہا تھا بلکہ کرتے کے نیچے پاجامہ ... صاف نکلا ہوا ... ایک ہاتھ میں چھڑی تھی اور اسی ہاتھ میں ایک چار خانہ رومال ... دوسرا ہاتھ خالی تھا۔

یہ واقعہ ہے غالباً اوائل ۱۹۲۳ء یا اواخر ۱۹۲۲ء کا جب مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا وفد اپنے دورہ کے سلسلہ میں لکھنؤ آیا تھا اور رفاہ عام کلب لکھنؤ میں اس وفد کا پیغام اہل لکھنؤ تک پہونچانے کے لئے ایک جلسۂ عام منعقد کیا گیا۔ اس کے بعد ہم اس جلسہ کو اور جلسہ کے ساتھ ہی ساتھ ان بزرگ محترم کو بھول گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں والد صاحب قبلہ مرحوم کے انتقال کے بعد ہم کو اپنی نامکمل تعلیم چھوڑ کر ایک ذبح ظفر موج قسم کے خاندان کا بار اٹھانے کے لئے ذریعہ معاش کی فکر ہوئی اور اپنے فطری ذوق کے ماتحت صحافت کی طرف متوجہ ہو کر بحیثیت ایک امیدوار کے لکھنؤ کے سب سے زیادہ مشہور بلکہ یوپی کے سب سے زیادہ با اثر اخبار ہمدم کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو یہی صاحب کرسی ادارت پر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہیں اور ہاتھ میں قلم ہے جو کاغذ پر پچیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہا ہے ہم چپ ہی میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گئے اور اس کے منتظر ہو گئے کہ یہ صاحب منھ اٹھائیں تو ہم سلام کریں مگر وہاں تو یہ عالم تھا کہ لکھنے میں غرق ہو رہا تھا اور منھ سے حقے کا دھواں نکل رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم کو کھڑے کھڑے تقریباً دس منٹ گذر گئے وہ دیکھئے۔ خدا بھلا کرے کاتب کا کہ جس نے دروازے سے کمرے سے چلا کر کہا —— "مضمون لاؤ"

اس کی آواز پر آواز ملا کر ان صاحب نے فرمایا "لیجاؤ" اس لیجاؤ کے ساتھ ہی آپ نے گردن اٹھا کر اس طرف کو دیکھا اور دیکھتے ہی دونوں طرف سے السلام علیکم اس طرح روانہ ہوئے کہ گویا تصادم ہو گیا۔ ان بزرگ محترم نے ہم کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم نہایت سعادتمندی کے ساتھ خاموش بیٹھ گئے۔ ادھر یہ حضرت پھر لکھنے میں مصروف اور ہمارا یہ حال کہ بیٹھے بیٹھے اونگھنے کو دل چاہنے لگا مگر قبل اس کے کہ ہم اپنی اس خواہش کو پورا کریں ان صاحب نے ہماری طرف دیکھے بغیر بدستور اپنے کاغذ پر نگاہیں جھکائے ہوئے فرمایا:۔

فرمائیے" کیسے تکلیف فرمائی صاف بات یہ ہے کہ میں ان اوقات میں کسی سے ملنے کا وقت بمشکل نکال سکتا ہوں"۔

ہم نے عرض کیا کہ "میں آپ کا طلب کیا ہوا آیا ہوں، میرا نام شوکت تھانوی ہے آپ کا گرامی نامہ کل ہی مجھکو ملا تھا۔

ہمارا نام سنتے ہی آپ نے جھکی ہوئی گردن کو ہماری طرف پھیر کر ہم بازآنکھوں سے سر سے پیر تک ہم کو دیکھا اور پھر باقاعدہ ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔

آپ کے متعلق خان بہادر میر احمد حسین صاحب کا پیغام قاضی حامد صاحب نے مجھکو پہونچایا تھا لہذا میں نے آپ کو وہ خط لکھدیا، صاحب بات اصل میں یہ ہے کہ اردو صحافت جن دشوار گذار رستوں سے گذر رہی ہے ان کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے تو میں ہر نوجوان کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس خارزار میں قدم نہ رکھے چنانچہ یہی مشورہ میں آپ کو بھی دوں گا لیکن اگر آپ ہماری بدقسمتی میں ہمارے شریک ہونا چاہتے ہیں تو بسم اللہ کام شروع کیجئے اور یہ سمجھ کر شروع

نامۂ کیمبرج

پروفیسر تاثیر کا تازہ ترین خط

۸ نومبر ۱۹۳۴ء

حکیم جی!

السلام علیکم۔ کل شام جرمنی و یورپ سے ہوتا ہوا آیا ہوں۔ نہایت مفید اور باعث راحت تھی لیکچر دیئے۔ سنے۔ اچھے رسالے پڑھے۔ ریڈیو پر اردو اور انگریزی میں پیغامات دیئے۔ جو ہندوستان بھی پہنچے ہوں گے۔ ہوائی جہاز میں اڑے۔ نازیوں کی چھاؤنیاں دیکھیں۔ دوستیاں استوار کیں۔ ان سب سے مستفید ہوا فنون لطیفہ کے وں سے لطف اندوز ہوئے۔ خود بحد ذاتی طور پر ہزاروں خرچ کرتے پر بھی یہ کچھ نا ممکن تھا۔ گر سکتا تھا۔ میں کیمبرج کی طرف سے نوجوان نازیوں کی انجمن میں نمائندہ تھا گویا یہاں کے کام میں خلل آیا۔ مگر بقول سب نے کوئی عذر نہ کیا۔ تعلیم محض کتابوں کا مطالعہ ہی نہیں۔ تجربات نعمت غیر مترقبہ تھے۔

اس وقت کس میں سالنامہ کا وعدہ ایفا ہو سکتا مگر اب افرا تفری میں ایک غزل۔ اور ایک نئی قسم کا مکالمہ۔ یعنی ہوائی ڈاک بھیج رہا ہوں۔ اس سے کافی تلافی ہو جائے گی۔ ہاں ایک نظم اور ملفوف ہے۔ یہ سر عبدالقادر کے صاحبزادے شیخ منظور قادر کی نظم ہے۔ در خوب چیز ہے۔ سلیس گفتگو میں ایک اہم فلسفی مسئلہ سلجھایا ہے۔ اس کی اشاعت سالنامہ کی زینت افزائی کا باعث ہوگی ——— شیخ منظور قادر بی اے کیمبرج میں پڑھتے ہیں۔ والسلام۔ باقی باتیں پھر بوقت فرصت ہوں گی ——— میری غزل یہ ہے۔

لبالب جام پھر ساقی نے واپس لے لیا مجھ سے ۔۔۔ نجانے کیا کہا میں نے نجانے کیا ہوا مجھ سے

مری توبہ۔ مجھے باور۔ وہ کافر ہے وہ کافر ہے ۔۔۔ خفا تو بھی ہوا جاتا ہے اے میرے خدا مجھ سے

چھپا پھرتا تھا اب تک تیری آنکھوں سے مگر کب تک! ۔۔۔ یہ کہہ ڈالیں گی اک دن میرے دل کا مدعا مجھ سے

نگاہیں التجائیں کر رہی ہیں لب لرزتے ہیں ۔۔۔ تو پھر اب منہ سے ہی کہہ دیں وہ سب کچھ برملا مجھ سے

مجھے معلوم ہے تاثیر سب کچھ جانتا ہوں میں ۔۔۔ ارے اب پی بھی جا کیوں بن رہا ہے پارسا مجھ سے

تاثیر

میرزا غالب کے گھر میں ایک شام

ایک قصیدہ کی سرگذشت

پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم اے کے قلم سے۔

آج کل کردار اور شخصیت میں تمیز نہیں کی جاتی، اور نہیں ہم معنی الفاظ سمجھ کر مصنف کی زندگی اور تصانیف کو ایک بنایا جاتا ہے شکسپیر کے متعلق بھی اس قسم کی کوششیں صدیوں سے ہو رہی ہیں مندرجہ ذیل مضمون اس نئے انداز پر ایک پھبتی ہے لیکن اسے محض پھبتی ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ آخر مصنف ماحول سے متاثر ضرور ہوتا ہوگا، اور تخیل رائی کا پہاڑ بنا لیتا ہے، غالب کو بھی آخر آس پاس کی اشیاء سے ہی "تحریک شعری" ہوتی ہوگی۔ ماحول کے تاثرات کے علاوہ اس مکالمہ میں شاعر کا فطرتی رجحان، حالات کی مجبوری، اور کشمکش دکھائی ہے۔ اور قصیدہ کی سی مصنوعی صنف سخن میں غالب جیسے وہبی شاعر کے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ پھبتی تعمیری تنقید کے سلسلہ میں ایک نادر کارنامہ سمجھنی چاہئے۔

ہر شعر کا ردیف قافیہ ضرور دیا ہے۔ اور کلام غالب کے علاوہ جو حوالے ہیں ان پر مختلف نشانات لگائے ہیں، مسلسل نمبر محض غالب کے اشعار کے لئے ہیں۔ (ادارہ)

تاریخ:۔ شب قدر [1] والی کا دن؛ مابین غدر دلی میں؛ ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء

وقت:۔ مابین عصر و مغرب۔ سایہ ڈھل رہا ہے [2]

کردار: میرزا غالب، بیگم غالب

حالات:۔ ایک مردانہ کمرہ۔ دیواروں پر تازہ سفیدی پھری ہوئی بوسیدہ ایرانی قالین جس پر چیتے [3] کی کھال کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ہے۔ تین تکئے [4] ادھر ادھر پڑے ہوئے ایک پر کلاہ پیاخ [⊕] ایک کے پاس جام سفال [5] (مٹی کا آبخورہ) ایک پر اوندھی مینائے [6] مے۔ پاس ہی ایک شمع خاموش [7]۔ اور ایک چوپٹ [8] کی بساط بچھی ہوئی ہے دائیں طرف باہر کا ایک دروازہ کنڈی [9] لگی ہوئی۔ وسط میں ایک مقفل دروازہ قفل ابجد [10] والا، بائیں طرف ایک افسردہ گلخن۔ آدھی جلی ہوئی لکڑیوں سے

---

[1] ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم ۔۔ ہے اب کے شب قدر و دوالی باہم۔ کوئی نجومی معین تاریخ بتا سکتا ہے۔ نہیں تو ۱۸۵۷ء ہی سہی۔ غالب نے میرزا جعفر کی تاریخ۔ مخفوظ نکالی تھی [2]: ۵ ہنیں ۳ سا یہ کوشش کر نوید مقدم یار۔ گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار + یہ تاویل برج کے سایہ کے متعلق بھی ہو سکتی ہے مگر یار کی آمد ہے اس لئے شام ہوگی [3] سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پہ [4] ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر [5] "پرن تکیہ" "سخن تکیہ" والی غزل جو کبھی اہلال میں چھپی تھی۔ ⊕ غالب کی قلمی تصویر اور "یادگار غالب"۔ [5] جام جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے [6] مینائے پے شراب و دل بے ہوائے دل [7] اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے۔ [8] مخلص بہر ہم کیسے سے گنجفہ بازِ خیال ۔ نہیں ۔۔۔ بتخانہ ہم ۔ اسی چوپٹ کی بدولت زنداں کی ہوا کھانی پڑی۔ "یادگار غالب" [9] قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج۔ [10] مجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد ۔ تھا ۔۔۔ جدا ہو جانا۔

بھر ہوا۔ عین اوپر چھت کے قریب جالے سے ڈھنپا ہوا روزن۔[۱۲]

پردہ اٹھنے پر میرزا غالب تنہا کھلا ہوا قبا پہنے[۱۳] ادھر ادھر ٹہلتے نظر آتے ہیں کچھ گنگناتے ہیں۔ کبھی قلم[+] سے کاغذ پر کچھ لکھ لیتے ہیں۔

میرزا غالب ۔ ۔ ۔ ۔ بہفت اورنگ۔ اے جہاندار آفتاب آثار ۔ ۔ ۔ آفتاب آثار۔ انقلاب آثار۔ آفتاب کو قافیہ کر دوں بادشاہ کو ایسی ہی زمین پسند آتی ہے ان "لیلئے آشنا" اور "بے پروا تمکے" والی غزلوں پر بہت خوش ہوئے تھے جبھی وظیفہ مقرر کر دیا۔ گو یہ کچھ اس بد ذوق کا اندازہ ہوجاتا ہے، اور پھر خواہ مخواہ کی دماغ سوزی "آثار" ٹھیک ہے "افگار"، اور "نگار"۔ دونوں طرح کے قافئے بند سکیں گے۔ ہاں تو ع تھا میں اک دردمند سینہ فگار" ٹھیک! ؎ تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں۔ تھا میں اک دردمند سینہ فگار" + اور ع تھا میں فرہ دل شکستہ ۔ ۔ ۔ + مگر یہ مرا اپنا مرثیہ نہیں ان کا قصیدہ ہے۔ سینہ فگاری کافی ہے۔ تو پھر کیا ہوا تھے؟ — ع ہو گئی میری گرمئی بازار"، ہاں ؎ تم نے جو مجھکو آبرو بخشی۔ ہو گئی میری گرمئی بازار"۔ بڑی! — مومن خاں کو فقرہ کسنے کا موقعہ مل گیا اور تو کچھ نہ ہوا۔ کہتا تھا ع اب تم وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا[⊗] لیکن اس کی تعلیوں سے کیا ہوتا ہے۔ آپ تو رمل فال سے پیسے ۔ ۔ کما لیتا ہے، گو ڈھونگ طبابت کا رچا رکھا ہے۔ خیر مجھے مصرعہ ہاتھ آگیا۔ مقطع نہیں بنتا تھا۔ بجلنے یہ مقطع کیوں ضروری ہے، مشاعرہ کی غزلوں میں کہنا ہی پڑتا ہے، اچھا بھلا ہو گیا تھا ؎ غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں"۔ جیسے شاعر ویسی غزلیں۔ عجب عجب شعروں پر داد ملتی ہے ع خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں"۔ ہائے! ع آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں"۔ اس پر بس مومن اور مفتی صاحب[۱۶] کو جنبش ہوئی باقی تو وہ خاک بت بنے رہے، یہ بھی صنع حکمت ہو گئی۔ کمبخت درباریوں کی صحبت میرا مذاق بگاڑ رہی ہے۔ قصیدے بھی بکنے پڑ گئے۔ ابھی تین شعر ہی ہوئے ہیں، اور یہ مصرعہ "ہو گئی میری ۔ ۔ ۔ ۔ "کچھ سست سا ہے قطعہ کیوں نہ کر ڈالوں۔ ع ہوئی میری وہ گرمئی بازار" ٹھیک! ع کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز" کیا ہوا؟ — ذرے کو آفتاب بنانا پڑے گا۔ جبھی سمجھیں گے — ہاں۔ ع ۔ ۔ مجھ سا ذرۂ ناچیز" کیا ہو گیا؟ — مطلع الانوار —؟ قافیہ تو خوب ہے ع روکش مہر مطلع الانوار۔؟ بے معنی معلوم ہو گا انھیں۔ آگے ہی مہمل گو کہتے ہیں۔ ۔ ۔ ع آفتاب ثوابت وسیار؟ — نہیں نہیں۔ ع روشناس ثوابت وسیار" یہ ٹھیک ہے۔ لیکن یہ پھر میرا اپنا قصیدہ ہوتا جاتا ہے اس کمبخت کو کان بھرنے کا موقعہ مل جائے گا۔ کیا کروں، ناحق درباری بن گیا۔ اس کے لئے تو باعث آبرو تھا یہ عہدہ، اس دن چوٹ بھی نہیں ع بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا" مقطع کام آگیا، سب ہنس رہے تھے اور وہ حیران تھا — ہاں — تو ع بادشاہ کا غلام کارگذار" — یہ ٹھیک رہے گا۔ اس میں اپنی کارگذاری بھی آگئی — مسلسل کر ڈالوں اسے۔ ایک۔ دو تین۔ ٹھیک۔ تینوں بیٹھ گئے ہیں: — گرچہ از روئے ننگ بے ہنری۔ ہوں خود اپنی نظر میں، اتنا خوار۔ کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار۔ شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں۔ بادشہ کا غلام کارگذار — بادشاہ سلامت کو معرفت کا بھی دعویٰ ہے بچارا صوفی مزاج ہے اس دن۔ ع اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے۔[۱۵] پر خاصی داد دی تھی، اس دن سے کبھی کبھی غزل میں ایک آدہ تصوف کا شعر جوڑنا ہی پڑ جاتا ہے، پیر و مرشد جو ہوئے ع خانہ زاد اور مرید اور ۔ ۔ ۔ "خدا جانے کیا؟ مرید اور ذکر؟ — نہیں نوکری کا الگ ذکر چاہئے۔ اس مقطع پر کہا گیا تھا کہ ع وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں" میں رعونت پائی جاتی ہے، گویا متاسف ہوں، اور ہوں بھی — ہاں تو ؎ خانہ زاد اور مرید اور ۔ ۔ مداح۔ تھا ہمیشہ سے یہ ۔ ۔ ۔ + کیا تھا میں پہلے؟ سوانح نگار۔ تھا۔ مگر یہ لفظ بیٹھتا نہیں۔ تو پھر کیا ہو؟ — ہاں! — "عریضہ نگار"، ع تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار۔ ٹھیک! ؎ خانہ زاد اور مرید اور مداح۔ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ

[۱۲] ع جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں ۔ ۔ ۔ "برنگ پنبہ روزن میں ع مثل ذرہ روزن میں۔ ع چشم روزن پر۔ [۱۳] ع مست کب بند قبا باندھتے ہیں۔ + + عام طور پر اشعار میں مذکور ہیں۔ حوالہ غیر ضروری ہے ع ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے ع ٹیڑھا لگا ہے خط قلم سرنوشت کا + وغیرہ وغیرہ دیکھو ص۳۲ - ⊗ "آب حیات"، "یادگار غالب" ؎ جنھوں میں یہ مومن مکان لیتا ہے۔ نجومی بن کے جو ہاتھی کا دان لیتا ہے [۱۶] مفتی صدر الدین آزردہ [۱۴] ع دگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔ [۱۵] ع حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں۔

نگار"، دور جے بارے ذکر بھی ہو گیا . . . صدحیف :— سچ تو یہی ہے مگر

(قفل دروازے پر زنانے سے دستک ہوتی ہے)

لکھ رہا ہوں۔ لکھ رہا ہوں۔ صبر کرو۔ کیا حرف تھے قفل ابجد لگا ہوا ہے تمہاری ہی پسند ہے صبر کرو، بڑی مشکل سے حروف جوڑ کر کھولتے ہیں۔ وہ بیگم صاحبہ ناک پر رومال رکھے داخل ہوتی ہیں۔)

بیگم یہ دروازے بند کرکے کیا کر رہے تھے؟ ہائے آج خلوت ہے۔ مینا خالی ہے جو بہت ناک سے رومال ہٹا کر) مگر بو بدستور آ رہی ہے۔ سارا کمرہ متعفن

میرزا کام کر رہا ہوں اب یہ پرانی بحث از سر نو شروع کرنے سے کیا حاصل۔ میرے کھانے پینے[5] کے برتن تک تو الگ کر رکھے ہیں تم نے۔

بیگم تم نے وہ برتن بھی تو بیچ ڈالے، اب مٹی کے آبخوروں پر جام جم کے تصور میں خوش ہو رہے ہو۔ بنانے تمہاری یہ فاقہ مستی[17] کیا رنگ لاکے گی جو چھا ہو۔ وہ سارا اصفہانی کارخانہ بھی ساتھ ہی برباد ہو گیا۔[18] شراب سب ہوئے ڈونی آج نہیں ایسی بودار چیز سے اتنی محبت کیوں ہے؟

میرزا (مسکرا کر) تمہارے جیسے[19] نکیرین کو بھگانے کے لئے۔ جو ہے کام کر رہا ہوں مطلب کی بات کہو۔

بیگم کام؟ کیوں کام کا نام بدنام کرتے ہو کیا کام تھا۔

میرزا کام کا نام بدنام! ——— ماشاء اللہ مقفےٰ عبارت بولنے لگی ہو آخر شاعر کی بیوی ٹھہری۔

بیگم تم شعر بھی تو کام کے نہیں کہتے۔

میرزا (بگڑ کر) کیا ہے میرے شعروں کو؟

بیگم یہی تو میں پوچھتی ہوں، بجانے کیا ہے ان کو۔ آغا عیش[*] کی میری کہتی تھی کسی کی سمجھ میں ہی نہیں آتے۔

میرزا کچھ ہو تو آئیں۔ مگر تم اچھی بیوی ہو دشمنوں کی ہاں میں ہاں ملاتی ہو۔

بیگم جے سچ بولتی ہوں جھوٹ کی عادت نہیں مجھے وہ تمہارا ہی کہا کیا ہے

میرزا (مسکرا کر) ہائے میرے شعر تو یاد ہونے لگے تمہیں۔ آہستہ آہستہ سمجھنے بھی لگو گی۔

بیگم تم نے پھر کچھ میری زبان سیکھنی شروع کی ہے تو سمجھ گئے ہو ورنہ وہ آغائی اردو کیسے یاد ہو سکتی تھی جے . . . . ناخن تیشۂ مضراب نہیں نہ بجنے کیا تھا۔ حکیم عیش کی بیوی کچھ سن رہی تھی۔

غالب (بگڑ کر) کیا بیہودہ ہے۔ میرا شعر کب ہے یہ۔ سب اس بیگم نی آغائی تہمت تراشی ہے چاہتے ہیں میں بھی زنانہ بولی لکھا کروں۔ ہم آبائی سلح بند ٹھہرے۔ (تن کر) جے سو سال سے ہے پیشۂ آبا سپہگری کچھ . . . .

بیگم (بیچ میں بات کاٹ کر) سچ کہتے ہو۔ واقعی یہ تمہاری ہی قسم کی شاعری ذریعہ عزت نہیں ہو سکتی، اس میں تم سے تو وہ حجام کا لڑکا ہی اچھا ہا خاقانی ہند، ملک الشعراء جانے کیا کیا کچھ کہا یا۔ کاش تم بزرگوں کی طرح سلح بند ہی رہتے۔ یہ شعر گوئی نہیں شروع کی، بزرگوں کا نام نہ ہوتا ہی تھا تو کوئی اور کام کرتے جس سے کچھ آمد ہوتی۔

میرزا کام ہی کر رہا تھا۔ تم بے بہتی تضیع اوقات کر رہی ہو

بیگم خاک کام کر رہے تھے۔ کیا کام تھا جو آتے چیز آ زر بوں جیسے لگ سے

غالب اب نہیں تو جب تک کوئی گھاس کھودتا نظر نہ آئے کام معلوم نہیں ہوتا۔ مسدد دیکھ رہا تھا۔ دولت و سلامت کا . . . . . . میں نہ ضروری سمجھا ہے۔

بیگم سنا ہے گھاس دیکھتے تم دیوں وہ در و دیوار پر سبزہ تو نہ اُگ رہا ہو گا۔[20] گھر تمہارا معلوم ہوتا ہے، اتنا سبزہ ہے کہ بازار میں بیچنے سے رات کی روٹی کا سامان ہو جاتا۔[22] اسی نے آئی تھی، نہ لکڑی ہے نہ کوئلہ۔ آرام کے اسباب[23] تو کیا سامان خورد و نوش بھی نہیں۔ مہینے بھر سے روز کہتی ہوں ختم ہو گیا ہے۔ مگر تم ہر بار مذاق میں ٹال دیتے ہو۔

میرزا مہینے بھر سے روز کہتی ہو اور ختم آج ہوا ہے۔ مگر عورتوں کی گنتی کا بھی خدا نیا ہو۔ اور پھر میں کیا کروں ماما کو پیسے دو۔ منگوا لو۔

بیگم پیسے دو۔ منگوا لو! پیسے کہاں سے دوں؟ جے ہیں سے گھر سے لائی تھی ماں کہاں ہے مردوں[24] کی چھ ماہی کی طرح تنخواہ ملتی ہے تمہیں۔ ایک

---

(۵) یادگار غالب . . . دورے آئیں گے اور سے گر ٹوٹ گیا جام جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے (۱۷) جے رند رنگی بھاری فاقہ مستی ایک دن (۱۸) صرف ہینٹ سے ہوئے آلات میکشی تھے یہی، وحساب سو یوں پاک ہو گئے (۱۹) فاہہ ہے کہ گھبرا کے . بجا ہیں گے نکیرین — . . . . بزم بادۂ روشینہ کی بو آئے . * آب حیات۔ حکیم آغا عیش کا ذکر غالب کے حالات میں (۲۰) جے کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے۔ (۲۱) اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب . . . . . . بہار آئی ہے (۲۱) جے وحشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (۲۲) جے ہاں اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا (۲۳) سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں . . . کے اسباب کہاں سے لاؤں (۲۴) منصب و زیر تصنیف کے اشعار۔

[۵۲۴] پہنائی ساہوکار کی نذر ہو جاتی ہے کچھ شراب و کباب میں اڑا ڈالتے ہو۔ جا بیجا اور پہلے ہی سے رہن ہے۔ خدا جانے تم شراب کیوں پیتے ہو۔ نہ اور رہن کا خیال نہیں تو حبیب ہی کا فکر ہوتا۔ شراب کی محبت ہے تو لگے جہان میں مردودی کے خوف سے ہی رک جاؤ۔

میرزا — وہاں ملتی رہے گی فکر نہ کرو، تمہیں عادت نہیں ہے تم اپنا خیال کرو۔ اچھو یہ اچھو نہیں گے ہمارا کیا ہے ساقی و کوثر [۵۲۴] بخشش پہ سہارا ہے اور یہاں تو ہمارے رشتے کو برداشت کرے، وہ ہمارے کی خاطر پیتا ہوں۔ کل بیمار تھا۔ اکیلا پڑا سڑ گیا۔ تمہیں اتنی توفیق نہ ہوئی کہ پوچھ لیں۔ شراب نہ پیوں تو اور کیا کروں۔

بیگم — بیمار؟ زیادہ پی لی تھی اور کیا۔ اور پھر تم نے خود ہی کر رکھا ہے ع۔ پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار۔ میں نے تمہارا کہا کر دیکھا۔

میرزا — سالہ ع۔ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو۔ کی شرط بھی تو تھی۔ اس روز کی چخ چخ سے تنگ آ گیا تھا۔ بھلا اس کو تو بتاؤ ہم میں کام کیا ہو سکے روپیہ کہاں سے آئے۔

بیگم — دیکھ روپیہ کمانے کا کام کر رہے تھے؟ کیا تھا وہ کام؟

میرزا — قصیدہ لکھ رہا تھا بادشاہ سلامت کا۔

بیگم — تم روپیہ کمانے کا ذکر کر رہے تھے۔ ان قصیدوں میں کیا رکھا ہے پہلے مجھ کو کیا ملا! سڑی ہوئی مونگ کی دال [۵۲۵]۔ اکڑی ہوئی بیسنی روٹی [۵۲۶] سیم کے بیج [۵۲۷] اچار یوں دعوے باندھتے ہو۔ یہی غنیمت ہے جو سال میں چند ٹھیکریاں مل جاتی ہیں۔ جیسا کام ویسا دام۔ خدا جانے یہ سلسلہ بھی کس طرح قائم ہے۔ تمہارے شعر بھی تو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔

میرزا — دیکھو۔ مذاق کی حد ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں نماز پر کچھ ہنسی مذاق میں کہا تھا تو تم میکے چلے جانے کی دھمکیاں دینے لگی تھیں۔ میرے شعروں کے متعلق یہ انداز گفتگو [۵۲۸] جاری رکھا تو پھر میں بھی کھوٹے ہتھیاروں پر اتر آؤں گا۔

بیگم — لیکن نماز تو فرمودۂ خدا ہے تمہارے شعروں سے کیا نسبت؟

میرزا — میرے شعر بھی تو نوائے سروش [۵۲۹] ہیں غیب سے مضامین آتے ہیں [۵۲۹] ۔ ہے
غالب اگر این فن سخن دین بودے ۔ آن دین را ایزدی کتاب این بودے۔

بیگم — توبہ۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ غیب ہی سے مضامین آتے ہونگے جو معنی یوں غائب رہتے ہیں۔ اور زبان تو واقعی اوپر والی ہے اس زمین پر بسنے والے تو نہیں بولتے۔ کم از کم دلّی میں تو نہیں بولتے۔

میرزا — دلّی! دلّی کو میں کیا جانتا ہوں؟ خود اردو کی کیا حیثیت ہے [۵۳۰]؟ میرے معانی آنے والی نسلیں سمجھیں گی [۵۳۱]۔

بیگم — صحیح ہوگا۔ مگر روٹی تو آج چاہیے، آنے والی نسلیں خدا جانے کب آئیں۔ قصیدہ تو بہادر شاہ دلّی کے بادشاہ نے سننا ہے۔

میرزا — اور ایسا لکھ رہا ہوں کہ بادشاہ سن کر پھڑک جائے۔ سنو کیسے پرزور اشعار ہیں ۔ ہے

اے شہنشاہ آسماں اورنگ — اے جہاں دار آفتاب آثار

تھا . . . . .

بیگم — (ٹوک کر) یہ پہلا شعر ہے کیا؟ مطلع کہاں ہے؟

میرزا — مطلع مقطع کیا ہوتا ہے، تم شعر سنو

اے شہنشاہ . . . . .

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں — تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی — ہوئی میری وہ گرمئی بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز — روشناس ثوابت و سیار
گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری — ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار
کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی — جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار
شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں — بادشہ کا غلام کار گزار
خانہ زاد و مرید اور مداح — تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

---

[۵۲۵] بھی ہے جو مجھ کو شہ جم جاہ نے دال [۵۲۶] نہ پوچھ اسکی حقیقت حضور والا نے۔ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی [۵۲۷] ان سیم بیجوں کو کوئی کیا جانے۔ بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے [۵۲۸] ع تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے [۵۲۹] آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے [۵۳۰] فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است [۵۳۱] شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن ۔ ہوں گرمئی نشاط تصور سے نغمہ سنج ۔ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں۔

باسے نوکر بھی ہوگیا صد شکر　　نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

بیگم اس میں آدھی فارسی ہے، اور کام کی بات ندارد۔ یہ داستان ماضی ہے آج کی حالت بیان کرو، مگر تمہیں سیدھا صاف لکھنا ہی نہیں آتا، میں یہ تھا اور وہ تھا۔ اب کیا ہو یہ کہو، لیکن اب وقت تنگ ہے اور ایسی مشکل زبان میں لکھنا کوہ کندن کے برابر ہے

میرزا کوہ کندن کیا۔ لکھنا کیوں نہیں آتا۔ میں کیا ہوں یہ لکھوں۔ لو ابھی لو۔ (فی البدیہہ کہنے لگتے ہیں)۔

آج مجھ سا نہیں زمانے میں　　شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار
رزم کی داستان گر سنئے　　ہے زبان میری تیغ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے　　ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

بیگم (ٹوک کر) یہ اپنا قصیدہ لکھ رہے ہو کہ بادشاہ کا۔ مطلب کی بات کہو، صاف صاف کہو تنخواہ ماہوار چاہئے، اوپر سردیاں آرہی ہیں۔ کپڑے نہیں ہیں، آخر تم درباری ہو، تمہاری بے آبروئی دربار کی بے آبروئی ہے، قرضہ بڑھ رہا ہے۔

میرزا مگر یہ تو بھٹ گری ہوئی۔

بیگم تو قصیدہ اور کیا ہوتا ہے، میری مانو سیدھی سیدھی باتیں لکھو، مگر وہی آغا عیش کی بیوی کی بات تم اس طرح لکھ ہی نہیں سکتے۔

میرزا لکھ نہیں سکتا، یوں واہیات بکنا کیا مشکل ہے۔ سن لو

ص نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں　　مدعائے ضروری الاظہار
پیرو مرشد اگرچہ مجھکو نہیں　　ذوقِ آرائشِ سر و دستار
کچھ تو جاڑے میں چاہئے آخر　　تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش　　جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار
کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال　　کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار
آگ تاپے کہاں تلک انسان　　دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
دھوپ کی تابش آگ کی گرمی　　وقنا ربنا عذاب النار

بیگم (بیچ میں) بات ہوئی نا؟ اور وہ قرض اور تنخواہ کا معاملہ؟۔

میرزا (کان سے قلم اتار کر پھر لکھنا شروع کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ پڑھتے جاتے ہیں):ــ ص

میری تنخواہ جو مقرر ہے۔　　اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مُردے کی چھماہی ایک　　خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات　　اور چھماہی ہو سال میں دوبار
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض　　اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں تہائی کا　　ہوگیا ہے شریک ساہوکار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد　　قہر ہے گر کرو نہ مجھکو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ　　تا نہ ہو مجھکو زندگی دشوار

بیگم بات ہوئی نا! جب تم یوں لکھ سکتے ہو تو پھر ہمیشہ اسی طرح کیوں نہیں لکھتے۔ دیکھ لینا داد بھی خوب خوب ملے گی اور بادشاہ سلامت کو حقیقت حال بھی معلوم ہو جائے گی۔

میرزا خیر داد تو جبھی ملے گی معلوم ہو گی، البتہ قصیدہ ہو گیا پچیس کے قریب اشعار ہو گئے ہیں، ایک ص۳۳ دو دعائیہ راستہ میں لگا دوں گا۔ ترتیب ص بھی بدل دوں گا۔ مکمل کام ہو گیا۔ چلو تمہارا کہا بھی کر دیکھتا ہوں۔

(اتنے میں مغرب کی اذان سنائی دیتی ہے۔ بیگم نماز کے لئے زنانہ میں چلی جاتی ہیں اور غالب کپڑے بدلنے لگتے ہیں۔ کلاہ پاپاخ کا ترچھا زاویہ بنائے ہوتے ہیں کہ بیگم لوٹ آتی ہیں۔)

بیگم کھانا ابھی کھاؤ گے یا واپس لوٹ کر۔

میرزا کھانا؟ کہاں سے آگیا؟ اور تم اتنی جلدی کیسے لوٹ آئیں، نماز تو خدا کے دربار میں حضوری ہوتی ہے، مگر تم کرو بھی کیا، آخر تمہیں نمازوں سے کیا حاصل جنت میں ہم جائیں تو ہمیں حوریں ملیں گی۔ تمہیں کیا ملے گا؟ کوئی مسجد کا ملّا میلا تہمد، کھدر کا کرتہ، کاندھے پر رومال، رومال میں

ص۳۲ ط ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھکر قلم نکلے۔

ص۳۳ ص ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ــ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ص مطبوعہ قصیدہ میں "مشخص چار" کے بعد "ط" نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں" اور "عذاب النار" کے بعد "ط" میری تنخواہ جو مقرر ہے" "ساہوکار" تک ہے۔ پھر "ط" آج مجھ سا نہیں زمانہ میں" اور "ابرِ گوہر بار" کے بعد "ط" ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد" تا "دشوار" ہے۔

* "یادگار غالب"

مجرے کی گنجی۔ سر پر جھڑ۔ ایک، دو، ہم۔ . . جناب دائیں طرف . . . . "

بیگم (تڑپ کر) دیکھئے۔ یہ مسخراپن چھوڑیئے۔ بار بار کہہ چکی ہوں خدا اور رسول کے احکام پر پھبتیاں نہ کہا کرو۔ یہ اسی کا وبال ہے کہ میرے بچے زندہ نہیں رہتے۔ عارف[534] کو پالا تھا وہ بھی۔ . . . . (بیگم کی آنکھیں آبناک ہو جاتی ہیں[535]) غالب بھی غمناک ہو جاتے ہیں۔

اتنے میں باہر سے کہاروں[536] کی آواز آتی ہے۔ "مد پینس[536] حاضر" ! ——)

بیگم لو اب خیر سے سوار ہو جائیے۔ اور کوئی اچھی خبر لائیے۔

غالب زیر لب ع بلے ! یہ چرچا ہی کہ مرا زندہی۔

کہتے ہوئے باہر چلے جاتے ہیں، بیگم زنانہ میں لوٹ آتی ہیں۔

(پردہ)

دوسرے دن کا سین پھر کبھی سہی——!!

تاثیر

تن من واری

ازجناب ماسٹر باسط۔ بسوانی

تن من واری
پیاری تجھ پر تن من واری

موہنی صورت۔ پیاری پیاری   جگ سے انوکھی۔ سب سے نیاری
میں جاؤں تجھ پر۔ بلہاری   تیکھی چتون۔ نین کٹاری
پریم کا تیرے میں ہوں بھکاری
پیاری۔ تجھ پر تن من واری

تن من واری
پیاری تجھ پر تن من واری

بجلی گرانا تیرا ہنسکر   حسن کی دیوی۔ دل کی ٹھہر
شیش نواؤں تیرے در پر   کس کا کعبہ۔ کس کا مندر
میں ہوں تیرا پریم پجاری
پیاری تجھ پر تن من واری

تن من واری
پیاری تجھ پر تن من واری

جب ہم تیرے درشن پائیں   کیونکر تجھ سے آنکھ لڑائیں
تیری نظریں آفت ڈھائیں   دل پر ظالم تیر چلائیں
دونوں نیناں۔ باری باری
پیاری تجھ پر تن من واری

تن من واری
پیاری تجھ پر تن من واری

چلنے میں اٹھلانے والی   جھب دکھلا کر جانے والی
جھوٹی قسمیں کھانے والی   درشن کو ترسانے والی
باسط تیرے در کا بھکاری
پیاری تجھ پر تن من واری

---

[534] ہاں اے فلک پیر۔ جواں تھا ابھی عارف ۔۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

[535] ع قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیرے مژگاں کا۔

[536] پینس میں گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے ۔۔ کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے۔

معذرت

سر عبدالقادر کے صاحبزادے شیخ منظور قادر بی اے کی نظم

(یہ نظم کیمبرج انگلستان سے وصول ہوئی ہے جس کا ذکر پروفیسر تاثیر نے اپنے خط میں کیا ہے۔ ایڈیٹر)

معافی کا خواہاں ہوں یارب میں تجھ سے — نہ سوچوں میں یوں۔ بن پڑے گر یہ مجھ سے
نہیں زور اپنے خیالوں پہ مجھکو
تعجب ہے خود ان سوالوں پہ مجھکو

جو پیشِ نظر ہے۔ نظر آ رہا ہے — پڑے کان جو ہے سنا جا رہا ہے
نہیں زور میرا دلیلوں میں اسکو
یہ طاقت نہیں ہے نہ سمجھوں میں اسکو

عطا طاقتِ دید کی تو نے مجھکو — سماعت کی قوت بھی دی تو نے مجھکو
تجھی سے ہے جو میری تعمیر میں ہے
تجھی سے ہے جو میری تدبیر میں ہے

کہوں یوں نہ گو کچھ ادب سے میں تیرے — ڈروں خلق سے یا غضب سے میں تیرے
مگر نیک و بد کا اثر جانتا ہوں
اندھیرے اُجالے کو پہچانتا ہوں

یہ تو نے کہا ہے کہ بے دین جو ہیں — انہیں آپ ہے تو نے گمرہ بنایا
یہ سب لوگ ہیں دل کی آنکھوں کے اندھے
پڑے ہیں انہیں اور ہی اور دھندے

یہ سنتے نہیں ہیں سمجھتے نہیں ہیں — مگر کیوں؟ کہ تو نے نہیں ہے سمجھایا!

اگر ایک چینی کی گڑیا سے کہئے — کہ مردار اٹھ اب سے بھاگی پھرا کر
کرے گی اگر حکم کی تو عدولی
چڑھائیں گے بدذات ہم تجھکو سولی!

یہ سنکر اگر وہ بچاری نہ بھاگے — تو لٹکائیں سولی پہ اس کو اٹھا کر؟
یہ مانا بہت خوب یہ مشغلہ ہے — مگر اے خدا تجھکو زیبا نہیں ہے
معافی کا خواہاں ہوں تجھ سے خدایا — کہ تخیل پر زور میرا نہیں ہے۔

منظور قادر (کیمبرج)

نعرۂ خروش

از شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہٗ

ہوشیار اے مرد مومن ہوشیار!

بھاگ ان باطل پرستوں سے کہ یہ پایاں کار چھین لیں گے باتوں ہی باتوں میں تجھ سے ذوالفقار آ رہی ہے دشت استبداد سے باد سموم اور محکومی سمجھتی ہے نسیم خوشگوار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

پشت پر رہتا ہے انکی دولت دنیا کا ہاتھ کہہ رہی ہے انکے کانوں کی چپلنے روزگار جانور لیں سانس یکرنگی و آزادی کیساتھ نسل انسان اور تقسیم غلام و شہریار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

قبضے میں انکے دلیں کسقدر مجھ سے نہ پوچھ یہ سر منبر جو بیٹھے ہیں بشکل سوگوار تو ہے کس نکتے میں اے صید زبون علم و فن قوت بازو پہ ہے فتح و ظفر کا انحصار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

اللہ اللہ محفل وعظ و مقام ذاکری کھیلتے ہیں اس جگہ محراب و منبر سے شکار دیکھتا ہوں عصر حاضر کی نگاہ مہر میں وہ دہکتی آگ کہ نہیں جس سے دوزخ کے شرار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

حسین کی تلقیں کو سمجھا ہے تعلیم نجات تو وبا کو جانتا ہے رحمت پروردگار ننگی شمشیر براں ایک لاکھوں کی لڑی اللہ اللہ موج نطق ذاکران ذی وقار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

خون کے دھارے کو اندر سے ہے جکارا ستا آنسوؤں کی سیل میں تو ڈھونڈتا ہے وہ دیار عالمان دین کی دستار میں آتے ہیں نظر وہ بلا کے پیچ و خم جن سے ہوں اژدر شرمسار

ہوشیار ہوشیار

اے مرد مومن اے مرد مومن

ہوشیار ہوشیار

جرم کی تاریخ کہتی ہے بآواز بلند — مجرموں سے بڑھ کر اس فن میں ہیں مفتی پختہ کار
اے مرد مومن
ہوشیار
ہوشیار

اے مرد مومن
میر لشکر، سہما، ساونت، غازی شیردل — در لشکر بزدل وافسردہ، وزار و نزار
ہوشیار
ہوشیار

بندگان بے خطا کا چوس لیتے ہیں لہو — اور لب خونریز سے کرتے ہیں تجویز بادہ خوار
اے مرد مومن
ہوشیار
ہوشیار

اے مرد مومن
جنکے سائے میں مچلتی ہیں بہاریں خلد کی — مڑ نہ جائے دیکھ ان تا بندہ تلوار کی دھار
ہوشیار
ہوشیار

جادہ پیما، صف شکن، بیدار امیر المومنین — اور مومن خفتہ و مجہول و سست و شرمسار
اے مرد مومن
ہوشیار
ہوشیار

[illegible] ملیح آبادی

غزل

از جناب حاجی محمد صاحب طیب ایڈیٹر نقیب مرحوم

اردو میں سہل ممتنع کی ایک کامیاب مثال ہے جو حضرت آرزو لکھنوی کی دعوت پر تحریر میں آئی تھی۔ ایڈیٹر

اگر عشق میں دل گنوانا پڑے گا — تو ہر غم خوشی سے اٹھانا پڑے گا
یہ ہے مرگ و ہستی کہ اپنی خوشی سے — نہ آنا پڑا تھا، نہ جانا پڑے گا
وفا کیشیوں پر جفا کوشیاں ہیں — یہی ہے تو پھر آزمانا پڑے گا
کوئی یاد جو یونہی آتا رہے گا — تو اپنے کو بھی پھر بھلانا پڑے گا
یہ بزم محبت ہے اے حسن سرکش — یہاں آتے ہی سر جھکانا پڑے گا
تغافل تجاہل کی حد تک تو پہونچا — یوں ہی ہے تو پہچان جانا پڑے گا
قیامت یہی ہے کہ ہر نقش ہستی — مٹاتے تو ہیں پھر بنانا پڑے گا

کن انکھیاں نہیں، تیر و نشتر ہیں طیب
اچٹتا ہوا سا نشانہ پڑے گا

ایک درد بھری نظم جس میں ہندوستانی بیوی کے نہایت صحیح جذبات دکھائے گئے ہیں

اپنے پردیسی پریتم سے

نگارشِ زرّیں

محترمہ سیدہ زینب فریدہ جعفری، مرحومہ

ہم مرحومہ کا یہ ادبِ زرّیں نہایت احترام سے شائع کرتے ہیں۔ مرحومہ نے یہ رنگین نظم جو تمام و کمال درد و اثر میں ڈوبی ہوئی ہے ہمیں خلد آباد کو سدھارنے سے چند ہفتے پہلے بھیجی تھی، ہم نے مرحومہ کے مضامین کا مسودہ حاصل کر لیا ہے۔ اور اب ہم خوشی کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں کہ اپنی آئندہ اشاعتوں میں اور اپنے ہفتہ وار رسالہ لیلیٰ میں ہم مرحومہ کے ایک درجن افسانے اور سو سے زیادہ اسی قسم کی نظمیں شائع کریں گے۔ (ایڈیٹر)

مجھے اپنے جذبات کی سیلاب زدہ راتیں یاد آ رہی ہیں اور ان جذبات کے طوفانی سمندر میں تمہارے قہقہوں کے بلبلوں کو پھوٹتی ہوئی دیکھ رہی ہوں ــــــ وہ راتیں جب ہمارے دل آپس میں خوب گھلتے ہوتے تھے، جب ہمارے پیاسے ہونٹ ایک دوسرے کی پیاس بجھایا کرتے تھے وحشی دانت جھوم جھوم کر اور میٹھے سریلے نغموں کے ساتھ پریم کی گلکاریاں کیا کرتے تھے ــــــ اور جب کبھی سرمستی کی تھکن مٹانے کیلئے ہم جمائیاں لیتے اور اپنی خاصی جاگتی ہوئی آنکھوں کو سلانا چاہتے تو پوروں کی آگ ہمارے دھیرے دھیرے ٹھنڈے ہوتے ہوئے خون کو کھولا دیا کرتی۔ پریم کی چنگاریاں ہم میں چنچنانے لگتیں۔

اب تم مجھ سے دور ہو، بہت دور، شملہ کی ٹھنڈی فضا نے تمہارے جذبات کو سرد کر دیا ہے، میں مرجھا رہی ہوں اور پریم کے چھینٹوں سے مجھے کھلانے کیلئے تم میرے پاس نہیں آتے، میرے بازو پریم کے انگاروں کو چھونے کیلئے بیقرار ہو رہے ہیں تمہارے ہونٹوں کی شہد پینے کیلئے بیقرار ہو رہی ہوں، لیکن تم ہو کہ کھنچے جا رہے ہو تم ہو کہ پھسلے جا رہے ہو، تمہارا خیالی پیکر میری نظروں کے سامنے ہے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ تم میں پریم کا رس اب نہیں رہا ہے تپتے ہوئے جذبات کا جھولا جھولنے کا اب تم میں شوق باقی نہیں رہا ہے، تمہاری آنکھوں کی نرمی اب پتھر کی سختی سے بدل گئی ہے ــــــ

کیا ہماری اندرونی زندگی کے بہار کو پریم کی خزاں جھلس گئی ہے اور ہماری سرمست زندگی کی لہراتی ہوئی پتیاں بہت زیادہ دھوپ کھا گئی ہیں؟ کہیں شملہ کی ناگنوں نے تو تمہیں ڈس ڈس کر بیجان نہیں کر دیا ہے؟ مگر تم تو بہت سخت جان تھے آسانی سے قابو میں آنے والے نہ تھے؟ تمہاری اس مسلسل خاموشی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی ــــــ

اچھا یہ بتاؤ کہ میں تمہیں خواب میں بھی کبھی نظر آتی ہوں؟ کیا تم نے اپنے پہلے کے کھلے ہوئے پھول کو مرجھایا ہوا دیکھا ہے؟ کیا میں تمہیں خواب میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کی پکار سناتی ہوئی دکھائی دی ہوں؟ ــــــ

میں اندھیری راتوں میں تمہارے لئے بڑبڑایا کرتی ہوں، تمہیں دونوں ہاتھوں سے ٹٹولا کرتی ہوں، دل کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ساتھ ہوتا ہے۔ تھک کر چور چور ہو جاتی ہوں، مگر تم نہیں ملتے، میں چھپکی ہوئی چاندنی میں تمہارے پیچھے دوڑا کرتی ہوں، مگر تمہیں نہیں پاتی اور جب تھک کر گر پڑتی ہوں تو تم نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہو ــــــ

یاد کرو کبھی تم نے اپنی جوانی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے میرے دماغ کو معطر کر دیا تھا، تم نے اپنے دل کا سارا خزانہ مجھ پر نچھاور کر دیا تھا، تم نے اپنے پریم کے چھلکتے ہوئے پیالوں سے مجھے روحانی غذا بہم پہنچائی تھی، تم نے اپنے ہونٹوں کی لالی سے میرے ہونٹوں کو رنگ دیا تھا ــــــ ــــــ

ــــــ ہاں میرے دیوتا، میرے خوابوں کے کاریگر، میں تمہاری یاد کے سیلاب میں بہی جا رہی ہوں، مجھے لپک کر بچا لو ــــــ وقت ٹوٹا جا رہا ہے اور ہمارے پرانے خواب بھی پھسلے جا رہے ہیں، دلکشیوں اور رعنائیوں کا زمانہ جا رہا ہے، رنگینیاں مدھم ہوتی جا رہی ہیں ــــــ

برہ کی آگ میں زیادہ نہ جلاؤ ــــــ ہم یک جان دو قالب ہیں، اس عہد کو نہ بھولو ــــــ تم میرے دل کے مندر میں ضرور ہو اور میں دن رات تمہیں پوجا کرتی ہوں مگر ــــــ میں چاہتی ہوں کہ تم شعلہ ہو کر میری نگاہوں میں سما جاؤ، خون ہو کر میرے دل میں دوڑ جاؤ، میں تمہیں اپنی آرائشوں کے ساتھ پوجوں، پریم کے جادو بھرے منتر جپوں، پھر تم کو جانے دوں گی، دنیا کے بکھاوے میں پھنسنے دوں گی، مگر ایک بار کیلئے آ جاؤ، بہت دن تمہاری تپسیا میں گذری ہے۔ ــــــ

فریدہ دولہن (الٰہ آباد)

باغباں

از مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے مدیر "انقلاب" لاہور

دولہن! اپنا کام کر چکو! سنو مہمان آگیا ہے۔
سنتی ہو؟ وہ دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ ہلا رہا ہے۔
دیکھنا تمہارے پازیب کی آواز بلند نہ ہو جائے۔ اُس سے ملتے وقت تمہارے قدم میں غیر معمولی سرعت نہ پیدا ہو۔
اپنا کام کر چکو۔ دولہن۔ مہمان شام کے وقت آپہنچا ہے۔

نہیں دولہن یہ زور کی آندھی نہیں ہے۔ تم خوف نہ کرو۔
اپریل کی رات ہے۔ پورا چاند چمک رہا ہے، باہر میدان میں چھاؤں زرد ہو رہی ہے۔ سر پر آسمان جگمگا رہا ہے۔
اگر ایسا ہی ہے تو اپنے چہرے پر گھونگھٹ نکال لو۔ اگر تم ڈرتی ہو تو چراغ دروازے تک لے جاؤ۔
نہیں دولہن یہ زور کی آندھی نہیں ہے تم خوف نہ کرو۔

اگر تم شرمیلی ہو تو اُس سے کوئی بات نہ کرنا۔ جب وہ تم سے ملے تو دروازے کے ایک طرف ہو کر کھڑی رہنا۔
اگر وہ تم سے کوئی سوال پوچھے۔ اور اگر تم چاہو تو خاموش رہ کر اپنی نظریں جھکا سکتی ہو۔
جب تم چراغ ہاتھ میں اٹھائے اس کو اندر لاؤ تو اپنے کنگن کے گھنگروؤں کی جھنکار نہ نکلنے دینا۔
اگر تم شرمیلی ہو تو اس سے کوئی بات نہ کرنا۔

دولہن۔ کیا تم نے اب تک اپنا کام ختم نہیں کیا؟ سنو مہمان آگیا ہے
کیا تم نے اب تک گائے بھینسوں کے چھپر میں دیا نہیں جلایا؟
کیا تم نے شام کی سندھیا کے لئے پوجا کے پھولوں کی ٹوکری اب تک تیار نہیں کی؟
کیا تم نے اب تک اپنی مانگ میں سرخ شبھ ٹیکا نہیں لگایا، اور آج کی رات کے لئے سنگار نہیں کیا؟
دولہن! سنتی ہو؟ مہمان آگیا ہے۔ اپنا کام کر چکو۔

(ٹیگور)

پندارِ نسائیت

مقصود نگاہ اہل بینش   سرمایۂ ناز آفرینش   منھ پھیرے ہوئے کشادہ کاکل   دنیا کے وجود سے تجاہل
جنت ہے مراد تیرے دم سے   دل ہے تو ہے شاد تیرے غم سے   پھیلا ہوا دل کے واسطے جال   حیلہ کہ سوکھائے جاتے ہیں بال
تسکین کو اضطراب کردے   جو چاہے تو انقلاب کردے   اللہ یہ شانِ دل نشینی
پردہ ترا شوق آفریں ہے   جلوہ ترا ذوق آفریں ہے   نازت بکشم کہ نازنینی

اللہ یہ شانِ دل نشینی   جب تو نے کہیں یہ حال دیکھا   ہے تیر نظر کا دل کو یارا
نازت بکشم کہ نازنینی   بس بن گئی ایک برق مضطر   ایسی، کہ شکار ہو نہ جاں بر

تحصیلِ دل افتخار تیرا   پامالیِ جاں شعار تیرا   گردن موڑی، نظر جھکائی   سینہ دیکھا، ملی کلائی
ہے خیر سے دلبری دلیری   دل چھین لیا، نگاہ پھیری   قامت کو عطا کیا وہ عنوان   ہو جس سے خم کمر نمایاں
میں نے جب یہ خطا کہیں کی   تیری طرف اعتنا نہیں کی   اللہ شانِ دل نشینی
دی تو نے سزا کہ مار ڈالا   آنچل سرکا دیا، سنبھالا   نازت بکشم کہ نازنینی

اللہ یہ شانِ دل نشینی   حیراں ہوں کہ یہ ہے نمائشِ حسن   یا ہوتی ہے آزمائشِ حسن
نازت بکشم کہ نازنینی   اے نشۂ دلبری سے سرشار   برحق ہے نسائیت کا پندار

[illegible] ناز تیرا   ایمائے نیاز ناز تیرا   کیا ہے جو ہو تجھ سے بڑھ کے پیارا   آ، دل میں ہو آ کے مسند آرا
بیگانہ وشی ہے آشنائی   ہر سعی حجاب خود نمائی   ہے حسن و ادا کی راج رانی   ہے نذر تری یہ نظم ماتیؔ

اللہ یہ شانِ دل نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

ماتیؔ. جائسی

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں

(۱)

ڈاکٹر اعظم کریوی سابق ایڈیٹر اکبر الٰہ آباد کے خیالات

فخر ملک و قوم حکیم محمد یوسف حسن صاحب کا ارشاد ہے۔ کہ بھئی بتاؤ تو سہی افسانہ کیونکر لکھتے ہو اب۔ کوئی تبلائے کہ ہم تبلائیں کیا۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ آج سے پہلے نہ تو کسی نے مجھ سے دریافت کیا۔ اور نہ خود مجھے یہ سوچنے کی ضرورت پیش آئی کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں جس طرح میری زندگی کی اور ضروریات پوری ہوتی رہیں اور مجھے محسوس ہی نہ ہوا کہ وہ کیونکر پوری ہوئیں یہی حال میری افسانہ نگاری کا ہے۔ فرمائش پر میں کبھی افسانہ نہ لکھ سکا۔ اور اگر زبردستی کچھ لکھا بھی تو ممکن ہے کہ میرے احباب نے قدر افزائی کے خیال سے اسے پسند کر لیا ہو لیکن میرا دل ایسے فرمائشی افسانوں سے مطمئن نہیں ہوا۔ کئی مہینے گزر جاتے ہیں۔ ہر ان رسائل و اخبار کی فرمائشوں سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے مگر تعمیل ارشاد نہیں ہو سکتی۔ ہاں کبھی خود بخود لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ بہ صورت شہر سے زیادہ جب میں کبھی دیہات میں رہتا ہوں تب پیش آتی ہے حساس دل پایا ہے اس سرسبز لہلہاتے کھیت، دریا کا کنارہ اور دیہاتیوں کی معصوم زندگی میرے دل پر خاص اثر کرتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ میرے افسانے زیادہ تر دیہاتی معاشرت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ میرا گاؤں کورٹی۔ پرگنہ چائل ضلع الہ آباد (یوپی) میں گنگا جی کے کنارے واقع ہے قریباً پانچ سال ہوئے میں الہ آباد سے لاری پر کورٹی کے لئے روانہ ہوا الہ آباد سے ۱۱ میل پر ایک گاؤں کوٹھا رسول پور ہے وہاں مجھے لاری سے اترنا پڑا، اب کورٹی پہنچنے کے لئے مجھے چھ میل پیدل چلنا تھا، برکھا رت ساون کا مہینہ اور پورنماشی کا دن تھا سہ پہر کا وقت رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر پہلے پانی برس چکا تھا، آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی تھیں۔ میں پگڈنڈی پر تیز قدم ایک بیخودی کے عالم میں سر جھکائے چلا جا رہا تھا یکبارگی بادل گرجا بجلی چمکی، اور موسلادھار پانی برسنے لگا میں ایک گاؤں موہٹہ کے قریب پہنچ چکا تھا گاؤں کے کنارے ایک معزز برہمن کا گھر ہے برہمن مجھ سے واقف تھا پانی نکل جانے تک کے لئے اس نے زبردستی مجھے اپنی بیٹھک میں ٹھہرا لیا۔ اس مکان سے کچھ دور پر ایک نیم کا درخت تھا۔ اس میں جھولا پڑا تھا اور گاؤں کی کمسن اور مست شباب لڑکیاں جن کے ہاتھوں میں مہندی رچی تھی جھولا جھول رہی تھیں۔ اور گاتی جاتی تھیں۔

سکھی آوت ہے اندھیری گھٹا کاری کاری نا ——— سکھی

ٹھیک اسی وقت اتفاق سے جھولا جھولنے میں ایک لڑکی کے ہاتھوں کی چوڑیاں ایک دوسری لڑکی کے کنگن کی رگڑ سے ٹوٹ گئیں، چوڑیوں کا ٹوٹنا تھا کہ کہرام مچ گیا، جس لڑکی کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹی تھیں اس نے اپنی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی تھی سب اسے منا رہی تھیں۔ مگر وہ چپ ہی نہ ہوتی تھی۔ آخرکار ایک شوخ لڑکی نے کھسیا کر کہا "واہ! ان کانچ کی چوڑیوں پر اتنا صدمہ، اتنا رنج" روتی ہوئی لڑکی نے اس شوخ لڑکی کی طرف گھور کر دیکھا، اور تنک کر جواب دیا "تیرے لئے یہ کانچ کی ہوں گی مگر میرے لئے تو یہ پریم کی چوڑیاں ہیں" سب لڑکیاں قہقہہ مار کر ہنس پڑیں۔ "آہا! یہ پریم کی چوڑیاں ہیں ——— اس کے دولہا نے بھیجی ہوں گی"

کوئی خاص بات نہ تھی، دیہاتیوں نے تو ان لڑکیوں کی باتوں میں کوئی دلچسپی تک نہ لی، بلکہ یوں کیوں نہ کہوں کہ انہوں نے اس طرف کوئی توجہ ہی نہ کی، لیکن اسی معمولی بات نے میرے دل کو متاثر کر دیا۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے چل پڑا کورٹی قریباً دو میل رہ گیا تھا۔ "یہ پریم کی چوڑیاں ہیں" بار بار اسی کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی، یہی معمولی جملہ میرے لئے ایک افسانہ بن گیا کورٹی پہنچکر والدین کی قدمبوسی سے فراغت پا کر میں نے اپنے ایک افسانہ "پریم کی چوڑیاں" کی بنا ڈالی تھی جو بعد میں رسالہ "نگار" میں شائع ہو کر

بہت مقبول ہوا۔ ابھی حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار ایسے زبردست نقاد نے اس افسانہ پر یہ رائے دی۔

"فسانہ اس قدر لطیف و پُراثر ہے کہ اس کو پڑھکر دیر تک عجیب کیفیت طاری رہی، گاؤں کی معاشرت کو پیش نظر رکھکر افسانہ لکھنا آسان نہیں اور اس سے وہی شخص عہدہ برا ہو سکتا ہے جو نہ صرف وہاں کی زندگی سے آشنا بلکہ اس زندگی کی صحیح روح اور معصوم کیفیات سے بھی باخبر ہو"

صرف اسی ایک مثال سے معزز ناظرین بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں فسانہ کیونکر لکھتا ہوں، چنانچہ میں نے آج تک جتنے اور جتنے افسانے لکھے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی تجربے یا مشاہدے کے نتائج ہیں، طوالت کے خوف سے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کی ہے کردار نگاری میرے لئے خاص چیز ہے پلاٹ کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی جس گاؤں یا شہر کے متعلق افسانے لکھتا ہوں میری انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ان مقامات کی مخصوص فطرتیں جھلکتی ہوئی نظر آئیں تاکہ پڑھنے والا اس مقام کی مخصوص فضا کا لطف حاصل کر سکے۔ عربی یا فارسی کے ثقیل الفاظ کے ساتھ ساتھ بھاشا کے میٹھے شبد، اور آسان سے آسان زبان میں سبق آموز افسانے لکھنا میری افسانہ نگاری کا خاص مقصد ہے۔ واقعات کی نفسیاتی پہلو کو میں نے کبھی نظر انداز ہونے نہیں دیا۔ میں افسانہ لکھتے وقت اس کا خاص خیال رکھتا ہوں کہ میں جو واقعہ لکھ رہا ہوں، وہ فطرت انسانی کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔

شور و غل سے بہت گھبراتا ہوں دل پر کسی خاص واقعہ یا نظارہ کا اثر ہوا اور میں تنہائی میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں اس عالم میں اگر میرے کسی کرمفرمانے پکارا یا میرے بچوں نے شور مچایا تو پھر لاکھ کوشش کرنے پر بھی میں اس وقت اپنے افسانہ کو مکمل نہیں کر سکتا چنانچہ اپنے اسی نقص کی وجہ سے سال میں دو چار ہی اور جتنی افسانے لکھ پاتا ہوں جو احباب یا مدیران رسائل میرے اس نقص۔ فوجی ملازمت، اور عدیم الفرصتی سے واقف ہیں وہ تو میری کوتاہ قلمی سے بدظن نہیں ہوتے مگر جو واقف نہیں ہوتے وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں نے ایک نشست میں بہت کم افسانے لکھے ہوں گے ایک اور جتنی افسانہ لکھنے میں مجھے کم از کم دو دن لگتے ہیں اگر افسانہ ایک دن میں مکمل بھی کر لوں تو پھر اس کا صاف کرنا میرے لئے قیامت ہے۔

موسم یا وقت کا میں زیادہ پابند نہیں جب دل پر چوٹ لگی یا دل کسی نظارہ سے متاثر ہوا تو میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں پھر بھی اگر کوئی مجھے اس سوال کا جواب دینے کے لئے مجبور کرے کہ دن اور رات میں افسانہ لکھنے کے لئے تم کس وقت کو زیادہ پسند کرو گے تو میں یہی عرض کروں گا کہ

جب رات کو دنیا سوتی ہے سناٹا سا ہو جاتا ہے
ہم اُن سے اعظم باتوں میں سب اپنی بیتی کہتے ہیں

[illegible]

(۲)

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں

پروفیسر منشی علی عباس صاحب حسینی ایم۔ اے۔ کے خیالات

یہ ایک طرح کی آپ بیتی ہے، اس کا لکھنا پرائی بیتی سے مشکل ہے اس لئے میں پہلے ہی صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ میری فسانہ نویسی کے نہ تو اوقات معین ہیں نہ سامان اور نہ اصول۔ نہ تو اس کے لئے میز کرسی کی شرط ہے۔ نہ مجھ کی ٹھنڈی ہواؤں کی، نہ خوشگوار موسم کی، اور نہ شب کی تنہائیوں کی، میں نے اکثر بستر پر لیٹے لیٹے فسانہ لکھا ہے۔ ریل کے سفر میں بھی، حد سے زیادہ گرمی میں بھی اور بچوں کے شور و ہنگامے میں بھی کبھی دوستوں کے اصرار سے مجبور ہو کر لکھتا ہوں۔ کبھی ایڈیٹروں کے تقاضے سے عاجز ہو کر اور کبھی اپنے جذبات کا محکوم بنکر! کبھی بے سوچے سمجھے قلم کاغذ لیکر بیٹھ گیا، کچھ لکھنا شروع کر دیا خیالات

کا سلسلہ شروع ہو گیا، پلاٹ بنتا گیا اور فسانہ مکمل ہو گیا، کبھی کوئی کتاب پڑھتے پڑھتے کوئی اچھی بات ذہن میں آ گئی۔ قلم کاغذ اگر پاس ہی ہوا تو اسی کو مرکزی خیال بنا کے لکھنا شروع کر دیا۔ پلاٹ کا ایک دھندلا سا خاکہ ذہن کے کسی کونے میں موجود رہتا ہے، اسی میں رنگ آمیزی کر دی، کبھی پورا پلاٹ پہلے ہی سے دماغ میں ترتیب دے ڈالتا ہوں۔ دو تین دن غور و فکر کے بعد اسے کاغذی پیراہن پہنا دیتا ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ کامیاب فسانے وہی لکھے گئے ہیں جو حقیقت پر مبنی ہیں۔ جو واقعات میں نے اپنے گرد و پیش دیکھے ہیں ان کی بعینہ مرقع کشی کر دی ہے، ان فسانوں کے لکھنے میں پلاٹ اپنی طرف سے بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر ان میں دماغ پر محنت سب سے زیادہ پڑتی ہے، انہیں فسانہ نگار کو فوٹوگرافر کے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں، جس طرح فوٹوگرافر کسی عمارت کا فوٹو لینے میں کیمرہ مختلف زاویوں سے لگا کر دیکھتا ہے کہ پوری عمارت کا فوکس کس زاویہ سے پورا اترتا ہے اسی طرح فسانہ نویس کو بھی ان فسانوں کی ابتدا میں حد درجہ دشواری محسوس ہوتی ہے، حقیقت کی تصویریں بڑی مشکل سے مکمل اترتی ہیں مجھے بھی بارہا اس طرح کے فسانوں کی ابتدا بدلنی پڑتی ہے، اس کے بعد بھی میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا فیصلہ میرے ہاتھوں میں نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے ہاتھ ہے! ——— خدا کرے دوسروں کو میری طرح کی دشواریاں نہ پیش آتی ہوں!

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں (۳)

حضرت سلطان حیدر جوش بی اے کے خیالات

اس سوال کا نہایت معقول اور مختصر جواب تو یہ ہو سکتا ہے۔ کہ میں افسانہ اسی طرح لکھتا ہوں جس طرح کہ لکھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سوال اپنی موجودہ صورت میں بہت کچھ مضحکہ انگیز ہے۔ یہ مانا کہ میرا فسانہ انداز بیان اور اظہار جذبات میں اوروں کے افسانوں سے بالکل جداگانہ ہو، مگر محض اس بنا پر یہ سوال کرنا کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں قابل تسلیم نہیں۔ یقیناً میری رفتار و گفتار بھی ہزاروں چلنے پھرنے اور بولنے چالنے والوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ مگر غالباً اس بنا پر آج تک کسی نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں راستہ کیونکر چلتا ہوں اور بات چیت کس طرح کرتا ہوں۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ اسی قدر لکھ کر ساری داستان ختم کر دیتا مگر جناب سید فرید جعفری مچھلی شہری کا بہ نفس نفیس ورود اور کسی طرح نہ رفع ہونے والا اصرار مجبور کرتا ہے کہ میں ایک چھوٹی سی بات کو افسانہ بنا دینے پر تیار ہو جاؤں۔

سب سے پہلی بات جو مجھے افسانہ نگاری کے متعلق یاد ہے، یہ ہے کہ میں افسانہ کسی خاص طرز میں، مخصوص موضوع پر یا کسی فرمائش کی تعمیل میں نہیں لکھتا۔ عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ غالباً سنہ ۳۰ء میں مجھ سے "عشق کی گتھیاں" کے تحت میں اپنے اصولوں سے ہٹنے کی خطا سرزد ہوئی ہے، لیکن ایڈیٹر کی ضد اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ زہر مجھے اس پہ بہ تاکید کہ پینا ہوگا، اور جو کچھ میں نے اس موقع پر لکھا اس کو میں افسانہ نہیں سمجھتا۔ میری رائے میں ایک مقررہ طرح میں غزل لکھنا اس قدر گناہ نہیں ہے جس قدر کہ ایک تجویز کردہ موضوع پر افسانہ لکھنا۔ آزادیٔ تخیل اور بیباکیٔ بیان اس قسم کی قیود سے ناقابل برداشت حد تک زائل ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ہمیشہ افسانہ اس وقت لکھا جب خود بخود میری طبیعت میں اس کے لکھنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ کبھی یہ تحریک دفعتاً وجود میں آئی، اور کبھی مہینوں میں اس حد تک پہنچی کہ میں پوری طرح اس کو محسوس کر سکا اس تحریک کے وجود میں آنے کے اسباب بھی مختلف ہوئے۔ کبھی بیرونجات کبھی دنیا کا سفر کبھی کسی نئے مقام کی سیر اور کبھی غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ مثلاً ہردوئی میں احباب کی ایک بے تکلف صحبت میں دفعتاً جو تحریک پیدا ہوئی۔ وہ اس مضمون کا باعث ہوئی جس کی سرخی تھی "نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں" یا نینی تال کا پہلا سفر اس افسانہ کا باعث ہوا جس کا عنوان "یہاں نہیں وہ ہے"۔

ایسی تحریک کے پیدا ہو جانے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کے اظہار کے افسانہ بنا لینے کا ہے۔ یہ زیادہ تر و بیشتر میں نے رات کی تنہائی میں اور کچھ نہیں تو حقہ کی

مداد سے پلنگ پر لیٹے ہوئے طے کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ تحریک صادق کے ساتھ محض ایک خیال، ایک مخصوص جملہ، ایک غیر معمولی تصویر یا ایک نیا مصالحہ دماغ میں آجاتا ہے، اس مخصوص تحریک کو افسانہ کے سانچے میں ڈھالنا بالکل ایسا ہی کام ہے جیسے گوندھی ہوئی مٹی سے مختلف اقسام کے رنگ برنگ میں کھلونے بنانا۔ اس میں شک نہیں کہ تحریک مذکور جب کبھی ایک سامعہ نواز آواز، ایک باصرہ فریب صورت یا ایک جاذب توجہ منظر سے پیدا ہوئی تو ہمیشہ دیرپا اور دلچسپ تخیل کا باعث ہوئی میری رائے میں یہ کیفیت بھی ارادتاً پیدا نہیں کی جاسکتی اور جب کبھی پیدا ہوجائے تو بہترین تخیل اور طرز بیان کی بنیاد بنائی جاسکتی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ایک معمولی سی تحریک پیدا ہوجانے پر صرف چند خیالات ہی نوٹ کرسکا، اور انکی تکمیل دوبارہ ویسی ہی تحریک وجود میں آنے تک ملتوی رہی، دوسرے الفاظ میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ بعض اوقات ایک مکمل افسانہ ایک ہی مرتبہ کی تحریک سے وجود میں آگیا اور بعض اوقات اسکی تکمیل تحریک خطری کی تکرار پر مبنی رہی۔

آخر میں صرف یہ بتانا رہ جاتا ہے کہ میں اظہار تخیل میں ارادتاً کن باتوں کا لحاظ رکھتا ہوں، لیکن آپ کا سوال ان امور سے تعلق نہیں رکھتا، اور انکو دو تین مختصر جملوں میں بیان بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر موضع یہ ہوتا کہ میں افسانہ میں کیا باتیں ضروری سمجھتا ہوں، اور اس کا لحاظ کیونکر رکھتا ہوں تو اس پر اظہار رائے کی ضرورت ہوتی۔ میاں فرید جعفری مطمئن ہیں کہ ان کے سوال کا جواب ہوگیا۔ اور شکر کا مقام ہے کہ شکایت رفع ہوگئی۔ مدیر معلومات کا مقولہ ہے کہ "گوئیے کے دو بول کافی ہوتے ہیں" اور میں تو پوری آستائی اور انترا الاپ چکا ہوں۔

جوش بی اے

---

(۴)

حسن نظامی افسانہ کیونکر لکھتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ

جس طرح خدا لکھواتا ہے

اور اس طرح جیسے خود خدا اس کائنات محسوسہ کے افسانے تصنیف کرتا ہے کیونکہ اس موجودہ معقولہ و محسوسہ دنیا کا ہر وجود موجود و محسوس خدا کی تصنیف کا ایک افسانہ ہے، اور میں خود بھی خدا کی تصنیف کا ایک قصہ ہوں۔

نئے سائنس کی تحقیقات پر یقین کرنے کو جی تو نہیں چاہتا۔ مگر یقین کئے لیتا ہوں کہ پہلے خدا نے دنیا پیدا کرنے کا یا کائنات کا قصہ لکھنے اور اس کو بصورت ڈرامہ وجود کے اسٹیج پر دکھانے کا ارادہ کیا تو ایک غبار نمودار ہوا، اس کے بعد وہ غبار پانی بن گیا، اور توریت میں خود خدا نے فرمایا ہے کہ پہلے دنیا میں پانی تھا اور خدا کی روح اس کی موجودگی میں جنبش کرتی تھی۔ پھر اس پانی سے نباتات جمادات حیوانات پیدا ہوئے، پھر انسان پیدا ہوا، اور انسان کی صورت میں خدا نے اپنی صورت نمودار کردی، اور اس میں اپنی صفات کا رنگ بھر دیا، اور ہر انسان میں ہزاروں افسانے دفن کر دیئے۔

میں حق تعالیٰ خدا کا ایک بندہ ہوں مگر خدا کی صفت تخلیق کے ارتقا کا ایک نمونہ اور اس کی مشیت کی ایک شکل بھی ہوں۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں قصے لکھنے کا شوق ہوا، مولانا شرر کے ناول اور مولانا محمد حسین آزاد دہلوی کی کتابیں پڑھکر بغیر کسی کی شاگردی اور اصلاح اور رہبری کے لکھنا شروع کیا۔

آٹھ برس کی عمر میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا، لیکن ماں کی سنائی ہوئی کہانیاں دل و دماغ پر نقش تھیں اور دنیا کے ابتدائی غبار کی طرح ذہن پر ان کی گھٹا چھائی رہتی تھی، وہ کہانیاں چڑے چڑیا کی نہ تھیں (تھوڑی بہت تھیں تو ان کا عدم وجود برابر ہے) بلکہ دہلی کے بادشاہ اور لال قلعہ اور غدر کے ہنگامہ کی کہانیاں تھیں، جو انھوں نے میرے نانا اور اپنے باپ سے سنی تھیں، جو بہادر شاہ بادشاہ

کے پاس لال قلعہ میں اکثر رہا کرتے تھے اور جب ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو بادشاہ لال قلعہ سے نکل کر چلے گئے اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؑ میں آئے تو نانا صاحب بھی ان کی آخری بار تک ہمراہ ہوئی تھیں۔

غرض میری افسانہ نویسی کی پیدائش ان کہانیوں سے شروع ہوئی۔ پہلے کہانیاں آتا تھیں ان باتوں۔ واقعہ کو اس طرح دکھا سکتا تھا جو سب کی سمجھ میں آسکے یا جس مقصد کو میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ ہو گیا لیکن رفتہ رفتہ مشق بڑھ گئی اور میں نے شاہی خاندان اور لال قلعہ کے گذرے ہوئے سچے قصوں سے افسانہ نویسی شروع کی اور یہ چھوٹے چھوٹے قصے "بہادر شاہ کی شہزادی" "بنت بہادر شاہ" وغیرہ عنوانوں سے اخباروں میں شائع ہوئے تو ان کی خوب دھوم ہوئی اور مجھے خوب داد ملی۔

اس وقت تک میں قصہ نویسی کے کسی مقررہ قاعدہ اور اصول کو نہ جانتا تھا۔ جو اپنے مشاہدہ یا سنی ہوئی بات کو قلم برداشتہ لکھ دیتا تھا اور اخباروں میں بھیج دیتا تھا۔

پھر جب حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی سے ملاقات ہوئی اور ان کی شفقت میرے حال پر بہت بڑھی تو ایک دن انھوں نے قصہ نویسی کی نسبت مجھ سے فرمایا کہ قصہ خلاف فطرت کو نہیں جو خواہش پر چلے اور چلانے لگے۔ لوگ یہ بھی ایسی باتیں قصوں میں لکھتے ہیں جو روزمرہ کی انسانی سرگذشت کے خلاف ہوتی ہیں، اور قصہ نویسوں کی یہ منشا یا یہ خواہش نہ صرف فطرت کے خلاف ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ فطرت سے ماورا ایک نمائش کرتے ہیں جو اس سے کہتے ہیں کہ اس طرح جس طرح ہم نے قصہ بنایا ہے۔

حضرت اکبر کی یہ بات سن کر مجھے اپنے افسانوں کی تحریر میں احتیاط ہوئی اور میں نے رنگ آمیزی کرنے اور قصہ کا اثر بڑھانے کے لئے ایسی باتیں لکھنی چھوڑ دیں جو واقعات مقررہ کے خلاف ہوتی تھیں۔

پہلے میں اماں سے سنی ہوئی باتوں کو سادہ الفاظ میں لکھا کرتا تھا۔ پھر واقعات کو موثر انداز میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بعد یہ خیال ہوا کہ اگر واقعہ معمولی ہو تو اس میں اثر پیدا کرنے کے لئے غلط باتیں بھی بڑھائی جائیں تاکہ قصہ مزہ دار اور اثر دار ہو جائے کیونکہ گناہ میں نیکی سے زیادہ لذت ہوتی ہے یا گناہ کے بیان میں نیکی کے بیان سے زیادہ اثر ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر گناہ مخفی ہوتے ہیں اور وہ گناہ کی باتوں کو اپنے آئینہ مخفی میں دیکھ کر متاثر اور مسرور ہوتا ہے۔

دنیا میں جس قدر قصے لکھے جاتے ہیں یا پہلے لکھے جاتے تھے ان کا کمال یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ بہت زیادہ جھوٹے اور خلاف عقل اور خلاف فطرت ہوں اور حیرت میں ڈالنے والے ہوں۔

داستان خیال اور داستان امیر حمزہ اور چہار درویش کے قصے عقل کو عاجز کرنے والے جھوٹ کے سبب سے بہت مقبول و مروج تھے مگر جب یورپ کی تہذیب و شائستگی یہاں آئی تو وہ جھوٹ بولنے کی ایک حکمت بھی اپنے ساتھ لائی اور لوگ جھوٹ کے اوپر سچ کو اس طرح لپیٹنے لگے جیسے کونین کی گولی پر شکر لپیٹ دیتے ہیں۔ یعنی وہ اس طرح جھوٹ بولنے لگے کہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کو بالکل سچ معلوم ہونے میں بھی نئی۔ یہ تہذیب کی اس کا نام ناول ہوا اور قصہ نویسی نے جھوٹ کو سچ کی صورت میں پیش کرنے لگا۔ اور جھوٹ پر جان دینے والی دنیا میرے قصوں پر گرنے لگی اور ان کی اتنی زیادہ قدر ہوئی جو میرے زمانہ کے قصہ نویسوں سے کچھ زیادہ تھی۔

دہلی میں پیدا ہوا تھا جہاں سولہ سو عورت مرد اور بچے تیموریہ خاندان کے شہزادوں کے رہتے ہیں اور میرے گھر میں بھی شاہی خاندان کے کچھ افراد میری خدمت اور پرورش کے شریک تھے ان کو دیکھتا تھا، ان کے قدیمی حالات تصور کرتا تھا اور قلم لے کر ایک قصہ لکھنا شروع کر دیتا تھا۔

لکھنے سے پہلے کوئی واقعہ یا کوئی سچی سرگذشت خیال میں ہوتی تھی۔ اور سب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کیا لکھوں اور اس کا نتیجہ کیا نکالوں۔ کیونکہ اصلیت تو ذہن میں ہوتی ہی نہ تھی، لیکن لکھنا شروع کرتے ہی قصہ خود بخود الفاظ ذہن میں پیدا کرنے لگتے تھے اور کسی نامعلوم قوت سے اس کی ایک ایسی صورت بن جاتی تھی کہ پورا کرنے کے بعد وہ بالکل سچا اور گذرا ہوا واقعہ معلوم ہونے لگتا تھا۔

درد و سوز اور غم کا اثر قصہ میں دماغی آمد سے پیدا نہ ہوتا تو میں فونو گراف پر کسی مرثیہ کا ریکارڈ بجاتا اور اس کوشش کر میرے اندر غم کی لہر پیدا ہو جاتی اور قصہ کو غم آلود اور غم پاش بنانے میں مجھے آسانی ہو جاتی۔

"غریب شہید کا گھر" ایک مختصر افسانہ ۱۹۱۲ء کے اخبار زمیندار میں شائع کرایا تھا جو تمام اخبارات میں نقل ہوا تھا اور ہندوستان میں اس قدر مقبول ہوا تھا کہ ہر جگہ اس کا چرچا تھا۔ وہ قصہ میں نے آغا حشر کے ایک ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد لکھا تھا۔ رات کو دو بجے ڈرامہ دیکھ کر واحدی صاحب کے مکان پر آیا جہاں اس زمانہ میں رہتا تھا، واحدی صاحب سو گئے۔ اور میں نے یہ قصہ لکھا، اور صبح تک اپنے لکھے ہوئے فرضی قصہ کو پڑھ پڑھ کر روتا رہا۔ اور اکثر یہ ہوا کرتا تھا کہ میں غمگین قصے لکھ کر پڑھتا تھا اور رویا کرتا تھا۔ اور جب یہ خیال آتا کہ یہ قصہ تو جھوٹا ہے

تب بھی دل کی خواہش یہی ہوتی تھی کہ اس کو پڑھوں، دنیا ناز دل بہ نکہ رونے میں ایسی لذت آتی تھی جو اب ہنسنے میں نہیں آتی۔

اب میں افسانہ لکھنے کے وقت یہ کوشش کرتا ہوں کہ واقعہ قطعی جھوٹا نہ ہو بلکہ کچھ اصلیت ضرور ہو اور میں ایک ذرہ کو آفتاب بناؤں اور کسی بات کو اپنا گمان سمجھوں۔

آج کل اعصاب کی کمزوری اور بڑھاپے کی عمر در، فکر روزگار کی کثرت کے سبب تصور کی قوت کم ہو گئی ہے اس لئے جب کوئی قصہ لکھنا ہوتا ہے تو کچھ دیر سوچتا ہوں کسی اصلی واقعہ کو باثر کرنے کے لئے اصلی [illegible]

کرتا ہوں ورنہ سب کا خاکہ دماغ میں ہوتا ہے کاغذ پر لکھ دیتا ہوں۔

البتہ جب کوئی [illegible] ضرورت ہو تو [illegible]

کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ [illegible] قلم [illegible]

جاتا ہوں [illegible] لکھا جاتا ہوں اور [illegible]

مضمون کے لکھنے میں ابھی یہی کیفیت پیش آتی تھی۔

حسن لطفی

[illegible]

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں

(۵)

مرزا امداد علی خنجر لکھنوی کے خیالات

مکرمی جناب حکیم صاحب تسلیم نیاز۔ چند روز ہوئے متعلم صاحب نے آپ کا عجیب غریب مگر دلچسپ پیام پہنچایا تھا جو میری افسانہ نگاری سے متعلق تھا۔ قبل اس کے کہ تعمیل ارشاد ہو انھیں کلکتے کا سفر درپیش آگیا۔ اور بات رفت و گذشت ہو گئی کلکتے سے واپس ہونے کے بعد انھوں نے پھر زبردست تحریک شروع کی اور آج تو ایسا سر ہوئے کہ لکھوا ہی کے چھوڑا۔

ہر چند اس بیان میں بعض باتیں غیر متعلق معلوم ہوں گی لیکن ایسے کیا کیا جائے کہ میں انھیں احساسات و تاثرات کے تحت میں افسانے لکھا کرتا ہوں۔ اگر انھیں روشنی میں نہ لاتا تو جواب تشنہ رہ جاتا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری افسانہ نویسی کا اصول بالکل سادہ ہے۔ ممکن ہے وہ غلط روی پر محمول ہو۔ تاہم میں ۱۹۱۹ء سے اب تک اسی طریقے پر کاربند ہوں جسے ذیل میں بیان کروں گا۔ کثرت مداولت نے اس اصول کو طبیعت ثانیہ بنا دیا ہے اور اُسے ترک کر دینا میرے امکان سے قریب قریب خارج ہے۔

موضوع :- مجھے جب کوئی افسانہ قلم بند کرنا ہوتا ہے تو اس کے واسطے سب سے پہلے ایک ایسا موضوع تلاش کرتا ہوں جو کسی نہ کسی اصلاحی، اخلاقی، معاشرتی یا نفسیاتی مقصد کا حامل ہو۔ جستجو کا حصول اکثر مشاہدہ اور مطالعہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے کبھی کبھی شش و پنج اور واقعات و حالات بھی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ افسانے کا بہترین موضوع تجارت ہے کیونکہ اب وہ زمانہ نہیں کہ غفلت زدہ ابنائے وطن کو دیو پری، جن بھوت یا سحر و ساحری کی فرسودہ اور بے نتیجہ طلسم بندیوں میں گم رکھتے ہوئے ان کی غفلت پاش زندگی میں تقویت کی روح پھونکی جائے، سوتے ہوئے کو تھپک کر اور زیادہ غافل بنایا جائے بلکہ وقت ہے کہ پستی پر بلندی، خواب پر بیداری کا دھوکا کھانے والوں کی غلامانہ ذہنیت بدلنے میں ہر ممکن سعی کو عمل کا جامہ پہنایا جائے اور افسانوں میں انھیں مناظر کی تصویر کشی کی جائے جن کی ضرورت اور شدید ضرورت ہے اگر ہم جستجو کر کے تجارتی رموز و نکات اور آزاد پیشوں کے محاسن بروئے کار لائیں تو امید ہے بڑی حد تک اہل وطن کی غلامانہ ذہنیت کو بدل سکتے ہیں ہم انھیں افسانوں اور کہانیوں کی امداد سے حوصلہ، عزم، جفاکشی اور ضبط و تحمل کے مردہ پیکروں میں زندگی کی لہر پیدا

کر سکتے ہیں۔ اخوت و ہمدردی، ایثار و مواسات کے بھولے ہوئے آموختہ کو ازبر کرا سکتے ہیں اور ایک ایسی جماعت کو جس نے قومی روایات کو۔ "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" بنا دینا ہی اپنی خصوصیت قرار دے لیا ہو۔ جو کارواں تو کیا؟ گردِ کارواں پانے کی سعی سے بھی بے نیاز ہو، اُسے ترقی یافتہ اقوام کے نقشِ قدم پر چلنے کی ترغیب و تحریص دے سکتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر متعدد افسانے تحریر کئے ہیں مثلاً "پاسِ دل"، "شرافتِ نفس"، "اتفاقات"، "تدبیر" وغیرہ وغیرہ۔ میں ایسا افسانہ لکھنے کے بعد محض اس خیال سے مطمئن ہو جاتا ہوں کہ اگر کسی ایک شخص نے بھی اس سے متاثر ہو کے بیداری کی جانب طبیعت کا میلان ظاہر کر دیا تو میری محنت ٹھکانے لگ جائے گی۔

میرا خیال میرا خیال ہے کہ علم و عمل کی تحریک و تلقین کے لئے صرف پند و وعظ کی مرتاضانہ مجلسیں ہی موثر نہیں ہو سکتیں کیونکہ وہ نفسِ سرکش کو مرعوب کر کے سیدھے راستے پر لانا چاہتی ہیں۔ حالانکہ ان کا غیر دلچسپ موضوع اور پھیکے سیٹھے مضامین جن میں رُومانیت کی روح ہوتی ہے۔ نہ ڈرامیٹک دل آویزی۔ اس لئے ان سے فطری طور پر طبیعتیں اُچاٹ رہتی ہیں اور سامعین کے قلوب نیکی اور اصلاح قبول کرنے کے بدلے منغص ہو جاتے ہیں۔ دل پر جبر کر کے سنا بھی جائے تو ذوقِ سماعت مجروح ہونے لگتا ہے جس کا انجام عدم توجہی اور انحراف کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لہٰذا اس غرض کے لئے افسانے ہی زیادہ مناسب ہیں جو اپنی گوناگوں لطافتوں کی اوٹ میں وہ تمام اسباب فراہم رکھتے ہیں جن سے سامعہ محظوظ و مسرور رہ سکتا ہے اور انسانی جذبات اثر قبول کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مختصر افسانوں کے ذریعہ سے ایسے مشکل مشکل مفہوم و مطالب ذہن نشین کرائے جا سکتے ہیں جنھیں سمجھانے میں ضخیم ضخیم کتابیں بھی ناکام ثابت ہوئی ہیں میرے افسانوں کی تعمیر اکثر اسی خیال اور جذبے کے ماتحت ہوتی ہے۔

پلاٹ موضوع کا مرحلہ طے کر لینے کے بعد پلاٹ کا مسئلہ سامنے آتا ہے جسے حل کئے بغیر آگے بڑھنا گویا تخیل کو گمراہی کی دعوت دینا ہے۔ غالباً افسانہ نگاری کا قاعدہ بھی یہی ہو۔ میں اکثر شب کو سونے سے قبل اس معاملے کا تصفیہ کرتا ہوں جب گرد و پیش کا ہنگامہ پرسکون فضا کی آغوش میں محوِ استراحت ہوتا ہے اور قلب و دماغ، افکار و تردّدات سے فارغ ہو کے یکسوئی حاصل کر لیتے ہیں یا اس وقت غور کا موقع ملتا ہے جب تفریح کے ارادے سے کسی تفریح گاہ میں نکل جاؤں۔ سہانی شام کی سُرور ریز لَویں سے مست ہو ہو کے خوش گلو طیور درختوں کی شاخوں پر بیٹھے گا رہے ہوں اور فضا کی کیف آفرینیاں دل و دماغ کو واقعات کی ترتیب میں مستغرق کر دیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ چند ہلکے ہلکے نقوش قائم کرنے کے سوا میں نے کبھی پورا پلاٹ متعین نہیں کیا، ہاں اگر دو سے زیادہ کیرکٹر پیش کرنے کی نوبت آئی تو تصنیف کرتے وقت یادداشت کے لئے اُن کے مجوزہ نام کسی کاغذ کے ٹکڑے پر نوٹ کر لئے کہ "دروغ گو را حافظہ نباشد" کا مصداق نہ بن جاؤں۔ بہت سے افسانے تو محض خیال کی رو پر قلم برداشتہ لکھ ڈالے جن کے متعلق پہلے سے کوئی خاکہ بھی تیار نہیں کیا تھا۔ تاہم جب کبھی پلاٹ پر غور کرنے کی نوبت آئی ہے تو صرف ان تین سوالوں پر نظر پڑی (۱) افسانہ کہاں سے شروع کیا جائے؟ (۲) درمیانی واقعات کیسے ہوں؟ (۳) اختتام کا طریقہ کیا ہو؟ ان سوالات کا حل تخلیق میں معاونت کرتا ہے اور دماغ میں افسانہ نویسی کے لئے تھوڑا بہت ذخیرہ مہیا ہو جاتا ہے اس کے بعد اخلاقی اور اصلاحی نقطۂ نگاہ سے جانچ پڑتال کے طور پر دیکھتا ہوں کہ تجویز شدہ افسانے سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی اچھا سبق حاصل ہوتا نظر آیا تو کامیابی ورنہ ناکامی تصور کر لیتا ہوں۔

پلاٹ کی قطع و برید مفروضہ پلاٹ جس کا اجمالی خاکہ ذہن میں محفوظ ہوتا ہے اکثر تبدیل بھی ہو جاتا ہے کیونکہ خیالات کا سیلاب قلم کو دوسری طرف بہا لے جاتا ہے اور جو نقشے ابتداً تجویز کئے گئے تھے ان کی کاٹ چھانٹ کر دینا پڑتی ہے۔ ان اوقات بھی طبیعت کی "حاضر دماغی" پر تکیہ کرتے ہوئے وہی راستہ اختیار کیا جاتا ہے جدھر تخیل کی روانی ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کے افسانے زیادہ موثر اور کامیاب ثابت ہوتے ہیں کیونکہ ان میں آورد کے بجائے آمد کا عنصر بیش از بیش ہوتا ہے مذکورۂ بالا تین ارکان میں پہلا اور تیسرا رکن تو اکثر اپنی جگہ قائم رہتا ہے، اُس میں ترمیم اور تنسیخ کی حاجت بہت کم ہوتی ہے لیکن درمیانی رکن تو شاذ ہی شاذ اپنی حالت پر برقرار رہ سکتا ہے ورنہ کچھ نہ کچھ تغیر و تبدل لازمی ہے اور کبھی کبھی تو اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔

لکھنے کا طریقہ ابتدائی مراحل طے کر لینے کے بعد تحریر کا کام جاری ہوتا ہے۔ اُس کے دوران میں تمام و کمال توجہ افسانے کی اخلاقی اور اصلاحی خوبی برقرار رکھنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب تک کام کی باتیں بیان نہ کی جائیں محض رنگینی اور عبارت آرائی کے میدان میں طبیعت کی جولانیاں دکھانا سود مند نہیں ہو سکتا۔

واقعات کا انتخاب

واقعات ہی پر افسانے کی بنیاد رکھی جاتی ہے ان کے انتخاب کرنے میں افسانہ نگار کو بھی سماجی اور کتابی تجربوں سے کام لیتے ہوئے صحافتی سلیقہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنے افسانوں کے واسطے صرف وہی واقعات منتخب کرنے کا عادی ہوں جو ممکن الوقوع ہیں اور ہر لمحہ مشاہدے میں آتے رہتے ہیں۔ بعید از قیاس اور دور از کار ہونے سے مقدور بھر احتراز کرتا ہوں کیونکہ ان میں دلفریبی اور جاذبیت کتنی ہی کیوں نہ ہو مگر فائدہ رسانی کا امکان مطلق نہیں ہوتا۔

حسن و عشق

افسانوں میں رنگ اور دلکشی پیدا کرنے کے واسطے حسن و عشق کا عنصر ناگزیر تصور کیا جاتا ہے مجھے بھی اس خیال کی اہمیت سے انکار نہیں قصہ کو پرکیف اور عبارت کو جاذب توجہ بنانے کا رنگین و سریع الاثر ذریعہ یہی لطیف موضوع ہے بشرطیکہ افراط و تفریط سے کام نہ لیا جائے حقیقت میں افسانہ نگار کے لئے اس سے دشوار تر مرحلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا سارے افسانے میں یہی ایک مقام ہے جو مصنف کو مغالطہ میں مبتلا کرکے گمراہ بنا سکتا ہے میں اس جگہ کافی احتیاط ملحوظ رکھتا ہوں، اپنے افسانے کے ہیرو اور ہیروئن کو جادۂ اعتدال سے باہر نہیں نکالتا اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہوں جنھیں صاحبان تہذیب پسند نہیں کرتے۔

واقعات عالم

دنیا میں روزانہ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں جن میں حسن و محبت کی رعنائیوں کو مطلق دخل نہیں ہوتا پھر بھی اُن میں اچھی خاصی رُومانیت پائی جاتی ہے اور وہ اہل عالم کے لئے ایک ناقابل سہو سبق ہوتے ہیں بالخصوص دردمند اور حساس طبیعتیں اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں اور جب انھیں واقعات کو ترتیب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تو وہ نفسیاتی حیثیت سے نمایاں شہرت و مقبولیت حاصل کرتے ہیں میرے افسانوں کی بیشتر تعداد انھیں حالات و واقعات کی رہین منت ہے جیسے "غیور شہزادہ" "گشتہ ناکامی" "عارف کی شادی" "بچے کا مونڈن" وغیرہ وجوش محبت" اور "ماماتا" بھی اسی سلسلے کی دو کڑیاں ہیں۔

تحریکات

افسانہ نویس کے لئے کسی نہ کسی تحریک کا ہونا بھی لازمی ہے جو جذبات کو برانگیختہ کرکے تصنیف کی جانب مائل کرے ایسی تحریکیں اُس وقت شروع ہوتی ہیں جب کوئی واقعہ خواہ کسی نوع کا ہو دل و دماغ پر اثر ڈالتا ہے اور ذہن خود بخود تخلیقی خدمت پوری کرنے لگتا ہے میرے لئے بسا اوقات وہ خبر و لچسپ اور بے نتیجہ مضامین بھی محرک ثابت ہوئے ہیں جن میں کوئی رنگ تھا نہ لطف! مگر عجب تو یہ ہے کہ اُن کی بے کیفی نے میرے دماغ میں کسی نہ کسی افسانے کا مکمل پلاٹ تیار کر دیا!

خوشگوار موسم

زیادہ سردی اور شدید گرمی میں مجھ سے تصنیف کا کام بالکل نہیں ہو سکتا جبراً کچھ لکھنے کی سعی کرتا ہوں تو افسانے کو آگے بڑھانے کے لئے الفاظ دستیاب نہیں ہوتے اور شدت سے نیند کا غلبہ ہوتا ہے کہ آنکھیں کھلی رکھنا قریب قریب ناممکن سا ہو جاتا ہے مجبوراً ہاتھ سے قلم رکھ کے سو جاتا ہوں یا کسی دوسرے شغل میں مشغول ہو کے نیند کا حملہ روکتا ہوں البتہ وہ موسم نہایت خوشگوار ہوتا ہے جسے اصطلاح میں "گلابی جاڑا" کہا جاتا ہے اس فصل میں اچھے اچھے مضامین ذہن نشین ہوتے ہیں، تھکن کا احساس کم ہوتا ہے گرمی کی شدت سے دماغ پراگندہ ہوتا ہے سرمائی برودت انگلیوں کو یخ بستہ کرکے ہوئے قلم پکڑنے سے معذور کرتی ہے ایک عجاتی کیفیت طاری رہتی ہے اور محویت کے عالم میں خیالات امنڈتے چلے آتے ہیں جتنی تیزی ممکن ہے اتنی ہی سرعت سے قلم دوڑتا ہے درمیان میں سستانے اور اندسخن میں تقویت و تازگی پیدا کرنے کی ضرورت تو ضرور پڑتی ہے لیکن دو چار منٹ سے زیادہ نہیں، یہ وقفہ گھر کے صحن میں چہل قدمی کی نذر ہوتا ہے اس کے بعد پھر سابقہ انہماک سے کام شروع ہو جاتا ہے معمولی مراتفات خیال کی رو میں خالج نہیں ہوتے اور ہوں تو کیونکر؟ اس واسطے کہ ذہن ماحول کے حالات سے کلیتہً بے خبر ہوتا ہے۔ کوئی شور، کسی قسم کا ہنگامہ سمع خراشی نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ اسی نشست میں افسانہ مکمل ہو جاتا ہے، برخلاف اس کے جس افسانے سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے وہ کئی کئی نشستوں میں بھی پورا نہیں ہوتا چاہے اس کا سارا پلاٹ قبل ہی سے تیار کر لیا گیا ہو۔

ایک اعتراض

کہا جاتا ہے کہ ہمارے افسانوں کے ہیرو اس دنیا کی مخلوق کے ماسوا فرشتہ، یا اُس سے مختلف کوئی نوع ہیں۔ اُن کے تمام نیک و بد اوصاف مصنف کے عنایت کردہ ہوتے ہیں اگر وہ نیک ہیں تو سارے عالم کی خوبیاں اُن کی ایک ذات میں خون و روح کی طرح موجود ہیں۔ بد ہیں تو شیطان بھی اُن سے پناہ مانگتا ہے، حالانکہ عناصر اربعہ کا مجموعہ ہونے کی حیثیت سے ان میں معائب و محاسن کا پایا جانا لازم و ملزوم ہے یہ اعتراض ایک حد تک درست ہے سائنس کی تحقیقات نے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ کائنات ہستی کا ایک ایک ذرہ تغیر پذیر واقع ہوا ہے۔ اس صورت میں طبائع انسانی کا انقلاب بھی یقینی اور لابدی ہے، اور افسانے کے

ہیرو کو بھی فطرت بشری سے مستثنیٰ نہ ہونا چاہئے۔ لیکن اس اعتراض کو قبول کر لینے کے بعد بھی عرض کروں گا کہ ہم جتنے بھی افسانے ضبط تحریر میں لاتے ہیں اُن سے محض رفع الوقتی کا کام لینا نہیں چاہئے بلکہ کچھ مخصوص مقاصد بھی وابستہ رکھنے چاہئیں۔ جو ہیرو ہوتا تو اسی گوشت و پوست کا پتلا ہے مگر ہم محض اس کے کمزور پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف وہی اوصاف نمایاں کرتے ہیں جنہیں ابنائے فن کے سامنے پیش کرنا منظور ہوتا ہے اور توقع رکھتے ہیں کہ اگر ہیرو کی ایک خوبی نے بھی کسی دل میں گھر کر لیا تو ایک نقص کا ازالہ ہو جائے گا۔ اسی طرح نکات اور مذموم کیریکٹر پیش کرنے میں بھی اصلاح کا خیال کارفرما رہتا ہے۔

افسانوں کا عام اثر

اس حقیقت سے تو انکار ممکن ہی نہیں کہ افسانوں کا اثر اخلاق پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ ملک کے نوجوان جنہیں دنیا کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا اکثر اسی قسم کے لٹریچر سے متاثر ہونے کے خوگر ہوتے ہیں، پھر اگر ہم محبت کو عداوت، دوستی کو دشمنی اور نیکی کو بدی سے بدل جاتے ہوئے دکھائیں تو کیا اس سے مفید نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے، اور کیا ایسے لٹریچر سے اثر پذیر ہونے والی ہستیاں اس رنگینی کی مسموم فضا سے محفوظ رہ سکیں گی؟ غالباً نہیں۔

یہ ہے میرا اصول جو افسانہ تحریر کرتے وقت میری راہنمائی کرتا ہے اور میں اس کی ہدایت سے اپنے مختصر افسانے پورے کیا کرتا ہوں۔

میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں

(۶)

سید فرید جعفری مچھلی شہری کے خیالات

حکیم صاحب! آپ نے یہ دریافت فرما کر، کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں، میرے دل کے بیکار تاروں کو چھیڑ دیا۔ میرے سامنے میری انیس سالہ زندگی ہے۔ اور میں اس پریشان زندگی کی گہرائیوں میں چلا گیا ہوں، بھولے ہوئے واقعات یاد آئے ہیں۔ میرے دل و جگر میں چبھی ہوئی سماجی سوئیاں کھٹکنے لگی ہیں، حوادث کے بگولوں کے داغ نگاہوں میں رقص کرنے لگے ہیں، لکھوں تو کیا لکھوں، بتاؤں تو کیا بتاؤں؟

میری اس انیس سالہ زندگی کا ہر دن اور ہر دن کا ہر گھنٹہ اور ہر گھنٹہ کا ہر منٹ میرے لئے ایک نیا افسانہ رہا ہے۔ میں نے اب تک افسانوں کی ہی دنیا میں پرورش پائی ہے اور اس لئے بیجا تعلّی نہ سمجھئے گا اگر کہوں کہ میں خود مجسم افسانہ ہوں۔ اور میرے قلم سے نکلے ہوئے فسانے خود میری آپ بیتیاں ہیں۔ اس مختصر سی زندگی نے مجھے دنیا کے وہ وہ فسانے پڑھائے ہیں کہ ان کو صفحۂ قرطاس پر پھیلانا چاہوں تو سماجی دنیا ایک ہنگامہ برپا کر دے۔ میرے دل و جگر کے ہزاروں نشتر چبھے ہوئے ہیں اور جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک لطیف کھٹک پیدا نہ کرے، خود ہی سمجھئے کہ میں اپنے افسانہ لکھنے کی کہانی کو کس طرح لکھوں؟ آپ کو ضد ہے تو سنئے سنئے میں اپنی داستان درد دل رو رو کے سناتا ہوں

جہاں سے چاہنا تم سنتے سنتے مسکرا دینا

مجھے افسانہ لکھنے کے لئے نہ تو خلوت چاہئے، اور نہ ہی گھنگھور رات اور زمانے کے جوش کسے، دو ادیبی، اور ہجر کے نشتر زن نغمے، مجھے اس کی بھی ضرورت نہیں کہ میرے بیٹھنے کی جگہ صاف ستھری ہو، تنگ ہی جہاں نہ ہو، روشنائی دلفریب ہو، اور قلم نازک، اور مجھے فسانوں میں نزاکت حسن اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے آبشاروں، سبزہ زاروں اور قدرت کے لہلہاتے ہوئے خونی دریاؤں سے بھی متاثر ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایک چھپا ہوا خیال یا نظارہ چاہئے پھر مجھے دنیا کی کوئی قوت خیالات کے اظہار سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب میں نے قلم ہاتھ میں لے لیا پھر میں دنیا اور اہل دنیا سے اس وقت تک کے لئے بے نیاز ہو جاؤں گا جب تک کہ میں اپنے دل کا سارا خون نچوڑ نہ لوں۔ اس اثنا میں شور و شغب، بارش طوفان کھانا پینا، غرضیکہ کوئی چیز میری سد راہ نہ ہو سکے گی۔ میں اس وقت قطعاً دنیا کی

کی بیماری ہوں گا۔ میرا قلم مشین کی طرح چلتا ہوگا۔ اور جب تک کہ چیز تیار نہ ہو جائے گی نہ معلوم چاہے میرے ایک طرف ڈالری کا ریکارڈ بج رہا ہو، دوسری طرف ایک جماعت ناچ گا رہی ہو، تیسری طرف میز پر زبردست ٹریفک چل رہا ہو اور چوتھی طرف بیوی بچے پیاسی سوالی آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ لیکن میں اس وقت بہرا، اندھا، گونگا اور فالج زدہ بن جاؤں گا۔ اور مجھے سوائے اپنی میز کی، بلکہ تحریر کے کچھ نظر نہ آئے گا۔ اور جب فسانہ ختم ہو چکیگا یقینی ہے کہ میں زار زار رو رہا ہوں گا۔ اور بیگم بھی بیمار ہی ہوں گی۔

میں نے اکثر فسانے اس طرح بھی لکھے ہیں کہ سڑک پر چل رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک بھکاری ایک دولتمند آدمی سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ملنے کا ایک سکہ مانگ رہا ہے۔ اور اس مغرور آدمی نے اسے جھڑک دیا۔ ٹھوکر لگائی۔ اور وہ گر پڑا۔ صرف اتنی سی بات سے میرے لئے ایک نہایت دردناک فسانہ کا پلاٹ تیار ہو گیا۔ اسی وقت جیب سے پنسل نکالوں گا۔ اور ردی کاغذات یا خطوط کی خالی جگہوں پر اس تیزی سے کہانی لکھنا شروع کر دوں گا کہ میرے ہمراہیوں کو تعجب ہوگا اور وہ یہی سمجھیں گے کہ میں کوئی رٹی ہوئی کہانی ان کو مرعوب کرنے کیلئے لکھ رہا ہوں۔

میں نے ایک فسانہ بہار کی بھکارن لکھا ہے جو غالباً میرے دلی تاثرات کا بہترین نمونہ ہے حضرت علی عباس حسینی ایم اے۔ سندر لال جی ایم اے ایسے نقاد بھی اس فسانہ سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور فخر ملت آنریبل سید عبد العزیز صاحب منسٹر حکومت بہار کو تو اس فسانہ نے اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے اسے کتابی صورت میں شائع کرا دیا ہے۔ اس فسانے کے لکھنے کی بھی صورت عجیب ہوئی۔ اخبارات میں بہار کے دردناک واقعات پڑھتا تھا اور ایک دو آنسو گرا دیتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ میری زندگی خدا اور اس کے بعد ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ہاتھوں میں تھی۔ دل کے ٹوٹنے کی بیماری تھی۔ گھنٹہ گھنٹہ پر ذرا ذرا سی ٹھیس سے بیہوش ہو جاتا تھا۔ ایک روز بیگم کے اصرار سے چاندنی چوک جا رہا تھا۔ موٹر ہی پر بیٹھا تھا کہ ایک بھکارن آئی وہ سراپا غم تھی۔ اس کی آنکھیں نہایت فریادی تھیں میرے نزدیک وہ مظلوم حسن کا بہترین نمونہ تھی موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے نکلے اور وہ ٹوٹتی ہوئی آواز میں صرف اس قدر کہہ سکی۔ بہار کی دکھیا ہوں بابوجی۔ صرف اس ذرا سے جملے نے میرے قلم سے ایسی کہانی نکالی کہ میں قریب قریب موت کی آغوش میں پہنچ گیا۔ ہفتوں غشی کے دورے آتے اور میرے تیمارداروں کو مجھے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اس فسانے کو پڑھ کر میرے احباب نے اس حادثہ کے متعلق مجھے ہمدردی کے خطوط لکھے اور حالانکہ واقعہ بیگم کے سامنے کا تھا۔ مگر جب انہوں نے فسانہ پڑھا تو سارے واقعات کو سچ سمجھیں اور کئی دن تک مجھ سے روٹھی رہیں۔ اور میں بمشکل ان کے پریم کی چھلکتی ہوئی رس بھری آنکھوں میں اپنے دل کی کشتی کو سنبھال سکا۔ مگر جب میرے دل دوبارہ انھوں نے قابو میں کر لیا تو اس کہانی کو پریم کا وجدانی صحیفہ قرار دیتے ہوئے روز اس کا مطالعہ اپنے اوپر فرض سمجھا۔[1]

میرا ایک دوسرا فسانہ ہے پھول کی راکھ۔ اس کے لکھنے کی بھی عجیب صورت ہوئی گاؤں میں تھا۔ دیکھا کہ چھاؤنی کے برآمدہ کو چند چمارنیں لیپ رہی تھیں ان میں ایک کمسن اور انتہائی بھولی بھالی تھی۔ ایک کارندہ آیا اور اس سے کہنے لگا، چل جلدی صاحب بلاتے ہیں۔ وہ معصوم دنیا کی مکاریوں سے بے خبر اٹھی اور چلی گئی۔ ایک گھنٹہ بعد میں نے دیکھا کہ وہ روتی ہوئی چھاؤنی کے عقب سے نکلی اور ڈگمگاتے قدموں سے اپنے "گھروندے" کو واپس گئی۔ صرف اتنے سے واقعہ نے مجھ سے ایک بہترین فسانہ لکھوا لیا۔

ادھر میں ہریجن اور "اصلاح طوائف" کی تحریکوں سے بہت حد تک متاثر ہوا ہوں۔ اپنے ان ناقابل دید بہنوں کو جب دیکھتا ہوں، تڑپ جاتا ہوں۔ اور جس حالت میں دیکھتا ہوں وہ مجھ سے ایک فسانہ لکھوا لیتی ہے۔ اکثر متعصب مسلم احباب اور پتھر دل رکھنے والے ایڈیٹر صاحبان نے مجھ سے اعتراض کیا کہ مسلمان کے قلم سے اس قسم کی تحریکوں سے متعلق فسانے نہ لکھے جانے چاہئیں لیکن میرے نزدیک ان کا یہ اعتراض غلط ہے۔ کیا فسانہ نگار بھی مسلمان اور ہندو ہوتے ہیں؟ فسانہ نگار کا مذہب تو دل ہے اور دل کے نقوش اس کے لئے صحیفۂ آسمانی ہیں پھر کیا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے کہ دوسروں کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھائے؟ کیا عصمت فروشی کا گناہ کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا! کیا کسبیوں کے لئے دنیا کی آغوش ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے؟

میرے اکثر دوستوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ ہنگامی تحریک سے لکھے ہوئے فسانے ادبی دنیا میں کوئی وقعت نہیں رکھتے مگر میرے نزدیک فسانہ نگاری کا مقصد یہی ہے کہ دنیا کی چلتی پھرتی تصویریں اور سماج کے جیتے جاگتے مرقع دنیا کے سامنے مسحور کن اسلوب بیان میں پیش کر دیئے جائیں۔

غرضکہ میں فسانہ اپنی سماجی فضا سے متاثر ہو کر لکھتا ہوں۔ ہاں مجھ میں ایک بات اور بھی ہے۔ جس فسانہ کو ایک ہی نشست میں ختم کر دیتا ہوں چاہے چھ گھنٹے متواتر مجھے قلم کیوں نہ چلانا پڑے۔ اور اگر کسی انتہائی ضرورت سے مجھے اٹھنا پڑ گیا تو وہ فسانہ کبھی مکمل نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ میرے بکس میں ان گنت فسانے آج بھی نامکمل پڑے ہیں۔

---

[1] افسوس کہ ۲۴ ستمبر ۳۴ء کو بیگم فرحت کا انتقال ہو گیا۔ ایڈیٹر

میں اپنے افسانوں کی نظرثانی نہیں کر سکتا، اکثر میرے افسانوں میں تھوڑی غلطیاں رہ جاتی ہیں جو شاید ہو سے پہلے شعر میں ہوتی ہیں ... زندگی میں سے دور نہیں ہو سکتی۔ برادرم محترم مسٹر کلیم جعفری کی صحبت نے اکثر اس کمزوری کو دور کرانے کی کوشش کی ہے مگر بیگم نے خود اس کام کو اپنے ذمہ لے کر پھر مجھے اس طرف سے بے پرواہ کر دیا ہے

اپنی کہانیوں کے عنوانات کے متعلق مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ہر معاشی سوتی یا دوسرے الفاظ میں معاشرت کی ہر کشمکش میرے افسانوں کا عنوان بن جایا کرتی ہے اسی عنوان کے ماتحت میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ اور معلوم کیوں بغیر کسی مجبوری کے بھی اس کے حدود سے باہر نہیں ہوتا۔

زبان کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ میرے افسانوں میں زیادہ تر ہندوستانی زبان استعمال ہوتی ہے، جو مستقبل کے ہندوستان کی زبان ہے

اور مجھے میرے دلپسند افسانہ نگار منشی پریم چند، ڈاکٹر اعظم کریوی، اور منشی [illegible] حسین بند خواجہ صاحب ہی لگتے ہیں

محترم صاحب! غالباً مندرجہ بالا سطور آپ کی تشفی کے لئے کافی ہوں گی مگر ابھی میری زندگی کی صبح ہے۔ انیس سال کی عمر ہی کیا عمر ہوتی ہے لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ عمر ایک شمع ہے اور شمع کے لئے ضروری نہیں کہ رات کی تمام گھڑیاں گذار دے اس لئے بہت ممکن ہے کہ حوادث کے جھونکے مجھے بھی سلا دیں اور پھر یہی تحریر آپ لوگوں کے لئے یادگار ہو ——— بہر صورت میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے یہ سوال پوچھ کر میرے دل کو بہت کچھ ہلکا کر دیا ہے۔ اور کم از کم تھوڑی دیر بے قراری سے مجھے آرام ہے۔

پھر غم دل نے مری ہستی کا سامان کر دیا — مجھ کو پنہاں کر کے مجھ کو نمایاں کر دیا

۱۲ اگست ۱۹۳۴ء [illegible] — فرید جیلی شہری



مقالات علمیہ

(۱)

شیر پنجاب راجہ رنجیت سنگھ کی زندگی پر ایک نظر

نوشتہ مسٹر شہنشاہ حسین رضوی ایم اے ایل ایل بی علیگ ایم آر اے ایس ایڈوکیٹ لکھنؤ

رنجیت سنگھ ہمارے ملک کی تاریخ میں وہ شخصیت ہے جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں تقریباً پچاس سال تک پنجاب پر مسلط رہی سنہ ۱۸۳۸ء میں بیرن کارل وان ہیوگل جرمن سیاح اپنے دوران سیاحت پنجاب میں رنجیت سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

سراپا رنجیت سنگھ کی عمر اس وقت ۵۸ سال کی ہے بچپن ہی میں اس کے چہرہ کو چیچک نے داغدار اور بائیں آنکھ کو بے نور کر دیا ہے سکھوں کے اصول مذہب کے مطابق اس کی ڈاڑھی کسی قدر دراز ہے اس کا جسم گٹھا ہوا اور قد پستہ ہے سر بڑا اور چھوٹے جسم پر اس وجہ سے نازیب معلوم ہوتا ہے کہ فالج کے موذی مرض نے اس کی کمر کو توڑ دیا ہے دست و بازو کوتاہ ہیں حالانکہ شانوں کے پاس سے جسم چوڑا ہوتا ہوا کشادہ سینہ سے جا ملا ہے پیشانی فراخ اور تاباں ہے باوجود اعضا کی نامناسبت اور بھونڈے پن کے صرف داہنی آنکھ جو باقی ہے بڑی ہے نظر میں غائر اور دل میں اتر جاتی ہیں جب کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گہری نظر دلوں میں تلاش کر رہی ہے اور سینے کے تمام رازوں کو طشت از بام کر کے رہیگی، فالج کا اثر تمام جسم پر نمایاں ہے زبان میں اس قدر لکنت پیدا ہو گئی ہے کہ گفتگو میں تکلف ہوتا ہے [illegible] طرح بولتا ہے کہ سننے والا آسانی سے نہیں سمجھ سکتا۔

اس سراپا سے [illegible] نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جہانتک کہ اس کی قطع اور کینڈے کا تعلق ہے وہ عجیب الخلقت واقع ہوا ہے حکمرانی کیلئے جس جسمانی خوبصورتی کی ضرورت ہوتی ہے اس سے محروم تھا چہرہ چیچک سے داغدار تھا چہرہ پر نہ معلوم کس غضب کی جلالت تھی کہ بڑے سے بڑے جری کا زہرہ آب ہو جاتا تھا اور اس کے جسم کے تمام عیوب چھپے جاتے تھے، ایک ہی آنکھ تھی لیکن اس میں بھی وہ جادو تھا کہ نظر اٹھتے ہی دل پر چل جاتا تھا۔ فقیر عزیز الدین نے سچ کہا ہے۔

مہاراجہ کے چہرے کی جلالت نے میری نظروں کو خیرہ
کر دیا ہے اور آجتک موقع نہیں دیا کہ میں تمیز کر سکوں
کہ اس کی داہنی آنکھ بے نور ہے یا بائیں۔

اخلاق و عادات جہانتک اس کے کیرکٹر کا تعلق ہے یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ عجیب المتضاد الصفات انسان تھا اور اس میں متضاد اوصاف موجود تھے۔

ایک طرف وہ محتاط تھا اور معلم اخلاقیات، شراب خوری، اور زنا بازی کو روا رکھتا تھا۔ دوسری طرف اپنی ذات کو مستثنیٰ سمجھتا تھا، فریزر کے خیال کے مطابق وہ شراب بھی پیتا تھا اور تعیش پسند بھی تھا، مرتے

---

۱ برٹش انڈیا R. W. Frazer [illegible] British India
آر ڈبلیو فریزر مطبوعہ لندن سنہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۲۴۱

وقت اس کی چار رانیاں تھیں جو اس کے ساتھ ہی نذر آتش ہو گئیں۔ موسم سرما میں اکثر وہ کسی مشہور رقاصہ کو طلب کرتا اور بزم رقص و سرود گرم کرتا۔

علم نوازی

وہ جاہل تھا لیکن غضب کا ذکی و ذہین۔ جہالت کا یہ عالم تھا کہ دستخط تک نہ کرسکتا تھا اور زعفران میں ہاتھ ڈبو کر نشان لگا دیتا تھا، لیکن ذہانت و ذکاوت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص کی دل کی حالت فوراً تاڑ جاتا تھا۔ اس کو علمی مباحث سے نہ صرف فطری دلچسپی تھی بلکہ کافی اطلاع بھی رکھتا تھا، اور معلومات حاصل کرنے کے مواقع سے مستفید ہوتا رہتا تھا۔ تجسس کا یہ شوق تھا کہ جب کسی تعلیم یافتہ شخص کو اس کے دربار میں باریاب ہونے کا موقع ملتا تھا تو وہ پے در پے اس سے مسائل علمیہ پر سوالات کرتا، وکٹر جیکو مانٹ فرانسیسی سیاح اس کے سوالات پر ششدر رہ گیا تھا۔

مذہبی رواداری

وہ سکھ مذہب میں راسخ عقیدہ رکھتا تھا۔ لیکن توہم پرست بھی تھا۔ واقعات شاہد ہیں جن سے ثابت ہوسکے گا کہ برہمنوں کے اصول کی طرف بھی اس کا رجحان تھا لیکن یہ امر قابل تعریف ہے کہ باوجود اپنے عقائد میں غیر متزلزل اور مستحکم ہونے کے اس میں تعصب مطلق نہ تھا اور ہر مذہب و ملت کے افراد کو مساوی سمجھتا تھا اسلام، عیسائیت، اور مذہب ہنود و سکھ سب کی اس کے دل میں یکساں عزت تھی، اور وہ کسی کے جذبات وحسیات مذہبی کو مضروب نہ کرتا تھا، فقرا اور درویشوں سے اس کو انس تھا اور وہ ان کی بلا لحاظ اختلافات مذہبی توقیر کرتا تھا۔

سیرچشمی و طمع

وہ سیرچشم تھا، اور طامع بھی آخرالذکر رائے کی تائید میں متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں (فریز) شجاع کے واقعہ کو بھی اسی رائے کے تحت میں تحریر کرتا ہے۔

جب شجاع افغانستان سے بھاگ کر ہندوستان آیا تو رنجیت سنگھ نے . . . گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ رنجیت سنگھ کو معلوم ہو گیا تھا کہ شجاع اپنے ساتھ کوہ نور ہیرا بھی لایا ہے، یہ وہ ہیرا تھا جو کسی زمانے میں اکبر کے مزار پر سنگ مرمر کے ایک ستون میں جڑا ہوا تھا اس کے بعد شاہجہاں اور اورنگ زیب کے تاج کی زیب و زینت رہا جب نادر شاہ ایرانی نے ۱۷۳۹ء میں دہلی کو لوٹا تو علاوہ بے شمار گراں بہا جواہرات کے کوہ نور بھی اس کے ہاتھ آیا۔ نادر سے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ میں پہنچا اور ابدالی سے شاہ شجاع تک آیا، شجاع سے رنجیت سنگھ نے حاصل کیا۔ اور رنجیت سنگھ کے بعد آخر کار ۱۸۴۹ء میں ملکہ وکٹوریہ کے قبضہ میں آگیا۔

(۲) دوسری مثال "لیلی" کی ہے جس کے حاصل کرنے میں مہاراجہ کو سات لاکھ روپیہ، اور بارہ ہزار جانیں بھینٹ دینا پڑیں۔ اور پھر فریز کی رائے میں مورخین کو کلام ہے کہ "لیلی" اس کو ملا بھی یا کوئی دوسرا قیمتی گھوڑا اس کے عوض میں پیش کیا گیا

(۳) ۱۸۱۰ء میں رنجیت سنگھ نے اچل امام کی اسلامی خانقاہ کے بیگناہ فقرا و مجاورین سے بلا کسی جرم کے دس ہزار روپیہ تشدد کے ساتھ وصول کیا تھا،

(۴) ۱۸۲۱ء میں رنجیت سنگھ نے اپنی محسنہ مائی سدا کور کو جس نے اس کی اکثر مہمات میں مدد کی تھی، مقید کردیا، اور اس کی ریاست کو ضبط کرلیا حالانکہ مائی کی ریاست ڈونی جو دریائے ستلج کے شرق میں واقع تھی بعد کو کپتان مرے کی مداخلت سے واپس کردینا پڑی

(۵) ۱۸۲۳ء میں بعض جاگیرداروں پر جرمانہ کیا گیا ان میں صرف سنہرا دال سنگھ سے ایک لاکھ روپیہ وصول کیا گیا، جس نے آخر کار زہر کھا کر خودکشی کرلی۔

(۶) دیوان چند کی پر اسرار موت پر بھی اس کی طمع کے سلسلہ پر ایک نظر ڈالی جاسکتی ہے ۱۸۲۶ء میں وہ اپنے محبوب رفقاء پر عنایات خسروانہ کی بارش کر رہا تھا اور ہر ایک کو دل کھول کر دیتا تھا۔ دوسری طرف ریاست کے افسران سے تشدد سے روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ فاتح ملتان دیوان چند ہی پنجاب کا ہونہار فرزند تھا، اور مہاراجہ کا جنرل بھی، اس نے اس نامناسب طرز عمل کی مخالفت کی لیکن رنجیت سنگھ کو ناگوار گذرا اور اس نے دیوان جی کی خدمات فراموش کرکے اس کو ڈانٹا۔ دیوان چند بڑا غیور تھا اس میں تاب کہاں؟ آخر کار اس نے اس واقعہ کا اتنا اثر لیا کہ زہر کھا کر جان دیدی۔

رحم و تشدد

وہ رحمدل تھا اور ظلم و تشدد سے تنفر کرتا تھا لیکن اپنے مقصد کی برآری میں تمام ان ذرائع کو جن کو اصولاً نامناسب سمجھتا تھا استعمال کرنے میں تامل نہ کرتا تھا۔

راجہ دھیان سنگھ اس کا وزیر تھا جو راجہ انوردھ چند والی کانگڑہ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا تھا مہاراجہ نے راجہ کو مجبور کیا لیکن اس نے اس بنا پر صاف انکار کردیا کہ دھیان سنگھ کا خاندان غیر معروف تھا جب رنجیت سنگھ

سنے بہت مجبور کیا تو راجہ نے ایک ماہ کی مہلت طلب کی تاکہ اس کی بہن بہروداد بھاگ نکلا ہیں مستان کر آئے سردار اجر اس بہانہ سے نالہ گھر جو ستلج کے مشرق میں تھا بھاگ گیا، ادہر رنجیت سنگھ کو موقع مل گیا اور اس نے رانا کو معزول کر کے ریاست کو اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔

یوروپین سیاح اور انگریزی حکام جن کو اس کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی تھی اس کی کریم النفسی اور وسیع الاخلاق ہونے کے شاہد ہیں لیکن دوسری طرف خود اس کے چہیتے جنرل دیوان چند کی پر اسرار موت اس کی تردید کرتی ہے۔

بہادری

یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بہادر تھا لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قوی دشمن سے خائف بھی رہتا تھا، یہ عاقبت اندیشی خیال کی جاوے یا تدبر سے اس کی تعبیر کی جاوے، لیکن جن مواقع پر انگریزی مداخلت کا خوف پیدا ہوا ہے رنجیت سنگھ نے احتیاط سے کام لیا ہے اور پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے، جب عاشورہ کے روز فروری ۱۸۰۹ء میں سکھوں نے سر چارلس مٹکاف کے کیمپ کے مسلمان سپاہیوں پر حملہ کیا تو رنجیت سنگھ نے اس کی اطلاع پاتے ہی سر چارلس سے سکھوں کی اس ندموم حرکت کی معذرت کی، اور ۲۵ اپریل ۱۸۰۹ء کو اس مشہور معاہدہ پر دستخط کر دئے جس کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مہاراجہ ستلج کے مشرق میں اپنی سلطنت کو وسعت نہ دے گا۔

صدق و وفا و عہد شکنی

وہ وفا کیش تھا اور عہد شکن بھی جہاں تک برطانیہ اور رنجیت سنگھ کے ارتباط کا تعلق ہے اس میں ذرا بھی کلام نہیں کہ اس نے مرتے دم تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی دوستی کو نبھایا۔ حالانکہ تعلقات کو کشیدہ کرنے کی پیہم کوششیں کی گئیں، اور اس کو لالچ دیا گیا، وعدے کئے گئے، لیکن جب یہ جادو نہ چلا تو اس کو دھمکیاں دی گئیں مخالفتیں کی گئیں، لیکن وہ پیمان وفا پر قائم رہا، دوسری طرف جہاں تک چھوٹی ریاستوں کے عہود کا تعلق ہے ایک دو نہیں متعدد مثالیں ملیں گی جن سے یہ ثابت ہو سکیگا کہ جب کبھی بھی ان کو ملک گیری کی حرص و آز یا زر و جواہر کی طمع دامنگیر ہوئی اس نے نہ کبھی کسی عہد کی حرمت کی نہ پیمان کا لحاظ کیا ہے اور اپنی ذاتی اغراض کے لئے زیردستوں پر بے دریغ تشدد کیا ہے۔

مغلوب پر ظلم کرنا وہ اپنی کریم النفسی کے خلاف سمجھتا تھا لیکن ماں کا ہولناک قتل ہی ایک ایسی مثال ہے جو اوّل الذکر اوصاف کے متضاد ہے تاہم ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر واقعہ کے عمق کے پر نظر ڈالی جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ماں کا قتل اخلاقاً جس قدر بھی مذموم ہو لیکن مقتضائے سیاست و تدبر ضروری تھا،

تبصرہ

رنجیت سنگھ اپنی شاندار زندگی تیرہ سال کی عمر میں جبکہ وہ اپنی موروثی ریاست پر قابض ہوتا ہے شروع کرتا ہے، بیس سال کی عمر تک قریب دوآبہ کے اضلاع پر اس کا تسلط ہو جاتا ہے اور بہت زیادہ زمانہ نہیں گذرتا کہ لاہور اس کی قلمرو میں داخل ہو جاتا ہے لاہور کی تسخیر کا سہرا اس کے سر نہیں بلکہ اس کی فتح غیبی تائید کا ثبوت ہے لاہور اس وقت تین حکمرانوں کی غارتگر سپاہ کا جولانگاہ تھا، جنہوں نے شہر کی تاراج عمارات کو مسمار اور باشندگان کو خانماں خراب کر دیا تھا، قحط زدہ وفاقہ کش آبادی شہر چھوڑ چھوڑ کر آس پاس کے مواضعات میں پناہ گزین ہو گئی تھی، رنجیت سنگھ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور لاہور جا دھمکا، آبادی تاب مقاومت کیا لاتی اس نے گلو خلاصی اسی میں دیکھی کہ حملہ کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرے اور اپنی قسمتوں کو اس کے ہاتھ میں دیدے۔

رنجیت سنگھ کے عہد میں لاہور سرسبز ہوا اور بہت جلد پنجاب میں سب سے زیادہ دولتمند سب سے زیادہ زرخیز آباد شہر ہو گیا۔

رفتہ رفتہ اس نے چھوٹے چھوٹے سرداروں کو جو کسی زمانہ میں خیلداروں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتے تھے، لیکن ابدالی کے غارتگر حملوں کے بعد سپاہ جمع کر کے طاقتور اور برسر اقتدار ہو گئے تھے، یکے بعد دیگرے مغلوب کر کے اپنی ریاست کو وسعت دینا اور اپنی طاقت کو مستحکم بنانا شروع کر دیا پنجاب اس وقت دو کشیدہ شمشیروں کی زد میں تھا، ایک طرف افغانوں کے دانت لگے ہوئے تھے دوسری طرف برطانوی فتوحات کی موج بڑھتی آتی تھی، ایسی حالت میں اگر پنجاب آزاد و خود مختار رہ سکتا تھا تو ایک عظیم جرار سپاہ کے قیام سے جو دونوں فاتحین کے سیل گراں کو روک سکے حسن اتفاق سے جو طاقت اس کی پشت پناہ تھی وہ ایک جنگجو قوم تھی جس نے ہمیشہ تیغوں کے سایہ میں نشو و نما پائی تھی، سکھ سپاہی پیشہ تھے اور دیسی سرداروں کی سپاہ میں قسمت آزمائی کے لئے بھرتی ہوتے تھے۔ انھوں نے ایک مذہبی جرگہ یا اخوت قائم کر لی تھی جس کا ہر فرد کٹر اور پرجوش سکھ تھا، اور مذہب کی خاطر سرفروشی کرنا زندگی کا نصب العین

سمجھا جاتا تھا سوسائٹی میں کسی کو امتیاز نہ تھا. اور ہر شخص مساوی درجہ رکھتا تھا، وہ اپنے آقا کی اطاعت میں میدان جنگ میں عالم کی توقعات کی مدنک کرتے تھے وہ خود سر تھے اور مطلق العنان، سکھوں کی تعداد اس وقت بیس لاکھ سے زیادہ نہ تھی نہ ان کے اصول کسی مذہب کے ماتحت تھے بلکہ ان کا کیش ہی تھا جس کی تعلیم گرو نانک نے دی تھی اور وہ ایسی تعلیم تھی جو ایک جنگجو قوم سے اپیل کرتی تھی، گرو نانک کے بعد ان کے دس جانشین ہوئے جنہوں نے اس مقدس تعلیم کی اشاعت کی، سکھوں کے روحانی مقتداؤں کو جو مصائب مذہب سکھ کے نشر میں برداشت کرنے پڑے تھے ان کے انتقام کا عہد کیا گیا، اور ایک مسلح سپاہ کی تنظیم کی گئی جو "خالصہ" کہلائی. یہ ایک قومی اور مذہبی فوج تھی جس کا ہر سپاہی ہم آہنگ وہم آواز تھا، رنجیت سنگھ کی پشت پناہ یہی طاقت تھی، اور اسی نے اس کو "شیر پنجاب" بنایا تھا، یا یوں کہا جائے کہ "شیر پنجاب" نے اس کو منظم کر کے اور مغربی فنون جنگ سے آراستہ کر کے اس قابل بنایا تھا کہ اس میں ایک زبردست طاقت کی شان پیدا ہو گئی تھی، اور اس کی توپوں کی گرج لداخ سے ملتان تک اور ستلج سے قلب افغانستان تک گونجتی تھی اور جس نے سندھ، راوی، بیاس، چناب، جہلم کی سینچی ہوئی شاداب سرزمین کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا. ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے وقت سپاہ خالصہ کی تعداد ۸۰۹۰۴ تھی،

لیکن رنجیت سنگھ کی آنکھ بند ہوتے ہی سکھوں کی قومیت کا طلسم ٹوٹ گیا، بند ہن کھل گیا، شیرازہ ابتر ہو گیا، اور صرف ایک شخص کی جانبازیوں سے جو سلطنت نپولین اعظم کی سلطنت کی طرح سر لیپل گریفن کے الفاظ میں۔

"سرعت کیسا تھ ظہور پذیر ہوئی تھی سرعت کے ساتھ اپنا کروفر دکھا کر ختم ہو گئی"

محاکمہ یہ ہے شیر پنجاب کی چالیس سالہ فاتحانہ زندگی کی سرگذشت مارشمین نے کیا خوب کہا ہے۔

"یہ رنجیت سنگھ ہی کا کام تھا کہ اس نے سکھوں کی قومیت کی فلک رفعت عمارت کی جبکہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے بنیاد ڈالی ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ نے سکھوں کے اقبال کے آفتاب کو نصف النہار ترقی پر چھوڑا لیکن جیسا کہ جنرل سر جے، ایچ گارڈن نے کہا ہے۔

"ہندوستان کی سیاسی اسٹیج سے رنجیت سنگھ کی پیٹھ مڑنا تھی کہ سکھ قوت ایک آتشین مادہ کی طرح پھٹی اور بہت جلد خاکستر ہو کر بادر ہوا ہو گئی"

(۲)

بٹیر بازی

از قلم خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

دو قسم کے بٹیر ہندوستان میں ہوتے ہیں ایک چنک اور ایک گھاگر اور دونوں میں چنک کی زیادہ قدر ہے کہ قد میں چھوٹا اور غصہ میں گھاگر سے زیادہ تیز ہوتا ہے مرغ کے بعد اسی کی بہادری مشہور ہے

شکار کا قاعدہ یہ ہے کہ بٹے ہوئے سوت کا جال مسلمان کہار ایسا بناتے ہیں جس کی ڈوری پتلی ڈورے کچھ موٹی ہوتی ہے اور جال کا چھید اتنا ہوتا ہے کہ بٹیر کی گردن میں آسکے دس بارہ گز لمبا اور ڈھائی تین گز چوڑا ہوتا ہے۔

جب جون کی آخری تاریخوں میں گرمی کا آخر اور برسات کا آغاز ہوتا ہے تو پہاڑوں سے بٹیر آنا شروع ہوتے ہیں اس وقت شکاری دس بارہ چھندیت بٹیر کو شکار کو لے جاتے ہیں چھندیت اس بھگے کو کہتے ہیں جو پالی میں بدل بدل آئے اسے ایک پنجرے میں ڈال دیتے ہیں اور کاکن پانی وغیرہ پنجرے میں دیدیا کرتے ہیں سال بھر میں وہ بولنے لگتا ہے اور رات کو زیادہ آواز سے بولتا ہے رات ۔ ۔ ۔ ر کھیت پر جال پھیلا دیا جاتا ہے اور جال کے قریب چار پانچ ۔ ۔ دو چھندیت کا پنجرا لٹکا دیا جاتا ہے رات کو یہ چھندیت فٹ فٹ بہت زور سے بولتے ہیں دو تین بجے کے قریب بٹیروں کی بھیڑ کی بھیڑ اڑتی ہوئی آتی ہے اور ان کا گگدا ایک تو ہوتا ہے وا بھی بٹیر کی قسم سے ایک پرند ہے سب بٹیر اس کی اطاعت کرتے ہیں جب وہ اپنے ہمجنس کی آواز سنتا ہے فوراً اس جگہ اتر آتا ہے اور سب بٹیر بھی وہیں اتر آتے ہیں اب شکاری لوگ تھوڑی دیر کے بعد پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ جھکتے ہوئے بٹیروں کے قریب کھٹ پٹ کرتے ہوئے جاتے ہیں بٹیر کھیت تب جال کے نیچے نیچے کھسکتے ہوئے چلے جاتے ہیں،

اس کے بعد شکاری ایک دم غل مچاتے ہیں تو بٹیر فوراً اڑانا مارتے ہیں اڑنے میں ان کی گردنیں جال میں پھنس جاتی ہیں اور وہ گرفتار ہو جاتے ہیں شکاری فوراً ان کو جال سے نکال کر دونوں کو ایک پچھی میں اور نزدل کو تھیلے میں بند کر کے لاتے ہیں جال کی تکلیف گھنٹہ دو گھنٹہ تک ان کی گردن ٹھہری رہتی ہے پتا دریں ہی بٹیر کا شکار ہوتا ہے صبح کو شکاری نہیں بدوتی منہ چیر کر گندھا ہوا آٹا کھلاتے ہیں اور منہ میں پانی لے کر کلی سے چونچ میں ڈالتے ہیں اس کے بعد بازار میں لے جا کر بیچ لیتے ہیں اس کھلانے پلانے سے بٹیر فربہ معلوم ہوتا ہے۔

مادہ معمولی قیمت پر بکتی ہے اور اسے صرف کھانے والے مول لیتے ہیں نر کی قیمت قد کے موافق ہوتی ہے اور پالیوں میں نر لڑایا جاتا ہے۔ لوا لڑتا نہیں بہت سیدھا پرند ہوتا ہے، گھاگر کا شکار جالوں میں اسی طرح ہوتا ہے گھاگر کم آتے ہیں اور کم لڑائے جاتے ہیں لیکن گھاگر کے ساتھ جو چنک ملتا ہے وہ بہت مضبوط اور قد آور ہوتا ہے اور خوب لڑتا ہے ان کی پالیاں ہوتی ہیں اور ہار جیت ہزاروں روپیہ کی ہوتی ہے کہتے ہیں غدر کے بعد پالیاں نواب بنے صاحب رئیس اور صاحب عالم کے مکان پر ہوتی تھیں گورنمنٹ کو جب خبر ہوئی کہ بٹیر لڑائے جاتے ہیں اور اس میں ہار جیت بھی ہوتی ہے تو اس نے ان لوگوں پر مقدمہ قائم کیا تھا کی برابر پیشیاں ہوئیں اور مقدمہ ہائیکورٹ تک گیا، ملزمین نے ہزاروں گواہ دیکر سمجھایا کہ یہ صرف رئیس اور نواب اور شہزادوں کا طبعی مشغلہ ہے اور اس حیلہ سے ہزارہا غربا کی پرورش ہوتی ہے ایک ایک بٹیر پر صدہا روپیہ تنخواہ کے صرف ہوتے ہیں اور یہ تنخواہ ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو بٹیر کو بناتے اور اس کو پالتے ہیں اور بٹیر باز لگے جاتے ہیں ہار جیت تو بہانے نام مشغول قائم رکھنے کے واسطے ہے

گورنمنٹ نے اس شکل کو منظور کر لیا اس دن سے جتنی پالیاں ہوتی

ہیں چاہے کسی رئیس کی طرف سے ہوں اور کسی کے مکان پر ہوں سب بے حصاب اور صاحب عالم کے نام سے ہوتی ہیں۔

پالی کا دستور یہ ہے کہ دونوں طرف کے فریق اپنی اپنی طرف سے پالی کا خرچ برداشت کرتے ہیں اور ایک رئیس کا مکان پالی کے لئے مانگتے ہیں جس کو پالی کا شوق ہوتا ہے۔

پالی کے لئے خیمہ، قنات، فرش، پانی کا کن وغیرہ سب کا سامان دونوں فریق کے ذمہ ہوتا ہے۔ ہر پالی میں آٹھ سات سو پیسہ صرف ہوتے ہیں بعض پالیاں نئے بیٹر کے لڑانے کے واسطے مقرر ہوتی ہیں۔

نیا بیٹر اس کو کہتے ہیں جو دو چار مہینہ کا پکڑا ہوا ہو۔ اور ایک پیسہ کی بازی پر لڑایا گیا ہو اور بعض نوکار ہوتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں جو اسی سال تیار کیا گیا ہو۔ بعض کریز کریز اس کو کہتے ہیں جو ایک سال کے بعد اپنے پر اپنے پرانے کر نئے نکال لایا ہو۔

کریز دوبرسہ، تبرسہ، چوبرسہ، پنجبرسہ، چھبرسہ، سات برسہ، آٹھ برسہ تک ہوتا ہے۔ ان سب کو کریز کہتے ہیں۔

بیٹر کی عمر دس برس تک ہوتی ہے۔ بلکہ بیٹر کمزوری کے سبب اچھا نہیں لڑ سکتا۔ نئے بیٹر کی پالی کا دن مقرر کر کے سب بیٹر بازوں کو اطلاع دیجاتی ہے جو لوگ اپنے بیٹر کو تیار کر چکے ہیں وہ آتے ہیں۔

بیٹر کے بنانے کا قاعدہ یہ ہے کہ جب مول لیتے ہیں اور اس کے پیٹ میں جو آٹا بھرا ہوتا ہے تو اسے دانہ پانی کچھ نہیں دیتے تاوقتیکہ آٹا پیٹ سے نکل نہ جائے صرف مونٹھ کرتے ہیں، اس کے بعد جب دانہ ڈالتے ہیں تو وحشت کے سبب سے وہ چونچ نہیں اٹھاتا ہے نہ پانی پیتا ہے اسے مونٹھ کرتے ہیں یعنی ٹھنڈے پانی سے بھگو کر ہاتھ میں لے کر اسے سکھلاتے ہیں تو اس کی گرمی کچھ کم ہوجاتی ہے دن بھر میں دو دفعہ مونٹھ کرتے ہیں اور پان کھا کر اس کے لعاب سے اسے رنگتے ہیں یعنی منہ سے اس کے پروں میں پیک گراتے ہیں تو ذرا اس کی وحشت کم ہوتی ہے بلکہ کچھ دانہ اٹھانے لگتا ہے، چند روز کے بعد دانہ اٹھانے لگا اب رات کو ایک نبجے اسے بیٹر کو کابک سے نکالا اس کے بعد دونوں کانوں اور سر پر کوک بھری کچھ چونچ مارنے لگا اب دیکھا کہ کمزور ہے سیپ لگ گئی ہے یعنی دبلاپے کی وجہ سے ہڈی نکل آئی ہے پستہ وغیرہ روغنیات سے چرب کر کے دانہ دیا، پھر قریب آئی دانہ دیتے ہیں ایک مٹھا ہاتھ میں لے کر سامنے کر دیا اس نے خوب چونچیں ماریں، اب دن میں کئی بار تھوڑا تھوڑا دانہ دینا شروع کیا اور مونٹھ بھی کرنے لگے دانہ سے فربہ ہو گیا تو جلاب دیا جب صاف ہو گیا تو بھوک دی یعنی دانہ کم دیا، اس کو بھوک دینا کہتے ہیں اس کے بعد پالی کے روز لڑانے کے واسطے لاتے پالی کے روز کچھ دانہ نہیں دیا پالی کی صورت یہ ہے کہ ہزاروں آدمیوں کی دو طرف بھیڑ ہے اور جس طرح کھانا کھانے لوگ بیٹھتے ہیں بیچ میں دسترخوان بچھایا جاتا ہے، اسی طرح ایک صاف چاندنی ہے جو دو گز کی چوڑی اور چھ گز کی لمبی ہے بیچ میں کاکن پھیلی ہوئی ہے اور چاروں طرف آدمی بیٹھے ہوئے ہیں ان کی پشت پر دونوں طرف آدمیوں کا ٹھٹھ لگا ہے۔

ایک صاحب اپنا بیٹر لے کر آئے ان سے پوچھا کس کی طرف سے بیٹر لڑانے آئے ہو انھوں نے کہا بنے صاحب کی طرف سے دوسرا آدمی صاحب عالم کی طرف سے نیا بیٹر لایا دونوں نے ایک دوسرے کے بیٹر کو دیکھا اور بازی منظور کی ایک پیسہ پر بازی لڑی اب جس فریق کا بیٹر کمزور ٹھہرا دوسرے فریق سے ایک پیسہ دیکر اپنا بیٹر اٹھا لیا پھر کسی بازی میں لڑایا۔

قاعدہ ہے کہ جب بازی لڑانا منظور ہوتی ہے تو بیٹر کو ایک دن کی بھوک دیتے ہیں تاکہ اس کا غصہ زیادہ ہو اور جب بیٹر کو لڑانے جاتے ہیں تو اس فرش پر بیچ میں آمنے سامنے دونوں آدمی بیٹھتے ہیں جہاں دانہ پڑا ہوتا ہے کچھ کاکن ہاتھ میں لے کر پہلے بیٹروں کو الگ کھلاتے ہیں، اس کے بعد دانہ پر چھوڑ دیتے ہیں دانہ کھلانے کو چگی دینا کہتے ہیں وہ دونوں بھوک کی جلن میں ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ دانہ سوا میرے دوسرا بیٹر نہ کھائے دیر تک لڑتے رہتے ہیں جب کوئی شخص اپنا بیٹر کمزور دیکھتا ہے تو بازی دیکر بیٹر اٹھا لیتا ہے۔ اس کی ہار مان لی جاتی ہے۔

نوکار اس بیٹر کو کہتے ہیں جو ایک سال کا ہو یہ خوب لڑتا ہے۔ اور اس کی بازی بھی زیادہ لڑائی جاتی ہے۔ یعنی بیچ میں نہیں اٹھا سکتے اور اس پر ہار جیت ہوتی جاتی ہے، تیس چوبیس تک بازی لگاتے ہیں، اس کی بادیاں بھی الگ ہوتی ہیں، بیٹر کی کابکیں بڑی تکلف کی ہوتی ہیں، انبر فول یا اطلس کے غلاف چڑھے ہوتے ہیں، عموماً تحتانی یا پچھ خانی ہوتی ہیں یعنی تین خانہ یا چار خانہ کی ہوتے ہیں ہر خانہ میں ایک بیٹر رہتا ہے بعض بیٹر باز فیسو کی نوکری کر لیتے ہیں اور ان کے بیٹر پالتے ہیں بعض بیٹر بنا کر اور چھوٹی بازی سے لڑا کر بیچ ڈالتے ہیں، مگر اصل لڑائی کریز کی ہوتی ہے، کریز وہ بیٹر ہے جو دو برس کا پرورده ہو اور مونٹھ وغیرہ سے بالکل سردی کے زمانے میں تیز ہو گیا



ادارہ نیرنگ خیال - ایس ایم اشفاق غازی - حکیم یوسف حسن - سید فرید جعفری -

سکے کابک میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ اسے گرمی کے موسم میں پھر موٹھ کرتے ہیں اور ہاتھ میں رکھتے ہیں اس کی چونچ بھی چاقو سے تیز بناتے ہیں اور امتحان کیلئے بھگے بٹیر سے لڑاتے ہیں اس کا دل بڑھاتے ہیں اور اس پر سو سو پچاس پچاس کی بازی لگاتے ہیں اکثر کریز ہی سے اسے لڑاتے ہیں۔

دس بارہ برس کا زمانہ ہوا افضل خاں تارکش چار سو روپیہ ماہوار کی آمدنی کے مالک تھے تارکشی کا بہت بڑا کارخانہ تھا دس پندرہ کاریگر ان کے مکان پر کام کرتے تھے اچھی خاصی آمدنی تھی بہت بڑی املاک بنوائی تھی۔ امراسے میل جول تھا سب کی دیکھا دیکھی ان کو بھی بٹیر بازی کا شوق ہوا کئی پرانے بٹیر باز نوکر رکھے جو روزانہ اپنی اپنی محنت دکھانے کو حاضر ہوتے تھے ان کے کریز سو دو سو کی بازی پر لڑتے تھے بہت نام پیدا کیا اکثر ان کے بٹیر بازی لے جاتے تھے دو چار برس میں تارکشی کے کارخانہ میں نقصان ہونے لگا۔ ہر اتوار کو پالی میں ضرور جاتے تھے اور دو چار بٹیر ان کے لڑتے تھے جب کارخانے میں نقصان آگیا تو بٹیر بھی بازی ہارنے لگے آخر کار بٹیر بازوں کو جواب دیدیا۔

ایک مرتبہ اچھے کریزوں کو چوہے نے کابک میں گھسکر کاٹ ڈالا بڑا صدمہ ہوا کئی روز تک کھانا نہیں کھایا۔ پھر بھی کئی کریز موجود تھے۔ اسی تفرق میں نوبت یہانتک پہنچی کہ مکان بک گیا کارخانہ بند ہو گیا۔ کوکین فروشی خفیہ کرنے لگے اس میں گرفتار ہوئے چار برس کی قید ہوئی۔ قید کے بعد چھوٹ کر آئے آٹھ سات مہینے بیمار رہے تین برس ہوئے نہایت تنگدستی میں انتقال کیا جو لوگ ان کے عیش و عشرت کا زمانہ دیکھ چکے ہیں کہتے ہیں اچھے اچھے رئیس ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ محمد علی خاں صاحب بہادر تعلقدار ملیح آباد کی طرف سے اچھے اچھے بٹیر آئے تھے ایک پالی میں یہ بھی شریک تھے اور بھی بہت سے پٹھان ملیح آباد کے آئے ہوئے تھے ایک معرکہ کا بٹیر پالی میں لایا گیا۔ بلاقی نعل بند لکھنؤی نے اپنا بٹیر پیش کیا بازی سطے پا گئی اور ایک پٹھان اس بٹیر کو لے کر پالی کے اندر آیا دوسری سے باقی بھی اپنا بٹیر لیکر آیا دونوں نے بٹیر کو پہلے چھٹی دی اس کے بعد آمنے سامنے چھوڑ دیا دونوں بٹیر خوب جی کھول کر لڑے آخر کو ملیح آباد کا بٹیر بھاگ گیا

ساری پالی میں غل ہوا وہ مارا مارا کہ سارا مکان گونج گیا پٹھانوں کو یہ بات بری معلوم ہوئی کہ بٹیر کی بازی ہے کچھ آدمی کی لڑائی نہیں ہے بٹیر ہار گیا کچھ ہم نہیں ہارے ایسا ہی ہے تو ہم لوگوں سے بھی کشتی ہو جائے۔ بلاقی نے کہا جیسے بٹیر ہارا ویسے اس کا مالک ہارا اس پر خوب دونوں طرف سے مار ہونے لگی۔ مگر بلاقی بھی بہادر تھا، لکڑی لے کر سامنے ڈٹ گیا اور کئی پٹھانوں کو گرا دیا چونکہ تنہا تھا اسے بھی پٹھانوں نے ملکر خوب مارا اور زخمی ہوا بیہوش ہو گیا اسے ڈولی میں ڈالکر لوگ گھر میں لے گئے اس سے ہر چند کہا کہ تم نالش کرو کہ ہمیں مارا اس نے کہا یہ بہادری کے خلاف ہے۔ کھیل میں جب تکرار بڑھ جاتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے اس نالش کی کیا ضرورت ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محمد علی خاں نے اس روز سے پالی میں آنا چھوڑ دیا اس کو پچیس برس کا زمانہ ہوا یہ پالی نواب سیف الدولہ کے پھاٹک میں ہوتی تھی، اور محمد نواسے صاحب منتظم تھے۔ اس اتوار کو نواب مرزا علی خاں نے احاطہ میں جو متصل حسین آباد عقب جامع مسجد واقع ہے پالی ہوتی مچھن تارکش کا بٹیر شیخ کلو تمباکو والے کے بٹیر سے پچاس روپیہ کی بازی پر لڑا ہزارہا آدمی کا مجمع تھا بہت دیر تک بٹیر لڑا کیا آخر کار کلو کا بٹیر بھاگ گیا۔

اس اتوار کو آغا میر کی ڈیوڑھی پر نواب بنے صاحب کے ہاں پالی بہت شاندار ہوئی مصطفےٰ حسین کشمیری بھانڈ کا کریز یوسف خاں کاتب والے کے کریز سے دو سو کی بازی پر لڑایا گیا دونوں بٹیر خوب لڑے آخر کو مصطفےٰ حسین کا بٹیر بھاگ گیا، اور کئی ہزار کی اس پر بازی لڑائی گئی تھی یوسف خاں کی طرف سے جن لوگوں نے بازی لگائی تھی وہ سب جیتے بٹیر کی لڑائی کا قاعدہ یہ ہے کہ تین دفعہ لڑایا جاتا ہے۔

جب دوسری دفعہ لڑایا گیا تو یوسف خاں کے بٹیر نے منہ نہ دکھایا اور مصطفےٰ حسین کے بٹیر نے دو لاتوں میں بھگا دیا تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔

آخر سب لوگوں نے بازی کے روپیہ پھیر کر اور ہارے ہوئے اپنے پاس سے دئے کئی ہزار کی ہار جیت تھی اور مصطفےٰ حسین کا بٹیر بازی لے گیا۔

عام طور پر بٹیر بازی صرف برسات میں ہوتی ہے، بٹیر کو آرام دیتے ہیں موٹھ نہیں کرتے نہ لڑاتے ہیں، برسات کے قریب بٹیر پر محنت کرتے ہیں، اور گرمیوں کے زمانے میں بٹیر لڑائے جاتے ہیں اور بازی ہمیشہ اتوار کو ہوتی ہے۔

ہر اتوار کو کئی ہزار کی ہار جیت ہو جاتی ہے بہت لوگوں کی معاش بٹیر بازی ہے۔

عبدالرؤف

(۳)

ہندوستان میں انگریزوں کا ابتدائی نظام اراضی

از جناب ڈاکٹر سید نجم الدین صاحب بی اے بیرسٹر ایٹ لا۔ ڈپٹی ڈائرکٹر

ہم ان رسالے کے پچھلے سالنامہ نمبر میں ہندوستان کے قدیم نظام اراضی کا تذکرہ کر چکے ہیں، اور اس پر بھی روشنی ڈال چکے ہیں کہ مسلمانوں کے زمانہ میں کیا کیا ترقیاں و تبدیلیاں ہوئیں آج ہم یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ انگریزوں کا نظام اراضی یہاں کب سے اور کس طرح شروع ہوا۔

انگریزوں کے نظام اراضی کی ابتدا ۱۶۹۸ء سے ہوئی یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو فرمان مغلیہ حاصل ہونے کے تقریباً ایک صدی بعد۔ پہلا فرمان جس اراضی کے متعلق ملا تھا وہ کلکتہ کے قریب تھی لیکن چند ہی سالوں کے بعد پٹنہ اور مرشد آباد تک اس کی توسیع ہو گئی۔ مگر فی الحقیقت انگریزی نظام کی ابتدا ۱۷۶۵ء سے ہوتی ہے یعنی جب لارڈ کلائیو کو شاہ عالم نے بنگال کی دیوانی کی سند عطا کی۔ اس عطیہ کے بعد سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے نظام اراضی کی طرف خاص طور سے توجہ مبذول کی، اور مالگذاری یا محصولات سے متعلق خاص کاوشش کی، وقت یہ تھی کہ انہیں ہندوستان کے نظام اراضی کا کوئی تجربہ نہ تھا، نہ یہاں کے رسوم سے واقفیت تھی۔ اس کے علاوہ ایک مشکل یہ تھی کہ ہر طرف ایک ہی طریقہ جاری نہ تھا، سچ تو یہ ہے کہ نواب علی وردی خاں کے انتقال کے بعد سے صوبۂ بنگال کے نظام کا شیرازہ بالکل بکھرا ہوا تھا، اور تمام نظام منتشر ہو رہا تھا۔ سب سے پہلا کام جو کمپنی نے کیا وہ یہ تھا کہ تمام ایسی اطلاعات جو نظام کے لئے بہم پہنچانا ضروری تھیں بہم پہنچانا شروع کیں، اور اس غرض کے لئے ۱۷۶۹ء میں انگریز ناظم مقرر کئے تاکہ اس وقت کے مروجہ نظام کی مفصل حالات اور مکمل تاریخ سے پوری واقفیت ہو جائے۔ اس لحاظ سے ان کے فرائض تقریباً اسی قسم کے تھے جیسے آج بندوبست افسر کے ہوتے ہیں اور جو ہدایتیں ان کو جاری کی گئیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کو کس قدر تشویش تھی کہ نظام اس طرح کیا جاوے کہ رعایا کو کامل اطمینان ہو اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ ان کی ہدایات کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے اس پر خاص روشنی پڑتی ہے:-

"تم کو یہ واضح ہونا چاہئے کہ اس کمیشن کی رو سے تم کو ایک ایسے صوبہ کی نگرانی اور ایسی جگہ کا انتظام دیا جا رہا ہے کہ جس کی بہبودی اور فلاح بہت حد تک تمام ملک کی بہبودی اور فلاح سے تعلق رکھتی ہے جبر و تشدد اور ہزاروں ناروا ظلم جو حکومت کے لئے بھی اسی قدر ضرر رساں ہیں جتنا کہ غریب کسانوں کے لئے نیست و نابود ہو جانا چاہئیں۔ اپنی عزت، شجاعت، جفاکشی اور انسانی ہمدردی کے قومی اصولوں کو جو ہر انگریز کے لئے باعث فخر ہیں دکھاؤ، اور غریب سے غریب مظلوم کے دل میں اس امر کا احساس پیدا کرو کہ تم اپنی کوشش سے اس کو مایوسی اور ذلت کے قعر سے نکال کر امن و امان اور خوشی کی راہ پر لگاؤ گے، اس احساس کا فائدہ ہماری قوم کو بہت ہوگا۔ مگر اس کا دارومدار تمہاری عقلمندانہ روش پر ہے۔ وہاں کی زبان سے تم خوب واقفیت پیدا کرو کسی پر ایسے طریقہ سے اعتبار نہ کرنا، تم خود سمجھو اور صحیح رائے قائم کرو تم تک لوگوں کی رسائی مشکل نہ ہونی چاہئے۔ اپنے ماتحتوں کے رویہ سے ہوشیار رہنا کسی قسم کا بے جا اثر نہ ڈالنا بہت احتیاط سے کام کرنا۔ اس کام کے لئے بڑی محنت جفاکشی اور غیر جانبداری کی ضرورت ہے، یہ صرف تمہارے لئے ہی مشغلہ نہیں ہیں بلکہ اوروں کے لئے سبق آموز ہوں گی کیونکہ تمہاری سب کارروائیاں اور سب نصیحتیں بیکار ثابت ہوں گی جب تک تمہارا ذاتی عمل ان کا آئینہ نہیں بنے"۔

ان ہدایات کا بہت اچھا اثر ہوا، لیکن افسوس یہ ہے کہ ان ہدایات کے ساتھ ساتھ ڈائرکٹروں کا روپیہ کا تقاضا اس قدر زیادہ رہا تھا کہ آ ت سکے

ہاتھوں کو جو ہندوستان میں رہتے تھے یہ آسان نہ تھا کہ وہ ان مقاصد کو پورے کر سکیں۔ بہرحال ان ناظموں نے تمام اطلاعات بہم پہنچائیں اور اس بات کے لئے کمپنی کے افسر متعین ہوئے۔ "کہ بنگال کی دیوانی میں جو خرابیاں ہیں ان کو دور کریں اور نظام کو صحیح راستہ پر لگائیں۔ سب سے پہلے انہوں نے اس زمین کی قیمت لگائی جس کا نظام ان کے ہاتھوں میں تھا، دوسرے یہ دیکھا کہ کس قدر اور کس قسم کی پیداوار وہاں ہو سکتی ہے اور اس کی کیا قیمت ہے۔ اس بات کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ ہر چیز کی جانچ پڑتال غیر جانبدار ذرائع سے کی جائے اور ماتحتوں پر بہت زیادہ بھروسہ نہ کیا جاوے، یہ کام ہو ہی رہا تھا کہ بنگال میں بہت زبردست قحط ۱۷۷۰ء میں پڑا جس کو "چالیسہ" کہتے ہیں۔ اس قحط سے اس کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی نیز بعض لحاظ سے ناظموں نے بھی اپنے انداز بدل دیئے اور غالباً اس وقت کی مکدر فضا نے ان کے تدبر پر بھی برا اثر پیدا کیا۔ ڈائرکٹران کو جب یہ خبر لگی کہ ان کی ہدایات پر اصلی معنوں میں عمل نہیں کیا گیا، جیسا کہ ان کو توقع تھی اور نیز یہ کہ ناظم اور چند ممبران کونسل نے نمک، سپاری، اور تمباکو کا اجارہ حاصل کر لیا ہے تو وہ بہت خفا ہوئے اور اس پر اظہار تاسف کیا۔ کمپنی کے ماتحتوں نے رعایا کو نقصان پہنچا کر خود فائدہ اٹھایا، چنانچہ انھوں نے اپنی ایک یادداشت میں لکھا کہ ناظموں نے انصاف اور ہمدردی کے تمام اصولوں کو پس پشت ڈال دیا، اور خود غرضی کی انتہا کر دی چونکہ انھوں نے چاول کا اجارہ لیا جس سے ایک ایسی ضروری چیز کی گرانی پیدا ہو گئی جس پر رعایا کی زندگی کا دارومدار ہے ممکن ہے کہ ان کا یہ خیال رہا ہو لیکن بظاہر تو اس غصہ کی زیادہ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان ماتحتوں کے ذاتی اجارہ حاصل کرنے سے کمپنی کا صریحی نقصان تھا۔

بہرحال اسی کے ساتھ ساتھ نظام میں مرکزیت یعنی Decentralisation کے اصول پر دو کونسلیں اور قائم کی گئیں، ایک پٹنہ میں دوسری مرشد آباد میں، مقصد یہ تھا کہ مالگذاری کی وصولیابی میں سہولت ہو، چنانچہ عظیم قحط سالی کے باوجود ۱۷۷۱ء کا مطالبہ جو سال گذشتہ سے زیادہ رکھا گیا تھا، کل وصول کر لیا گیا، لیکن یہ مطالبہ بڑی سختی سے وصول کیا گیا۔ خود وارن ہیسٹنگز نے جو تقرر ۱۷۷۲ء کے نومبر میں اپنی کونسل تب ان میں سے تسلیم کیا کہ وصولیابی تشدد اور جبر کے ساتھ عمل میں لائی گئی ہے۔ تین سال بعد ڈائرکٹران کا یہ حکم آیا کہ "دیوانی کا اعلان کیا جاوے" اور "اس پر پورے طور سے عمل کیا جائے" (۱) بنا بریں محمد رضا خاں نائب دیوان اور ان کے اختیارات موقوف کر دیئے گئے اور جو خدمات یہ صرف انجام دیا کرتے تھے وہ کونسل کے سپرد کر دی گئیں، مئی ۱۷۷۲ء میں گورنر جنرل نے ایک اعلان کیا جو بہت اہم ہے کیونکہ بعد کے آئین کی بنیاد اسی کو سمجھنا چاہیے۔ اس اعلان کے ذریعہ سے منجملہ دوسری باتوں کے یہ طے پایا کہ اراضیات پانچ سال کے لئے مستاجری اصول پر اٹھا دی جائیں اور ایک دورہ کرنے والی کمیٹی بنائی جائے جو تمام اضلاع میں دورہ کر کے بندوبست کرے اور جو گورنر جنرل اور چار ممبران کونسل پر مشتمل ہو۔

ناظموں سے جو توقعات تھے وہ پورے نہ ہو سکے لہذا ان کی جگہ کلکٹر مقرر کئے گئے۔ . . . . ہر ایک کلکٹر کو ایک ہندوستانی نائب دیا گیا جس کو دیوان کہتے ہیں۔ شاید یہی عہدہ ہو جس کا نام اب واصل باقی نویس ہو گیا ہے کیونکہ ابھی تک بہت سی جگہ واصل باقی نویس کو دیوان کہتے ہیں۔ کلکٹروں کو سوائے سرکاری کام کے تمام باتوں کی ممانعت کر دی گئی ہے نذر و نیاز وغیرہ قبول کرنے کو بھی روک دیا گیا ہے غالباً اس سے مطلب ڈالیوں کا نہ تھا کیونکہ وہ اب بھی جاری ہیں۔

کونسل کی تقرری کا سبب بھی مالگذاری کی وصولیابی کے اعتبار سے زیادہ قابل اطمینان ثابت نہ ہوئی کیونکہ بہت سے مستاجرین باقی دار رہ گئے۔ غالباً جس وقت ان کا تقرر بحیثیت مستاجر کے کیا جا رہا تھا تو اس کا لحاظ نہ رکھا گیا کہ ان کو "چالیسہ" قحط کے باعث لگان کی وصولی میں بہت دقت اور مصیبت پیش آئے گی۔ مسٹر ڈلش جو بعد میں لکھنؤ میں ریذیڈنٹ ہوئے اس وقت مرشد آباد ڈویژن کے انچارج تھے ان کا خیال تھا کہ بندوبست دورہ کرنے والی کمیٹی نے جو کچھ کیا وہ واقعات سے مطابقت نہیں کرتا تھا چنانچہ انہوں نے رانی راج شاہی کے معاملہ کو لکھا ہے کہ اس نے اس سے کہیں زیادہ مالگذاری قبول کر لی تھی کہ اس کو اپنے کاشتکاروں سے وصول ہو سکتی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ ایک باہر کا مستاجر اس کے علاقہ میں حکومت کرے۔

یہ انتظام بھی کامیاب نہ ہوا اور یوروپین کلکٹروں نے بھی جیسا کہ ان سے امید تھی ویسا کام نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ ان کی ناواقفیت تھی۔ لہذا ۱۷۷۳ء میں ڈائرکٹروں نے یہ طے کیا کہ انگریز افسران ہٹا دیئے جائیں اور ان کی جگہ پر ہندوستانی امین مقرر ہوں جن کی نگرانی ایک مستقل کمیٹی کرے اور جو بورڈ ریونیو کمیٹی کے نام سے موسوم ہو۔ یہی کمیٹی بڑھتے بڑھتے

آج بورڈ آف ریونیو کی شکل میں مختلف صوبہ جات میں ہے ۳ مئی ۱۷۷۲ء کو وارن ہیسٹنگز نے ایک حکم جاری کیا جس کی رو سے صوبہ بنگال چھ بڑے ڈویژن میں تقسیم کیا گیا، اور ہر ڈویژن کا انتظام ایک کونسل کے ہاتھ میں رکھا گیا، کونسل کے چار ممبر ہوتے تھے اور ایک صدر، اسی ضمن میں کلکٹران کا تقرر پھر ہوا گران کے فرائض نگرانی میں، البتہ کچھ تبدیلی ہو گئی، اس خیال سے کہ وہ زیادتی نہ کر سکیں نذر اور سلامی کی رسم بالکل بند کر دی گئی، اسی قسم کی، اور بہت سی خرابیاں دور کی گئیں، یورپین اور ہندوستانی دونوں ملازموں کو ممانعت کر دی گئی کہ زمین ٹھیکہ پر نہ لیں اور نہ لین دین کریں، اور نہ کسی کی طرف سے ضامن بنیں علاوہ اس کے جیسا کہ مسلمان بادشاہ رعایا کو تقاوی دیا کرتے تھے ویسا ہی کم شرح پر تقاوی دینے کا طریقہ جاری کیا گیا، لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی نظام کی پوری اصلاح نہ ہوئی، اس کی وجہ یہ تھی کہ مالگذاری پورے طور پر زمین کی یعنی ہر جائداد کی قائم نہیں ہوئی تھی اور نہ جو کچھ رعایا سے وصول ہوتا تھا اس کا مکمل حساب وکتاب تھا، جو مطالبہ رعایا پر رہ جاتا تھا اس کا اندراج بھی پورے طور پر نہیں ہوتا تھا اور نہ یہ طے ہوا تھا کہ اگر مستاجرین سے مطالبہ وصول نہ ہو تو کیا کارروائی عمل میں لائی جائے،

اسی وقت مرشد آباد اور دیناج پور کی کونسل نے صاف صاف لکھا کہ اراضیات پر مالگذاری زیادہ تشخیص ہو گئی ہے اور اسی قسم کی رپورٹیں بردوان سے بھی آئیں، اس لئے تشویش نظام اراضی کے متعلق قائم رہی۔

۱۷۷۳ء میں Regulating Act پاس ہوا جس سے نظام کمپنی پھر بدلا اور کلکتہ میں ایک کونسل اعلیٰ یعنی سپریم کونسل قائم ہوئی جس کے چار ممبر ہوتے تھے اور ایک صدر جس کو گورنر جنرل کا لقب دیا گیا، اس کو بورڈ کہتے تھے اور مالگذاری کے سب معاملات اس کے اختیار میں تھے یہ کمیٹی اس گورنمنٹ کے ماتحت تھی جو اس وقت لندن میں ریسٹ منسٹر میں حکمران تھی وارن ہیسٹنگز ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا، اس کمیٹی کے چار اور ممبران تھے جن کے حسب ذیل نام تھے۔

(۱) جنرل کلیورنگ
(۲) کرنل مانسن
(۳) ایم بارویل
(۴) فلپ فرانسس

ان سب میں مسٹر فرانسس بہت مشہور ہیں اس کونسل نے بھی مالگذاری کے معاملہ میں کوئی کارنمایاں نہیں کیا، بلکہ نومبر ۱۷۷۶ء تک اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے کوئی کمیٹی بھی نہیں ہوئی، یہ سب دیکھکر وارن ہیسٹنگز نے نظام میں پھر تبدیلی کرنے کی تجاویز پیش کیں، انہی کی تجویز کی بناء پر بورڈ نے یہ طے کیا کہ پنج سالہ مستاجری کو آئندہ سال ختم کر دیا جائے، اور قبل اس کے کہ کوئی نیا بندوبست عمل میں آوے یا پرانے معاہدے کی تجدید ہو ایک افسر خاص پر تعینات ہو جو مالگذاری کے بہت سے غیر طے شدہ مسئلوں کو طے کرے اور نیز اس پر تحقیقات کرکے رپورٹ دے کہ آیا رعایا کو حق موروثی دیا جائے یا نہیں؟ تقریباً پانچ برس تک یہ تحقیقات ہوتی رہی ۱۷۷۷ء میں مستاجری کا طریقہ ختم کیا گیا، اور نیا بندوبست بھی چند شرطوں سے کیے نئے بندوبست ۱۷۷۷ء میں ڈائرکٹروں نے یہ لکھا کہ ہم حق حین حیاتی یا حق موروثی کے الفاظ کو پٹہ کے لئے مناسب نہیں سمجھتے، لہذا نیا بندوبست صرف ایک سال کے لئے ہوگا، اور ایک شرط یہ بھی لگا دی گئی کہ اگر مطالبہ وصول نہ ہوگا تو زمین نیلام کر دی جائے گی یا ٹھیکہ پر اٹھا دی جائے گی اور زمیندار کی گرفتاری بھی مطالبہ کے عوض میں جائز قرار دی جائے گی۔ تین سال تک یہ بندوبست سالانہ قائم رہا۔ سالانہ بندوبست کا طریقہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ موقعہ ملنے پر بندوبست استمراری کر دیا جائے گا۔ ۱۷۸۱ء میں مالگذاری کی وصولیابی کے انتظام کو مضبوط کرنے کے لئے پھر کچھ قاعدے بنے اور ڈویژنوں کی کونسلیں منسوخ کر دی گئیں، ان کی خدمات سب ریونیو کمیٹی جو بورڈ کہلاتی تھی ان کے سپرد کر دی گئیں، چونکہ اب ان کے پاس کافی مواد صحیح حالات کے اندازہ کرنے کا موجود تھا، لہذا یہ خیال کیا گیا کہ مالگذاری کی وصولیابی کے بہترین طریقہ پر غور کیا جاوے، بہت غور کے بعد یہ طے ہوا کہ زمیندار سے بہتر اور کوئی ایسی نمائندہ مالگذاری کی وصولیابی کے لئے نہیں ہو سکتا، لہذا یہ طے پایا کہ وصولیابی زمیندار کے ذریعہ سے ہو بجز اس حالت کے کہ جب وہ بدنظمی یا بے جا سختی کا مرتکب ہو۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہوا کہ وصولیابی سالانہ کی جائے اور معاہدہ کی تجدید کی جائے، سپریم کونسل نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اس پر عمل درآمد ہوا، یہ سال بہ سال یا چند سالہ بندوبست کا طریقہ اس وقت تک جاری رہا جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہو کر آئے، اسی اثناء میں پارلیمنٹ میں بھی ہندوستان کے معاملات پر بحث وغیرہ ہونے لگی اور پارلیمنٹ نے کمپنی کو یہ رائے دی

کہ وصولیابی اعتدال اور انصاف کے ساتھ کی جائے اور رعایا کے حق موروثی پر غور کیا جائے چنانچہ سنہ ۱۷۸۶ء میں جو یادداشت ڈائرکٹروں نے بھیجی اس کو بندوبست استمراری کی پہلی کڑی سمجھنا چاہئے۔ اس یادداشت میں یہ کہا گیا کہ قطعی طریقہ بندوبست کا زیر غور ہے لیکن ایک سالہ بندوبست کو فوراً دس سالہ بندوبست میں تبدیل کر دیا جاوے اور اس کا نتیجہ دیکھنے کے بعد بندوبست استمراری تجویز ہوگا جس کا انحصار بہت کچھ اس بات پر ہوگا کہ آئندہ چار سال کے اعداد کیا ہوتے ہیں۔

لارڈ کارنوالس جب ہندوستان آئے تو انھوں نے دیکھا کہ ابھی تک تمام اطلاعات نامکمل ہیں، نہ تو کلکٹروں ہی کو معلوم ہیں اور نہ ریونیو بورڈ کو۔ اس لئے انھوں نے ڈائرکٹروں کے حکم کو ملتوی رکھا۔ اور سالانہ بندوبست جاری رکھا۔ اسی درمیان میں کلکٹروں کو یہ احکام بھیجے گئے کہ آئندہ بندوبست کیلئے تیاری کی جائے اور خاص طور پر ان تین باتوں پر توجہ مبذول کی جائے۔

۱ - مالگذاری کیا مقرر کی جائے؟

۲ - وہ صحیح اشخاص کون ہیں جن کے ساتھ بندوبست کیا جائے؟

۳ - رعایا کے حقوق کی کس طرح حفاظت کی جائے، اور ان کو بعض زمینداروں کے ناروا سلوک سے کیسے بچایا جائے؟

۱ مالگذاری کی شرح کے متعلق یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے وقت میں مختلف شرح رہی ہے۔ کبھی $\frac{1}{2}$ اور کبھی $\frac{1}{3}$ تو اکبر کے زمانہ میں زیادہ تر $\frac{1}{3}$ رہی ہے اور یہی شرح بہت جگہ اورنگ زیب کے وقت تک جاری رہی ہے مگر بعد میں تفاوت ہوتا گیا۔ مسلمانوں کے آخری سلطنت کے زمانہ میں جبکہ نظم منتشر ہو چکا تھا تو $\frac{1}{2}$ اور $\frac{3}{4}$ تک بھی بعض بعض جگہ شرح مالگذاری رہی ہے، چنانچہ سر جان شور نے یہ تجویز کی کہ بندوبست استمراری کے لئے حاصل کا ۹۰ فیصدی مالگذاری مقرر کیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ فی الحقیقت ماننگو ریفارم کے پہلے تک اکثر صوبوں میں کم و بیش یہی شرح مالگذاری رہی، ہاں اس کے بعد البتہ اصول میں کچھ تبدیلی ہوئی اور صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ نے تو ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے عام طور پر شرح مالگذاری چالیس فیصدی رکھی گئی، اور بعض خاص حالتوں میں اس سے بھی کم شرح رکھی گئی ہے۔

۲ - بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ بندوبست کن اشخاص کے ساتھ کیا جاوے اور اس معاملہ میں انگریزوں نے کم از کم بنگال میں بڑی غلطی کی۔ اس وقت جو لوگ زمینداری کے دعویدار تھے ان میں سے خاص طور پر یہ لوگ قابل ذکر ہیں:

۱ وہ مسلمان اور ہندو خاندانوں کے نمائندے جو سنہ ۱۵۹۶ء یعنی اکبر کے زمانے سے زمین کے مالک چلے آتے تھے۔

۲ وہ راجہ اور بڑے زمیندار وغیرہ جن میں سے اکثر نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں جائداد حاصل کی تھی، یہ لوگ مسلمان بادشاہوں کو صرف مالگذاری دیتے تھے، اور تقریباً آزاد جاگیردار سمجھے جاتے تھے۔

۳ وہ افسران یا عمال اور ان کے خاندان والے عموماً ایک دو پشت سے مالگذاری کی وصولیابی کے لئے مقرر کئے گئے تھے، یہ لوگ بہت ذی اثر ہو گئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اتنے دنوں تک اس طرح جائداد پر قبضہ رکھنے سے ان کو حق ملکیت حاصل ہو گیا ہے۔

۴ وہ لوگ جو اس وقت سے جبکہ کمپنی کو دیوانی کے اختیارات ملے تھے کمپنی کے مستاجرین تھے۔

۵ تعلقہ داران[1] جو زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ایک خاص حیثیت رکھتے تھے۔

۶ وہ لوگ جن کو فوجی یا سول خدمات کے عوض میں جاگیریں عطا کی گئیں تھیں، ان جاگیروں پر بہت کم شرح لگائی گئی تھی، یا یہ مالگذاری سے بالکل مستثنیٰ تھیں۔

۷ وہ لوگ جن کے مدرسوں اور مندروں کے لئے جائداد بطور وقف کے دی گئی تھی۔

۸ کاشتکاران۔

اس معاملہ میں بڑی بڑی بحث ہوئی کہ ان میں سے کس کو اصلی مالک سمجھا جائے چنانچہ اس مسئلہ کے اوپر بہت سے رسالے بھی لکھے گئے مگر آخری فیصلہ جو ہوا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرضی زمینداروں کے ساتھ جن میں پرانے عمال اور کمپنی کے مستاجرین بھی شامل تھے، بندوبست ہو گیا اور گاؤں کے باشندے جو پرانے پنچایتی اصول پر مالک تھے وہ اس ملکیت سے محروم کر دیئے گئے۔

---

[1] یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اودھ میں جو لوگ تعلقہ دار کہلاتے ہیں وہ ان سے بہت کچھ مختلف ہیں ان کی حیثیت مثل دیگر زمینداروں کے ہے صرف یہ فرق ہے کہ ان کو زمینداری سلطنت برطانیہ سے غدر میں ضبط ہونے کے بعد ایک سند کے ذریعہ سے عطا کی گئی ہے۔

۳ ۔ رعایا کے حقوق بہت غیر متعین تھے۔ عام خیال یہ ضرور تھا کہ زیادہ دنوں تک کاشتکاری قبضہ میں رکھنے سے حق دخیلکاری حاصل ہو جاتا ہے لیکن یہ سمجھا جاتا تھا کہ رہن و بیع کا اختیار نہیں ہے۔ ملکیت کا حق بھی صاف نہ تھا۔ انگریزوں نے رعایا کے حقوق کی کوشش تو کی لیکن جس انداز سے بندوبست ہوا اُس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

۱۷۸۹ء میں دہ سالہ بندوبست ہوا۔ اور اسی وقت یہ تصور تھا کہ یہ میعاد ختم ہونے پر بندوبست استمراری ہو جائے گا۔ لیکن اس وقت تک کمپنی کے جو ماتحتان ہندوستان میں تھے ان میں خود اتفاق نہ تھا۔ مسٹر جان شور اور نیز بعض دیگر معزز افسران اس کے خلاف تھے۔ لیکن لارڈ کارنوالس نے ان تمام اعتراضات کا جواب ایک یادداشت میں لکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۰ مارچ ۱۷۹۳ء میں ڈائرکٹروں کا یہ حکم آیا کہ بندوبست استمراری فوراً عمل میں لایا جائے۔ چنانچہ فوراً گورنر جنرل کی طرف سے اعلان ہوا جس کا حسب ذیل اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اینجانب مارکوئس کارنوالس گورنر جنرل باکونسل جو کہ آنریبل ڈائرکٹران کمپنی کی طرف سے کمپنی کے امور کا انتظام کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اور اینجانب صوبہ بنگال بہار اور اوڑیسہ کے تمام زمینداروں اور تعلقداروں اور زمین کے حقیقی مالکوں کو مطلع کرتے ہیں کہ مالگزاری جو دس سالہ بندوبست کی رو سے قائم کی گئی وہ شرح ہمیشہ کے لئے رہے گی۔"

بندوبست استمراری بنگال کے کل صوبہ میں نافذ ہو۔ اور چند ان اضلاع میں بھی جو صوبہ متحدہ میں ہیں مثلاً غازیپور، جونپور اور بنارس اور مرزاپور کے کچھ حصہ میں۔ بعد میں جو بندوبست ہوئے وہ میعادی اصول پر ہوئے۔ اور کسی صوبہ میں تو زمینداروں کے ساتھ اور کسی صوبے میں براہ راست کاشتکاروں کے ساتھ ہوئے۔ اور وہ غلطی جو بنگال میں ہوئی تھی کہ فرضی اشخاص کے ساتھ بندوبست کیا گیا اس کا خاص طور پر لحاظ کیا گیا۔ اور اس امر کی کوشش کی گئی کہ بندوبست اصلی مالکوں کے ساتھ کیا جاوے۔

جعفری



کرما

ایک بین الاقوامی فلم پر منظوم ریویو

ہو گئے تھے سات آٹھ مہینے   کرما کرما سنتے سنتے
انگلستان سے تار آتے تھے   با تصویر اخبار آتے تھے
ہر اخبار تھا اس کا مظہر   ہے یہ فلم نہایت بہتر
ہور اور اردو دیکھنے آئے   ظاہر کی پھر اچھی رائے
جس نقاد نے بھی دیکھا   ہر اک سین پہ صاد کیا
خاص اختر دیویکا رانی   حسن و ادا میں ہے لاثانی
دیکھ کر اس کے رنگ نرالے   حیرت میں ہیں لندن والے
القصہ یاروں نے بالکل   تعریفوں کے باندھ دیئے پل

ختم ہوا جب موسم سرا   دہلی میں بھی آیا کرما
اخباروں نے شور مچایا   کرما آیا۔ کرما آیا
لوگ بہت بیتاب تھے سارے   دوڑ کے پہنچے شوق کے مارے
خاص بھی پہنچے عام بھی پہنچے   رام بھی پہنچے شام بھی پہنچے
مسٹر ٹامس کنگ بھی پہنچے   اور نردتم سنگھ بھی پہنچے
شبیر محمد خاں بھی پہنچے   اور عبد الرحمٰن بھی پہنچے
عصمت اور اسلم بھی پہنچے   ساتھ ان سب کے ہم بھی پہنچے
بھر گیا سارا ہال کھچا کھچ   پھر بھی بہت سے لوگ گئے پہنچ
رائے صاحب، رائے بہادر   سر، دیوان، سوامی، ٹھاکر
اونچے اونچے کاموں والے   لمبے لمبے ناموں والے
راجہ اور نواب بھی سارے   تھیٹر ہال میں آن براجے
وائسرائن۔ وائسرائے   اور سر آغا خاں بھی آئے
خود بھی ہمنسو اور دیویکا   دیکھنے آئے اپنا تماشا

کرما کے آغاز سے پہلے   تصویر اور آواز سے پہلے
دیویکا اسٹیج پہ آئی   اپنی اصلی شکل دکھائی
دبلی پتلی۔ ہلکی پھلکی   نازک سی اک ٹہنی گل کی
یہ تو کہوں کیونکر حسین ہے   البتہ بدشکل نہیں ہے
آنکھیں ہیں بے شبہ رسیلی   ہے آواز بھی خوب سریلی
لطف دکھایا جنبش لب کا   موہ لیا دل اس نے سب کا

ختم ہوئی جب نغمہ باری   آئی اصل فلم کی باری
پہلا منظر سامنے آیا   سب کے دل کو خوب یہ بھایا
گو نا عمدہ منظر دلکش   تھا یہ سین سراسر دلکش
لیکن اس کے بعد ہوا کیا   اس کی شرح : کرنا اچھا

راج کمار شکار پہ جائے   یا وہ اپنا بیاہ رچائے
دونوں اتنے لمبے منظر   آنکھ اور دل رہ جائیں تھک کر
ہر ٹکڑا پھر پھر دہرانا   بالکل اس کا لطف مٹانا
راج کمار کا چلنا پھرنا   ہلنا جلنا، اٹھنا گرنا
پیدل چل کر آگے بڑھنا   اور مچان کے پیڑ پہ چڑھنا
جا کر اک جنگل میں پھنسنا   راہ میں سانپ کا اسکو ڈسنا
القصہ ہر عیب اور خوبی   تھی مصنوعی رنگ میں ڈوبی
اصلیت کا نام نہیں تھا   داد کے قابل کام نہیں تھا
حیرت ہے کہ ہمنسو رائے   اس پر بھی ایکٹر کہلائے

پرچھائیں حبشی اور سادہ ننگی   حرکت ناقص اور بے ڈھنگی
شکلیں سب کی بھونڈی بھدی   ناٹک اور کھیل نہایت ردی

دکھلایا اک خاص سپیرا　　جس کا تھا جنگل میں ڈیرا
شکل سے اسکی صاف تھا ظاہر　　فن میں اپنے نہیں ہے ماہر
کیونکر سمجھیں اس کو دیانا؟　　آئے نہ جس کو بین بجانا

٭

دیویکا کا مندر جانا　　دو گھنٹے میں مندر جانا
کیا آنے کیا جانے والا　　ہر اک سین تھکانے والا
کرنا میں اظہار محبت　　یورپ پر بھی لے گیا سبقت
عورت مرد کے اوپر چڑھ کر　　چومے چاٹے حد سے بڑھ کر
جوشش، اصلیت اور نہ گرمی　　صرف اک اظہار بے شرمی
پوچھے کوئی اہل وطن سے　　یا اس فلم کے صاحب فن سے
کیا ہندی تہذیب یہی ہے؟　　جو اس میں دکھلائی گئی ہے
اہل یورپ میں یہ مشاغل　　ہیں ان کی تہذیب میں داخل
گھر میں ہوں یا شہر میں گھومیں　　عورت کو جب چاہیں چومیں
مشرق میں یہ ریت نہیں ہے　　یاں بے شرمی ریت نہیں ہے
مبہم ہے تصویر بے باکی　　ہندی عورت شرم کی پتلی
مانا فرق نہیں فطرت میں　　آڑ تو ہے خلوت جلوت میں
خلوت کو بے پردہ کرنا　　ہے فطرت کو رسوا کرنا
ہندی میں عام نہیں جو منظر　　لائے جائیں کیوں پردے پر!

٭

اور وہ اصلی راج کماری　　سیدھی سادی سی بیچاری
ہونی چاہئے تھی یہ سہیلی　　ہنس مکھ، چنچل اور البیلی
لیکن وہ پتھر کی مورت　　مورت کی بھی روتی صورت

٭

اور دیوان شرر ملتانی　　مونچھ سفید اور منہ پہ جوانی

٭

کوئی اچھا پارٹ نہ دیکھا　　حسن نہ دیکھا آرٹ نہ دیکھا
دل کو کچھ نہ ہلانے والے　　جوشش نہ مطلق لانے والے
کچھ نہیں اس میں حیرت خیزی　　اور نہ کہیں ہیجان انگیزی
ہنسنا رونا پیار لگاوٹ　　ہر اک بات میں صاف بناوٹ
رنگ دکھاتی جو دیویکا　　ثابت ہوتا بالکل پھیکا
وہ روتی تکلیف میں پڑ کر　　ناظر رہ جاتے تھے ہنس کر
خواہ کوئی ہنستا یا روتا　　کچھ نہ اثر جذبات پہ ہوتا

٭

گورا ہے گو اس کا شوہر　　دیویکا میں ہے کچھ جوہر
کاش کوئی اچھا سا ایکٹر　　یا کوئی ماہر ڈائرکٹر
اس جوہر کو کام میں لاتا　　دھندلے تارے کو چمکاتا

٭

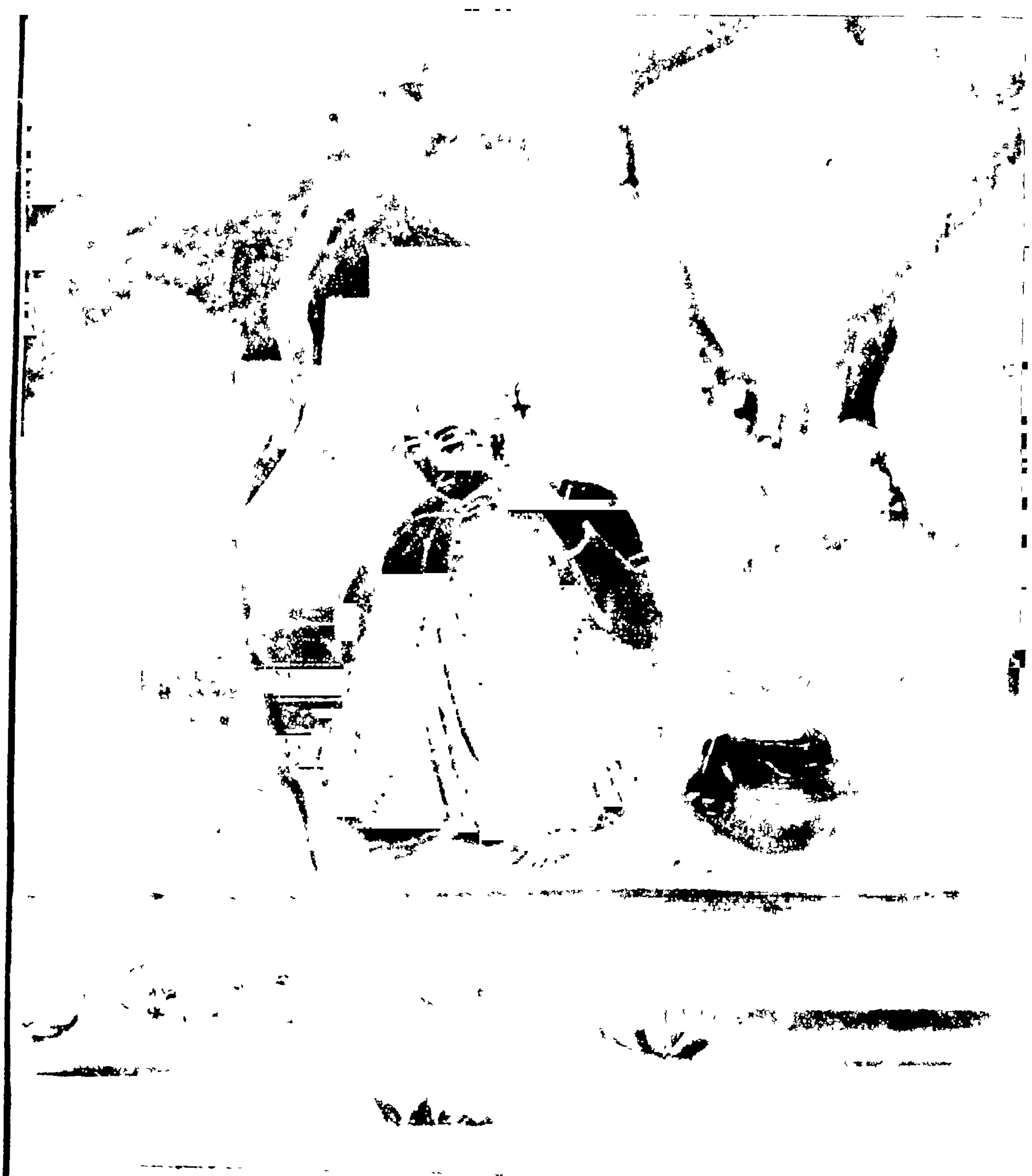
حیرانی ہے یورپ والے　　ہوگئے کیوں اسکے متوالے
شاید یہ جنگل کے منظر　　کٹیا اور محل اور مندر
راجا جی کی خاص کچہری　　ہاتھی، شیر اور سانپ، گلہری
جوگی سادھو اور سپیرے　　راج کمار کے خیمے ڈیرے
ہندوستان کے باجے تاشے　　دہقانوں کے کھیل تماشے
انگریزوں کے دل کو بھائے　　اپنے بچوں کو بھی دکھائے
چونکہ زباں بھی تھی انگریزی　　بڑھ گئی اور بھی دل آویزی
یا پھر ہند کو فول بنایا　　سب کو غلط رستے پہ لگایا

٭

دیکھ کے فلم ہوا اب ٹھنڈا　　غوغا، شور، پروپیگنڈا
کوئی پلاٹ نہ کوئی کہانی　　ہر پھر کے دیویکا رانی
واہ دیویکا واہ ہمانسو　　سب کو خوب بنایا الو
جو بھی ہال سے آیا باہر　　شعر یہی تھا اس کی زباں پر

”شور بہت سنتے تھے دل کا
چیرا تو کچھ خون نہ نکلا“

دہلی ۷ر فروری ۳۴ء　　اسد ملتانی



(۴)

قلمی فرس نامہ حضرت رنگین

از حضرت مولانا ورد کاکوردی

سعادت یار خاں رنگین سنہ ۱۱۶۹ھ میں بمقام سرہند پیدا ہوئے، مرزا طہماسپ بیگ خاں تورانی کے بیٹے تھے، دلی میں نشو و نما پائی، شہسواری، تیر اندازی اور گھوڑوں کے علاج و شناخت میں کامل تھے، شعر و سخن سے فطرتاً دلچسپی تھی ابتدا میں شاہ حاتم سے مشق سخن کی تھی، مزاج میں شوخی، طبیعت میں غیر معمولی جدت تھی، ریختہ سے ریختی نکالی، انھوں نے سنہ ۱۲۵۱ھ میں انتقال کیا، مجموعہ تصانیف کا نام نورتن ہے، اردو میں چار دیوان ہیں، ۱ ریختہ ۲ بیختہ ۳ آمیختہ (یہ مجموعہ ہزلیات ہے جس میں شیطان کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ ہے) ۴ انگیختہ (ریختی کا دیوان ہے) اس کے علاوہ مثنوی دلپذیر، مجالس رنگین، رنگین نامہ، فرس نامہ بھی ان کی بہترین تصانیف ہیں۔

تذکرہ گل رعنا میں حضرت رنگین کی تصانیف کو صراحت سے گنایا ہے مگر یہ نہیں لکھا کہ کون کون سی کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ہمارے پاس حضرت رنگین کا فرس نامہ قلمی موجود ہے جو مولوی عاشق علی رنا صاحب مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے اس کتاب میں پانچ فصلیں اور ۱۴۱ بیان ہیں جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱ حمد ۲ نعت ۳ مدح حضرت چاریار ۴ مناجات در جناب کبریا ۵ در بیان تمہید کلام و باعث این نسخہ ۶ در بیان صفت اسپان (سرخی نہیں لکھی مگر فصل کی ابتدا یہیں سے معلوم ہوتی ہے) ۷ در بیان بھونری آنسو ڈھال ۸ در بیان بھونری کنپٹی ہمیانی زر ۹ در بیان بھونری دیومن ۱۰ در بیان بھونری ہرداول ۱۱ در بیان بھونری کنارہ بغل ۱۲ در بیان بھونری گوم ۱۳ در بیان بھونری کھونٹی گاڑ ۱۴ در بیان بھونری کھونٹی اکھاڑ ۱۵ در بیان بھونری بیج پل ۱۶ در بیان بھونری ارپل ۱۷ در بیان بھونری سامن ۱۸ در بیان بھونری چتر پھنگ ۱۹ در بیان بھونری ڈنک اجاڑ ۲۰ در بیان حدیث شریف آمدہ و سوائے آن موافق رسم ۲۱ فصل دوم در بیان مذہ و سوتنٹرہ وغیرآن ۲۲ در بیان مونٹرہ ہا ۲۳ در بیان مذہ ہا ۲۴ در بیان زانو ۲۵ در بیان سرہڑی ۲۶ در بیان چکہ دل ۲۷ در بیان پشتک ۲۸ در بیان گپ ماکہ در پشتک دو انگشت فرق می شود ۲۹ در بیان بیضہ ۳۰ در بیان تھنی ۳۱ منی ۳۲ فصل سوم در بیان شناختن عیب ہائے صورت ۳۳ در بیان شتر دندان ۳۴ در بیان فتح پیشانی ۳۵ در بیان شناختن پریشان گوش می گوید ۳۶ در بیان شناختن تختہ گردن ۳۷ در بیان شناختن کاوشانہ ۳۸ در بیان شناختن زین پشت ۳۹ در بیان حیاتی سم ۴۰ در بیان خرسم ۴۱ در بیان مرغ پا ۴۲ در بیان ہتر ۴۳ در بیان شناختن پلچ ۴۴ در بیان شناختن کشادہ رو ۴۵ فصل چہارم در بیان شناختن عیب و رنگ ۴۶ در بیان ستارہ پیشانی ۴۷ در بیان بنل ۴۸ در بیان قشقہ ابرو ۴۹ در بیان عقرب ۵۰ در بیان طاقی ۵۱ در بیان چقر ۵۲ در بیان گلدستہ ۵۳ در بیان دست چپ ۵۴ در بیان پدم خالدار ۵۵ در بیان ارجل ۵۶ در بیان سور و سنجاب ۵۷ در بیان رنگ اسپ ۵۸ فصل پنجم در بیان شناختن عیب شرعی معترف اصطلاح دلالاں ۵۹ در بیان کہنہ لنگ ۶۰ در بیان کری ۶۱ در بیان کم خور ۶۲ در بیان دنداں گیر ۶۳ در بیان شب کور ۶۴ در بیان اسپ خوب کہ در اقلیم ہند کدام جا باشد ۶۵ در بیان شناختن سن و سال اسپان ۶۶ در بیان معالجہ اسپان ۶۷ در بیان شناختن بیماری اسپ کہ چہارم قسم ست ۶۸ در بیان شناختن بیماری اسپ ۶۹ در بیان اسپ ۷۰ در بیان بادی ۷۱ در بتانہ سرخ ۷۲ در بیان چنی سیاہ ۷۳ در بیان شناختن اسپ از پیشاب ۷۴ در بیان شناختن بیماری از سرگین اسپ ۷۵ در بیان طیارہ بچہ اسپ ۷۶ ترکیب دادن مرتع ۷۷ ترکیب دادن راتب ۷۸ در بیان ترکیب زردچوب ۷۹ ترکیب دادن

خیبہ ... ترکیب دادن منزا اسپ ۸۱ حسب ... عیب آوردن بچھرا ۸۲
در بیان داغ چارسد ۸۳ ترکیب دادن کالیل اسپ ۸۴ در بیان شناختن
بیماری کرکری کہ بر شب قسم می شود ۸۵ کرکری اول کہ از باعث بند شدن
پیشاب می شود ۸۶ کرکری دویم کہ از باعث بند شدن لید می شود ۸۷
کرکری سوم کہ از باعث سول می شود ۸۸ کرکری چہارم کہ از فراموش شدن
باد می شود ۸۹ کرکری پنجم کہ از باعث ورم ... می شود ۹۰ کرکری ششم
کہ از باعث ... در فوطہ اسپ می شود ۹۱ کرکری ہفتم کہ باعث بند
شدن شکم می شود ۹۲ کرکری ہشتم کہ از باعث درد قولنج اسپ ۹۳
در بیان چانگی زدن ۹۴ در بیان سینہ بند اسپ ۹۵ در بیان سفر موسم
گرما ۹۶ در بیان سفر موسم سرما ۹۷ در بیان خون پیشاب کردن اسپ
۹۸ در بیان تیلی چوٹ اسپ ۹۹ در بیان بیماری بوغما ۱۰۰ در بیان خلل
آمدن پیٹھ اسپ ۱۰۱ در بیان خارشت اسپ ۱۰۲ در بیان بیماری الگن باد
۱۰۳ در بیان بال جر ۱۰۴ در بیان کوت گیر ۱۰۵ در بیان پے اسپ ۱۰۶ در
بیان رس ۱۰۷ در بیان کنار اسپ گوید ۱۰۸ در بیان پیچ ہائے گوید ۱۰۹ در بیان
ورم پشت اسپ ۱۱۰ در عمل زخم پشت اسپ ۱۱۱ در بیان شستن زخم سم
اسپ ۱۱۲ در بیان افتادن کرم در زخم ۱۱۳ در بیان زخم سخت ۱۱۴ در بیان
خشک کردن زخم ۱۱۵ در بیان موئے بر زخم اسپ ۱۱۶ در بیان موترہ گوید۔
۱۱۷ در بیان تولد بچھڑہ ۱۱۸ در بیان آختہ کردن بچھڑہ ۱۱۹ علاج ضرب
اسپ کہ در رسیدہ باشد ۱۲۰ در بیان بیرحذی اسپ ۱۲۱ در بیان
اسپ کہ جو لے نداشتہ باشد ۱۲۲ در بیان دہانس اسپ گوید ۱۲۳
در بیان مصالح چر یعنی خوردن بسیار اسپ ۱۲۴ در بیان ہضم شدن
ہیلہ اسپان ۱۲۵ در بیان سلسل بول اسپ ۱۲۶ در بیان سہ اسپ
۱۲۷ در بیان زخم تنگ اسپ ۱۲۸ در بیان اسپ شیردم ۱۲۹ در بیان
مشیر شدن اسپ بہ بادی و شناختن اسپ دامی و بادی ۱۳۰ در بیان
سون مادہ بچہ، بزرگ بچہ گرفتن ۱۳۱ در بیان اسپ سوختہ از آتش خواہ از
بارود ۱۳۲ در بیان بیماری نیش یعنی مرض سفید داغ کہ بر لب و دہن اسپ
می شود ۱۳۳ در بیان علاج ہتنی یعنی پستان اسپ گوید ۱۳۴ در بیان دور
کردن برسوزی یعنی زہر ... ۱۳۵ در بیان دور کردن عقرب و ستارہ
وغیرہ ۱۳۶ در بیان دور کردن پشتک یا چکاول از دست و پائے اسپ
گوید ۱۳۷ در علاج پتی اسپ ۱۳۸ در علاج باچہ اسپ ۱۳۹ در بیان
راتب حلوہ ادرک کہ بہ بچھڑہ خوردن اسپ نیز برابر نفع می کند ۱۴۰ ترکیب
دادن کھیر عوض دانہ ۱۴۱ در بیان بیماری بدنام ۱۴۲ در بیان بند کردن
خون از زخم اسپ می گوید

فرس نامہ کی حمد سے یوں ابتدا کی ہے۔

حمد

خدا کی حمد کب مجھ سے رقم ہو — رواں جب تک نہ شید بز قلم ہو
کہاں قدرت قلم نے اتنی پائی — کہ یہ اس کی کرے صنعت نمائی
سب اس وادی میں آ اچپا گئے ہیں — فرس کو وہم کے ڈپٹا گئے ہیں
مری کب حمد کے قابل زباں ہو — یہ خود کیا ہے اور اسکا کیا بیاں ہو
کوئی ہر چند دھیان اس کا لگائے — پتا مشئے کنہ کو اسکی نہ پائے
تحیر یاں فہم کا چلتا نہیں ہے — یہاں کچھ عقل کا چلتا نہیں ہے

انسانی عقل آزادی مشہور ہے مگر انسان کی عقل جہاں آ کر جھک جاتی ہے وہ بندگی ہے اس کو اس طرح بیان کرتے ہیں حمد میں اس سے بہتر شعر نہیں ہے ؎

بھلا پھر ہوسکے کیونکر رسائی — کہاں بندہ بندگی اور خدائی

نعت

نعت میں فرماتے ہیں:۔

لکھوں میں نعت اسکی کیونکر ساری — براق ارنی ہے اک جسکی سواری
فلک سے بھی بڑا ہے اسکا پایا — کہ سب کچھ جس کی خاطر ہے بنایا
بظاہر گرچہ وہ امی تھا لیکن — بھرا تھا علم سے کل اس کا باطن

مدح حضرت چار یار

پیمبر جان تھا ان سب میں لاریب — وہ عنصر چار تھے ہر چار بے عیب
بس ان کا دوست بے شک جنتی ہے — عدو ان کا مقرر دوزخی ہے

اس کے بعد مناجات ہے جس میں سچے جذبات کی جھلک نمایاں ہے

مناجات

دیا ہے تو نے یارب مجھکو سب کچھ — طلب کرتا نہیں میں تجھ سے اب کچھ

مگر اک آرزو میری بڑی ہے   کہ مشکل سخت وہ مجھ پر پڑی ہے
سو اس کے ہیں اب مجھکو یارا   کروں منت اپنی کروں تجھ سے دوبارا
سو اس دھوکے کو اب اپنے چھوڑ کر   سو وہ میں مانگتا ہوں تجھ سے وہ کر
یہاں سے مجھکو با ایمان اٹھانا   وگرنہ کچھ نہیں میرا ٹھکانا
الٰہی کر قبول اس مدعا کو   اجابت کے لگا پر اس دعا کو

فرس نامے کے متعلق تمہید میں لکھتے ہیں کہ پہلے نیئر تھا گردش روزگار سے تنگ آ کر لکھنؤ پہنچا اور وہاں محمد بخش نامی ایک شخص سے ملاقات ہوئی جس کی دوستی کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے کہ محمد بخش صاحب نے میرا دیوان دیکھا جس میں نثر فرس نامہ شامل تھی چونکہ محمد بخش صاحب کو گھوڑوں کے علاج وغیرہ سے کافی دلچسپی تھی، اور شعر و سخن سے بھی ذوق تھا اس لئے انھوں نے نثر فرس نامہ کو نظم کرنے کو کہا، میں نے بہت عذر کیا، مگر جب ان کا اصرار حد سے گذر گیا، تو نظم کر دیا اس واقعہ کے منتخب اشعار یہ ہیں ۔ ؎

یہ دھیان آیا کہ دنیا ہے یہ فانی   خدا جانے ہے کے دن زندگانی
عبث لہو و لعب میں یوں ہی نزات   کروں برباد کیوں میں اپنی اوقات
زن و فرزند سب دشمن ہیں جی کے   نہیں آتا کوئی آڑے کسی کے
اذیت جب بہت سی پائی میں نے   تو ہونا چار یہ ٹھہرائی میں نے
کہ گو پیسہ نہیں کچھ پاس توشہ   پر اب لازم یہی ہے لیجے گوشہ
یہ کہکر گھر سے نکلا جب سویا   پھرا مدت تلک صحرا بصحرا
رہا مدت تلک یوں خانہ بردوش   مجھے پھر ایک دن جو آگیا ہوش
تو میں نے یہ کہا دل سے بتکرار   کہ کب تک زندگی سے رہئے بیزار
کہاں تک جوشش مستی میں رہئے   بس اب چلئے کسی بستی میں رہئے
پھر اس جا تک میرا دھیان پہنچا   یکایک لکھنؤ میں آن پہونچا
میاں مجھو جو اک ان مہرباں تھے   تو اپنے سب طرح ہاں مہرباں تھے
محمد بخش نام ان کا ہے مشہور   میاں مجھو ہے عرف ان کا بدستور
خدا ان کو ہمیشہ شاد رکھے   غم و اندوہ سے آزاد رکھے
مجھے وہ دیکھکر ایسے ہوئے شاد   کہ پھر مطلق رہا ان کو نہ کچھ یاد
گئے لیکر وہ مجھکو اپنے گھر کو   رکھا لا میرے آگے مال و زر کو
غرض جہان کا تھا سو تھا وہ میرا   نہ تھا کچھ مجھ میں ان میں میرا تیرا

وہاں جو شے مجھے ہوتی تھی درکار   مہیا جن سے ہوتی تھی سو بار
غرض جب تک رہا میں اس جا میں   تو گویا تھا بہشت جاوداں میں
قضارا ایک دن جو وہ سخنداں   لگے پڑھنے اٹھا کے میرا دیوان
فرس نامہ نکل پہلے ہی آیا   نہایت طور اس کا ان کو بھایا
زبس گھوڑے سے ہے ان کو بہت ذوق   سواری کا غضب رکھتے ہیں وہ شوق
لگے وہ ہنس کے کہنے مجھسے یوں جی   کہ نثر اس کو لکھا ہے تم نے کیوں جی
ہماری خاطر اس کو کیجئے نظم   بہرصورت اسے کر دیجئے نظم
کہا میں نے مجھے جیتا تھا معلوم   کیا تھا نثر میں، میں نے یہ مرقوم
سو وہ کیا ہے جسے نظم اب کروں میں   یہی لازم ہے بس چپ ہو رہوں میں
مگر جب کہا مجھسے بہ منت   تو کی ان کے لئے میں نے یہ محنت
کیا خاطر سے ان کی عزم بالجزم   وگرنہ کچھ مرا مطلب نہ تھا عزم

اس کے بعد گھوڑوں کی قسمیں وغیرہ بیان کی ہیں ان سب کا انتخاب چھوڑ کر صرف چند ضروری اور کار آمد بیانات اور منظوم نسخہ جات کو بیان کر کے مضمون ختم کرنا چاہتے ہیں، آگ یا بارود سے اگر گھوڑا جل جائے تو اس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

کسی کا گر کہیں جل جائے گھوڑا   تو زخم اس کا بہت یا تھوڑا
عرق وہ پیاز کا گر اس پہ ملوائے   تو بس فی الفور اسے آرام ہو جائے
یہی انسان کی بھی ہے دوا یار   مکرر آزمایا ہے یہ سو بار

گھوڑے کے لب اور دہن پر سفید داغ پڑ جائیں تو اس کا علاج

کوئی گھوڑا اگر ہو پیش خانی   تو اس کی سن لو دوا مجھسے زبانی
کہ بیگن کاٹ کر پانی میں اک سال   یا تو اس کو رکھے خوب فی الحال
لگایا کر وہ پانی اس پہ ہر روز   تو گن کر آٹھ بار اے مرد دلسوز
یقین ہے بیس دن میں آمر جائے   وہ داغ اس کا نہیں بچنے کا زنہار
اسے میں نے بہت ہے آزمایا   نہیں ہر گز کبھی فرق اس میں آیا

طاقی گھوڑے کے بیان میں

سفید اک آنکھ جس گھوڑے کی ہووے   تو لازم ہے کہ مالک اس کا رووے
یہ سب کہتے ہیں یہ گھوڑا ہے طاقی   رکھے گا کچھ نہ گھر میں اس کے باقی

ایک پاؤں سفید ہونے کے بیان میں

کسی کا پاؤں گر ہووے سفید ایک   تو اس کو بھی نہ جانے یار تو نیک

پتیں ہے جو اپنے باٹیں کی کچھ قید / برا ہے وہ دو رنگ کچھ اس سے امید
اُسے پہچانتے ہیں لوگ سارے / اُسے بد جانتے ہیں لوگ سارے
سبب یہ ہے کہ ہے رجل دو کمیت / نہ لے اس کو ہے کا عیب با صحت
پیمبر نے کہا اس کو برا ہے / اب اس کے عیب میں تکرار کیا ہے

گھوڑے کی لید سے بیماری کی پہچان

اگر کرتا ہے پتلی لید گھوڑا / تو دانہ ہضم اس ہوتا ہے تھوڑا
نہایت اس میں آتی ہو گی بدبو / کبھی گر غور سے سونگھو گے تو
کہا تو مان میرا گر ہے دانا / نہ دے ہرگز کئی دن اسکو دانا
معالجہ کتنے دن دے اسکو ہیم / کہ تا ہو لید کی بدبو وہ برہم

گھوڑے کی کھجلی

اگر ہو کبھی گھوڑے کے خارشت / تو غافل مت ہو بیماری ہے یہ سخت
کئی دن باسی پانی سے جو دھوئے / تو البتہ کہ فرصت اس کو ہووے

گھوڑے کے دمن اتر آنا۔

کسی گھوڑے کے گر آوے اتر دمن / تو بہنے مت اُسے دمن بیٹھ جاوین
چھڑک اس پر نمک تھوڑا سا کھاری / کہ تا چندے وہ ہووے خوب جاری
پھر اس کو تو اگر چاہے کہ ہو بند / تو یہ اس کی دوا ہے اے خردمند
برابر لے تو چونا اور ہلدی / کھرل میں پیس کر پھر اس کو جلدی
بس اک دو تین دن کا ہے بکھیڑا / خدا چاہے تو ہو جاوے وہ اچھا
یہی ہے جان رکھ اس کی نشانی / نکلتا ہے سڑا پتلی سے پانی

زخم میں کیڑے پڑنا

اگر اس زخم میں کیڑے پڑے ہیں / تو پھر وہ یعنی چھوٹے یا بڑے ہیں
ملیم اور خشک تمباکو، کو تو چھان / پھر اس میں شوق سے بڑ کا ملا ان
پھر اس کو لیپ نا مٹی سے پیاسے / کہ اس میں پھنس کے وہ مر جائیں سبھی

زخم پر چھیڑا سخت ہونا

اگر ہو زخم پر چھیڑا کہیں سخت / تو یوں مت جان اسے ہے یہ تو ہی سخت
نمک اور گھی لگا اس پر کئی دن / مساوی دونوں چیزیں ہوویں لیکن

زخم خشک کرنا

جو چاہے زخم جلدی خشک ہو جائے / تو لازم ہے گدھے کی لید منگائے
سکھا کر پیس اس کو خوب باریک / چھڑک اس پہ کئی دن تا کہ ہو ٹھیک
چھڑک یا اونٹ کی پیلی جلا کر / کرے اچھا کرے اس کو سکھا کر
دیا جوتی کا چمڑا سے جلانا / کرے اس میں ہرگز نہ کچھ بہانا
جَسے بھی پیس کر چھڑکے اسی طور / یقیں ہے خشک ہو جاوے وہی فور
دیا میری ملا کر خوب پسوائے / لگا دے اس پہ تا وہ خشک ہو جائے

٭

ہم نے ناظرین کی دلچسپی کے لئے ہدایات اور نسخہ جات والے کچھ اشعار نمونے کے طور پر پیش کر دیئے، اگر کوئی صاحب بغرض جمع اس کی نقل لینا چاہیں تو خط کتابت کر سکتے ہیں۔ فرس نامے کے آخری اشعار یہ ہیں ؎

وہ نسخے تھے جو میرے آزمائے / سو میں نے تجھ کو وہ سب کہہ سنائے
کیا ہے بیس دن میں اسکو مرقوم / یہ ہے تعداد اس کی تجھکو معلوم
ہزار اس کے ہیں پورے شعر جانی / تجھے ہے گنتی اس کی کہہ سنانی
یہ ہے رنگین سے جانی یادگاری / دوائی گھوڑے کی جو تجھے پیاری

٭

اس کے بعد یہ عبارت (ختم پر) لکھی ہوئی ہے۔

"تمت، تمام شد فرس نامہ تصنیف میاں رنگین از خط محمد عاشق علی علوی ساکن ککوری واقع تاریخ بست و چہارم رجب المرجب ۱۲۷۱ ہجری مطابق مارچ ۱۸۵۵ عیسوی بمقام تاج گنج متعلقہ ضلع آگرہ"۔

اس وقت ہجری ۱۳۵۱ میں اس حساب سے اس کو ۸۰ سال اور عیسوی ۱۹۳۲ کے حساب سے ۷۷ سال ہوتے ہیں۔

فرس نامے کی بعض اصطلاحوں کی تشریح

بھونری۔ بالوں کا چکر جو آدمی یا گھوڑے کے جسم پر ہو، گھوڑوں کے ماتھے کے ہوئے بال جس سے وہ منحوس سمجھا جاتا ہے۔

آنسو ڈھال۔ گھوڑوں کی بیماری جس میں آنکھ سے پانی آنسو کی طرح بہتا ہے۔

بھونری کنٹھی جیمانی نر۔ گلے کے نیچے کی بھونری۔

بھونری بردادل۔ سینے والی بھونری۔

بھونری کنارہ بغل۔ بغل والی بھونری۔

بھونری گوتم۔ پیٹ والی چھوٹی بھونری

بھونری کھونٹی گاڑ۔ اگلے پیروں کی بھونری جس کا رخ نیچے ہو۔

بھونری کھونٹی اکھاڑ۔ سمہ والی بھونری۔

بھونری پیچ ال۔ گھوڑے کے بازو کی بھونری۔
بھونری ابرتی۔ پشت یا کانوں کے جڑ کی بھونری۔
بھونری ساپن۔ بال کے جڑ والی بھونری۔
بھونری چتر مکھ۔ زین کے نیچے والی بھونری۔
بھونری ڈنک اجازہ۔ پونے کی بھونری۔
نمدہ۔ جوڑ سے ہڈی نکلنا
مونسرہ۔ کنپٹی کے اندر کی رگوں کا پھول جانا۔
زانوا۔ آگے کے گھٹنوں میں جوڑ سے ہڈی نکلنا۔
بیر ہڈی۔ نلی والی ہڈی۔ ہڈی پر ہڈی نکلنا۔
چکاوتی۔ سم کی اتنی موٹائی کہ رنگ کا اثر ظاہر ہو۔
پشتنگ۔ گھوڑے کی دولتی، بھوں کے موٹے بال۔
کیاں۔ کانا
گلدستہ۔ آگے کا بایاں پیر سفید
تھنی۔ گھوڑے کی بیماری، پوست میں کیڑے پڑ جانا۔
تختہ گردنیا۔ موٹی گردن کا گھوڑا۔
گاوشانہ۔ اونچی شانہ
زین پشت۔ پیٹھ کا خم۔
حیاتی سم۔ پتلے سم۔ ناقص سم۔ یعنی پہ تل سول۔
خرسم۔ گدھے والے سم۔
مرغ پا۔ سیدھے پاؤں والا گھوڑا۔
تبرہ۔ نکھوں ٹا۔

کیلچ۔ بالوں سے گھٹنے تل جانا۔
تل۔ پیشانی کا بڑا ستارہ (نشان)
چتکرہ۔ گھوڑا آدم چشم۔
پدم۔ خالدار۔ سفیدی میں تل۔
ارجل۔ گھوڑا ایک پاؤں سفید۔
سوروسنجاب۔ سیاہی مائل خاکی رنگ خودرنگ گھوڑا۔
نیش خانی۔ لب ودہن پر سفید داغ۔
چینی سیاہ۔ گھوڑے میں حد سے زیادہ لالی اور سیاہی۔
کلہ۔ جبڑا
کٹرکٹری۔ گھوڑے کا دم بدم تنا۔
کن باد۔ گھوڑوں کا وہ مرض جس میں کھال ادھڑ جاتی ہے، اور روئیں اڑ جاتے ہیں۔
کف گیرا۔ پنڈلی کا بڑھا ہوا گوشت۔
مہیلہ۔ گھوڑوں کا ابلا ہوا دانہ۔
بادی۔ گھوڑے کا قدان پر بندھے بندھے ہڈی نکال دینا۔ بادی میں بھر جانا۔
باچہ اسپ۔ ہونٹوں کے کونوں کا پک جانا۔
بوخما۔ وہ بیماری جس میں گھوڑے کے تمام اعضاء سے پسینا ٹپکتا ہے۔

ناچیز
درد کاکوروی

ٹوٹا ہوا کھنڈر

از جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی سابق مدیر ادیب الہ آباد

اے کھنڈر! تیرا ادب اک خلق کے ہے دلنشیں — تو کبھی تھا وجہ عز و جاہ و اجلال مکیں
تیری اس حالت میں بھی اک شان آتی ہے نظر — تو ہے اپنی شانِ ماضی کا نشانِ بہترین
تجھ میں از خود رفتگی بھی اور محویت بھی ہے — صرف اہلِ دین کی سادہ مزاجی ہی نہیں
ہر پرانی چیز کو دنیا سمجھتی ہے عزیز — یادگارِ دورِ اول جانتی ہے بالیقیں
تو بھی ہے ٹوٹا ہوا ایوانِ کہنہ کا کھنڈر — اس لئے عزت تری ہے سب کے دل میں جاگزیں
جس طرح اللہ والوں کی زیارت کے لئے — لوگ جاتے ہیں سمجھ کر ایک کار بہترین
اس طرح تیری زیارت کیلئے بھی شوق سے — لوگ آتے ہیں ادب کرتے ہیں تیرا بالیقیں
تو جہاں ہے گو وہاں حسرت برستی ہے مگر — پھر بھی نظریں ہیں کہ تیری سمت سے پھرتی نہیں
دیکھتے ہیں سب عقیدت کی نگاہوں سے تجھے — دامن آنکھوں سے لگاتے ہیں ترا انجام بیں
تیری خاموشی سبق دیتی ہے جس عنوان سے — مدرسہ اور وعظ کی مجلس سبق دیتی نہیں
جس طرح کوئی جوانی میں رہا ہو پُر خطا ق — ہو گیا تائب ہو پیری میں وہ ہو کر شرمگیں
پھر ریاضت اس نے کی ہو اس قدر شام و سحر — ہو گیا ہو پاک باطن، پاک طینت، نیک بیں
منہدم ایواں! ہے تیری بھی تو ویسی ہی مثال — کبر وہ تجھ میں نمائش کا نظر آتا نہیں
تجھ میں اخلاقی برائی تھی کبھی پر اب کہاں — دور اپنے عیب تو نے کر دئے اے دوربیں
ہو گیا اب پاک باطن کی طرح سے تو بھی پاک — اب سیہ کاری کے دھبے تیرے دامن پر نہیں
تیرا در اب بند بد اخلاقیوں پر ہو گیا — تجھ میں اب ہونے نہ پائے گی بد اخلاقی کہیں
اب وہ بدمستی تری وہ خود پرستی ہے کہاں — چھپتیں اب تجھ میں بے شرمی کی کب ہیں جاگزیں
عبرت انگیز اب ہے خاموشی تری ان [illegible] — جن دماغوں میں یہ سودا تھا کہ ہم فانی نہیں
ان بزرگوں کی دلاتا یاد ہے تیرا سکوت [illegible] — [illegible] فانی جہاں سے تھے ہمیشہ جو حزیں
ہو گئے ہیں اب ہمیشہ کے لئے خاموش [illegible] — [illegible] ہیں پاؤں پھیلائے ہوئے زیر زمیں
تیری تنہائی تری سنسان حالت دیکھ [illegible] — [illegible] تے ہیں وہ عزلت گزیں خلوت نشیں
ترک دنیا کو جنہوں نے کر دیا ہے دیکھ کر — [illegible] دنیا کے ثمر میں کوئی لذت ہی نہیں
بھول جاتے تھے خدا کو عیش و عشرت میں جو لوگ — [illegible] کھنڈر! اب وہ نہیں سکتے ہیں وہ تجھ میں مکیں
ان چھتوں کے نیچے اب بدکاریوں کا وہ سماں — جن سے دل شرمندہ ہو جائے نظر آتا نہیں

اب قدم رکھیں گے وہ تجھ میں بہت ڈرتے ہوئے
ہوں گے تجھکو دیکھ کر خوفِ خدا سے ہمگیں

تو نشیمن جن کا ہے اب وہ بھی دنیا سے نفور
تیری ہی مانند ہیں، ویرانۂ عزلت گزیں!

ہیں ابابیل اب تو تجھ میں جاگزیں شام و سحر
اور مسند کے تیری یہ ہو گئے ہیں جانشیں

اے کھنڈر! ہیں تجھ میں یہ طائر ہی اب تسبیح خواں
اُس خدا کے جس کا ہے یہ آسمان اور یہ زمیں

دیکھ لینا ہی انھیں کافی ہے عبرت کے لئے
ہیں بھرے جن کی صدا سے گوشِ عقل و دیں

کرم خوردہ تو ورق تاریخ کا ہے اے کھنڈر
جھلملاتی شمع سے نظارہ تیرا کم نہیں

ہیں ترے نقش و نگار اب تو مٹے گھستے ہوئے
تھے کبھی لیکن جوابِ نقشۂ خلدِ بریں

کنگرے تیرے شکستہ منہدم ہیں کس لئے
ہے یہ جرمِ سرکشی تجھکو خبر اس کی نہیں

سر اٹھایا تھا، انھیں نیچا دکھایا دہر نے
آسماں سمجھے تھے خود کو، کھا گئی ان کو زمیں

تو ہے عبرت کا مرقع ہے نصیحت کا ورق
تیرا کیا کہنا کھنڈر، ہستی پہ تیری آفریں

سرگذشت اُن سرکشوں کی تو سناتا ہے ہمیں
جو سمجھتے تھے کہ دنیا بھر میں ہیں سب کچھ ہمیں

خود پرستی کے وہ سب سامان اُن سے چھن گئے
اب ہے اصلیت، وہ سامان نقل کے باقی نہیں

اب نہیں وہ چند روزہ جاہ و ثروت کا غرور
اب وہ بدمستی نہیں ملتی ہے ڈھونڈے سے کہیں

اب کہاں تجھ میں کھنڈر! وہ جاہ و حشمت منجلی
شان و شوکت وہ تری اب دفن ہے زیرِ زمیں

شاکر (میرٹھی)



(۵)

مخدوم نظام الدین قاری دانشمند

از قلم جناب منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔ ڈپٹی کلکٹر

حضرت مخدوم نظام الدین قاری المعروف بہ شیخ بھکاری و شیخ بھیکہ سید علوی تھے (اولاد حضرت محمدؐ بن حنفیہ خلف جناب امیر علیہ السلام سے) حضرت مخدوم کے بعض خلفاء کے شجروں میں آپ کا اسم گرامی شیخ بھکاری درج ہے، اور آپ کے خلیفہ رشید مخدوم عبد الکریم اپنے عطا کردہ شجروں میں آپ کی طرف "پیر دستگیر بیدی" حضرت شیخ بھیکہ" سے اشارہ کرتے تھے،" شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے کشف المتواری میں لکھا ہے کہ:۔

"در فرامین پادشاہی کہ درباب مدد معاش بودند بعضے جا شیخ بھکاری نوشتہ دیدم مگر در کاکوری فقط بنام شیخ بھیکہ مشہور اند"

تلاش سے ایک فرمان حال میں دستیاب ہوا ہے جو دربار اکبری سے ۹۸۲ھ میں حضرت مخدوم کی وفات سے ایک سال بعد جاری ہوا تھا اور اس میں آپ کا نام و لقب۔

"نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند"

درج ہے، یہ فرمان کم توجہی اور مرور دہور سے کرم خوردہ ہو گیا ہے لیکن جس قدر حصہ پڑھا جا سکتا ہے نذر ناظرین کیا جاتا ہے:۔

"موازی یک ہزار و ہشت صد بیگہ زمین از مواضع ضمن از پرگنہ کاکوری من اعمال سرکار لکھنو بموجب فرامین در مدد معاش فضائل مآب کمالات اکتساب قاری آبائی نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند و شیخ عبد الجلیل نبیرہ مشار الیہ مقرر بود و مشار الیہا ودیعت حیات سپردہ و ترکہ مذکورہ بجانصر تکر لیفہ انتقال یافتہ و دین ولاکہ اولاد و بنا بر ایشان بعد گاہ خلائق پناہ آمدہ فضیلت ایشان بوضوح پیوست و معلوم شد کہ بقدر ہفت صد و بست و پنج بیگہ بموجب فرمان عالیشان علیحدہ الیہ کہ مرکدام از مرکاد عبرآباد با کم بنا بر مشار الیہ مقرر است ـــــــ دیگر چیزے نداند وخب استحقاق و کفاف ایشان حکم دادم کہ سوائے ہفت صد و بست و پنج بیگہ زمین مذکورہ من ابتدائے ـــــــ موازی یکہزار و ہفت صد بیگہ زمین مزروعہ بدستور سابق در وجہ معاش اولاد بنا بر و غیرہ و غیرہ مرومین مذکورین بموجب ضمن میفرمایند حاصلات از سال بسال صرف معیشت خود نمودہ بدعائے از دیاد دولت آید مدت قیام نمائند می باید کہ حکام و متصدیان مہمات سرکار لکھنو ـــــــ و صاحب اہتمام ـــــــ و کارکنان حال و استقبال آں پرگنہ برین موجب مقرر و معین واشتہ زمین مزبورہ را بدستور سابق بتصرف ایشان بگذاشتہ ـــــــ و در استمرار و استقرار این حکم کوشیدہ تغیر و تبدیل بحال راہ ندہند و تعیین موجبات و اخراجات و عوارضات چوں قلعہ و پیشکش ـــــــ ـــــــ دو ہم و ـــــــ تا ـــــــ و باغات و محترفہ و کل تکالیف دیوانی ـــــــ نہ نمائند ـــــــ مطالبات معاف و مسلم ـــــــ محتاج نہ نمائند دریں باب تقاضا دانند

تحریر فی التاریخ ۱۱ شہر شوال ۹۸۲ھ

(بر پشت) مہر اکبر بادشاہ

غرض حضرت مخدوم کا اسم گرامی نظام الدین عرف شیخ بھیکہ اور بسبب فضل و کمال کے لقب دانشمند تھا اور آبائی قاری تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب یہ ہے:۔ مخدوم نظام الدین قاری بن قاری امیر سیف الدین بن واسطہ بن قاری محمد صدیق المعروف بہ بابو محمد خانی بہ واسطہ بن قاری عبد المجید بن حاجی سلطان حسین بن قاری امیر ابراہیم نبیرہ و خلیفہ سید عبد الرزاق خلف و خلیفہ حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی بہ وسائط بن قاری احمد بن علی بن محمدؐ بن الحنفیہ بن اسد اللہ الغالب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہٗ



اعلیٰ حضرت میر عثمان علیخان شاہ دکن

یہ مسلم ہے کہ مخدوم صاحب موصوف کے اجداد حضرت محمد بن حنفیہ کے عہد تک ملک عرب میں مسکن گزیں رہے، لیکن یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے کس نے اول بار عربستان کی سکونت ترک کی اور کس کس زمین کو اپنے قیام سے زینت بخشی۔ صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ مخدوم صاحب کے اسلاف ایک مدت تک قصبہ صحرام میں جو بغداد و خراسان کے درمیان واقع تھا مقیم تھے، اور آپ کے جد اعلیٰ قاری محمد صدیق کے وقت تک وہی مسکن تھا، اگرچہ اس مدت میں بعض بزرگوں نے آستانہ رسول اللہؐ اور روضہ غوث الثقلین کے جوار میں ہی اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ صرف کر دیا، لیکن اپنا آبائی وطن صحرام ہی کو سمجھتے رہے یہاں کے معزز خاندانوں اور شریف قبائل میں ان کا شمار تھا، اور درس تدریس، تعلیم و تفہیم اور ہدایات مسلمین و مومنین کے مفید عام مشاغل میں ان کی عمریں بسر ہوتی تھیں۔

آج تقریباً ساڑھے چار سو برس کے بعد یہ دریافت کرنا دشوار ہے کہ صحرام خراسان یا عراق عجم میں کس جگہ آباد تھا، شاہ تراب علی قلندرؒ نے کشف المتواری میں لکھا ہے کہ:-

صحرام نواح خواف سے تھا مگر اس سے ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ خواف کس صوبہ میں تھا۔

منشی عاشق علی خاں نے جو بادشاہ اودھ کی طرف سے مدت تک کلکتہ میں سفیر رہے ایک بیاض میں تحریر کیا ہے کہ:-

صحرام مابین اصفہان و کاشان تھا۔

بعض افراد کہتے ہیں کہ مخدوم صاحب ایک صدی قبل جامی الاصل سمجھے جاتے تھے اور ان کے بعض بزرگوں کی مہروں میں لفظ جامی کندہ ہے، لہذا حضرت مخدوم خافی نہ تھے بلکہ جامی، بجنیس خطی سے اختلاف قرأت ہو گیا۔ تطبیق ان روایات کی اس طرح ہو سکتی ہے کہ شاید صحرام ضلع جام کا کوئی قریہ ہو اور اس جگہ سے قریب کوئی بڑا موضع خواف بھی ہو، کیونکہ پروفیسر براؤن نے پرشین پوئٹری انڈر تارتار ڈومینشن میں جام کا ضلع ہونا تحریر کیا ہے۔ اب تو نہ خواف کا پتہ ہے اور نہ صحرام کا نشان، اگلے وقتوں کا جام بھی باقی نہیں ہے۔

جستجو سے ایک نقشہ کا پتہ چلا ہے جو سلطنت ایران کے زیر اہتمام ۱۳۲۲ ہجری میں شائع ہوا تھا، اور اس سے حسب ذیل امور دریافت ہوتے ہیں:

۱۔ ایک قصبہ تربت شیخ جام نام صوبہ خراسان میں سرحد افغانستان کے قریب ۶۰ طول البلد اور ۳۵ عرض البلد کے درمیان موجود ہے۔

۲۔ تربت شیخ جام سے ۴۰-۵۰ میل کے فاصلہ پر طول البلد ۶۰ عرض البلد ۳۴ کے درمیان ایک شہر خاف نام آباد ہے اور اس کو خواف بھی کہتے ہیں۔

۳۔ تربت شیخ جام اور خاف سے ہرات کا فاصلہ تخمیناً ۱۰۰ میل ہے ہرات سے مشہد مقدس کو جو شاہراہ جاتی ہے اس کے شمال میں تربت شیخ جام ہے اور جنوب میں خاف ہے۔

۴۔ کاشان اور اصفہان صوبہ عراق عجم میں ہیں ان شہروں سے سینکڑوں میل کے فاصلہ پر شمال و مشرق میں خاف اور تربت شیخ جام ہیں اور ایسے ہی دور دراز فاصلہ پر مغرب میں بغداد ہے۔

۵۔ صحرام کا اس نقشہ میں نشان نہیں ہے ممکن ہے کہ اب اس قصبہ کا نام تبدیل ہو گیا ہو یا اس کی آبادی باقی نہ ہو۔

الف۔ اگر وہ روایت تسلیم کی جائے کہ صحرام کاشان اور اصفہان کے درمیان تھا تو وہ توابع خواف سے نہیں ہو سکتا۔

(ب) بغداد اور ممالک خراسان کے درمیان ہزارہا میل کا فاصلہ ہے اس لئے یہ پتہ بھی کافی نہیں ہو سکتا کہ صحرام بغداد اور خراسان کے درمیان تھا۔

(ت) صحرام توابع خواف غالباً موجودہ خاف اور تربت شیخ جام کے توابع سے تھا جو سرحد افغانستان اور ہرات کی شاہراہ کے قریب طول البلد ۶۰-۶۲ اور عرض البلد ۳۴-۳۶ کے درمیان واقع ہیں۔

(ج) قصبہ تربت شیخ جام غالباً وہی جام ہے جہاں کے مولانا عبدالرحمٰن جامی رہنے والے تھے۔

فلک کج رفتار کی گردش سے قاضی محمد صدیق خستہ دل بسبب مخالفت مذہب سلاطین ایران ایذا رسانی ایرانیان و ناموافقت اقارب کالعقارب کچھ ایسی پھنس گئی کہ گھر بار سے منہ موڑا اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر سخت پریشانی اور مصیبت کی حالت میں وطن مالوف سے چل کھڑے ہوئے اور کچھ عرصہ تک ہرات و ملتان میں سرگرداں و پریشاں پھر کر وارد لاہور ہوئے۔ پانچ سال تک وہاں قیام کیا بعد ازاں پٹیالہ کو محل سکونت شرفاء خیال کر کے کچھ دنوں وہاں قیام کیا، پھر حاجی صفاں تاجر کی صلاح اور مظفر خاں صوبہ دار

اودھ کے اصرار سے اپنے فرزند اصغر قاضی نجم الدین کو (جن کی شادی قصبہ پٹیالہ میں ایک سیدزادی سے ہو گئی تھی) چھوڑ کر اور فرزند اکبر حافظ امیر نصیر الدین اور دیگر متعلقین کو ہمراہ لے کر ملک اودھ میں داخل ہوئے اور یہاں بھی مختلف مقامات پر سکونت کا اتفاق ہوا، اور آخر کار امیر سیف الدین باستقلال تمام و اطمینان واقعی قصبہ کاکوری (مضافات لکھنؤ) میں سکونت پذیر ہوئے جو آج تک ان کی اولاد کا ملجا و ماویٰ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ لودیوں کا آفتاب اقبال کشور ہند کو منور کر رہا تھا، غالباً سنہ ۹۱۸ھ یا سنہ ۹۱۹ ہجری تھا، جب سکندر لودھی فرماں روائے دہلی تھا۔

❁

حضرت مخدوم کے حالات ملا عبد الرشید ملتانی نے مقدمہ زاد الآخرۃ میں مفصل درج کئے ہیں، اور حضرت شاہ تراب علی قلندر نے ایک مستقل کتاب کشف المتواری آپ کے حالات میں تالیف فرمائی ہے اور یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں، ملک کے مشہور مورخ ملا عبد القادر بدایونی نے حضرت مخدوم کے متعلق اپنی بے نظیر تاریخ منتخب التواریخ میں لکھا ہے،

"شیخ بھیکہ کاکوری کہ قصبہ ایست از توابع لکھنو اعلم علمائے روزگار و متورع و متشرع و در تقویٰ امام اعظم ثانی بود و سالہا بدرس افادہ خلق اشتغال داشت و لفظ کلام مجید بہفت قرأت بود و شاطبی را درس میفرمود و را فت از سید ابراہیم ایرجی قدس سرہ داشت کہ از اعلم علمائے روزگار بود و ہرگز سخن تصوف بہ مجلس نمی گفت مگر در خلوت با محرمان راز و طن رسے، بست کہ اگر نکتہ توحید علانیہ گویند رجعت ہر گوینده باہر اہل عالم کند سرو نشیندی و بظاہر منع فرمودے، و اولاد امجاد بسیار صاحب کمال دارد کہ ہمہ بحلیہ صلاح و تقویٰ و دانش و علم فضائل آراستہ بودند جامع اوراق منتخب در صحبت محمد حسین خاں بملازمت آں بزرگوار مشرف شدہ ماہ مبارک رمضان بود کہ شخصے کتابے از علم منطق آوردہ سبق فرماید فرمود کہ بے از علوم دینی باید خواند وفات شیخ در سنہ نہصد و ہشتاد و یک بود رحمۃ اللہ علیہ،"

تذکرہ الاصفیا، بحر ذخار اور رقیات الاعیان میں بھی تقریباً یہی مضمون خفیف تغیر و تبدل کے ساتھ موجود ہے۔

❁

مخدوم صاحب کی وفات ۹۱ برس کی عمر میں ۵ ذیقعدہ سنہ ۹۸۱ ہجری ہوئی اور اسی تاریخ آپ کا عرس ہوتا ہے آپ کی شادی قصبہ بھگوئی (من مضافات خیرآباد ضلع سیتاپور اودھ) کے شریف خاندان میں ہوئی جس سے ۳ لڑکیاں اور چار لڑکے پیدا ہوئے، ان میں سے حافظ شہاب الدین اپنے حسب نسب سے ممتاز و ذی شخصیت و لیاقت تھے اپنے والد ماجد کی حیات میں داغ جدائی دے گئے، اور ان کے دو صاحب کمال صاحبزادے مخدوم عبد الکریم اور مخدوم عبد القادر فضل و کمال کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بنکر چمکے اور اپنے جد امجد کے مقدس و بابرکت نام کو اجاگر کیا، انہی میں سے مخدوم عبد الکریم اردوے شاہی اور دارالسلطنت دہلی کی طرف متعدد بار سفر کا اتفاق ہوا، عہد اکبری میں بھی کئی بار تشریف لے گئے اور عہد جہانگیری میں بھی مدت تک لشکر بادشاہی کے ساتھ کوچ و مقام میں رہنا پڑا، اسی زمانہ میں ایک مغل کے یہاں خوش کش ہونیکا اتفاق ہوا، اس کو آپ نے ولادت طفلی کی بشارت دی پیشین گوئی جلدی پوری ہوئی اور وہ مغل بچہ ہندوستان کی تاریخ میں مرزا غیاث (پدر نورجہاں) کے نام سے مشہور ہے لوگ کہتے ہیں کہ مرزا غیاث نے آپکی نیکو صورتی اور کمالات باطنی کو ملاحظہ کر کے اپنی بھانجی کا عقد آپ کے ساتھ کرنا چاہا، مگر مخدوم نے منظور نہ کیا اور "دل تنگ شدہ خاطر از سکونت شہر بر داشت" اور اس واقعہ کے بعد آپ کاکوری تشریف لا کر "با سکنہ بدرس و تدریس علوم و اشتغال و اذکار و اوراد" مشغول ہو گئے اور اردوے شاہی کی طرف دوبارہ رخ نہیں کیا، آپ کو جاہ دنیوی سے اس قدر نفرت تھی کہ مرزا غیاث کا لڑکا جب صوبہ دار بنگالہ مقرر ہو کر پورب کی طرف جانے لگا، اور اپنے والد کے حکم سے مخدوم صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر گذارش کی کہ کوئی صاحبزادہ تقویت و پشت پناہی کے لئے ہمراہ تشریف لے چلیں تو اس کی دلدہی کے لئے آپنے اپنے فرزند ملا عزیز اللہ "کو بے از رخصت دینا" محسوس کر کے ہمراہ کیا تو ہمارے وطن کے مشہور مورخ منشی فیض الحسن مصنف فرح بخش کے مطابق حضرت مخدوم پر گریہ طاری ہوا اور آپنے فرمایا کہ،

داد یلا در داشت علم و فضل دفتر از خانہ ما بیرون گذاشت۔

آپ کی وفات ۳ ربیع الاول سنہ ۱۰۴۵ ہجری کو اپنے جد امجد کی وفات کے ۶۵ برس بعد واقع ہوئی۔ فرزندان اہل باطن ایشان بطناً بعد بطن بطریقہ بزرگان خود ماندند ازاں وقت تا اینجا در خاندان ایشاں علم و فضیلت قدرے قلیل باقی است۔

قاری امیر سیف الدین مخدوم نظام الدین دانشمند ملا عبد الکریم اور ملا عبد القادر کے مزارات کاکوری (مضافات لکھنو) میں موجود ہیں اور مرجع خلائق ہیں راقم مضمون کو انہی کی فرزندی کا شرف حاصل ہے۔ گرچہ خوردیم نسبتے ست بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

شمع محفل اور پروانہ

فخر قوم، درد مند ملک رائٹ آنریبل جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے جذبات قومی اور متعدد سفر لندن کا فلسفہ اور اس کی تشریح

از سحبان الہند جناب کیفی چریا کوٹی۔ اردو اسکالر ہندوستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد

دیا اس نے تڑپ کر جب ہمارے قلب سوزاں سے
"میں کچلی ہوں" صدا آئی یہ ہر تار گریباں سے

نمود زندگی کا نام جب سعی عمل ٹھہرا
مرے دل کی تپش کو باندھ دو تار رگ جاں سے

عمل کی کچھ تڑپ ہو، شوق کی کچھ ساز گاری ہو
بنا دیکھا ہے کار حسن کس نے چشم حیراں سے

محرک ہو اگر سوز عمل تو پھونک اٹھے صحرا
شرر کیا؟ آگ پیدا ہو ابھی بزم نیستاں سے

اگر حسن عمل بھی کچھ شریک دست ہمت ہو
تو دل کو گوندھ لے تار نگہ سے نوک مژگاں سے

کبھی بزم عمل میں بار پانے کے نہیں قابل
جو اپنے ہوش کو کھوتا رہے خواب پریشاں سے

تڑپ ہے جس کی خو میں، لوٹنے کی اسکو کیا پروا؟
ڈرا سکتا نہیں موجوں کو کوئی جوش طوفاں سے

اگر دعوائے ہستی ہے تو ہستی کھو کے سمجھا دو
رخ بے رنگ، کو دل کے لہو سے دھو کے سمجھا دو

کہا یہ شمع نے پروانۂ سوزاں سے محفل میں
کہ میری طرح تو جلتا رات بھر ہے آتش دل میں

بتا کیا چیز ہے جو اس طرح تجھکو جلاتی ہے
تجھے یہ کون لایا راہ غم سے منزل مشکل میں

کہا اس نے کہ شعلہ ہے وہی شکلیں ہیں جو اسکی
کبھی دامن ہے صحرا میں، کبھی پردہ ہے محمل میں

بہ طرز خویش دارد ہر کسے رنگ تپیدن ہا
بہ چاک خود بود در باغ گلہا مادہ۔ بدنہا

نگاہ شوق میں اے شمع تو وہ فتنہ ساماں ہے
کہ تیرا حسن پردہ در، حجابوں سے نمایاں ہے

زمانہ ہے ترا محو تماشا، چشم حیراں سے
کہ سوزاں بزم میں ہے یا دلوں میں تو فروزاں ہے

سراپا حسن ہے لیکن وفائے عشق ہے تجھ میں
مزاج بزم پر عبرت ہے خندہ زن تو گریاں ہے

تو خود جلتی ہے لیکن روشنی دیتی ہے محفل کو
ترا حسن عمل، دست کرم سے نور افشاں ہے

سراپا سوز بن کر تو نے یہ ہستی کو سمجھایا
کہ اس کا نام روشن ہو گیا جو شعلہ در جاں ہے

بہ قدر ظرف تیرا نور ہے پہنائے عالم میں
کہیں آنکھوں میں تابانی، کہیں صورت میں عریاں ہے

بصیرت جس کی خو میں ہے وہ تجھ کو پیار کرتا ہے
مگر جو تیرہ دل ہے تیری صورت سے گریزاں ہے

تپش ہے میری سیرت میں کشش ہے تیری صورت میں
کہیں دھبا ہے آئینہ بھی پڑنے کی کدورت میں

کروں جو کچھ کہ میرے پاس ہے اے رشک مہ صدقے — مرا دل پہلے صدقے، پھر مری جان حزیں صدقے
متاع عاشق جاں باز ہے جو کچھ ہے دنیا میں — جہاں کی انجمن صدقے، فلک صدقے، زمیں صدقے
مرے دم تک ہے سب یہ عالم امکاں میں جو کچھ ہے — میں خود صدقے، مرا یہ شوق ہمت آفریں صدقے

ترا حسن جہاں آرا تو اس سے بھی زیادہ ہے
متاع جان عاشق کیا ہے پیش پا فتادہ ہے

یہی بزم جہاں میں آج اہل دل کی صورت ہے — سکون حسرت آگیں ان کی خودداری کی زینت ہے
وہ اپنے دل میں حد و غیر رکھتے ہیں تڑپنے کو — یہی رنگ مجاز ان کا، یہی ان کی حقیقت ہے
وہ شب کو شمع، دن کو آفتاب شعلہ در دل ہیں — نہ دن بھر چین ہے ان کو، نہ شب بھر ان کو راحت ہے
سکون نارسا میں دن کو ہے کوئی، وہ مضطر ہیں — کوئی ہے شب کو غفلت میں گرفتار، ان کی حالت ہے
وہ سامان تعیش کو جفائے غم سمجھتے ہیں — وفائے عہد و درد غیر ان کی اصل فطرت ہے
کوئی موسم ہو، کوئی وقت ہو، کوئی زمانہ ہو — نگاہ عاقبت بینی میں ان کی وہ قیامت ہے
وہ صحرائے جہاں کو چھانتے پھرتے ہیں وحشت میں — انہیں کیا چین آئے، دل میں ان کے درد غیرت ہے

فلاح قوم کی رہتی ہے ہر دم جستجو ان کو
یہی سودا لئے پھرتا ہے یعنی کو بہ کو ان کو

ستم دیکھو کہ قوم نا سزا کانٹوں پہ سوتی ہے — صبا نے اس کے بیٹی یہ سے تقدیر روتی ہے
تپش رکھتی ہے لیکن مائل اشک خجالت ہے — یہ حسن سوز پروانہ کو پانی میں ڈبوتی ہے
سر رہ اپنے ہی نقش قدم پر سو گئی آکر — یہ اپنی خاک بن کر آپ ہی برباد ہوتی ہے

جگانے والا آتا ہے، محبت سے جگاتا ہے
یہ کروٹ بھی نہیں لیتی تو تھک کر بیٹھ جاتا ہے

زمیں سے پھر یہ اٹھتا ہے غبار آسماں ہو کر — اتر جاتا ہے دریا سے نگاہ دیدباں ہو کر
پہونچتا ہے وہ لندن میں کہ کشتی ہند کی پھیرے — مبادا یہ نہ جانے نذر بحر بے کراں ہو کر
وہ اندازِ سکوں میں طعنۂ اغیار سنتا ہے — خزاں کی تاب لاتا ہے بہار بوستاں ہو کر
جہاں کو آمد و شد ہند و لندن کی دکھاتا ہے — کبھی جاتا ہے دل ہو کر کبھی آتا ہے جاں ہو کر
اگر مسلم کا امن ہے تو ہندو کا بھی ملجا ہے — وہ دونوں میں ہے بیتاب خیال جنبش رگہائے جاں ہو کر
ملانا چاہتی ہے حاکم و محکوم کو دونوں — انہی کی صلح جوئی، مثل برزخ درمیاں ہو کر
وہ خادم قوم کا ہے اسلئے مخدوم ہے سب کا — میان دشمناں بھی ہے نصیب دوستاں ہو کر

وہ شمع روشن ہندوستاں سر بہ سجدہ ہے
جبلت قوم اس کی، خیر خواہی ملک کی خو ہے

بساطِ دہر پہ نقشا بنا قدرت نے کھینچا ہے — چمن میں ہند کے یعنی گلِ خوش رنگ زیبا ہے
ہوا ہے مبتلائے سوزِ جاں و دردِ دل لیکن — مریضِ قوم کی بالیں پہ وہ رشکِ مسیحا ہے
بجائے خوفِ فتن جذبِ نظر کیفیتِ دل ہے — وہ ہے تصویرِ غیرت اور ہمت کا سراپا ہے

مگر کب دیکھ سکتی ہے نگاہِ خویشتن بینی
کہ رسوائی ہے محروم ہیکو شوقِ گل چینی

زمانے کو وہ زورِ بازوئے ہمت دکھاتا ہے — کہ دل پر قوم کی خاطر سے کوہِ غم اٹھاتا ہے
بہت مشکل ہے فطرت نازو نعمت کی بدل دینا — وہ جذبِ غیرتِ بے تاب ہو کر تاب لاتا ہے
دو نکبت پر جن کے سر جھکے تھے ایک مدت سے — محبت سے اٹھا کر ان کو سینے سے لگاتا ہے
نگاہِ دور بیں اور عقل کامل کے اشاروں سے — وہ خضرِ قوم بن کر راستہ سیدھا دکھاتا ہے
اسے پروا نہیں ہے اہلِ ساحل غل مچاتے ہیں — درِ مقصود کی جانب وہ طوفاں بن کے جاتا ہے
عمل تسخیر کا رکھتی ہے اس کی شانِ دلجوئی — کہ چشمِ غیر میں رنگِ کرم بن کر سماتا ہے
کہا ہے اس کی یکرنگی نے نیرنگِ زمانہ سے — کہ ہے نقشِ اید و دل "انا" کو جو مٹاتا ہے

وہ بڑھ کر شمع سے ہے، نیرِ تابانِ یکتائی
اسی نے دیدۂ پروانہ دل میں جگہ پائی

سن! اب اے قوم، جوشِ ہمت مردانہ بن جانا — بنا وہ شمع تیرا، اس کا تو پروانہ بن جانا
بہارِ زندگی یہ ہے کہ باقی نام رہ جائے — خزاں کہتے ہیں، اس کا دہر میں افسانہ بن جانا
نگینِ تاجِ حکمت بن کے رہنا ملکِ دنیا میں — فنا کی ٹھوکریں ہیں، لغزشِ مستانہ بن جانا

نہیں اچھا ہے نذرانہ تمہارے جوش ہو جانا
بس اے کیفی مناسب ہے ترا خاموش ہو جانا



(۶)

کلیم اور سلیم

آٹوسجیشن کے بیان میں

از جناب میر ولی اللہ صاحب بی اے ایل ایل بی

کلیم اور سلیم کی مصروفیتوں نے دو ہفتے تک انہیں فرصت نہ دی کہ ایک دوسرے سے مل سکیں، دسمبر دو تہائی گذر چکا تھا، اور بڑے دن کی چھٹیاں قریب تھیں دونوں دوست کرسمس گھر سے باہر گذارنا چاہتے تھے۔ اس لئے باہر جانے سے پہلے ایک روز سلیم شام کی چائے کے وقت کلیم کے مکان پر آگیا، چائے وہیں پی اور رات کی روٹی بھی وہیں کھائی، کھانے کے ساتھ پینے کا سامان بھی موجود تھا، دونوں سرشار تھے اور گفتگو میں مشغول کہ سلیم نے زمانہ حال کے ایک نئے مضمون کا جس کا چرچا عام ہے، ذکر چھیڑ دیا۔

سلیم:۔ یورپ کے سائنسدان آئے دن نئی نئی ایجادیں کرتے رہتے ہیں اور ان کے فلاسفر ہر روز فلسفہ کے نئے نئے نظریئے پیش کرتے رہتے ہیں اور ہم ہیں کہ ع زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔

کلیم:۔ نئی ایجادوں کے متعلق آپ گل محمد کو جو چاہے کہیں، لیکن فلسفہ کے بارے میں یورپ ابھی گل محمد تک نہیں پہنچا۔

سلیم۔ آپ کی فارسی دانی نے آپ کو بہت متعصب بنا رکھا ہے، میں حیران ہوں کہ آپ نے ایجادات کے متعلق میری بات کیسے مان لی، مجھے تو امید نہ تھی کہ آپ کہیں گے کہ ریل تار، ہوائی جہاز اور موٹر کاریں وغیرہ سب گل محمد کی ایجاد کی ہوئی چیزیں ہیں۔

کلیم۔ خیر آپ کی امید بر آئی، میں نے صرف اتنا ہی کہا ہے کہ گل محمد اب بھی فلسفہ میں یورپ سے بہت آگے ہے، اور میں اپنے اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے تیار ہوں۔

سلیم:۔ بہت اچھا، آٹوسجیشن کے متعلق دیکھئے آجکل یورپ کے فلسفی کس قدر نظریئے بیان کر رہے ہیں، اور کتنی کتابیں شائع کر چکے ہیں اور فن طب میں ان نظریوں نے کتنی قیمتی امداد دی ہے کیا فلسفہ کے یہ نظریئے بھی جدید نہیں ہیں۔ کہئے تو مولانا گل محمد بیچ بارے اس مسئلہ کے کیا فرماتے ہیں۔

کلیم۔ گل محمد بیچارا انگریزی نہیں جانتا، اردو فارسی یا عربی میں گفتگو کرتا ہے، عربی فارسی بولے تو آپ سمجھتے نہیں، اور اردو بولے تو گھر کی مرغی دال برابر، آپ کے دل میں اس کا [illegible] نہیں کرتے آٹوسجیشن ایک موٹا تازہ انگریزی لفظ ہے اور مسٹر الفریڈ کی طرح خواہ مخواہ معتبر اسی طرح آٹوسجیشن کا اس قدر چرچا ہے رنگ رنگ کی کتابیں لکھی جا رہی ہیں اور ہر کوئی انہیں پڑھتا ہے اور سر دھنتا ہے، لیکن آپ فرمائیں تو یہی کہ آٹوسجیشن میں دھرا کیا ہے۔

سلیم۔ آپ اس مضمون پر کوئی کتاب پڑھیں، مجھے ڈر ہے کہ آپ میرے بیان سے پورا پورا لطف حاصل نہ کر سکیں گے۔

کلیم۔ میرے لئے آپ کا بیان بھی اتنا ہی پر لطف ہوگا، جتنی کوئی انگریزی کتاب لیکن بات وہی ہے کہ اردو زبان میں بیان کرنے سے سامعین مرعوب نہیں ہوتے اور انگریزی کتاب پڑھنے سے ان کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں، بہر حال آپ بے تکلفی سے کہیں اور بتائیں کہ آپ نے اس نظریئے کے متعلق کیا کچھ پڑھا ہے۔

سلیم۔ میں مختصراً عرض کرتا ہوں، فلسفیان یورپ کہتے ہیں کہ انسان کے دو دل ہوتے ہیں، ایک وہ جو سوچتا اور سمجھتا ہے، اور دوسرا وہ جو بنا

سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ لیکن اس کے سوچنے کی اور سمجھنے کی بھی ایک بنا ہوتی ہے جو انسان کی اندرونی گہرائیوں میں مضمر ہوتی ہے۔

کلیم۔ بلکہ یوں کہئے کہ انسان کا ایک نفس شعوری ہوتا ہے جو سوچتا اور سمجھتا ہے ارادہ کرتا ہے اور اس ارادے کو عمل میں لاتا ہے۔ یہ ہمارا ظاہر ہے یعنی Conscious self اور ایک نفس غیر شعوری ہوتا ہے۔ بظاہر سویا رہتا ہے نہ سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ نہ ارادہ کرتا ہے، لیکن درحقیقت سوچتا بھی ہے سمجھتا بھی ہے اور ارادہ بھی کرتا ہے گو ہمیں عام طور پر معلوم نہیں ہوتا۔ یہ ہمارا باطن ہے یعنی unconscious self

سلیم۔ خیر معلوم ہوا۔ آپ نے آٹو سجیشن پر کوئی کتاب ضرور پڑھی ہے صاف اعتراف کیوں نہیں کرتے۔

کلیم۔ میں نے کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں پڑھی، آپ کو اس سے کیا مطلب انگریزی لفظ تو میں نے صرف آپ کو مرعوب کرنے کے لئے کہدئے تھے اور پھر نفس شعوری اور نفس غیر شعوری جانے آپ کی بلا، خواہ مخواہ انگریزی لفظ کہنے پڑے۔

سلیم۔ آپ اتنا تو مانیں کہ انگریزی الفاظ نہ ہی، نفس شعوری اور نفس غیر شعوری ہی سہی۔ لیکن یہ چیزیں ہیں تو نئی۔

کلیم۔ نئی کیونکر مان لوں، آپ نے کبھی ہمزاد کا لفظ سنا ہے۔

سلیم۔ کئی بار سنا ہے لیکن ہمزاد کا اس بحث سے کیا تعلق ہے۔

کلیم۔ تعلق یہ ہے کہ ہمزاد اسی نفس غیر شعوری کا نام ہے۔

سلیم۔ مگر ہمزاد کے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ وہ جن ہوتا ہے۔

کلیم۔ نفس غیر شعوری سے بڑا جن اور کون سا ہے، اگر یہ جن قابو میں آجائے تو سمجھو کہ تخت سلیمان مل گیا، آپ نے ہمزاد کی تعریف پر کبھی غور نہیں فرمایا

سلیم۔ مجھے تو ہمزاد کی کوئی خاص تعریف معلوم نہیں۔

کلیم۔ خاص تعریف کو جانے دو، عام تعریف یہ ہے کہ ہمزاد آدمی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے ساتھ ہی مرتا ہے اور اس کا نام بھی وہی ہوتا ہے، اور اگر وہ قبضے میں آجائے تو زندگی بڑی کامیاب ہو سکتی ہے دیکھو ہمزاد بعینہ وہی چیز ہے جو نفس غیر شعوری ہے۔

سلیم۔ سچ تو یہ ہے کہ گو میں نے اس مضمون پر کئی کتابیں پڑھی ہیں لیکن تاحال مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا نفس سلیف جسے آپ نفس غیر شعوری کا نام دے رہے ہیں، کہاں ہے، اور کیا چیز ہے۔

کلیم۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن اتنا تو آپ جانتے ہیں کہ خواب کی حالت میں جب آپ بے خبر سوئے ہوتے ہیں آپ عجیب عجیب مناظر دیکھتے ہیں اور عجیب عجیب باتیں کہتے اور سنتے ہیں، یہ چیز جو خواب کی حالت میں دیکھتی سنتی کہتی اور کرتی ہے نفس غیر شعوری ہے، کئی آدمی تو خواب ہی کی حالت میں بستر سے اٹھ کر باہر نکل جاتے ہیں اور دن کا بچا ہوا کام پورا کر کے پھر اپنے آکر بستر میں لیٹ جاتے ہیں، حالانکہ تمام وقت وہ سوئے ہوتے ہیں۔ اس کے متعلق آپ نے کئی مرتبہ تجربہ کیا ہوگا، آپ سوتے وقت ارادہ کرتے ہیں کہ کسی خاص کام کے لئے آپ صبح سویرے تین بجے اٹھیں گے بیشک آپ روزانہ آٹھ بجے اٹھتے ہیں، کوئی چیز عین تین بجے صبح آپ کو اٹھا دیتی ہے، وہ کون سی چیز ہے، یہی نفس غیر شعوری، یہی گل محمد کا ہمزاد جسے آپ جن کہتے ہیں۔

سلیم۔ بہت اچھا نفس غیر شعوری ہمزاد ہی سہی لیکن آٹو سجیشن کے متعلق تو فلسفۂ قدیم خاموش ہی نظر آتا ہے۔

کلیم۔ ہرگز نہیں۔ فلسفۂ قدیم میں خیال، وہم و گمان، اور یقین کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور یہ سب کچھ آٹو سجیشن کا ہی بیان ہے۔

سلیم۔ وہ کس طرح۔

کلیم۔ وہ اس طرح کہ انسان کے دل میں جو خیال پیدا ہوتا ہے یا پیدا کیا جاتا ہے وہ دو صورتیں اختیار کرتا ہے، ایک صورت وہم و گمان کی ہے اور دوسری یقین کی ہے، اگر خیال میں شک کا شائبہ ہو تو وہ وہم ہے اور اگر راسخ ہو جائے تو یقین، جو خیال راسخ ہو کر یقین کی صورت اختیار کر لے وہ انسان کے تمام اعصاب اور جوارح پر حکمران ہو جاتا ہے اور تمام جسمانی عوامل پر اپنا اثر پیدا کر دیتا ہے چنانچہ انسان کے تمام ارادے درحقیقت اس کے خیال کے حکم میں ہوتے ہیں، اگر آپ ایک ارادہ کریں جو آپ کے خیال کے مطابق نہ ہو تو اس ارادے کو آپ عملی جامہ ہرگز نہ پہنا سکیں گے۔

سلیم۔ اس نظریے کی فلسفیان یورپ نے ایک نہایت خوبصورت مثال دی ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ ایک فٹ چوڑا راستہ زمین پر بنائیں تو آپ بے تکلف اس راستہ پر چل بلکہ دوڑ سکیں گے، لیکن اگر ایک اونچی دیوار پر جو ایک فٹ چوڑی ہو آپ کو چلنا پڑے تو آپ ہزار ارادوں کے باوجود نہ چل سکیں گے، بلکہ گو چلنے کی کوشش کریں گے تو غالباً گر پڑیں گے۔ وجہ یہ

ہے۔ ایک فٹ چوڑے راستہ پر چلتے وقت آپ کو خیال ہوتا ہے کہ آپ چل سکتے ہیں اور ایک فٹ چوڑی دیوار پر چلتے ہوئے آپ کا خیال ہوتا ہے کہ آپ نہیں چل سکیں گے، چنانچہ دونوں صورتوں میں خیال ارادے پر غالب ہوتا ہے۔

کلیم۔ یہ مثال بھی فلسفیان یورپ کی تصنیف کردہ نہیں، بلکہ مولانا جلال الدین رومی کی بتائی ہوئی بات ہے۔

سلیم۔ کیا یہ درست ہے۔

کلیم۔ ہاں بالکل درست ہے، سنو کہ مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں کہ:

عقل جزوی آفتش وہم است و ظن — زانکہ در ظلمات شد او را وطن
بر زمین گر نیم گز راہے بود — آدمی بے وہم ایمن میرود
بر سر دیوار عالی گر روی — گر دو گز عرضش بود کژ میشوی
بلکہ می افتی ز لرزۂ دل بہ وہم — ترس وہمی را نکو بنگر بفہم

(عقل جزوی یقین کی برکات سے محروم ہے) وہم و ظن اس پر غالب آ جاتے ہیں، کیونکہ عقل جزوی کا وطن اندھیرے میں ہے اگر زمین پر آدھ گز رستہ ہو تو آپ اس پر بے تکلف چل سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر آپ ایک اونچی دیوار پر جو دو گز چوڑی ہو چلنے کی کوشش کریں تو آپ ٹھہر سے ہو جائیں گے، بلکہ وہم کی وجہ سے دل لرز جائیگا اور آپ گر پڑیں گے۔

دیکھئے مولانا کس صفائی سے اس مثال کو اور اس کے متعلقہ فلسفے کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ نے کبھی مجدد کی باتوں پر کبھی غور ہی نہیں کیا۔

سلیم۔ آپ سچ فرماتے ہیں۔ ہماری شومئی قسمت ہے کہ ہم اپنے لٹریچر کو بھول گئے ہیں، لیکن یورپ والوں نے آٹو سجیشن کے ذریعے کئی بیماریوں کا علاج کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ علاج عموماً کامیاب ہوتا ہے۔ کم از کم اتنا تو آپ مان جائیں گے کہ یہ فلسفۂ جدید کا کارنامہ ہے۔

کلیم۔ یہ کارنامہ بھی فلسفۂ قدیم کا ہے۔

سلیم۔ فلسفۂ قدیم کا؟

کلیم۔ ہاں بیشک۔ ورنہ یہ فلسفۂ قدیم کا ہے: یہ جادو، تعویذ، گنڈے، جنتر منتر اور جھاڑ پھونک کیا ہیں؟ آٹو سجیشن ہی کے کرشمے ہیں، جادو اور تعویذ وغیرہ سے تندرست آدمی کو بیمار اور بیمار کو تندرست کیا جا سکتا ہے اور صدیوں سے کیا جا رہا ہے۔

سلیم۔ مگر جادو تو محض ڈھکوسلا ہے۔

کلیم۔ اگر جادو ڈھکوسلا ہے تو آٹو سجیشن اس سے بڑا ڈھکوسلا ہے۔ غور کرو تو دونوں کا طریق عمل ایک ہی ہے، عامل اپنے علم و فضل اپنی زبردست شخصیت اپنے تجربے اور اپنی شہرت سے معمول کو اس کی تفہیم حالت سے فائدہ اٹھا کر مرعوب کرتا ہے اور اپنے عمل کے موثر ہونے کا معمول کو یقین دلاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عامل اپنے معمول کے دل میں جس خیال کو راسخ کرتا ہے وہ خیال اگر صحت بخش ہے تو معمول کے تمام اعصاب و جوارح اور جسمانی عوامل کو حصول صحت پر مائل کر دیتا ہے، اور ستم آفریں ہے، تو معمول کو بیمار کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی عمل تعویذ اور گنڈے اور جنتر منتر کا ہے۔

سلیم۔ مگر تعویذ میں تو کلام کی برکت کا اثر ہوتا ہے۔

کلیم۔ کیوں نہیں، کلام کی برکت سے کون انکار کرتا ہے، لیکن آپ نے کبھی اس کلام کا بغور مطالعہ بھی کیا ہے۔

سلیم۔ نہیں، میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا، لیکن بہر حال کوئی متبرک اور مقدس کلمات ہوتے ہوں گے۔

کلیم۔ اچھا تو میں آپ کو ان کلمات کا ایک نمونہ بتاتا ہوں۔

سلیم۔ ہاں ضرور بیان فرمائیے۔

کلیم۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے اور یہ کوئی من گھڑت قصہ نہیں، بلکہ واقعہ ہے کہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ ایک گدھے پر اپنی کتابیں لادے سفر پر جا رہے تھے، آبادی سے دور جا چکے تھے کہ بارش شروع ہو گئی، کتابوں کے خراب ہو جانے کا ڈر تھا، گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا تو سامنے ایک زمیندار کی جھونپڑی نظر آئی، گدھے کو دوڑایا، خود بھی دوڑے اور اس زمیندار کے گھر جا پہنچے، زمیندار نے ایک مقطع اور مقدس صورت دیکھی تو خوب خاطر تواضع کی، اتفاقاً اس زمیندار کی بیوی دو تین روز سے دردزہ میں مبتلا تھی، بچہ نہیں ہوتا تھا، مولویانہ وضع قطع دیکھ اس نے امیر خسرو سے ماجرا بیان کیا، اور تعویذ کی درخواست کی، انھوں نے کتابوں کے بستے سے قلم دوات نکالی، کاغذ کا ایک پرچہ کاٹا، اور تعویذ لکھنے بیٹھ گئے چنانچہ

تعویذ لکھا گیا اور زمیندار کے حوالے ہوا۔ اس نے وہ تعویذ حسب ہدایت اپنی بیوی کی کمر میں باندھ دیا۔ خداوند تعالےٰ کے فضل کو بہانہ ہی چاہئے تھا، تھوڑی دیر گذری تو صحت و سلامت بچہ پیدا ہو گیا۔ بارش تھمنے پر امیر خسرو روانہ ہوگئے۔ مگر چند روز میں ہی اس تعویذ کا چرچا تمام علاقے میں ہوگیا، پھر کیا تھا۔ جہاں کسی گھر میں کوئی بچہ پیدا ہونے والا ہوتا، وہ تعویذ منگوایا جاتا اور حاملہ کی کمر پر باندھ دیا جاتا۔ اس تعویذ کی شہرت جب عام ہوئی تو ایک تعویذ نویس مولوی صاحب کو خیال آیا کہ کسی طرح اس تعویذ کو کھول کر دیکھا جائے تاکہ وہ خود بھی درد زہ کا یہ تعویذ لکھ لیا کرے چنانچہ ایک روز کسی بہانے سے اس نے وہ تعویذ منگوایا اور کھول کر دیکھا۔ تعویذ کے متبرک اور مقدس کلمات یہ تھے۔

مرا جا شد خرم رہ نیز جا شد
زن دہقان زاید یا نزاید

یعنی مجھے بھی جگہ مل گئی اور میرے گدھے کو بھی، اب زمیندار کی عورت جنتی ہے تو جنے، نہیں جنتی تو نہ جنے مجھے کیا پڑا ہے۔

سلیم۔ یہ خوب عجب تعویذ ہے، لیکن راز کھل جانے پر اس کی اور امیر خسرو کی خوب رسوائی ہوئی ہوگی۔

کلیم۔ یقیناً اس سے بڑھ کر اور کیا رسوائی ہو سکتی ہے کہ یہ تعویذ اب تک بھی تعویذوں کی کتابوں میں موجود ہے اور مستعمل ہوتا ہے۔

سلیم۔ آپ کیا فرماتے ہیں

کلیم۔ میں یہ فرماتا ہوں کہ نقش سلیمانی کے کسی ایڈیشن کو اٹھا کر دیکھو یہ تعویذ درد زہ کے تعویذوں میں لکھا ہوا اور چھپا ہوا موجود نظر آئے گا۔

کلیم کے اس دعوے پر سلیم کچھ عرصہ متردد رہا، اور گرمجوشی سے بحث ہوئی۔ بالآخر کلیم کی راہبری سے جب نقش سلیمانی کا ایک نسخہ نکال کر دیکھا گیا، تو سلیم کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔

سلیم۔ خیر یہ تو امیر خسرو نے ایک لطیفہ کر دیا، لیکن تمام تعویذ تو اس قسم کے نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کو بعض اسمائے الٰہی کے خواص معلوم ہوتے ہیں اور ان خواص سے مطلب برآری کرتے ہیں۔

کلیم۔ نقش سلیمانی کو پھر کھول کر) ان اسماء کے نمونے بھی میں آپ کو بتاتا ہوں، توجہ سے سنئے۔ یا طینبیخ۔ یا طیسین۔ یا ملیسر۔ یا صمصیح۔ یا مصلق یلیا نفضیح۔ یا مرکیع۔ یا شلیخ (دوسرا ورق پلٹ کر) چند اور نمونے بھی اسم اعظم کے ملاحظہ فرمائیے۔ یا کیعلہونشیا، یا اوصعفیہیشیا، یا علہلکہ طلتیشا۔ یا آہنلکعطشیشا وغیرہ وغیرہ۔

سلیم۔ کیا تمام تعویذوں میں یہی کچھ ہوتا ہے۔

کلیم۔ اور جو کچھ ہوگا وہ اس سے بھی بیہودہ تر ہوگا۔

سلیم۔ اسماء کے علاوہ تعویذوں میں اور کچھ نہیں ہوتا؟

کلیم۔ بہت اور بھی ہیں سنئے۔ ۲۰۳ ، ۵۰ ، ۲۲ [illegible] وہی الاسطلعف یا کعل یا معجل [illegible] یہ محبت کا تعویذ ہے اگر معشوق سادہ لوح ہو تو اس پر اثر ہو جاتا ہے لیکن اکبر الٰہ آبادی کے معشوق کی طرح اگر معشوق حسین بھی ہو اور ذہین بھی تو اس پر ان ہتھکنڈوں کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ ایک دو تعویذ اور بھی سنئے بڑے دلچسپ ہیں اور ان کے کلمات سے تقلید پر اگر کوئی تنگ کرے تو اس کے کافر ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ تعویذ سنئے ۸۰ [illegible] ۹۱ یا حشی۔ ایک اور تعویذ یوں ہے ۹۱۳ ل ۹۹ ۱۱ ۲ [illegible] ۸۱۱ ۱۱۱۔

سلیم۔ عجیب تعویذ ہیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ تعویذوں میں اس قسم کی بیہودگیاں ہوتی ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ ان کا اثر کیسے ہوتا ہوگا۔

کلیم۔ اثر ضرور ہوتا ہے اور اثر کرنے والی چیز وہی سجیشن اور آٹو سجیشن ہے یہ علم کیمیا، سیمیا، لیمیا، اور ہیمیا سب آٹو سجیشن پر ہی چلتے ہیں۔

سلیم۔ ہاں بعض یورپین فلاسفر اسے سجیشن اور بعض آٹو سجیشن کہنے پر مصر ہیں اس کی کیا حقیقت ہے۔

کلیم۔ صرف لفظی ہیر پھیر ہے۔ عامل معمول کے دل میں جو خیال پیدا کرتا ہے اس کا نام سجیشن ہے۔ اور معمول عامل کے ذریعے یا خود بخود جس خیال کو اپنے دل میں راسخ کر لیتا ہے اسے آٹو سجیشن کہتے ہیں۔

سلیم۔ کیا سجیشن یا آٹو سجیشن کا اثر ہر ایک شخص پر ہو سکتا ہے۔

کلیم۔ کسی پر کم کسی پر زیادہ اور کسی پر بالکل نہیں۔ بات وہی ہے جو میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں تمام دارومدار عامل کی زبردست شخصیت اور معمول کی کمزوری پر ہے، کمزوری خواہ ذہنی ہو یا جسمانی۔ آپ نے سنا ہوگا عام لوگ کہتے ہیں کہ اگر اعتقاد نہ ہو تو تعویذ وغیرہ اثر نہیں کرتے۔ ضعیف، ضعیف الاعتقاد آدمی جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ ذہین اور زور آور آدمی بعض دفعہ بالکل متاثر نہیں ہوتا اور بعض دفعہ بہت محنت کے بعد تھوڑا سا اثر پیدا ہو بھی جاتا ہے۔

سلیم۔ یورپ والے عام طور پر عورتوں کے مرض ہسٹریا کا علاج آٹو سجیشن

سے کرتے ہیں۔ اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوتے ہیں۔

کلیم:۔ ایشیائی ممالک میں صدیوں سے یہی کچھ ہو رہا ہے البتہ فرق اتنا ہے کہ وہاں یہ فن علمی رنگ اختیار کر رہا ہے اور یہاں اس طریق علاج کو تعلیم یافتہ لوگ دھوکے کی ٹٹی خیال کرتے ہیں۔ مسمریزم وہی مرض ہے جسے ہم لوگ جن بھوت کے اثر سے منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں عورت کو جن آتے ہیں تعویذ نویس فرقہ کے لوگ کئی طریقوں سے جن اتارتے ہیں اور وہ تمام طریقے آٹو سجیشن کے عمل سے ہی بر سر کار۔ لائے جاتے ہیں آپ کو غالباً یاد ہوگا۔ خود ہمارے شہر میں پیر شمس الدین مرحوم اس فن کے استاد مانے جاتے تھے۔ ان کا طرز علاج یہ تھا کہ ایک قسم کے مسالے کے ساتھ جو بے رنگ ہوتا تھا سفید کاغذ پر جنوں اور بھوتوں کی نہایت ڈراونی شکلیں بنایا کرتے تھے اس مسالہ کا خاصہ تھا کہ خشک ہو کر سفید کاغذ پر نظر نہیں آتا تھا اور کاغذ سفید کا سفید معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب اسے آگ کے نزدیک کیا جاتا تھا، تو حروف سیاہ ہو کر واضح ہو جاتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہی سے کاغذ پر تصویریں بنی ہیں، جب کسی عورت نے جن اتارنے کے لئے ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں تو پیر صاحب مریضہ کے پاس بیٹھ کر پہلے کچھ پڑھا کرتے تھے اور پھر آگ منگوا کر اپنے بستے سے ایک سفید کاغذ نکالتے تھے، پہلے اسے آگ کے سامنے کرتے اور گھر والوں کو اور مریضہ کو بتاتے کہ دیکھو، جن جس نے مریضہ پر قابو پایا ہے، حاضر ہو گیا ہے پھر اس کاغذ کو آگ میں ڈال کر جلا ڈالتے اور کہتے کہ جن جل گیا ہے، اب مریضہ شفایاب ہو جائے گی، گھر والوں کو اور مریضہ کو یقین ہو جاتا تھا کہ دشمن مغلوب ہو کر تباہ ہو چکا ہے، جب یہ خیال مریضہ کے دل میں جاگزیں ہو جاتا۔ . . تو وہ دل ہی دل میں کہنے لگتی کہ اب میں تندرست ہو جاؤں گی، چنانچہ نتیجہ یہ ہوتا کہ مریضہ چند دنوں میں اچھی بھلی ہو جاتی تھی، یورپین معالج ایم کوئے بھی اپنے مریضوں کو یہی سبق دیتا ہے کہ دل میں خیال کرو۔ کہ روز بروز میں ہر طرح سے بہتر اور بہتر ہو رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایم کوئے کے طریق علاج سے پیر شمس الدین کا طریقہ زیادہ موثر اور زیادہ زود اثر ہے۔

کلیم:۔ اسے فریب کہو یا کچھ اور، ہوتا یہی کچھ ہے، پنجاب کے مشہور بزرگ پیر . . . ! . . . شاہ صاحب ابھی اور بھی اُس کالج لاہور میں تعلیم پاتے تھے کہ ان کے ناصیہ میں پیری کا ستارہ چمکا تھا، ایک روز بورڈنگ ہاؤس کے ساتھ والے محلہ سے ایک آدمی اپنی لڑکی کا جن اتروانے کے لئے ان کو گھر لے گیا، پیر صاحب باہمہ کروفر تشریف لے گئے، مریضہ کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر تک یا لطیف یا اور یا عصفوجیا وغیرہ اسمائے اعظم کا ورد کرتے رہے پھر مریضہ کو اور اس کے گھر والوں کو کہا کہ اب جن حاضر ہونے والا ہے۔ نہایت ڈراونی وضع قطع کا ہے تم لوگ اسے دیکھ کر گھبرا جاؤ گے، آنکھیں بند کر لو چنانچہ سب نے آنکھیں بند کر لیں۔ پیر صاحب نے جیب سے مینگنیز پوٹاش کا ایک گولہ نکال کر صحن کی دیوار پر زور سے مارا سخت دھماکا ہوا سب نے آنکھیں کھول دیں اور پیر صاحب نے فرمایا کہ جن حاضر ہوا تھا۔ قتل کر دیا گیا ہے، اب مریضہ انشاء اللہ تندرست ہو جائے گی۔ چنانچہ فی الحقیقت مریضہ چند روز میں تندرست ہو گئی، اور پیر صاحب کی کرامات کا چرچا عام ہو گیا، ابتدا یہ تھی اب انتہا یہ ہے کہ آج کل پیر صاحب تمام ہندوستان کا دورہ فرماتے ہیں اور شیخ سعدی کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مریدوں کو ترک دنیا کی تعلیم دیتے ہیں وہ خود سیم اندوزی اور غلہ اندوزی اس شدت سے کرتے ہیں کہ لاکھوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں، یہ سب آٹو سجیشن کے کرشمے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نبخشد خدائے بخشندہ

سلیم:۔ پھر ماحصل کلام یہ ہوا۔ کہ یہ سب طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ معمول کے دل میں ایک خیال پیدا کیا جائے، اور پھر اس خیال کو یقین کے درجے تک پہنچایا جائے۔

کلیم:۔ بالکل بجا۔ نفس شعوری کے خیالات کو جب نفس غیر شعوری اپنے اندر جگہ دے کر انہیں روز بروز مضبوط کرتا جاتا ہے تو اس خیال کے اثرات آدمی کے جسمانی، اور قلبی عوامل پر ظہور پذیر ہونا شروع کر دیتے ہیں خلاصہ یہ کہ:۔ ؎ من کے ہارے ہار ہے اور من کے جیتے جیت

سلیم:۔ شکریہ (اٹھ کر)

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

میر ولی اللہ ایڈوکیٹ

(ایبٹ آباد)

آؤ

ساون میں جدائی کی ایک رات

(۱)

آؤ مری جان آ بھی جاؤ — ساون کی گھٹا میں چھپ کے آؤ
یہ سرد ہوا یہ مست بارش — آؤ ورنہ ہمیں جلاؤ
عالم جس سے مہک گیا تھا — ہاں پھر اسی طرح مسکراؤ
کاکل کے خم میں ہے اندھیرا — دریا انوار کے بہاؤ
ذرے ذرے میں نور بخشو — ذرے ذرے کو جگمگاؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۲)

کالی کالی گھٹائیں توبہ — دست رنگیں ادھر بڑھاؤ
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں توبہ — کچھ تم پیو کچھ مجھے پلاؤ
جو ساز بچے کچے ہیں — آؤ اور ساتھ انہیں بھی لاؤ
جھم جھم ساون برس رہا ہے — چھم چھم کرتے چلے بھی آؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۳)

چھیڑی ہے فضا نے راگنی سی — تم بھی اپنا رباب اٹھاؤ
قدرت سو گیت گا رہی ہے — آؤ تم بھی ملہار گاؤ
پژمردہ ہے فطرت ترنم — پھر دھن میں ہماری گنگناؤ
وہ نظم جو ہم نے کل کہی تھی — بوندوں کے ستار پر سناؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۴)

تاریک ہے شمع دل جہاں تک — دیکھو مجھے اور مسکراؤ
دل نے خرمن پہ مسکرا کر — ہے آگ کی بجلیاں گراؤ
ہلکی سی لطیف سانس لیکر — گہری فکروں میں ڈوب جاؤ
پھر دوں جہاں سے ہچکی کھو دو — آنسو آنکھوں سے پھر گراؤ
راز عرش فاکہ ہر سو ہے — نمناک نگاہ سے بتاؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۵)

پھر کعبۂ عشق کردو تعمیر — مندر پھر پریم کا بناؤ
پھر سجدے ہوں بار بار اور ہم — پھر تم رو رو کے روٹھ جاؤ
پھر اپنے قدم نازنیں سے — ٹھکرا کے ہمارا سر اٹھاؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۶)

قسمت سوتی ہے عاشق کی — اس خفتہ نصیب کو جگاؤ
پھر چھیڑ دو اپنا کوئی قصہ — باتیں باتوں میں پھر گنواؤ
دوری نے کیا ہے نقش پیدا — کل کو پھر حرف دیں ملاؤ
آخر کب تک حجاب ظاہر — باقی پردے بھی سب اٹھاؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۷)

ساون کی اندھیری رات اور تم — آئے ہو تو آکے اب نہ جاؤ
بس وقت کا تو یہ ہے تقاضا — ہم سو رہیں اور تم جگاؤ
ہلکی ہلکی یہ مست بوندیں — کوثر کی پھوار میں نہاؤ
ناگن سی نشاط میں یہ بجلی — للہ سنبھل کے مسکراؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

(۸)

جھینگر کیوں ساز چھیڑتے ہیں — اس ساز کا راز تو بتاؤ
بجلی کیوں مضطرب ہے پیہم — اس کی بے چینیاں مٹاؤ
بادل کیوں گھر کے رو رہے ہیں — ان کی حالت پہ رحم کھاؤ
چمپا دلہن بنی ہوئی ہے — آؤ اس کو گلے لگاؤ
ہستی کل انتظار میں ہے — مقصود حیات بن کے آؤ
سارا عالم بلا رہا ہے — لیکن تم میرے پاس آؤ

آؤ مری جان آ بھی جاؤ

ساغر نظامی

(۷)

عربوں کے احسانات تہذیب یورپ پر

از جناب عنایت اللہ صاحب بی اے

علم تاریخ ہمیں سکھلاتا ہے کہ زمانۂ موجودہ کے حالات اور حیات انسانی کی مختلف متنوع کیفیات نتیجہ ہیں ان واقعات اور حوادثات کا جو زمانۂ ماقبل میں وقوع پذیر ہوئے۔ تہذیب جدید کی روشنی میں اور مغربی تمدن کے دامن میں ہوش سنبھالنے والوں کے لئے زمانۂ حاضرہ کی سائنس کے کمالات، علوم کی فراوانی اور فنون کی ترقیات موجب صد حیرت و استعجاب ہو رہی ہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا اس معراج کمال پر کیونکر پہنچی، اس کی ترقی کی ارتقائی منازل میں کون کون سے اسباب و علل اس کے معاون ہوئے، اس مقصد کے حصول میں کون کون سی قوموں نے کیا کیا فرائض انجام دئے؛ اور کن کن مذاہب نے دنیا کے تمدن کو سنوارنے میں کتنا کتنا حصہ لیا۔ زمانۂ ماقبل تاریخ کے مبہم اور غیر یقینی واقعات سے قطع نظر کر کے جب ہم تاریخ عالم کے ان صفحات کا مطالعہ کرتے ہیں جن میں یکے بعد دیگرے اقوام عالم کی ترقی و انحطاط، سلطنتوں کے عروج و زوال اور مذاہب کے اثر و رسوخ کی داستانیں نہایت واضح طور پر درج ہیں تو یقیناً اس حقیقت سے خبردار ہوتے ہیں کہ تمام ایسی اقوام میں سے جنہوں نے حقیقتاً دنیا کی کایا پلٹ دی اور اپنی حیرت انگیز خداداد قوائے ذہنی سے اپنی ان تھک علمی کاوشوں اور غیر معمولی جرأت شجاعت اور حسن اخلاق سے دنیا میں عظیم انقلاب بپا کر دئے عربوں کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ ہم اس مضمون میں ان کے کارہائے نمایاں، ان کی علمی، ادبی، عقلی، صنعتی ترقیات اور ان کی برکات، ان کی عالمگیر سلطنت کے حالات اور تمدن جدید پر ان کی شاندار تہذیب کے ہمہ گیر اثرات پر ایک چھلتی ہوئی نگاہ ڈالیں گے۔

زمانۂ قبل از اسلام کے عربوں کو ایک قوم سے تعبیر کرنا یقیناً غلطی ہے کیونکہ ان میں سے قومیت کی روح مفقود تھی۔ ان کے لاتعداد قبیلے تھے۔ ہر قبیلہ کا علیحدہ قائد اور علیحدہ خدا۔ ان کی آزادروی، خانہ جنگیاں، جہالت، فسق و فجور، گندی معاشرت اور وحشیانہ رسوم ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ داستان ہے۔ ان کی ضرب المثل خوبیاں اور موروثی عادات حسنہ مثلاً شجاعت، فصاحت اور مہمان نوازی بھی ان کے خوفناک جرائم، خونریزیوں اور بداخلاقیوں میں دب کر رہ گئی تھیں۔ اگر کسی مذہب کی صداقت کا معیار اس کی وہ تعلیم ہو، جو بدترین خصائل والی اقوام کو تکمیل انسانیت کے درجہ پر فائز کر دے، تہذیب و تمدن کی علمبردار بنا دے، علمی و ادبی، اقتصادی، روحانی غرضیکہ کل دینی اور دنیوی ترقیوں کے لئے شاہراہ کھول دے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اسلام جیسا دین فطرت ان عرب جہلا کے لئے ایک غنیمت تھا جس نے انہیں نعمت محبت کا درس دیا، رحم و انصاف، علم و فضل سے آشنا کیا، ان کا مغرور سر ایک خدا کے آگے جھکایا، اور انہیں ایک مرکز پر جمع کیا، اور ان کے ذریعہ اللہ کا آخری پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچایا۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ ان مٹھی بھر عربوں کو صداقت کی وہ طاقت بخشی گئی کہ روم و ایران جیسی زبردست سلطنتیں ان سے ٹکرائیں اور پاش پاش ہو گئیں۔ ان کے . . . فتوحات کا نہ رکنے والا سیلاب دیکھتے دیکھتے مصر، ایشیائے کوچک، شام، ایران، افریقہ، اٹلی، سسلی، اندلس، پرتگال اور جنوبی فرانس تک پہنچ گیا، اور اقصائے عالم میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی۔ انہوں نے دنیا کو رواداری، محبت اور اخلاق حسنہ کا درس دیا، مردہ علوم و فنون کو انہوں نے از سر نو زندہ کیا اور وحشی یورپ اور افریقہ کو تہذیب و تمدن سے روشناس کیا۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ اس قوم کو جو اسی کا نام لے کر دنیا کو غیر اللہ کی غلامیوں سے نجات دلانے کے لئے برسرکار آئی تھی؛



میر و انچھا مر زمین کیام مین



مسافر

دنیا میں ممتاز اور برتر کرتا، اور دنیا کی قیادت کا تاج اس کے سر پر رکھتا، اسی ہدایت یافتہ قوم نے ازمنہ متوسطہ کی تاریکیوں میں علم و فلسفہ اور آزادی خیال کی روشنی پھیلائی، یورپ کی وحشی اقوام کو انسان بنایا، آج ہمارے تمام علوم و فنون کی ترقیاں نتیجہ ہیں عربوں کی مسلسل کاوشوں، زبردست تحقیقات، عمیق مطالعہ اور حیرت انگیز وسعت معلومات اور پر از نتائج اکتشافات اور ایجادات کا جن کے باعث انہوں نے دنیائے تمدن میں عظیم الشان انقلاب پیدا کردیا ہماری جدید سائنس ہمیشہ تشنۂ تکمیل رہتی، اگر غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیاں، نامور علما، فلاسفر، انجینئر، مہندس، ہیئت داں، اساتذۂ طب اور ماہر کیمیا داں پیدا نہ کرتیں، جن کے ہمہ گیر علمی اور اخلاقی اثرات نے یورپ کے نیم وحشی امرا اور جاہل عوام میں پھیل کر انہیں انسانیت کی شاہراہ پر ڈالا، عربی تہذیب جہاں جہاں پھیلی، اقبال، مساعدت اور برکت اس کے ہمرکاب رہی، ایران کو زندگی نو بخشی، ہندوستان کو مغلیہ تخیلات اور بہترین آرٹ کا نگارستان بنا دیا، ہندوستان کا تاج اور اندلس کا الحمرا ایسی عظیم الشان اور نادر الوجود عمارات عالم وجود میں آئیں، ایک فرانسیسی فاضل کا یہ قول کتنا برحق ہے کہ:-

دنیا کی علمی اور تہذیبی تاریخ کا وہ سب سے المناک دن تھا کہ جب تیغ و قلم ہر دو کے علمبردار موریش عربوں کا سیل رواں پائیرنیس کے مقام پر ہمیشہ کے لئے روک دیا گیا اور یہ یورپ کی جاہلیت کی فتح تھی اور اس کی بصیرت کی شکست"

علامہ ایس پی سکاٹ نے ستائیس سال کی محنت شاقہ کے بعد اپنی گرانقدر تصنیف "ہسٹری آف موریش ایمپائر" کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا، وہ لکھتے ہیں کہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں دس ہزار کتب ایسی جمع ہو گئی تھیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلمانان اندلس کے حالات سے مملو تھیں، عربوں کی علمی و صنعتی ترقیوں کا بیان یقیناً ایک ناپیدا کنار سمندر ہے ایک کوزہ میں بند کر دینا بعید از امکان ہے، تاہم کوشش کرتے ہیں کہ ان کے علوم و فنون پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیں، کسی ذاتی تحقیق و تنقید کا دعویٰ نہیں، بلکہ مقتدر مغربی اور مشرقی مورخین کی تصنیفات کا لب لباب سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

(۲)

جس زمانہ میں یورپ، جہالت فسق و فجور اور ظلم و تعدی کی تاریکیوں میں سرگرداں تھا، تعصب مذہبی کی بنا پر مسیحی دنیا میں قتل و غارت اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا، سوائے مذہبی مناظروں کے تمام علوم لوگوں کے دلوں سے محو ہو چکے تھے، اعتقادات کے خفیف سے اختلاف پر نیم وحشی اور بے علم راہبوں اور پادریوں کی مذہبی کونسلیں سزائے موت کے فتوے صادر کیا کرتی تھیں، اور شارع عام میں ایسے ملحد مجرموں کو نذر آتش کر دیا جاتا تھا جب کلیسا کے احکام ملک کے قوانین تھے، اسی زمانہ میں اندلس، صقلیہ اور اطالیہ کے ممالک شاہان اسلام کے زیر سایہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے سرچشمے بن چکے تھے اور فاتح عرب دنیا بھر میں ہر حیثیت سے ممتاز تھے وہاں پر جہالت کو ایک عیب سمجھا جاتا تھا، اور جرم کی مانند چھپایا جاتا، امیر و غریب ہر کس و ناکس کے دل میں حصول علم کا والہانہ جوش اور زبردست اشتیاق پیدا ہو چکا تھا، ان عربوں کی ہمہ گیر قابلیت اور علمی ترقیوں نے ایک عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا، سینکڑوں عظیم الشان کتب خانے، اور متعدد بلند پایہ دارالعلوم قائم کئے گئے جن میں تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم دی جاتی، تحقیق و تدقیق کی مجلس شاندار محافل اور رصد خانے قائم کئے گئے، قدیم لاطینی کتب، فلسفہ اور مقدس کتب مذاہب کے عربی ترجمے کئے گئے، ان کی بے تعصبی، رواداری اور آزادی خیال یورپ کے مختلف حصص سے سینکڑوں طلبا کو کشاں کشاں ان علوم و فنون کے مراکز میں لے آئی، اور صدیوں تک یہ فیضان جاری رہا، کہا جاتا ہے کہ ابن خصیب قرطبی نے علم مابعد الطبیعات تاریخ اور طب پر گیارہ سو کتب تصنیف کیں! ابن حسن فلسفہ اور فقہ کی چار سو کتب کے مصنف ہوئے، آلیات حدیث و فقہ پر لاتعداد کتب شرح لکھی گئیں، بادشاہ خود جید عالم اور علم نواز ہوتے تھے، ان کی علم دوستی اور قدردانی نے ملک میں علمی تحقیق کا ذوق اور علوئے مراتب کی زبردست خواہش پیدا کر دی، علما و فضلا کو بیش بہا انعامات سے مالامال کیا جاتا تھا، اور سلطنت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا جاتا تھا، قرطبہ کے شاہی کتب خانہ کی بیشتر کتب پر خود عبدالرحمٰن ثانی نے اپنے ہاتھ سے حاشئے اور شرحیں لکھیں، الحکم ثانی کے کتب خانے میں قریباً چھ لاکھ کتب موجود تھیں، جن کی نامکمل فہرست کو ۴۴ جلدوں میں ختم کیا گیا تھا، سلاطین یکے بعد دیگرے نشر و اشاعت علوم اور علما کی قدردانی میں سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے، عربوں میں تحصیل علم کی حیرت انگیز مستعدی تھی، جب کسی شہر پر قبضہ کیا جاتا سب سے پہلے مسجد اور مدرسہ کی بنیاد رکھی جاتی تھی، صرف و نحو، فلسفہ، جغرافیہ، علم النفس، علم طب، علم الادویہ، علم الاجساد، علوم نباتات، وحیوانات وریاضی ہیئت، غرضیکہ کوئی شعبہ حیات نہ تھا، جسے انہوں نے اپنی مسلسل تحقیق و تجسس

کامیاب۔ محنت اور غور و فکر سے کہاں تک پہنچ پایا ہوا جہاں جہاں اسلام کے قدم پہنچے، علوم و فنون کی روشنی پھیلی۔ عربوں ہی نے اپنی علمی تحقیقات میں تجربہ اور مشاہدہ کو داخل کیا۔ اپنے اکتشافات کے ذریعہ علوم کو محض ترقی ہی نہ دی، بلکہ اپنی لاتعداد تصنیفات سے ان کی اشاعت کی۔ موسیو۔ سدلی لکھتے ہیں کہ دارالعلوم بغداد کی تعلیم میں سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کی طرز استدلال بالکل علمی اصول پہ مبنی تھی، یعنی معلوم کے ذریعہ سے غیر معلوم کو دریافت کرنا، حوادث کا درست مشاہدہ کر کے معلومات سے علل کو نکالنا۔ ان ہی قضایا کو ماننا جو تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے۔ یہ ان اساتذہ کے اصول تحقیق تھے۔

نویں صدی کے عربوں کو وہ بار آور طریقۂ تحقیق معلوم تھا، جو بہت زمانہ کے بعد ہمارے حال کے محققین کے ہاتھوں میں بڑے بڑے اکتشافات اور ایجادات کا ذریعہ بن گیا"۔ . . . ازمنۂ متوسطا میں انسانی معاشرت اور اخلاق کو بلند ترین درجات پر لے جانے میں، جو کچھ علمی و عملی جانفشانیاں وہ کر گئے رہتی دنیا تک ہماری موجودہ اور آئندہ تہذیب ان کے احسانات سے عہدہ برآ نہ ہو سکے گی، کاش کہ یورپ کی تعصب سے موندی ہوئی آنکھیں ان حقائق کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتیں اور وہ اپنے قدیم استادوں اور کرم فرماؤں کے فیضان کا اقرار کرتے

(۳)

ریاضی اندلسی عرب زبردست ریاضی داں تھے، اس علم کی نشو و نما اور ترقی میں انھوں نے منتہائے شاقہ برداشت کیں سب سے پہلے عربوں نے مدت سال کی صحیح تعین کی ہندی ہندسے اہل عرب ہی نے اختیار کئے اور یورپ میں انھیں رواج دیا، جس سے رومن ہندسوں کا استعمال متروک ہو گیا۔ ابو موسیٰ نویں صدی کا زبردست مہندس گذرا ہے جس نے پہلے پہل علم ہیئت میں ریاضی کو دخل دیا۔ ابن کوریح نے الجبرا کو جیومٹری میں استعمال کیا، کسور اعشاریہ کے قواعد اہل عرب نے مرتب کئے جبیر نے اعداد میں عربی حروف کا استعمال جاری کیا، اور یورپ والوں نے موجد کے نام پر اس علم کو الجبرا کہا، گھڑی کی ایجاد کا فخر اسی ریاضی داں کو حاصل ہوا، علم اقلیدس کے ذریعہ انھوں نے علم مثلثات کی طرف قدم بڑھایا، اور مماس القوس، اور خط قاطع کو معلوم کیا، مساوات کعبی کے مسائل کی طرف توجہ دلائی، جبر و مقابلہ میں عربوں کی ترقیوں نے اس علم کی صورت بدل دی، خلیفہ مامون الرشید نے اپنے ایک درباری مہندس محمد ابن موسیٰ سے ایک عام فہم اور مفصل کتاب اس مضمون پر لکھوائی۔ وہ مسائل ریاضی جن پر عربوں نے زیادہ توجہ دی مختصراً یوں بیان کئے جا سکتے ہیں، کہ علم مثلث میں بجائے جریب اور قطع کے مماس اور خط قاطع کا استعمال کیا، اقلیدس میں جبر و مقابلہ سے کام لیا، مساوات کعبی کا حل کیا، علم مخروطات میں تحقیق کی موسیو شاسیل نے اپنی تاریخ اقلیدس میں عربوں کی ان علمی خدمات کی بہت تعریف کی ہے، اور خصوصاً مماس القوس کے ایجاد کو ایک احسان تسلیم کیا ہے۔

البغدادی نے پیمائش کے اصول وضع کئے، اور بحرۂ روم کا رقبہ نہایت صحت کے ساتھ معلوم کیا گیا، ایڈی رالڈ انگلستان کا ایک راہب، اور ڈینک مارلے نارفوک کا باشندہ، یہ دونوں آکسفورڈ اور پیرس یونیورسٹیوں کے متعلم علی الترتیب گیارھویں اور بارھویں صدی میں تحصیل علم کے لئے اسپین گئے، اور وہاں کے اسلامی دارالعلوم سے ریاضی اور طبیعیات کے علوم سیکھے، اور مدت العمر اپنے ممالک میں انہیں اصولوں کی تعلیم دیتے رہے جو عربوں سے سیکھے تھے ہنری اول کے زمانہ میں فلسفہ، جیومٹری، الجبرا اور علم الکلام کی جو تعلیم دی جاتی تھی، وہ حقیقتاً وہی تھی جو عربوں سے سیکھی گئی تھی۔ اقلیدس کے اصول اور قواعد پہلے پہل یورپ میں عربی زبان ہی میں وارد ہوئے۔

علم ہیئت کے مدارج ارتقاء پر غور کیا جائے تو ہمیں ایشیا کے ان صحرا نوردوں اور بادیہ نشینوں کا سراغ ملتا ہے جنہوں نے پہلے پہل اپنی ضروریات کی بناء پر، اکثر فرصت کی گھڑیاں اختر شماری میں بسر کیں، انھوں نے غیر ارادی طور پر ستاروں کی حرکات اور موسموں کے تغیرات میں ہم آہنگی پائی اور رفتہ رفتہ ان حرکات اور تبدیلیوں کے چند نامکمل اصول مرتب ہو گئے کہا جاتا ہے کہ پہلے پہل ہندوالوں نے اس علم پر فکر و غور کیا، دوسرا خیال یہ ہے کہ مصر والوں نے اولین اصول مرتب کئے، بہر حال یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ بتدریج یہ علم ایران اور شمالی ممالک کی راہ سے یونان پہنچا، مصر میں سب سے پہلے مدرسہ اسکندریہ کی بنیاد ڈالی گئی، جو دنیا میں علم ہیئت کی قدیم ترین درسگاہ مانی گئی ہے ہیپارک یونانی اور بطلیموس مصری جیسے ماہرین فن اسی مدرسہ سے پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنی تحقیقات سے آلات رصد کی ایجاد اور ستاروں کی ترصید سے اس علم کی گراں بہا خدمت کی بطلیموس نے ہیئات کی پہلی جامع کتاب مجسطی لکھی، اور اسی کتاب سے اسلامی علم ہیئت کا دور شروع ہوتا ہے خلافت عباسیہ کے عہد میں یکے بعد دیگرے چار پانچ دفعہ اس کتاب کے عربی ترجمے شائع ہوئے، عمر بن الفرخان، ابراہیم بن صلت اور طرفویش نے

س کتاب کے پہلے مقالہ کی تفصیل لکھی، فاضل نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری نے اس کی شرح تحریر کی اور متعدد علمائے متاخرین نے اس کے شرح لکھیں اور اس میں اضافہ کئے اگر مسلمانوں نے یہ علمی خدمات انجام نہ دی ہوتیں، تو یقیناً دنیا میں قدیم یونانی کتب کا نشان بھی نہ ہوتا۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہے۔ علمائے عرب نے ریاضیات کی بڑی پوری خدمت کی۔ اگر ان کی توجہ نہ ہوتی، تو یونانی ریاضی کتب کا اکثر حصہ برباد ہوگیا ہوتا، لیکن اصل نسخوں کے ضائع ہونے پر عربی تراجم میں محفوظ رہا، مثلاً ورس، سکندرانی استادوں کی تصنیفات بھی یورپ میں عربی سے ہی پہنچیں، المامون کو اس علم سے خاص شغف تھا۔ اسی کے عہد میں باقاعدہ طور پر رصدخانے بنائے گئے یونانی مسائل پر غور کیا گیا، اور تحقیق و ترقی کے باب کھول دئے گئے، مسلمانوں نے یونان، مصر، ایران اور ہندوستان کل ممالک کے علوم ہیئت کو جمع کرکے ان پر جرح و تعدیل کی، ان میں یہ علم اتنا مقبول ہوا، کہ ادنیٰ غلام سے لے کر سلاطین تک کامل الفن استاد اور ماہر ہیئت پیدا ہوئے، ابو معشر کے غلام نے اپنے آقا کی تقلید میں، بردست مطالعہ اور گہرے غور کے بعد ہیئات کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی دو کئی ایک کتابیں لکھیں، ان لوگوں نے اپنی رصدگاہوں میں عجیب و غریب آلات ایجاد کئے، جن میں سے چند ایک کے نام ہی ہم تک پہنچ سکے ہیں، مگر ان کا صحیح استعمال متروک ہونے کے باعث معلوم کرنا دشوار رہا۔ ذات الجیب المشبۃ بالمناطق ربع التام، ذات السمت والارتفاع، ذوات الاوتار، اور حلقۃ الاعتدالیہ وغیرہ وغیرہ رصد مامونی۔ رصد ابی حنیفہ دینوری، رصد حاکمی۔ رصد بیرونی، رصد طوسی رصد الغ بیگ، متعدد رصدگاہیں اسلامی سلطنتوں کے زیر اہتمام بنائی گئیں اور تحقیق کا سلسلہ جاری رہا، حاکم بامر اللہ کے عہد خلافت میں ابن یونس ایک ماہر ہیئت گذرا ہے، اس کی کتاب جدول الحاکمیہ فرانس میں طبع ہوئی، اس کے حالات میں ڈورو تین کرنلیس فانڈریک لکھتا ہے، ابن یونس نے مصر میں ہیئات کے جو طریقے استعمال کئے جن کو ابن یونس سے اس کے بعد یورپ کے ہیئت دانوں نے اخذ کیا، مزید براں علم ہیئت کی متعدد عربی اصطلاحات ایسی ہیں جو آج تک یورپ میں مستعمل ہیں، مثلاً اسطرلاب۔ العضادہ، السموات، الرجل، النہر الطائر، آخر النہر، راس الغول وغیرہ

مسلمانوں نے ہی پہلے یونان کے فلسفہ ہیئت کے باطل اصولوں سے انکار کیا اور ان کی تردید کی۔ وہ آسمان کو روح اور واقعات عالم سے باخبر دار مانتے تھے اور ستاروں کے خاص اثرات کے قائل تھے، سبع سیارات کی ترتیب میں اختلاف چلا آتا تھا یونانی قدماء کی رائے تھی کہ عطارد اور زہرہ آفتاب کے اوپر ہیں، مسلمانوں میں محی الدین راصد مراغہ اور علامہ قطب الدین کا خیال تھا کہ آفتاب دونوں سیاروں کے درمیان ہے بطلیموس نے اندازاً آفتاب کو دونوں کے اوپر بتلایا، مگر کوئی دلیل نہ پیش کرسکا، آخر مسلمانوں نے اپنے مشاہدات سے موخرالذکر رائے کی تائید کی ابو عمران البغدادی محمد بن عبدالکریم اور ابن باجہ اندلسی نے مختلف زمانوں میں دونوں سیاروں کو آفتاب کے نیچے دیکھا، یہی زمانہ حال کی تحقیق ہے کہ عطارد آفتاب سے سب سے قریبی سیارہ ہے یا اسی طرح بطلیموس نے شمسی سال کی مدت کا تعین کیا، مختلف زمانوں میں، ومختلف ممالک میں تحقیقات کی گئیں مگر مسلمانوں کی تحقیق کا نتیجہ بطلیموس اور ہیئت جدید مسلمات سے بہایت قریب رہا، جس میں صرف چند سیکنڈ کا فرق تھا۔ ابوالوفا نے سب سے پہلے چاند کی حرکات پر غور کیا، اور ان میں اختلافات اور اضطرابات پاکر مبادرۃ السرعۃ کی دریافت کی، اور فن ہیئت میں یہ ایک زبردست انکشاف تھا۔ ابو عبداللہ بن محمد جابر بتانی نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ زمین کا نقطہ الراس اور نقطۃ الذنب ہمیشہ بدلتا رہتا ہے، اس ہیئت داں کے تمام انکشافات اور علمی معلومات خود اسی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانہ روما میں موجود ہیں، جن کا لاطینی ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔ یہ ایک زبردست محقق اور رصد کے ماہر گذرے ہیں جنہیں یورپ والوں نے بطلیموس کے بعد دوسرے درجہ پر جگہ دی ہے آفتاب اور ماہتاب کو بے داغ مانا جاتا تھا، ابن رشد نے سب سے پہلے یہ کہا اور ثابت کیا کہ دونوں کے چہرہ پر سیاہ داغ ہیں، ہیئت جدید نے اسے تسلیم کیا، اور ان کے داغوں کی وجوہ اور ان کی اشکال بتائیں، المنصور کے عہد میں احمد بن عبد النہاوندی نے اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر زیچ تیار کی جو یونانی اور ہندی مسلمات سے زیادہ صحیح اور بالاتر تھیں، ربیع ابن حضرہ اور الفانسو دہم جیسے ماہرین فن کو عربوں کی شاگردی کا فخر حاصل تھا، اور ان کی تمام تر علمی ترقیاں اور تصنیفات اپنے استادوں کے فیضان کا نتیجہ تھیں، ابوالحسن بن الحسن گیارہویں صدی کا مشہور ہندسہ داں و ہیئت داں تھا جس نے نگاہ اور روشنی کے وہ تمام اصول مرتب کئے جن پر تحقیق جدید کا دارومدار ہے۔

بغداد کے مدرسہ ہیئت کا قیام ۱۵۰ سال رہا، یہاں کی آخری تالیفات میں سے زیچ الغ بیگ ہے جو اپنی صحت کے لحاظ سے آجتک قابل قدر خیال کی جاتی ہے گرے گری کی تحقیق کے بموجب ایک سال میں دس ہزار برس

کی مدت میں تین دن کا فرق آتا، مگر عربوں کے سال میں اسی مدت میں دو دن کا فرق تھا۔ البتانی نے [illegible]ء میں آفتاب کے نقطہ اوج کو دریافت کرنے کے لئے ۲۰ اہم مشاہدات کئے، اور نہایت صحت سے یہ معلوم کیا کہ سال میں استقبال معدین النہار میں ۵۰ ثانیہ کا فرق پڑتا ہے۔ موسیو سدیو کا خیال ہے کہ ستاروں کے دوازحرکت کا بیضوی ہونا اور زمین کا آفتاب کے گرد گھومنا یہ دونوں مسائل عربوں نے کپلر اور کوپرنکس سے پہلے معلوم کر لئے تھے۔ روایت ہے کہ قاہرہ کے کتب خانہ میں دو کرۂ سماوی اور چھ ہزار کتب ریاضی اور ہیئت موجود تھیں۔ مگر آج ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ کلیسا کی معاندانہ تباہ کاریوں نے ان خزائن کو لوٹ لیا اور برباد کر دیا۔

۴

اس سے پیشتر کہ عربوں کی طبی ترقیوں پر روشنی ڈالی جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی جہالت کا نقشہ کھینچ کر یہ بتلا دیا جاوے کہ چھٹی اور ساتویں صدی میں ان تہذیب کے دعویداروں کی طبی معلومات کہاں تک محدود تھیں۔ ان کی صحت کیسی تھی اور ان کے یہاں حفظان صحت کے کیا اصول تھے۔

اس زمانہ میں قدیم طبی تصنیفات پیروان کلیسا کے غارتگر ہاتھوں برباد ہو چکی تھیں۔ اگر کچھ باقی تھیں تو پرانے تاریک گرجوں اور گرجاؤں کے ویران گوشوں میں، اس طرح پوشیدہ کر دی گئیں تھیں کہ یہ علوم خواب وخیال ہو چکے تھے اور اسکندریہ کے طبی مدارس کی شہرت اور علمی خدمات کی یاد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی تھی۔ مسیحی دنیا میں کئی صدیوں تک یہ علم محض علوم نجوم اور جادو کی ایک شاخ سمجھا جاتا رہا۔ پادریوں نے جہلا کو اس فریب میں مبتلا رکھا کہ بیماریاں صرف گناہوں کی سزا ہیں اور ارواح خبیثہ کے سایہ اور حلول سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہی خیال اور عقیدہ قرنوں تک علم طب کی بیداری اور ترقی میں مانع رہا۔ ان کے نزدیک بیماریوں کا یہی علاج تھا کہ مریضوں پر متبرک پانی چھڑکا جاوے، دعائیں پڑھی جاویں اور متبرک مقامات اور شہداء کے مزاروں کی زیارت کی جاوے، اور وہاں طلب شفا کے لئے دعائیں کی جاویں اور اسی طرح مختلف امراض کے علاج کے لئے علیحدہ علیحدہ اولیاء کی قبور مخصوص ہو چکی تھیں، تبرکات سے دردوں کو دور کیا جاتا، اور خیرات کی تلقین کی جاتی تھی۔ لاعلاج امراض میں مجاہدے کرائے جاتے تھے اور مخصوص چشموں اور کنوؤں کے پانی کو استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک عجیب حماقت تھی کہ خنازیر اور غدودوں کے امراض کا علاج صرف بادشاہوں کے پاس محفوظ سمجھا جاتا تھا، کہ بادشاہ ایک خاص دعا پڑھ کر جسم کے بیمار اعضاء کو چھو دیتا تھا۔ یہ تو تھے ان پادریوں کے کارنامے جو اپنے ہر ایک کام کو مذہبی تقدیس اور روحانیت کے پردے میں انجام دیتے تھے، اور اس طرح بادشاہوں پر عوام پر اور ان کی زندگی کے ہر شعبہ پر تسلط جمائے ہوئے تھے اپنی ان فضول خدمات کے عوض میں مریضوں سے وہ بیش بہا رقوم حاصل کرتے تھے اور انہیں گوارا نہ تھا کہ ان کے یہ طلسماتی جال ٹوٹیں۔ دوسرا گروہ ان مکار شعبدہ بازوں کا تھا جو اس زمانے کے وہمی اور سریع الاعتقاد طبقہ پر اپنے جادو کیمیا گری اور علم نجوم کا سکہ بٹھائے ہوئے تھے امراض اور ان کی تشخیص کا دار ومدار اجرام فلکی کی حرکات پر سمجھتے تھے۔ ان کی شکارگاہیں خفیہ ہوتیں کیونکہ ان کے اکثر اعمال اور احکام میں کلیسا سے انحراف ہوتا اور اس طرح وہ قانون کے پنجے سے ہمیشہ محفوظ رہتے۔ محبت، عداوت اور خفیہ زہر خورانی کے معاملات میں انھیں کمال حاصل تھا۔ قرون وسطیٰ میں ان کے جرائم اور قابل نفریں اعمال حد سے بڑھے ہوئے تھے اور بارہا یہ معلوم ہوا کہ بادشاہوں اور امرا کی ناگہانی اموات میں ان کا ہاتھ ہوتا تھا، اس طرح اکثر سلاطین بھی ان سے خائف رہتے تھے۔ ان دونوں دغاباز گروہوں کے ہاتھوں میں لوگوں نے اپنی صحت دے رکھی تھی، دونوں گروہ تعویذ گنڈے اور عملیات علوی وسفلی سے امداد طلب کرتے تھے، نہ تشخیص نہ دوا، ہاں ستاروں کی حرکات اور طلوع وغروب پر توجہ دی جاتی، اور وہی بخورات کا دھواں، پانی کا چھڑکنا، زیارت اور مریم کا سلام علاج کی انتہا تھی، اور لطف یہ کہ ناکامیوں کو مریض کی مفروضہ اعتقادی کمزوری میں چھپا دیا جاتا۔ غلیظ بازار اور گلیاں، تنگ وتاریک مکانات نجس جراثیم سے لبریز گندا پانی عفونت سے بھرے ہوئے صحن اور راستے لباس کالعدم، یہ تھا یورپ کا تمدن اور معاشرت، وبائیں آتیں اور آناً فاناً ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتیں، جذام اور دیگر متعدی امراض ہمیشہ ہی وراثتاً چلی جاتیں اور نابود نہ ہوتیں۔ سنہ ۱۲۵۰ء میں صرف فرانس میں دو ہزار اور کل یورپ میں ۱۹ ہزار جذامی خانے تھے، یہ صرف علم طب کے فقدان اور حفظان صحت کے اصول سے ناواقفیت کا نتیجہ تھا۔ اس کے برعکس اور اس سے بہت پہلے مشرق اور خصوصاً عرب میں دوا اور علاج کا طریقہ جاری تھا، اسلام کے پیروان میں مذہبی بیداری کے ساتھ ہی دیگر علوم کی طرح علم طب کا بھی چرچا ہوا۔ صفائی اسلام کا ایک اصول ہے اور اس کے بیشتر احکام حفظان صحت کے ممد ومعاون ہیں، ارشادات نبوی میں اکثر نہایت بیّن اصول صحت بیان کئے گئے ہیں۔ گندگی اور فضول اغذیہ کو امراض کی جڑ اور معدہ کو

فن کا مخرج قرار دیا ہے، خلیفہ المامون نے سب سے پہلے علم طب کی ترقی و تحقیق کی جانب توجہ دی، دنیا کے مختلف حصص سے مشہور معالج اور اساتذہ طب جمع کئے اور جہاں جہاں سے طب کی کتب و رسائل مہیا ہو سکے فراہم کئے، بہترین مترجم مقرر کئے اور جالینوس اور دیگر یونانی اطبا کی تصانیف کو عربی جامہ پہنایا، کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا شفاخانہ بغداد میں کھولا گیا تھا۔ عربوں کی بیشتر طبی تصنیفات زمانہ کی دستبرد سے اس طرح بچ گئیں کہ وہ مختلف یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہیں، ورنہ دیگر علوم کی طرح چند خفیف آثار کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہوتا۔

نویں صدی میں الرازی ایک مشہور ماہر علم کیمیا و طب گذرا ہے جس نے ۵۰ سال تک بغداد میں مطب کیا، بخار، ورم اس کی مختلف اقسام اور علاج پر بہت کتب تصنیف کیں، کتاب الاحفال، اپنی نوع کی پہلی کتاب تھی جو اس نے لکھی تپ محرقہ میں ٹھنڈے پانی کا استعمال اس نے تحقیق کیا، جسے ہم آج صدیوں کے بعد ضروری خیال کرنے لگے ہیں، اس کی مشہور کتب میں سے برالاعظم اور المنصوریہ ہیں، جن میں تشخیص امزجہ و امراض، غذا، معالجات، حفظان صحت جراحی، سمیات، بخار اور دیگر امراض عامہ کے مختلف ابواب نہایت بالتفصیل لکھے گئے ہیں، اس کی کتاب جو مرض چیچک پر لکھی گئی تھی، اس بیماری کی قدیم ترین کتاب مانی گئی ہے، اس کی اکثر کتب سولہویں صدی میں لاطینی و فرانسیسی میں ترجمہ ہوئیں، مدت دراز تک یورپ کے طبی مدارس میں الرازی و بو علی سینا کی کتب بنائے تعلیم رہیں ابن سینا اطبائے عرب میں سے مشہور ترین شخصیت گذری ہے جس کی متعدد طبی تصنیفات میں سے سب سے بڑی تصنیف قانون ہے جو بحیثیت حفظ صحت، امراض، معالجات اور خواص الادویہ جیسے علوم سے لبریز ہے اس کی تصانیف کا ترجمہ تقریباً کل دنیا کی زبانوں میں ہوا، درخصوصاً فرانس اور اٹلی میں ۱۷ صدی تک انہیں کتب کی بنا پر تعلیم و تدریس ہوتی رہی۔ ۱۱۰۰ ۱۲ صدی میں قرطبہ کا ابوالقاسم زبردست جراح گذرا ہے اس نے بہت سے آلات جراحی ایجاد کئے اور پتھری نکالنے کا عمل معلوم کیا، ہالر کے قول کے مطابق ۱۴ صدی کے کل جراحوں کا دارومدار اسی کی تصانیف پر رہا۔ جن میں زخم کو جلانا، چاقو سے چیرنا، دانتوں اور آنکھوں کی جراحی، فصد، بچے جنانا، ہڈی کے ٹوٹنے اور اکھڑ جانے کے متعلق واضح اور درست عملی ہدایات درج ہیں، اس کی اکثر کتب کئی بار لاطینی میں ترجمہ ہوئیں، ابن رشد نے جو ۱۲ صدی کا زبردست فلسفی گذرا ہے ابن سینا پر شرحیں لکھیں، تریاق، سمیات اور حمیات پر اس کی متعدد کتب یورپ میں ترجمہ ہوتی رہیں۔

ابن زہر اشبیلی نے سب سے پہلے یہ معلوم کیا کہ جسم انسان میں ایک خاص قسم کے جراثیم کم ہو جانے سے خارش ہوتی ہے اس کی دوا گندھک تجویز کی، محمد التمیمی کی کتاب متعلقہ فتق اور رسولی ۴۰۰ صفحوں میں ختم ہوئی، وہ لوگ ہمیشہ آسان، سادہ اور معمولی علاج کو ترجیح دیتے، قدرت کے شفابخش اثرات کو قبول کرنے کی ہدایت کرتے اور کئی امراض میں محض تبدیلی آب و ہوا کو کافی خیال کیا جاتا تھا۔ علاج چشم میں وہ ماہر ترین جراح گذرے ہیں، ان کی جراحتیں اور عمل ہمیشہ کامیاب رہے نزول الماء کی نو قسمیں معلوم کیں، خون کے روکنے کے لئے شریانوں کو باندھ دینے کا دستور رائج تھا، فالج اور سکتہ کے لئے جونکیں لگانا عام علاج تھا، دسویں صدی میں ابوالقاسم نے جسم کا وہ مقام تجویز کیا، جہاں سے چیر کر مثانہ کی پتھری نکالی جائے، اب تک اسی پر عمل ہو رہا ہے انہی لوگوں نے یورپ کو علم الادویہ سے روشناس کیا، ابن العوام نے اپنی کتاب میں چھ سو بوٹیوں کا نام بتلایا، ابن بیطار نے ۲۰۰۰ سے زائد دوائیوں کا ذکر کیا ہے، ابن اسودی نے اپنی کتاب میں خشک بوٹیوں کی تصاویر بنائیں، اور یہ کتاب شاید ممالک عربیہ میں پہلی رنگین مصور کتاب تھی انھوں نے علم طب کی اس شاخ پر علم نباتات کے اصول کا اطلاق کیا، اور مختلف دواؤں کے عرقوں اور جوشاندوں سے بعض بوٹیوں کو پال کر ان کے پھلوں اور پتوں کو استعمال کیا، بہت قسم کے ضماد اور مرہمیں انہی سے ہم تک پہنچی ہیں، مختلف اقسام کے شربت، معجون ضماد، عرقیات، متعدد مفرد اور مرکب ادویات، مثلاً سنا، راوند چینی، تمر ہندی، کچلا، حب القرمز، کافور، الکحل وغیرہ انہیں کی ایجاد اور تحقیقات کے نتائج ہیں، آج امریکہ کو اپنی دندان سازی پر ناز ہے، مگر اس سے صدیوں قبل مسلمانوں میں سے بہترین جراح اور معالج دندان ہو گذرے ہیں، انھوں نے کئی کوشش سے نہایت مفید اور خوشبودار منجن تیار کئے، ابوالقاسم نے ہی ماسخوڑہ کی شناخت کی، ضائع شدہ دانتوں کے خلا کو بھرنے میں سونا وغیرہ دھاتوں کو استعمال کرتے، اور اس زمانہ میں جب یورپ کے اطبا دانت کے درد کو دور کرنے کے لئے مخصوص منتر پڑھتے اور مریض کے جبڑوں پر تحریر کرتے تھے، اس سے بہت قبل مسلمان حکما نے بہت عجیب و غریب دوائیاں اور نسخے تجویز کر رکھے تھے، ان کے شفاخانے نہایت وسیع ہوادار، اور کامل اصول صحت پر تعمیر ہوتے جن میں باغات، فراخ صحن اور فوارے بنائے جاتے تھے، اور متعدی امراض کے لئے بالکل علیحدہ کمرے

مخصوص ہوتے۔ ان شفاخانوں کے متصل طلباء کے لیکچر روم ہوتے جنہیں درسی تعلیم سے زیادہ عملی تعلیم دی جاتی۔ الرازی کو جب کہا گیا کہ بغداد میں شفاخانہ تعمیر کرنے کے لئے بہترین مقام تلاش کرے تو اس نے شہر کے مختلف حصص میں گوشت کے ٹکڑے لٹکا دئے اور جس مقام کا گوشت سب سے زیادہ دیر میں سڑا، وہ مقام آب ہوا کی صفائی کے لحاظ سے بہترین تجویز کیا گیا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کو کیسے سائنٹفک اصول پر ترقی دی۔ ان کے مقاصد کتنے بلند اور طریقہ ہائے تحقیق کتنے سادہ اور پر از نتائج ہوتے، شفاخوں کے مصارف کی ذمہ دار حکومت ہوتی تھی اور شاہی اطبا ان کے نگران مقرر ہوتے، ان ممتاز عہدوں کے لئے مسلمان ہونے کی شرط نہ تھی بلکہ اکثر خلفا کے ذاتی طبیب یہودی اور عیسائی ہوتے تھے۔ گیارہویں صدی میں مدرسہ طبیہ بغداد میں طلبا کی تعداد چھ ہزار تک پہنچ گئی تھی، اصولی طور پر ایک طریقہ علاج بارہا تجربات کے بعد نافذ کیا جاتا، ادیب بن سعید نے فن قابلہ اور امراض نسواں پر بڑے بڑے رسائل لکھے، اور ابن زہر کا خاندان تین سو سال تک اندلس میں اپنی طبی معلومات اور خدمات کے لحاظ سے ممتاز مانا جاتا رہا۔ گو مشرقی خلفاء کے عہد میں تشریح الابدان کے علم کی ترقی میں ایک قیاسی بے حرمتی اور تعصب مانع رہا، مگر اندلسی عربوں نے اس کی تقلید نہ کی، اور اندرونی اعضاء انسانی کے افعال کو جاننا ضروری سمجھا۔ ہڈیوں کے ڈھانچ دیکھتے دیکھتے علم الاجساد کی طرف توجہ کی اور جانوروں اور سزا قصاص یافتہ لوگوں کی لاشوں کو چیر کر ان اہم مقاصد کو بخوبی حاصل کیا۔

غرضیکہ اسلامی دنیا میں سینکڑوں محقق علم طب گذرے جنہوں نے اس شریف پیشہ کو چار چاند لگائے، اور اس علم کو اوج کمال پر پہنچایا، خلفاء کے دربار میں یہ لوگ بڑے بڑے عہدوں پہ فائز ہوتے اور ان پر انعام واکرام کی بارشیں ہوتیں، حنین نے جتنی کتب یونانی سے ترجمہ کیں مامون نے ان کے عوض میں سونا تول کر دیا، یہی باعث تھا کہ یہ لوگ طمع لالچ سے بے نیاز ہو کر کام کرتے، اور مرتے وقت سینکڑوں کتب اپنی یادگار چھوڑتے، ڈاکٹر اکلرک اپنی تاریخ طب عرب میں تین سو سے زیادہ تصانیف کا ذکر کرتے ہیں جن کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا، اور اسی طرح قدمائے یونان کی کتب بھی محض عربی ترجموں کے ذریعہ یورپ تک پہنچیں، موسیو لی بری لکھتے ہیں، کہ اگر عربوں کا نام تاریخ سے نکال دیا جاتا، تو یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کئی صدی تک پیچھے ہٹ جاتی۔

(۵)

ان علمائے عرب کے ناموں اور ان کے علمی کارناموں کو شمار نہیں کیا جا سکتا جنہوں نے فلسفہ، طبیعیات، والٰہیات وغیرہ دقیق علوم میں کمال حاصل کیا اور بڑی بڑی ضخیم کتب اپنی یادگار چھوڑیں، شروعات میں ان کا فلسفہ محض علم روحانیات تک محدود رہا، مگر دینیات کے تمدن میں داخل ہوتے ہی انہوں نے ارسطو، سقراط، ہرقل، اپی کیورس، ایمپے ڈاکلیز وغیرہ کل یونانی فلاسفہ کی تصنیفات کا عربی ترجمہ کیا، اور دیگر علوم کی طرح اس میں بھی کافی ترقی کی، فلاسفہ عرب کی قدر و منزلت گو دارالعلوموں میں بہت کچھ تھی، مگر عوام کے نزدیک ان کی اکثر تعلیمات اور اقوال مائل بہ الحاد تصور کئے جاتے تھے، گو وہ اپنی تحریرات میں کس قدر محتاط تھے تاہم اظہار حقیقت میں بارہا وہ ایسے فقرات لکھ جاتے جو عوام کے نزدیک قابل اعتراض ٹھہرتے، اور یہ اعلیٰ ترقی کے رستہ میں ایک بھاری رکاوٹ تھی، دسویں صدی کے ابو علائے تنوخی کا قول مشہور ہے کہ دنیا میں دو ہی قسم کے آدمی ہیں، ایک تو وہ جن میں عقل ہے اور مذہب نہیں اور دوسرے وہ جن میں مذہب ہے اور عقل نہیں، بالآخر مذہب کو فلسفہ و معقولات سے بالکل علیحدہ کر دیا گیا، اور مشہور فلسفی امام غزالی نے نہایت عمدگی سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا کہ ہمارے دائرہ فہم سے خارج ایک اور دائرہ مکاشفات ربانی ہے جس کے اسرار سے گو ہم ناواقف ہوں، مگر اس کے وجود کو مان لینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا، اور ایسے حقائق بھی موجود ہیں جن تک ہماری عقل مطلق نہیں پہنچ سکتی، اور ہم استدلال منطقی سے انہیں ہرگز دریافت نہیں کر سکتے۔ ابن رشد ان ممتاز ترین فلاسفہ عرب میں سے ہیں جن کی تعلیمات کا اثر یورپ پر بہت پڑا ہے۔ انھوں نے ہندی فلسفہ میں کمال کا درجہ پایا اور یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ ان کی شرح ارسطو یقیناً متن سے بڑھی ہوئی ہیں اور یہ شارح بہت سے اہم مسائل پہ ارسطو سے سبقت لے گیا ہے، اور اس کی رائے کو بہتر مانا جاتا ہے، الٰہیات، فقہ، فلسفہ و طب کی ان کی متعدد کتب موجود ہیں اور ان کی تعلیمات کا اثر بھی ابھی تک محو نہیں ہو سکا خصوصاً یہودیوں نے ان کی حد سے سوا عزت کی، اور ان کی کل تصانیف عربی زبان میں ترجمہ کر ڈالیں، ۱۴-۱۶ صدی تک پیرس اور پیڈوا یونیورسٹیوں کی تعلیم کا انحصار انھیں کی تعلیمات پر رہا، المنصور باللہ کے عہد میں وہ افسر الاطباء کے عہدہ پہ فائز رہے اور عرصہ تک قرطبہ میں قاضی القضاۃ کے فرائض انجام دیئے یہودیوں نے ان کے نظریوں کو یورپ میں پھیلایا، اور یہی یورپ کی ذہنی

ترقی کا بنیادی پتھر ثابت ہوئے، شروع شروع میں مسلمان علما کی مانند کلیسا والوں نے بھی ان کی تعلیمات سے احتراز کیا، اور کفر و الحاد گردانا، مگر یہ سب کچھ بیکار تھا، ان کے فلسفہ کے اثرات کی حقیقت آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتے رہے۔ یہ اسی فاضل عربی فلسفی کا قائم کردہ اصول ہے، کہ ہر امر کو مشکوک سمجھو اور ہر تحقیقات میں انصاف کو مدنظر رکھو، مسئلہ بقائے روح کے متعلق وہ نہایت آزاد خیال واقع ہوئے تھے، ان کے خیال میں عقل کل قائم اور جسم سے علیحدہ ہے عقل شخصی فانی اور جسم کے ساتھ فنا ہونے والی ہے، اس لئے تصور انسانی کو فنا لازم ہے، عقل جو خود باقی ہے ادراک کی قید میں آ کر فانی ہو جاتی ہے، وہ کہتے تھے کہ جزائے العقبیٰ کی امید باندھ کر نیک کام کرنے کا یہ مطلب ہے کہ نیکی چنانچہ بنفسہٖ کوئی چیز نہیں، لہٰذا جسمانی اس خیال سے نیکی کرنا گویا اس کا چند در چند معاوضہ ملیگا، یہ کہاں خطرناک اور غلط خیالات کا منبع ہیں، ان کے فلسفہ اور الٰہیات کی کتب کو جرمنی میں ۱۸۸۵ء میں جے مولر نے شائع کیا ان کی شرح ما بعد الطبیعات ارسطو کو ۱۲۳۵ء میں جیکب نے نیپلز میں ۱۲۴۷ء میں سلیمان نے طلیطلہ میں، اور ۱۲۶۰ء میں موسیٰ نے لیونل میں ترجمہ کیں، اور عبرانی اور دیگر زبانوں میں شائع کیں۔

ان کے علاوہ ابن سینا ایک بلند پایہ محقق اور فلسفی گذرے ہیں ۱۶ برس کی عمر میں انہوں نے حیرت انگیز ترقی اور کسب کمال کر لیا تھا، اور بائیس برس کی عمر میں وہ سلطنت کے وزیر اعظم مقرر ہوئے، اور سائنس، دینیات، ریاضی، ہیئت، علم الابدان، منطق، قانون، سیاسیات، اور موسیقی پر زبردست تصانیف چھوڑیں علم الحیوانات پر ان کی کتاب کا ترجمہ میکائیل سکاٹ نے کیا، ان کی طبی تصانیف کو روم میں شائع کیا گیا ۱۴۹۱ء میں نیپلز میں عبرانی میں ترجمے شائع ہوئے۔ ۱۶۵۰ء تک لووین اور مونٹ پیلیز کی یونیورسٹیوں میں وہ شامل درس رہیں جملہ علوم کی اکثر کتب یورپ کی زبانوں میں ترجمہ ہوتی رہیں، علیٰ ہذا القیاس ابونصر فارابی الکندی، ابن عباس، یعقوب ابن اسحاق وغیرہ بے شمار مشاہیر گذرے ہیں جن میں سے ہر ایک کی علمی خدمات کا تذکرہ کرنا طوالت طلب اور حسن مضمون سے باہر ہے علامہ شبلی نعمانی کا یہ قول کتنا درست ہے کہ "یہ ظاہر ہے کہ فلسفہ یونانی اور فلسفہ حال میں بعد المشرقین کی نسبت ہے۔ اصول ارتقا کے موافق کوئی شئے دفعتاً ترقی نہیں کر سکتی، اس لئے فلسفۂ یونان کو فلسفہ حال تک پہنچنے کے لئے ایک زینہ کا ہونا ضرور ہے، اور یہ زینہ دراصل اسلام ہی کا فلسفہ

(۶)

علم طبیعات کے ساتھ بھی عربوں کو خاص شغف اور اس کی تحقیقات اور تجربات میں دلچسپی اور ذوق تھا، مگر افسوس کہ بیشتر کتب تلف ہو گئیں اور ہم تک سوائے چند بڑی بڑی تصانیف کے ناموں کے کچھ نہ پہنچا، الحسن نے اپنی کتاب المناظر میں مستقیم منعکس، منعطف، شعاعوں، مقعر آئینوں اور نقطۂ اجتماع الضوء جیسے تمام مسائل پر نہایت محققانہ بحث کی تھی جس سے کہ کیلر نے اپنی کتاب مناظر میں استفادہ کیا اس کتاب کو اطالوی اور لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا موسیو سیڈیل نے اسی کتاب المناظر کو یورپ کی کل معلومات علم مناظر کا ماخذ قرار دیا ہے، عربوں کو جر ثقیل کا بھی علم تھا اور ان کے چند ایک آلات جو بچ سکے ہیں ان کی اعلیٰ علمیت اور صناعی پر دال ہیں، آکسفورڈ کے ڈاکٹر برنارڈ کے قول کے مطابق عربوں کو ہی گھڑی کے پنڈولم کی ایجاد کا فخر حاصل ہے ایک یورپین سیاح نے جو بارہویں صدی میں فلسطین گیا تھا، مسجد دمشق کی گھڑی کو دیکھکر ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا، "جس وقت جی روم کے دروازہ سے نکلو، تو سیدھے ہاتھ کی غلام گردش کی دیوار میں ایک بڑا سا طاق نظر آتا ہے اس طاق کے اندر دو تانبے کے گول قرص ہیں جن میں اس قدر سوراخ کئے ہوئے ہیں جتنے گھنٹے دن میں ہیں، ان کے سوا دو تانبے کے وزن ہیں جو دو مسی بازوں کی چونچ میں سے دو مسی پیالوں میں گرتے ہیں جن کے پیندے میں سوراخ ہے یہ باز اپنی گردن کو بڑھا کر وزنوں کو پیالے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ور ایسے وہ اس عجیب نزاکت سے کرتے ہیں کہ سحر کا گمان ہوتا ہے جس وقت وزن کاسہ پر گرتے ہیں، تو ان سے آواز نکلتی ہے اور اس کے بعد وہ سوراخ میں سے ہو کر دیوار میں چلے جاتے ہیں، تمدن ۴۴۵ . . . . .

قدیم زمانہ سے مہوسی کا علم مصر میں سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا، خاندان بطلیموس کو اس سے خاص شغف تھا اور وہ وراثتاً زمانہ دراز تک اس کے حامل رہے مقتدایان مذہبی خصوصاً اس علم کا مخزن اور اس فن میں ماہر رہے، وہ اکثر اپنے حجروں کے تنہا گوشوں میں، پہاڑوں کے غاروں میں دوا سازی اکسیر کی تلاش اور سونا بنانے کے تجربات میں سرگرداں اور مشغول رہتے، انہی لوگوں نے یہ ناکارہ علم یورپ اور ایشیا میں پہنچایا، فراعنہ مصر کے عہد میں یہودیوں نے اس علم میں خاص دلچسپی لی، اور اس کے رموز سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے، یہودیوں کے ذریعہ مصر کے فن (متبرک ہنر) کی تعلیم یونان پہنچی۔ ان سے عربوں میں آئی، اور عربوں نے اس بیہودہ علم کو اپنے تجربات، وسیع مطالعہ، اور محنت شاقہ کے ذریعہ سے ایک مفید اور کارآمد سائنس کی شکل دیکر یورپ میں پھیلایا، اندلس میں یہودیوں نے مہوسی میں امتیاز حاصل کر رکھا تھا، ان کی دیکھا دیکھی عربوں نے بھی ان

سے نئے تجربات کی طرف توجہ دی، اور تمام دوسرے علوم کی طرح اس فن میں بھی اپنے استادوں سے سبقت لے گئے، اور علم کیمیا کے لئے نئے اصول مرتب کئے چونکہ مذہبی طور پر عربوں کو اس فن میں کوئی خاص حوصلہ افزائی اور رعایت حاصل نہ تھی اس لئے شروع میں ان کے تجربات میں اخفا کو ملحوظ رکھا گیا۔ مگر جوں جوں علم سے بہرہ ور ہوتے گئے آزاد خیال طبقہ میں اضافہ ہوتا گیا اور لوگ علم کی ہر ایک شاہراہ پر گامزن ہو گئے، تو کیمیا دانی کی طرف بھی عوام کی توجہ منعطف ہوتی گئی، خلفا نے ان کے تجربات، مسائل اور معلومات کی داد دی اور رفتہ رفتہ نئے اصول اور نظریے قائم ہونے لگے۔ ان کا خیال تھا، کہ تمام معدنیات میں ایک ہی جوہر مختلف مقدار میں موجود ہے، نیز بعض ترکیبوں سے اس جوہر کا ازالہ کر دیا جائے تو ایک جنس یا دھری چیز منتقل ہو سکتی ہے، اور اسی طرح یہ ممکن ہے کہ تانبے سے سونا بنا لیا جائے، یہ مفروضات کے اصول تھے، جو بذات خود تو سودمند نہ ہوں، مگر ان کے بابائے تجربات اور محنت شاقہ نے اس علم کو چار چاند لگا دئے، ان کے معلومات اور مکاشفات نے کچی دھاتوں کی تحویل اور تعدیل کرنے میں نہایت آسانیاں پیدا کر دیں جن سے زمانہ حال بھی متمتع ہو رہا ہے۔ ان ہی تجربات کے نتیجہ کے طور پر شیشے کو گلانا، اس سے نئی نئی چیزیں بنانا، معدنیات پر شیشہ چڑھانا، اور متعدد تراکیب عالم ظہور میں آگئیں، تبلور، تصعید، تقطیر، ترویق، اور تتلیل کی نہایت وسیع ترکیبیں اختراع کی گئیں، موجودہ علم کیمسٹری کے اصل الاصول وہ تمام قسم کے تیزاب ہیں جو انھوں نے ایجاد کئے، نمک اور شورہ کا مرکب تیزاب کی ایجاد ایک احسان عظیم تسلیم کیا گیا ہے۔ انھوں نے ہی دنیا کو الکحل، نوشادر، تیزاب، پوٹاش، بائیکلورائڈ آف مرکری اور فاسفورس سے آشنا کیا، ان چیزوں سے علم طب اور علم الادویہ کی ترقی میں حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔

آٹھویں صدی میں جابر کوفی علم کیمیا کے ماہر اور استاد الکل مانے گئے ہیں جنہوں نے گیسوں کے پیدا کرنے کی ترکیبوں اور نسخوں کو سب سے پہلے بیان کیا، نمک اور شورہ کا مرکب تیزاب انہی کی ایجاد ہے۔ اس کی بیشتر کتب لاطینی میں ترجمہ ہوئیں، جن میں سے مشہور ترین نتائج التکمیل ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۶۷۲ء میں شائع ہوا، وہ نہایت قریبی زمانہ تک مقبول عام رہا۔ ۱۰ صدی میں الرازی نے سب سے پہلے گندھک اور الکحل کا بیان کیا، اور ان کے بنانے کی تراکیب وضع کیں، ان دو حکماء کے علاوہ باقی تمام کیمیا والوں کی کتب تلف ہو گئیں، بہرحال یہ معلوم ہوتا ہے کہ دھاتوں کو ایک دوسرے میں تحویل کرنے کے تجربات صدیوں تک جاری رہے اور گو سونے کی بستیوں میں کامیاب نہ ہو سکی مگر علمی تحقیقات کے میدان میں شاندار نتائج پیدا ہوئے، گو مقتدایان مذہب کی نفرت اور عوام کے غلط خوف نے اس سائنس کو بہت بدنام کر دیا ہے۔ مگر علم الادویہ میں اس سے کافی کام لیا گیا، قرطبہ اور طلیطلہ کے مرکزی دواخانوں کے ماتحت ملک بھر میں تحت دواخانے بنائے گئے جو حکومت کی زیر نگرانی ہوتے، دواؤں کو صاف اور تازہ رکھنے میں انتہائی احتیاط عمل میں لائی جاتی، دواسازی کے متعلق سخت قوانین بنائے گئے، اور دواسازوں کے لئے اعلیٰ امتحانات سے گذرنا ضروری ہوتا۔ اور انہیں اعلیٰ اطبا کے روبرو یہ قسمیہ اقرار کرنا ہوتا، کہ اگر وہ مقررہ مقدار اور درجہ سے کم درجہ کی ادویات فروخت کریں گے، تو اس کی اطلاع حکومت کو دیدیں گے حکومت کی جانب سے نرخنامے دکانوں پر آویزاں ہوتے اور ان قواعد کی خلاف ورزی کی سخت سزائیں دی جاتی، عربوں کی صنعت و حرفت، فلزات کا اخراج، رنگوں کی ترکیبیں، فولاد کی صفائی، چمڑہ کی دباغت، یہ تمام امور ان کی وسیع کیمیاوی معلومات پر شاہد ہیں، اور تعجب ہوتا ہے کہ وہ اپنے علم کو کس طرح کارآمد اور مفید بنانا جانتے تھے۔

مسلمانان اندلس کی سائنس سے البرٹ میگنس، رابرٹ گراسٹینٹ اور راجر بیکن خصوصیت کے ساتھ زیادہ مستفید ہوئے، انھوں نے فلسفہ کیمیا اور آہیات پر بڑی بڑی کتب تحریر کیں اور ۱۳ صدی میں یورپ کے تمام ممالک میں سائنس کے علوم کی اشاعت کی، مگر کلیسا کی مخالفت نے انہیں پسپا کر دیا۔ ان کے علوم جادو، ان کی کلوں اور ایجادوں کو شیطانی طلسمات گردانا گیا، راجر نے خصوصاً اس علم میں کمال حاصل کیا، آلات بصریہ میں عینک ایجاد کی، طیارہ برقیات انجن وغیرہ اشیا کے ایجاد کے امکان کا ذکر کیا، کلیسا کی طرف سے مورد عذاب گردانا گیا، اور دس برس کے لئے تنگ و تاریک قیدخانہ میں ڈالدیا گیا، رہائی کے بعد ان کی روح بھی قفس عنصری سے آزاد ہو گئی۔

اس نے مردانہ وار دنیا کے بیہودہ تعصبات کا مقابلہ کیا اور یقیناً سب سے پہلے یورپ میں تجربی فلسفہ اور سائنٹفک خیالات کی ترویج کی زندگی میں اسے مطعون اور مردود قرار دیا گیا، اور اس کی موت کے بعد پھر ایک ایسی جہالت کی تاریکی چھاگئی تین صدی بعد یورپ کی آنکھیں کھلیں اور از سر نو کیمیا کی برکات پر غور کیا گیا

(۷)

حاجی خلیفہ نے اپنی کشف الظنون میں بارہ سو عربی مورخین کے نام لکھے ہیں جنہوں نے شعبۂ تاریخ میں اپنے وسیع علمی معلومات کے لازمی دکھلائے، معلوم ہوا



مرقعے کی پرواز نمبر ۱



فرشتے کی پرواز نمبر ۲

کہ ان کی تحریرات نہایت مفصل اور مستند ہوتیں اور چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی اس طریق پر بیان کر دیا جاتا کہ شک کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انہی حاجی خلیفہ کی اسماء الرجال میں بیس ہزار تصانیف سے امداد لی گئی تھی جن میں سے بارہ ہزار تو صرف تاریخی کتب تھیں۔ ان تصانیف کے نام مصنفین کے نام اور مختصر سوانح حیات درج کی گئی ہیں، منجملہ ان لاتعداد فاضل مورخین اسلام کے چند ایک کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔ نویں صدی میں طبری نے ایک تاریخ عالم مرتب کی جس میں ابتدائے عالم سے لے کر اس وقت تک کے اکثر مشہور واقعات درج کئے گئے تھے اور یہ کتاب امنی قریبہ میں یورپ میں چھپ چکی ہے مسعودی دسویں صدی کے مشاہیر مورخین میں سے گذرا ہے اس کی مشہور کتب تاریخ میں سے اخبار الزمان اور مروج الذہب ہیں۔ موسیو کاترمئیر لکھتے ہیں کہ جب ہم اس مورخ کی تصنیفات پر نظر ڈالیں، تو حقیقت میں ان مضامین کو جنہیں اس نے لکھا ہے اور جس طرح اس نے بڑے بڑے مسائل کو حل کیا ہے دیکھکر حیرت ہوتی ہے اس زمانہ کے لئے جس میں وہ تھا اس کا علم نہایت وسیع تھا اس نے نہ فقط عربوں کی کل تاریخوں کا مطالعہ کیا تھا بلکہ اس نے یونانیوں اور رومیوں کی کل نئی اور پرانی اقوام مشرقی کی تاریخیں بالتفصیل دیکھی تھیں، تیرھویں صدی میں ابوالفرج نے ایک مشہور تاریخ عالم تحریر کی چودھویں صدی میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مورخ علامہ ابن خلدون گذرا ہے، اس میں اعلیٰ قوت امتیازیہ اور تحقیق واقعات کا مادہ موجود تھا، بربریوں کی تاریخ کے مقدمہ میں اس نے علم تاریخ کے نہایت اہم اصول عمدگی سے بیان کئے ہیں، یہ کتاب فرانسیسی میں ترجمہ ہو گئی، انہی کے عہد میں مقریزی نے تاریخ مصر لکھی اور وہ اس ملک کی بہترین تواریخ میں شمار کی جاتی ہے۔

ابن القطیس بادشاہ بطلیموس نے اندلس کی سیاسی اور ادبی تاریخ مرتب کی، الغزالی تذکرۃ الشعراء اندلس لکھا، ابن بشکوال اور محمد قرطبی نے اسماء الرجال کی کتابیں ترتیب دیں، اور ابن خطیب کی تصنیفات ادبی اور تاریخی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔

ہر ایک خلیفہ کے دربار میں ایک مورخ اور ہر شہر میں حکومت کی طرف سے ایک واقعہ نگار مقرر ہوتا تھا، محمد ابو عبداللہ قرناطی نے ایک ضخیم کتاب سائنس کی تاریخ میں لکھی ہے اُن کے وقت پسند دل ہمیشہ عجیب و غریب مضامین اور مسائل کے عقدہ کشائیوں میں مصروف رہتے تھے، علم تاریخ کے ذوق کی یہ حد تھی کہ مشہور جانوروں، گھوڑوں، دنبوں کے نسب و نسل کی تاریخ قلمبند کی گئیں۔ البیرونی کا سفرنامہ ہند پیرس میں ترجمہ ہو کر شائع کیا گیا، وہ سیاحت اور وسیع معلومات کے لحاظ سے بہترین کتاب مانی گئی ہے جس میں ہندوستان کے مذاہب، فلسفہ، معاشرت، آداب و رسوم کا مفصل بیان کیا گیا ہے، اسی طرح تاریخ یمن، اور جنوبی عرب اپنی نوع کی عجیب چیزیں ہیں جغرافیہ عالم کی تحقیق و ترتیب میں بھی عربوں نے کافی سے زیادہ حصہ لیا، اس زمانہ میں عیسائی یورپ کرۂ ارض کو مسطح تصور کئے بیٹھا تھا، اسلامی دارالعلوم میں جغرافیہ کی تعلیم کیلئے عجیب و غریب کرے استعمال کئے جاتے تھے، عربوں نے دنیا کے دور دراز ملکوں میں سفر کئے اور وہاں کی آب و ہوا، مشہور شہروں کے محل وقوع قلمبند کئے۔ وہ لوگ عموماً تجارت کی غرض سے سیاحت اختیار کرتے تھے اور گو انہیں تحقیقات اور علمی مشاہدات کا ادراک نہ ہو مگر بہرحال ان کی معلومات و بیانات نہایت مفید ثابت ہوتے رہے۔ سلیمان ایک عربی تاجر نے سب سے پہلے چین کا سفر کیا، اور اس کا سفرنامہ سب سے پہلا عربی سفرنامہ ہے، اور یہ پہلی کتاب ہے جو یورپ میں چین کے متعلق شائع ہوئی، اٹھارھویں صدی میں اس کا فرانسیسی ترجمہ ہوا، مسعودی نے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اپنی عمر کے ۲۵ سال تمام ممالک اسلامیہ اور قرب و جوار کی سیاحت میں گذارے اپنی کتاب مروج الذہب میں مختلف ممالک کی آب و ہوا، پہاڑ، دریا، سمندر، تقسیمات ملکی، شاہی خاندان وغیرہ تمام امور بہ تفصیل بیان کئے ہیں ابن حوقل نے ۲۸ سال تک دنیا کا سفر کیا، اپنی کتاب میں لکھتا ہے میں نے روئے زمین کا طولاً و عرضاً بیان کیا ہے اور ممالک اسلامیہ کی توضیح کی ہے، ہر ایک ملک کی بابت نقشہ شریک ہے جس میں مختلف مقامات دکھائے گئے ہیں، ہر ملک کی سرحدیں، شہر صوبہ جات دریا سمندر، ملک کی پیداوار مختلف قسم کے محاصل، وہ بڑے راستے جو ملک میں سے گذرتے ہیں، فاصلے جو ان میں اور قرب کے ممالک میں ہیں، اجناس تجارت جو زیادہ ہیں، غرض کل چیزیں جو علم جغرافیہ کو بادشاہ وزرا اور کل طبقات کے اشخاص کے لئے دلچسپ بناتی ہیں میری کتاب میں موجود ہیں، تیرھویں صدی میں ابوالحسن نے شمالی افریقہ کے ساحل بحر مصر سے مراکش تک کیا، اور بطلیموس کے نقشہ افریقہ کو درست کرنے کے خیال سے ۴۲ مقامات کے عرض بلد کو از سر نو درست معلوم کیا، سیاحین عرب میں سب سے ممتاز ابن بطوطہ ہیں جنہوں نے چودھویں صدی میں کل روئے زمین کا سفر کیا، ان کی علمی تحقیقات، استقلال اور جرات کا دشمن بھی اعتراف کرتے ہیں، عربوں کی معلومات ہیئت اور ان کی یہ تمام سیاحتیں علم جغرافیہ کی ترقی اور تکمیل کا باعث ہوئیں، یہ نجوم کا تذکرہ ..

تحقیقات، شہروں کے طول بلد اور عرض بلد کے تقرر میں فاش غلطیاں تھیں، جو عربوں نے درست کیں، بہترین سفرنامے لکھے، اور وہ کتب جغرافیہ تحریر کیں، جو مدت تک یورپ میں پڑھائی گئیں، سب سے ممتاز عرب جغرافیہ دان ادریسی ہیں جنکی تصنیفات نے یورپ میں یہ علم پھیلایا۔ ان کی تمام کتب لاطینی میں ترجمہ کر لی گئیں ۱۱۵۴ء میں انھوں نے پہلا جغرافیہ لکھا۔ جو اتنا مکمل متعدد نقشہ جات اور واضح حقائق سے لبریز تھا، کہ تین صدی تک یورپ اس کی تقلید پر قانع رہا، یہ ان کی پندرہ سالہ محنتوں کا شاندار نتیجہ تھا، راجر شاہ صقلیہ نے ان کی قدر افزائی میں کمی نہ کی، اور اپنا مقرب درباری منتخب کیا، دریائے نیل کے منبع کے متعلق ان کا اندازہ ہماری موجودہ تحقیقات کے عین مطابق نکلا ہے، انھوں نے اپنے مربی شاہ راجر کے لئے ایک چاندی کا گلوب تیار کیا جس کا قطر و فٹ اور وزن ساڑھے پانچ من تھا جس پر دنیا کے حالات کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اور منطقۃ البروج وغیرہ دکھلائے گئے تھے، اس کے علاوہ ابن جبیر، ابن بطوطہ، ابن حوقل، المقدسی اور بہت سے دوسرے عرب جغرافیہ دان گزرے ہیں، جنہوں نے اس علم کو ترقی دی، مگر بخوف طوالت ان کی علمی سرگرمیوں کو نظر انداز کرتا ہوں۔

(۸)

گو یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ عربوں نے قلیل عرصہ میں ایک عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈال دی مگر اس سے زیادہ تعجب خیز یہ امر ہے کہ ملکی تسلط کے فوراً بعد مفتوحہ ممالک میں ہر ممکن ذریعہ ترقی و فلاح کے سوچے اور وہاں کے تمدن کو استوار کرنے میں اپنی تمام قوائے ذہنی کو منعطف کر دیا، اندلس میں علمی اور عربی ترقیوں کے ساتھ ساتھ وہاں کی زمین پیداوار اور ذرائع آبپاشی پر غور کیا گیا، اور بہت جلد ان اصول پر زراعت شروع کر دی جو عراق عرب اور مصر کی سرزمین میں برتے جاتے تھے۔ اور جہاں کے لوگوں نے تاریخ سے بھی پیشتر زراعت میں کافی ترقی حاصل کی ہوئی تھی، خلفانے دور دراز ممالک سے مفید پھلوں کے بیج اور انواع و اقسام کے پودے منگوائے اور ان کی کاشت کے تجربات کئے گئے، ذاتی تحقیق اور تجربہ کی مدد سے نئی نئی کھادیں کام میں لائی گئیں، اور جغرافیائی آب و ہوا کے اثرات پر غور کر کے بہترین فصلیں حاصل کی گئیں، وہ عرب کے بادیہ نشینوں کی اولاد تھے اور فطرۃً آزادانہ دیہاتی زندگی کو ترجیح دیتے، یہ ناممکن تھا کہ یہودیوں کے تمول کو دیکھکر ان کا کاروباری ذوق صنعت و تجارت پر متوجہ ہو جاتے، دیکھتے دیکھتے اندلس کی بنجر اور ویران زمینیں سرسبز ہو گئیں، بے برگ و گیاہ میدانوں میں زیتون، نارنگی، انجیر، انار کے باغات نظر آنے لگے، اور پہاڑوں کے دامن سبزے سے ڈھک گئے، سلاطین نے یکے بعد دیگرے عوام کے لئے آسانیاں پیدا کیں، اور ذرائع آبپاشی میں اضافہ کیا۔

نہروں، کنوؤں، مصنوعی چشموں، وسیع تالابوں، آبدوز اور زمین دوز نہروں، غرضیکہ ہر ممکن الوجود ذریعہ آبپاشی سے زمین کے چپہ چپہ کو آباد کر دیا گیا، پانی کی قدرتی قلت کے باعث اس کے مصرف میں نہایت احتیاط برتی جاتی تھی، اور سرکاری طور پر نہروں کی گشت اور تالابوں کی حفاظت کا انتظام کیا جاتا، آبپاشی کے متعلق جرائم یا نزاع کے لئے عدالتیں (دیوان الماء) قائم ہوئیں جو ہر جمعرات کو اپنا اجلاس کرتیں، بڑے بڑے سنگین حوضوں میں کوڑا کرکٹ، راکھ، گارا، اناج، سڑے گلے پھل، مذبوحہ جانوروں کا خون اور ہڈیاں وغیرہ اشیا جمع کر کے نہایت زوردار کھادیں تیار کی جاتی تھیں، ایشیا کے اناج، ساحل افریقہ کے شیریں پھل غرضیکہ پردہ دنیا کے کل اثمار وحبوب جمع کر لئے گئے وہ علم نباتات میں زیادہ کی تمیز اور ان کے پیوند لگانے کو خوب جانتے تھے، ان کے ہاں پیوند کے آٹھ طریق رائج تھے، باغات کی ترقی اور پھلوں کی نباتات کے لئے متعدد طریقے ایجاد کئے گئے، جو ہر، عرق، عطر نکالنے میں انہیں کمال حاصل تھا، پھلوں اور اناجوں کو عرصہ دراز تک کھیتوں میں بند رکھنے کے طریق جانتے تھے کہ وہ گلنے سڑنے سے محفوظ رہیں، اندلس میں کئی ایسے مدرسے قائم کئے گئے جہاں زمینداری کی تعلیم دی جاتی، ابن العوام اشبیلی نے اپنی کتاب میں زراعت کے تمام شعبوں پر مفصل بحث کی ہے، جانوروں کی پرورش، نسل کشی، خواص، امراض، معالجات بتلائے ہیں، کاشتکاروں کے خانگی انتظامات اور دیہاتی زندگی کے قواعد و اصول بنا کر برتنے میں صفائی، باقاعدگی اور خوش سلیقگی کی تلقین کی ہے، الرازی، علی ابن العباس، اور ابن سینا وغیرہ محققین نے بھی علم نباتات پر عبور حاصل کیا، ان کے تجربات کے لئے باغات تیار کئے گئے، مالقہ کا ابن بیطار ایک ماہر زراعت گزرا ہے جس نے اس علم پر کئی کتابیں لکھیں، جن میں نئے نئے دریافت شدہ پودوں کی نہایت خوبصورت رنگین تصویریں جمع کی گئیں، اور اپنی ذاتی تحقیقات کی بنا پر قریباً دو ہزار پودوں کے وجود کا اضافہ کیا۔

قرطبہ کے علماء نباتات صحرا کے نخلستانوں، مصر و عراق کے سرسبز کھیتوں اور وسط ایشیا کے پہاڑوں غرضیکہ ہر جگہ مصروف تحقیق و فکر نظر آتے تھے دسویں صدی میں خلیفہ کی درخواست پر شہنشاہ قسطنطنیہ نے دیسقوریدس کے تمام نباتاتی

رسائل عربی میں ترجمہ کرا کے اندلس بھیجے۔

انھی لگاتار کوششوں کے باعث توت فرنگی، سٹابیری، لیموں، بھی کھجور، شہتوت، انجیر، کیلا، انار، پستہ، بادام، چاول، پالک، مرچ سیاہ، زعفران، قہوہ، کپاس، اور گنا وغیرہ مختلف میوے یورپ میں پہنچے، اشبیلیہ میں زیتون کے درختوں کا شمار نا ممکن تھا تو ملاغہ اور ایبیڈا میں برائے نام قیمت پر سیروں انگور دستیاب ہو سکتا تھا، قرطبہ میں ناشپاتی ڈیڑھ سیر وزن تک کی پیدا ہوتی، سیبزم کی نارنگیاں اور سیب اپنی نظیر آپ تھے۔

چار چار میل تک باغات کے سلسلے چلے جاتے، شہروں کی فصیل پر چڑھ کر دیکھئے تو سوائے سرسبز کھیتوں اور باغوں کے کچھ نظر نہ آتا تھا، شہتوت کی کثرت تھی، کئی شہروں میں ریشم کے کیڑوں کو پالکر ریشم حاصل کیا جاتا، مگر آہ عیسائیوں کی عالم سوز پالیسی نے اتنی بڑی تہذیب کو تباہ کر دیا، اور تباہی ملک پہ عذاب اور ایک ابدی لعنت بنکر آئی، آج وہی زمینیں ویران اور بنجر پڑی ہیں مسلمانوں کے تنعم کی تلاش میں سوائے کھنڈرات کے ڈھیروں کے کچھ نہیں ملتا، پانی قلیل بارش کا پتہ نہیں، شہروں کی آبادیاں کم ہو گئیں، پرانے گاؤں کے نام و نشان بھی باقی نہ رہے اور آج تک اندلس میں لاکھوں ایکڑ زمین نا قابل زراعت پڑی ہے۔

اندلسی مسلمانوں میں عام چوپاؤں، عربی النسل گھوڑوں کے پالنے، بھیڑ بکری کی نسل کشی، اور شہد کی مکھیوں کی پرورش کے بھی اشتغال پائے جاتے تھے، مرینو بھیڑوں کے پالنے کے لئے خلافت نے خاص قوانین بنا رکھے تھے جن کے مطابق ان گلوں کو سال بھر میں دو مرتبہ پہاڑیوں اور ڈھلوان میں لیجا کر سرسبز مرغزاروں میں رکھا جاتا، اور اس طرح گرمیوں کی آندھیوں اور جاڑوں کی شدت سے محفوظ رکھکر ان سے وہ ملائم پشم حاصل کی جاتی جن سے نہایت نفیس اور گرم کپڑا مرینہ تیار ہوتا، ابوعثمان اور الدمیری کی تصانیف علم حیوانات کی نہایت معتبر کتب تھیں، ان کے دار الحیوانات میں دنیا بھر کے حیوانات اور عجیب و غریب پرندے جمع رہتے، جو نسل کشی کے تجربات اور تحقیق کے بہترین مراکز ثابت ہوتے۔

(۹)

چشم فلک نے اس نگارخانہ عالم میں انگنت تماشے دیکھے، عظیم الشان سلطنتیں عالم وجود میں آئیں اور فنا ہو گئیں، سینکڑوں اقوام نے عروج کی بہاریں دیکھیں اور دیکھتے دیکھتے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، بڑے بڑے باجبروت شہنشاہ اپنی بے پناہ طاقت اور ٹڈی دل افواج کو لیکر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنی شاہی اور خدائی کا بول بالا کر گئے، ان کے پردۂ موت میں روپوش ہوتے ہی زمانہ نے اپنی نگاہیں بدل لیں، وسیع حکومتیں برباد ہوئیں، بھاری جمعیتیں پریشان ہوئیں اور ان کا نام لیوا بھی باقی نہ رہا، مگر بایں ہمہ مٹی ہوئی سلطنتوں کی یادگاریں برباد شدہ تہذیب و تمدن کے آثار، خاک میں ملی ہوئی دولت و حشمت اور طاقت کے نشانات ایک مدت تک اگر باقی رہ گئے تو وہ ان کی عمارتیں تھیں جو کہ اقوام عالم نے اپنے عروج کے زمانہ میں اپنی تہذیب کے صفحات پر ثبت کر دیں، کسی سلطنت کی تباہی میں اور کسی قوم کی تہذیب و آداب معاشرت کے ملیامیٹ کرنے میں اگرچہ کوئی انتقامی جذبہ بھی کارفرما ہو، مگر نہایت ممکن ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ اس عہد کی تصنیفات برباد اور کتب خانے تباہ ہو جائیں، مفتوحہ قوم کی معاشرت اور تمدن کو در خور اعتنا نہ جانکر پس پشت ڈال دیا جائے، اور اس طرح اکثر ہوتا رہا ہے مگر پھر بھی کسی عہد کی عمارات، اور عمارات نہ سہی تو ان کے کھنڈرات ہی صدیوں تک اپنے دامن عبرت میں ایسی یادگاریں اور نشانات محفوظ رکھتی ہیں جو ان کے تعمیر کرنے والوں کی تہذیب، تمدن اور معاشرت کا مرقع ہوں، عربوں نے اپنی وسیع سلطنت کے تمام ممالک میں ایسی بے نظیر اور عدیم المثال یادگاریں چھوڑیں کہ ان کی نفاست، نزاکت، دلربا طرز تعمیر اور پختگی آج بھی دنیا والوں کے لئے موجب صد حیرت و استعجاب ہو رہی ہے صدیاں گذر گئیں مگر آج بھی بعض عمارات امتداد زمانہ کے اثرات سے محفوظ اپنی اصلی شوکت و عظمت کو لئے کھڑی ہیں، افسوس کہ ہمارا موجودہ علم آثار قدیمہ عاجز ہے کہ مختلف ممالک اور عہد کی اسلامی عمارات اور ان کی طرز تعمیر کی مخصوص مشابہتوں اور اختلافات کو پورے طور پر واضح کرے گو اس موضوع پر بہتیرے علمائے مغربی نے کتب تحریر کیں، مگر وہ اتنا زمانہ بعد اور اتنا نامکمل طور پر کہ خود انھیں اعتراف ہے کہ ان کی مساعی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں اور یہ کہ مسلمانوں کی تعمیر کی تاریخ تقریباً کل ابھی لکھی جانی باقی ہے۔ (موسیو باقی سیر آخری طبع ۱۹۳۸ء)

بہرحال اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ عربوں کی عمارت کا استحکام ایک خصوصیت ہے جسے کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، پہلے انھوں نے محض اینٹوں کا استعمال کیا، مگر بعد ازاں صقلیہ کی اکثر عمارات میں پتھر کو کام میں لایا گیا ہے، علی الخصوص اندلس میں ایک مرکب مسالہ استعمال کیا جاتا جو چونا، ریت مٹی اور چھوٹے چھوٹے پتھروں سے ترکیب پاتا تھا، اور جو امتزاج کے بعد پتھر سے بھی مضبوط ہو جاتا تھا یہی باعث ہے کہ صقلیہ کے قصر اور اندلس کی الحمراء جیسی نفیس اور نازک عمارات

عمارت آٹھ صدی گزر جانے کے بعد بھی قائم ہیں، شکیلی اور پھیلی ہوئی محرابیں اور مختلف وضع کے مینار بنائے گئے جن کے اوپر کئی قسم کے دندانے ہوتے، گنبد کی شکل کو عربوں نے اجتہاد سے کام لیکر زیادہ خوبصورت بنا دیا، دیواروں کے گوشوں مربع مجھول اور گول چھتوں کی درمیانی جگہ کو بھر دینے کے لئے وہ نہایت خوبصورت ابھرے ہوئے طاق بناتے اور اپنی قلمی آرائشوں سے انہیں شہد کی مکھی کے چھتوں کی طرح خوبصورت بنا دیتے تھے کنگروں اور سطح سے نکلی ہوئی آرائشوں کا کثرت سے استعمال کیا جاتا تھا، نسخی گلکاریاں اور کتبے نہایت پیچیدگی اور خوبصورتی سے پتھروں میں کندہ کئے جاتے یا مسالہ سے تیار ہوتے تھے، عربی حروف کی ترکیب بذات خود اتنی خوبصورت ہوتی تھی کہ ازمنہ متوسطہ کے یورپی انجنیر کمال شوق اور تلاش سے ایسے نمونے حاصل کرتے اور کلیساؤں اور دیگر عظیم عمارات میں انہیں نقل کر لیا جاتا ان کی عمارات میں رنگین آرائشوں اور گلکاریوں میں قسم قسم کی رنگ آمیزیوں کے دلفریب نمونے بکثرت موجود ہیں، الحمراء کی کل دیواریں رنگین تھیں، اور اکثر اوقات بیرونی دیواروں کو بھی رنگین بنا دیا جاتا تھا، شام کی یادگاروں میں سے سب سے سربرآوردہ اور ممتاز عمارت مسجد عمر ہے جسے پہلی صلیبی جنگ میں ہی عیسائی دیکھ کر دنگ رہ گئے اور اس کی شہرت اور مقبولیت کے باعث یورپ میں اس طرز کے متعدد کلیسے بنائے گئے اس عمارت کے بیان میں ایک مکمل کتاب فرانسیسی میں لکھی گئی ہے اندر کی دیواروں پر مرمر کا استر اور چینی کی مینا کار تختیوں کی پچی کاری ان میں انواع و اقسام کے بیل بوٹے ہیں جن پر سورج کی شعاعیں پڑ کر انہیں جواہرات کی مانند درخشاں کر دیتی ہیں یہ ایک طلسم خانہ ہے جس کی خوبی اور نزاکت خواب و خیال سے بھی مافوق ہے اور تقدیس کے لحاظ سے یہ وہی جگہ ہے جہاں حضرت داؤد، ابراہیم اور حضرت سلیمان نے قربانیاں دیں، یہودیوں نے جہاں اپنے خدا کو پوجا، عیسائیوں نے جہاں حضرت عیسیٰ کی مورت رکھی، اور فرزندانِ توحید نے جہاں وحدت کا گیت گایا، مصر میں مسجد طولون، مسجد ازہر ایسی عمارات ہیں کہ جن میں مشرقی طرز تعمیر کی جھلک بالکل معدوم ہے اور یہاں صحیح طور پر عرب کی فطرت صناعی نے اپنی نئی طرز پیدا کر لی ہے مسجد حسن عربی طرز تعمیر کے عروج کا بہترین نمونہ ہے دیواروں کے آثار ۳ گز، بلندی ۲۲ گز، گنبدوں کی اونچائی ۶۰ گز اور میناروں کی بلندی ۹۵ گز ہے، مسجد برقوق، مسجد المؤید اور مسجد قائت بائی فن تعمیر کی بہترین مثالیں ہیں، ان کے خوبصورت گنبد، شاندار مینار، پر تکلف محرابیں، اچھے کٹہرے بےنظیر سنگ تراشیاں حیرت انگیز یادگاریں اور زبردست ایجادیں ہیں، ترکوں کے تسلط کے بعد ان کی بدذوقی کے باعث اس فن کی ترقی مصر میں رک گئی،

شمالی افریقہ، صقلیہ اور اندلس کی عمارات میں بین مشابہت پائی جاتی ہے، مینار ہر جگہ مربع بغیر کٹہرہ اور کنگروں کے ہیں، اوپر کی منزلیں بتدریج چھوٹی ہوتی گئیں ہیں صقلیہ میں منیزہ اور قوبہ کے قصر پتھر اور چونے کی زبردست عمارتیں ہیں جو قلعوں سے مشابہ اور سامان جنگ سے آراستہ رکھی جاتی تھیں، موسیو سدی یو لکھتے ہیں "۔۔ اخلاقی، علمی اور حرفتی لحاظ سے عرب ہر اسم عیسائیوں پر فائق تھے ان کے خصائص ان کی عادات اور اوضاع میں ایک فیاضی ایک دلبستگی اور مجزمی تھی جس کو دوسروں میں تلاش کرنا لاحاصل ہے، ان میں فطرت انسانی کا ایک ایسا اعزاز ہے جس نے انھیں ہمیشہ ممتاز بنائے رکھا ہے"

اشبیلیہ کا گرالڈا اور القصر ابتدائی عہد میں تعمیر ہوئے، غرناطہ کا الحمراء عربی طرز تعمیر کے عروج کی یادگار ہے، مختلف عہد کی عمارات میں ایک ہم آہنگی اور مشابہت پائی جاتی ہے عربوں میں اس قدر مادۂ خلاقی تھا کہ وہ ہر ملک کی موجودہ اشیاء کو ترتیب دیکر ایک نئی طرز پیدا کر لیتے تھے، انھوں نے ہند، ایران، اندلس میں وہیں کی اقوام کے خیالات اخذ کرکے اپنی عمارات پر عربی طرز کی مہر کر دی، اندلس میں سب سے قدیم عربی عمارت مسجد قرطبہ ہے جو ۷۸۶ء میں عبدالرحمن نے شروع کی عظمت و شان میں تمام روئے زمین کے معابد سے فوقیت لے گئی، اس کا مینار زمین سے ۱۰۷ گز بلند ہے اس کا گنبد ۹۳ ۔ ۱ مختلف الالوان مرمری ستونوں پر قائم ہے جو بساط شطرنج کے مربعوں میں نصب ہیں، اس طرح کہ ایک مربع میں پانچ ستون ہیں، اس ترتیب سے عمارات کے طول میں ۱۹ گلیاں بیچ اور ان کو قطع کرتی ہوئی عرض میں ۳۰ گلیاں بن گئی ہیں، رو کار دریائے رود الکبیر کی جانب ہے اور اس میں دروازے ہیں جن پر نہایت باریک کام کی ہوئی کانسی کی پتریاں جڑی ہوئی ہیں، بیچ کے دروازہ کی پتریاں سونے کی ہیں۔

آج اس کی بے حرمتی کی یہ حد ہے کہ اس کے اندر ایک کلیسا تعمیر کر دیا گیا ہے دیواروں کی آرائشوں اور کتبوں پر چونے کی استرکاری کر دی ہے، فرش کا پچی کاری کا کام اٹھا لیا گیا ہے، کندہ کی ہوئی لکڑی کی رنگین چھتیں فروخت ہو چکی ہیں، اور صرف ایک مصلی اس وحشیانہ دستبرد سے محفوظ رہ گیا ہے عبدالرحمن کا قصر زہرا جو قرطبہ کے نزدیک تعمیر کیا گیا تھا، آج اس کا نشان بھی باقی نہیں، اس کے بیان میں موسیو ژیرودے پران ژی لکھتے ہیں "کہ اس عمارت میں چار ہزار تین سو ستون قیمتی سنگ مرمر کے نہایت عمدہ تراشے ہوئے نصب تھے اس دالان میں جس کا نام قصر الخلیفہ تھا ایک سنگ یشب کا حوض تھا جس کے اوپر سونے کا بگلا قسطنطنیہ کی عمدہ دستکاری کا بیٹھا ہوا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خلیفہ کے

کوشک کے وسط میں وہ مشک ملاق کا مشہور حوض تھا، جس میں پارہ بھرا ہوا تھا، اور ایک خاص اختراع کے ذریعہ سے اس میں آفتاب کی شعاعیں نہایت لطف کے ساتھ منعکس ہوتی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اشبیلیہ اور طلیطلہ میں قدم قدم پر عربوں کے تسلط کی مثالیں ملتی ہیں۔ اشبیلیہ کا گرالڈا سرخ اینٹوں کی خوبصورت مکعب عمارت ہے، پتھر کی ترشی ہوئی جالیاں، کھڑکیاں، پھولدار اور نکیلی محرابیں دلکش چیزیں ہیں، قصر الحمراء کے متعلق متعدد کتب لکھی جا چکی ہیں، جن میں ۔ ۔ ۔ اس کی نفاست آراستگی، تکلفات، حیرت انگیز بیش بہا پتھر اور مصالحہ اور نفیس ترین طرز تعمیر کا ذکر ہے، اس کے بیان کے متعلق کاتب کے قلم کے بجائے ایک مصور کا قلم نہایت موزوں ہے۔ سیاح گھنٹوں اس کی دیواروں کے سامنے کھڑا ہو کر عش عش کرتا ہے، سنی گلکاریاں، جالیاں، نکیلی محرابیں، پر تکلف ہافات، فراخ کھڑکیاں، گوشہ گوشہ انسانی صنعتوں کے کمال کا مظہر ہے، قصر الیوث، بیت لاختین، برج السراج اور بیت العدل خوبصورت ترین حصے ہیں، قصر الیوث میں محراب، ارغلام گردشیں، سونے اور مختلف قسم کی رنگ آمیزیوں سے مرصع پچ کاری کی جالیاں، اور قلمکاریاں، ستونوں کا دلکش نظارہ ایسے نظارے ہیں کہ روح وجد میں آجائے، اس قصر کی تمام آرائشیں گچ سے بنائی گئی تھیں، جو سلفیٹ آف لائم اور بعض نامعلوم نباتاتی اجزا سے مرکب تھا، اس گچ کے بنانے کی ترکیب موجدوں کے ساتھ ہی دفن ہو گئی، مگر قیاس کیا جاتا ہے کہ سنگ مرمر کا پوڈر، چونا، اور انڈوں کی سفیدی وغیرہ اشیا کا مرکب تھا اور اس میں زہر اور ایسی چیزیں ڈالی جاتی تھیں جس سے حشرات الارض بھاگیں، دیواروں کی سجاوٹ میں عرب فرد واحد تھے، صناع اپنے کمال تخیل سے وہ لطف حسن اور رنگینی پیدا کر دیتے تھے کہ عقل دنگ رہ جائے، الحمراء میں فرامیدیکا کام اپنے عروج کی انتہا پر پہنچ چکا تھا، ان کی پچی کاری کی حیرت انگیز پیچیدگی، خوبصورتی اور صفائی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی جڑائی رنگوں میں موزونیت، جلا اور صفائی عربوں کی ہوشمندی، دوربینی اور ذہانت کے دلائل ہیں، ان کے جوہر اختراع کے ثبوت آج بھی در و دیوار پر ایسے ہی کندہ ہیں، کہ روئے زمین کے نقادان فن انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں قصر کے ایک کمرہ میں ۱۹۲ وضع کے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، جالیوں میں نہایت چھوٹے چھوٹے مختلف الالوان ٹکڑے اصول ہندسی کے موافق جڑے گئے ہیں الحمراء کے تکلفات، صدیوں کی ترقیوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں، دلکش جالیاں، قبوں پر لاجوردی، ارغوانی اور سنہرا کام اور دلپذیر نفاست ایک جادو ہے جو اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتا، اور بہترین خیالات کا مرقع ہے، مگر افسوس کہ نصاریٰ نے اپنے دیرینہ عناد کے باعث اس کی زینتوں کو برباد کر دیا، کہ آج ہر ایک سیاح ان دشمن تہذیب انسانوں کی وحشت اور بربریت کا ماتم کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پر تکلف چینی کی تختیاں چونا بنانے کی غرض سے فروخت کر دی گئیں، بیش قیمت لکڑی ایندھن کے کام آئی، اور کمروں کو فوجی رصدگاہ میں تبدیل کر دیا گیا، کیا یہ وہی عبرتناک انجام نہیں ہے جو شاہجہاں کے لال قلعہ دہلی کا ہوا؟ یقیناً وہی ہے۔ دیکھئے مرمر کا شیریں خواب، ارض آگرہ کا تاج، مسجد دہلی اور لاہور کے قلعے اور قصر ان تمام اسلامی عمارات کو شمار کرنا بھی ہمارے مقدور سے باہر ہے جیسا کہ ہر ایک قوم لازمی طور پر اختراعی مادہ میں اپنے پیشروؤں کی محتاج ہوتی ہے عربوں نے بھی قدیم خیالات اور معلومات سے استفادہ کیا، مگر ان میں مستفید ہونے اور ترقی کرنے کی غیر معمولی استعداد تھی، عربی فن تعمیر کا اثر یورپ پر کافی پڑا، گو مشرقی اور مغربی اقوام کی ضرورتیں اور مذاق اتنے مختلف ہیں کہ صنعت و حرفت وغیرہ معاملات میں بہت جلد تغیرات رونما ہو جانے کا امکان ہے، موسیو پائی سبر لکھتے ہیں، ہرگز شک نہیں ہو سکتا کہ فرانس کے ۱۱۔ اور ۱۲ صدی کے انجینیروں نے بہت کچھ تعمیری نکات اور آرائشوں کو عربوں سے اخذ کیا ہے، پائی کے کلیسے کی سی متبرک عمارت میں ایسا دروازہ نظر نہیں آتا، جو عربی کتبے سے آراستہ ہے۔ کیا ناربون اور مقامات کی فصیلوں پر عربی مذاق کا ملمع نہیں چڑھا ہوا ہے۔

موسیو ملالی اور موسیو پرلیس داوین نے باتفاق ظاہر کیا ہے کہ صلیبی فرانس نے ان کٹہروں، کنگروں اور چھجوں کو عربوں ہی سے اخذ کیا، جو سولہویں صدی کے اواخر تک یورپ کی معاشرتی اور فوجی عمارات میں مستعمل تھے، یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اہل یورپ تعمیر میں غیر اقوام کے صناعوں سے کام لیتے رہے ہیں اور پیرس کے گرجے اور بعض دیگر عمارات عربوں سے تعمیر کرائی گئیں زمانہ موجودہ میں بھی اشبیلیہ اور نواح میں مکانات عربی طرز کے حامل نظر آتے ہیں اور یہ صحیح ہے کہ کسی قوم کی تباہی اس کی تہذیب کی بربادی کے بعد بھی اس کے اثرات حسنہ ایسی مضبوط بنیادیں ہیں کہ صدیوں تک انسان انہیں نہیں مٹا سکتا، جو ان سلطنتوں کی یادگاریں ہیں، جو لاتعداد سائنٹیفک انکشافات، ذوق تحقیق اور تہذیب و تمدن کی علمبردار تھیں، آہ ان کے در و دیوار ان باجبروت شہنشاہوں کے مسرفانہ تکلفات کا نظارہ ۔۔ اور ان کی عظمت اور جلالت کا نشان ہیں، وہ شان و شوکت مٹ گئی، مگر اس کا مرثیہ حشر تک ختم نہ ہو سکے گا، یہ عمارتیں ان کی خاندانی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں، ان کے قصور اور عظیم الشان عمارات ان

فنون کی یادگاریں اور ان کے قومی جوہر ترقی و تہذیب کے روشن آفتاب ہیں۔

(۱۰)

اندلسی عربوں نے جہاں اپنی نادر عمارات میں ایک نمایاں اور گہرا اثر چھوڑا وہاں صنعت و حرفت کے وسیع میدان میں اپنی حیرت انگیز قابلیت کے کمالات دکھانے میں بھی کمی نہ کی، ان ممالک میں جہاں انھوں نے ۸ سو سال تک حکومت کی، امید کی جا سکتی ہے کہ ہم باسانی ہزاروں ایسی اشیا جمع کر سکیں جنہیں اُن لوگوں نے کمال صنعت ختم کر دیا تھا، مگر افسوس ہماری یہ امید موہوم ہے کلیسا والوں نے ان صنعتوں کو چن چن کر برباد کر دیا، ان کے سر میں وہ دماغ نہ تھا کہ ان چیزوں کی خوبی و نفاست اور ان کے بنانے والوں کے علو تخیل کو سمجھتا دل میں وہ ذوق نہ تھا کہ ان کی قدر کرتے، ہاں سر میں ایک جنون تھا کہ عربیں کو اور عربوں کی یادگاروں کو صفحۂ ہستی سے معدوم کر دیا جائے اور یقیناً انہوں نے ایسا ہی کیا، مسجد قرطبہ کے عیسائی متولی نے مسجد کے منبر اور رحل کو ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا کہ ان موتیوں کو حاصل کر سکے جو ان میں مزین تھے سمینین نے غرناطہ کے چوک میں علوم عربیہ کی ہزاروں کتابوں کو جلا دیا، جنہیں وہ سمجھ نہ سکتے تھے اور انہیں جادو و الحاد کے علوم سے لبریز قرار دیا گیا، فلپ ثانی کے ایک حکم سے ہر وہ پتھر اکھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا جس پر عربی کتبہ ہو، غرضیکہ یہ مظالم کی ایک عبرتناک داستان ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ان مسلسل انتقامانہ تباہ کاریوں کے باوجود ہمارے دیدۂ عبرت کو وا کرنے کے لئے ان فاتح عربوں کے عظیم الشان تمدن اور مٹی ہوئی شوکت کی یاد دلانے کو آج بھی اسپین میں متعدد عمارات، کھنڈرات اور چند ایک اشیا باقی رہ گئی ہیں جن کو دیکھ کر ایک منصف مزاج سیاح کا دل بھر آتا ہے اور اس کی آنکھوں میں وہ سماں بندھ جاتا ہے، جب یہ ملک دنیا میں گہوارۂ علم و کمال تھا، سرچشمۂ رحمت تھا، جہاں تشنگان علم کے گروہ کے گروہ دنیا کے ہر حصے سے آکر جمع ہوتے، اور مختلف علوم دینی و دنیوی سے مالا مال ہو کر خدا کی زمین پہ پھیل جاتے۔

غرضیکہ اس زمانہ کی صنعت و حرفت پر رائے زنی کرنے کے لئے ہمارے پاس نہایت کم مواد ہے پھر بھی مسلسل تحقیق اور کامیاب تجسس کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ اندلسی مسلمانوں نے صنعت و حرفت کے ہر شعبہ میں انتہائی ترقی کی، معدنی اشیا کے ڈھالنے میں انھیں کمال تھا، ضروریات زندگی کی اکثر اشیا مثلاً برتن، گلدان، چاقو، چراغ اور فانوس اور اسی نوع کی سینکڑوں چیزیں وہ پیتل، تانبے اور لوہے کو ڈھال کر بناتے، اور ان پر نہایت لطیف باریک اور خوشنما نقش و نگار بناتے تھے۔ ابھرے ہوئے خوشنما پھول پتیوں پر چاندی اور سونے کا ملمع کیا جاتا، طلیطلہ اور اشبیلیہ کے اسلحہ خانوں کے ہتھیار مہذب دنیا میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ خود اور زرہ پر نہایت باریک کام کیا جاتا اور تلواروں کے قبضوں اور میان پر اعلیٰ نقش و نگار اور مرصع کاری کی جاتی تھی، ان کو شیشہ گری، اور پچی کاری، مشبک، زیورات کے بنانے میں کمال حاصل تھا مہر کنی میں کافی دسترس تھی، مہروں میں خطوط کی لطافت اور موزونیت جاذب نگاہ ہوتی، فن کوزہ گری کو کمال پر پہنچایا گیا، ان برتنوں کی جلا اور چمک حیرت انگیز تھی، خیال کیا جاتا ہے کہ مختلف معدنیات کو پگھلا کر ان کی ایک نہایت باریک تہ ان ظروف پر چڑھا دی جاتی تھی، جس سے ان میں چمک اور نزاکت پیدا ہو جاتی تھی اور چمڑے کے خوبصورت پردے قرطبہ کی حرفتی خصوصیت تھی، جن پر عجیب و غریب سنہرے پھول بنائے جاتے تھے، چمڑے کی دباغت اور رنگائی میں انھیں کمال حاصل تھا، مراکش کے چمڑے کی نزاکت خوبصورتی اور پائیداری آج بھی زبان زد عام ہے غرناطہ میں نفیس ریشمی کپڑے کے لاتعداد کارخانے تھے۔ یہی کپڑے یہودی اور عرب تجار کے ذریعہ یورپ میں لائے جاتے تھے جنہیں وہاں کے بادشاہ اور امرا کمال حیرت سے تکتے اور زیب تن کرتے، ہشام ثانی کا طراز میڈرڈ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں اب تک محفوظ ہے اور دار الخلافت کے کمال صنعت کا شاہد ہے، آہنی صندوق اور مضبوط قفل بنائے گئے، قیمتی اور خوشبودار لکڑی کی اشیا پر آبنوس کھوپڑی، ہاتھی دانت اور موتیوں سے نہایت خوبصورت کام لیا جاتا تھا، سونے چاندی سیسہ اور لوہے کی کانیں کامیاب طریق پر کھودی گئیں، اندلس کے مختلف حصص میں کاغذ کے کارخانے موجود تھے، کرسیاں، صوفے اور کئی قسم کی پرتکلف قیمتی اور آرام دہ نشستیں بکثرت استعمال میں لائی جاتی تھیں۔

اندلس میں آٹھ سو ریشم کے کارخانے تھے جن میں کم و بیش ۱۶۰۰۰ کاریگر کام کرتے تھے، مطلا اور مذہب کپڑے اور مرسیہ کے قالین بے نظیر چیزیں تھیں، ملاغہ میں چینی کے برتنوں کے کارخانے تھے وہاں کے خوبصورت گلدان دنیا بھر کے امرا خریدتے تھے، المیریا میں چمکدار شیشے کی پھولدار اشیا بنتی تھیں، مسلمانان اندلس کی یہ صنعت اٹلی سے ہوتی ہوئی وینس پہنچی مگر افسوس کہ صنعتیں ان صناعوں کے ساتھ ہی دفن ہو گئیں اور زمانہ کے غارت گر ہاتھوں نے ان کے نقوش بھی مٹا ڈالے۔

ڈاکٹر لی بان مصنف تمدن عرب نے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ عربوں نے ہی سب سے پہلے بارود کا استعمال کیا، گو ان سے پہلے بھی چند ایک نامکمل اور غیر موثر سے نسخے موجود تھے، مگر وہ جنگی اغراض کے لئے بالکل بیکار تھے۔

جہازسازی اور جہازرانی میں عربوں نے کافی ترقی کی، ایک مدت تک سارا بحر متوسط ان کے قبضہ میں رہا، عربوں ہی نے سب سے پہلے قطب نما کی مدد سے دنیا کے دور دراز حصوں میں حصول علم اور تجارت کی غرض سے سفر کئے بارھویں، تیرھویں چودھویں صدی میں اعلیٰ پیمانہ پر تجارت ہوتی تھی، المیریا ملاغہ، بارسیلونا، اشیاء برآمدہ کی مشہور بندرگاہیں تھیں، ان اشیا میں سونا چاندی، تانبا، سلک، شکر، لوہا، گندھک، سندھ، چاول اور دباغت کیا ہوا چمڑا تھا، اسپین، بربر، مصر، ایشیا، ہند، چین، مکہ مدینہ، بصرہ، دمشق بغداد موصل اور مدائن میں تجارتی تعلقات اور مراکز قائم کئے گئے تھے۔

سمندروں اور صحراؤں میں تجارت کی غرض سے محفوظ ترین رستے تلاش کئے گئے، ایک یورپی مورخ [illegible] لکھتا ہے، کہ بحیرۂ روم میں مسلمانوں کی تجارت عیسائیوں کی نسبت بدرجہا زیادہ وسیع تھی، اور بحری قوت زیادہ شاندار اور قوی عرب علوم کا سرچشمہ تھے، اور ان کی تجارت ہی تھی جس کے طفیل تہذیب کی روشنی کی پہلی کرن نے گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی کی تاریکیوں کا تعاقب کیا۔

یورپ پر اہم اخلاقی اثر ڈالا ہے، صلیبی جنگوں کے دور میں عیسائیوں کی وحشیانہ معاشرت کا ذکر کرتے ہوئے خود یورپی مصنفین بھی شرماتے ہیں، ان کے مقابلے میں مسلمانوں کے بہادرانہ اخلاق، فرائض، اور حقوق انسانی کی تفہیم اور جملہ اوصاف حمیدہ اتنے اثر انداز ہوئے، کہ ایک بہت بڑے مذہبی مصنف موسیو بارتھے لیمی سینٹ ہلیر لکھتے ہیں کہ :- عربوں کی معاشرت اور ان کی تقلید نے ہمارے زمانہ متوسط کے امرائی زبوں مذاقوں کو درست کیا، اور یہ سردار بلا اس کے کہ ان کی بہادری میں کچھ فرق آتا ایسے اخلاق سیکھ گئے، جو انسان میں اعلیٰ درجہ کی وقعت اور قدر رکھتے ہیں، یہ امر نہایت مشکوک ہے کہ صرف عیسوی مذہب، وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو ان میں ایسے اخلاق پیدا کر سکتا تھا ؛

یورپ پر عربوں کے عظیم الشان احسانات کی یہ نہایت مختصر روداد ہے مگر وراثتی تعصب کے اثرات انسان کی آنکھوں پر ایسا پردہ ڈال دیتے ہیں کہ وہ حقائق کو دیکھکر بھی ان کے اعتراف سے ہچکچاتا ہے، پیروان اسلام کئی صدیوں تک یورپ کے بدترین دشمن سمجھے گئے، ان سے نفرت کا جذبہ ایک فطری جز ہو چکا ہے، کجا یہ بات کہ انہیں اپنا کرمفرما اور محسن تسلیم کیا جائے۔

مگر یہ حقیقت ہے، کہ عربوں کے ہی اخلاقی تسلط نے یورپ والوں کو انسان بنایا . . . .“

عنایت اللہ

طوالت کے خوف سے ہم اتنا عرض کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں، کہ عربوں نے



چودہویں صدی کی شکنتلا

(از منظر صدیقی اکبرآبادی، سابق مدیر شاعر)

نویدائے نگاہ آج پھر نظر وہ آگئیں   دل خراب کو مرے کچھ اور بھی مٹا گئیں   وہی جو پھول کی طرح تبسم آشکار ہیں   وہی جو نکہتوں کی روح جنت بہار ہیں

وہی کہ دیکھ کر جنہیں زباں سے نکل گیا   سنبھال سنبھال نظر کا وار چل گیا   وہی جو ایک مرمریں جواب ماہتاب ہیں   وہی جو میرے دل کی انجمن میں باریاب ہیں

وہی جنہیں جمیل اک ادا کہیں شباب کی   وہی جنہیں فضا کہیں لطافت گلاب کی   وہی وہی جو حسن بے پناہ کی امین ہیں

وہی جنہیں کنول کہیں جمال کی بہار کا   وہی جنہیں کہیں حسین گیت آبشار کا   امین ہیں، حسین ہیں، جمیل ہیں، متین ہیں

وہی جنہیں خدائے حسن کا اک آئینہ کہیں   وہی جنہیں فضائے حسن و ناز کا خدا کہیں   وہی جو زندگی کی رفعتوں کی ترجمان ہیں   وہی جو کارساز حسن کی عجیب شان ہیں

وہی جنہیں کہیں شباب سے بھری ہوئی امنگ   وہی جنہیں کہیں حقیقت جمال کی ترنگ   وہی جو بزم دہر کے لیے ہیں ایک بیخودی   وہی جو شمع کی طرح ہیں میکدے کی چاندنی

وہی وہی کہ جنکی ہر ادا میں ہیں قیامتیں   وہی جو کیف و مستی نگاہ کی کلید ہیں۔   وہی جو حاصل نشاط وصل و امید ہیں

قیامتیں، لطافتیں، صباحتیں، ملاحتیں،   وہی کہ جن سے گلستاں کی مست ہے ہر اک فضا   وہی کہ جنکے گیسوؤں سے جھوم کر اٹھے گھٹا

وہی جو ہیں بلند ہر حقیقت و مجاز سے   وہی جنہیں لگاؤ ہیں ہیں فطرت نیاز سے   وہی جو ہیں شفق کی ایک شاہزادی حسیں   وہی جو طلعت جمال سے ہیں ماہ و در جبیں

وہی جو گلکدہ ہیں ہر تبسم حیات کا   وہی ہے جن پہ منحصر قرار کائنات کا   وہی جو ہیں مرے نفس میں برق کی طرح رواں   وہی کہ جن کا ہر ستم مرے لئے نشاط جاں

وہی جو کر رہی ہیں بزم دل میں حکمرانیاں   وہی جنہیں ملی ہیں دو جہاں کی ضو فشانیاں   وہی تو حور، چودھویں صدی کی یا شکنتلا

وہی جو حد حسن سے ہیں فطرتاً بلند تر   وہی جنہیں ملی ہے بے پناہ مستی نظر   شکنتلا، شکنتلا، شکنتلا، شکنتلا



مادر وطن کا عطیہ



حسنِ ساحرہ

(۸)

تذکرہ خسرو کا ایک ورق

(از جناب مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی، بی اے علیگ)

حضرت امیر خسرو پٹیالی میں پیدا ہوئے یہ قصبہ اب ایٹہ سے متعلق ہے پہلے شہنشاہ اکبر کے عہد میں گنگا کے کنارے مومن آباد سرکار قنوز، میں صوبہ آگرہ کا ایک محال تھا اس قصبہ کو یہ شرف غیر فانی حاصل ہے کہ امیر سیف الدین محمود کے یہاں ابوالحسن نام ایک اقبال مند شیو سلطان بلبن کے قلعہ میں آنکھیں کھولتا ہے یہ قبیلہ لاچین ترک سے متعلق تھا، جن کے اجداد ہزارہ سے آئے تھے جن کی زبان پر پورے طور سے ب اور پ ت اور ٹ کے نازک حروف سے آشنا اور ہندوستانی ناموں کے صحیح تلفظ اور صحت کے لئے حرفوں کی تقدیم و تاخیر پر بھی قادر نہ تھا۔ کہ ایک مجذوب کی نظر فیض اثر نے مستقبل کی بشارت دی اور خاقانی سے بھی آگے جانے کی مبارک باد دی۔

.......❦.......

ابوالحسن جو آئندہ زندگی میں امیر خسرو کے نام سے دنیا میں مشہور ہوئے، غرۃ الکمال و دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں یمین الدولہ کا خطاب بھی عطا ہوا ہے وہ اپنے دور کے بہت خوش گو وہ بارس، متورع و متقی درویش مزاج شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوئے، بچپن کے چار سال پٹیالی میں بسر کئے، بچپن ہی سے شاعری کا چسکا لگا اور کچھ مدت تک سلطانی تخلص کرتے رہے چنانچہ تحفۃ الصغر میں اپنے مولد و منشاء کا تذکرہ اس محبت سے کرتے ہیں

گرچہ این از قضائے یزدانی ست   پٹیالی چہ جائے سلطانی ست
من کہ از جملہ سواد آخیم   از تہی دستی اشک بارانیم

اوراق تاریخ شاہد ہیں کہ امیر خسرو نے غیاث الدین بلبن کے عہد سے لے کر محمد شاہ تغلق تک ۱۱ بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا۔

(۱) غیاث الدین بلبن (۲) معز الدین کیقباد (۳) کیومرث الملقب بہ شمس الدین (۴) جلال الدین فیروز شاہ خلجی (۵) رکن الدین ابراہیم شاہ (۶) علاء الدین خلجی (۷) شہاب الدین عمر (۸) قطب الدین مبارک شاہ (۹) ناصر الدین خسرو خاں (۱۰) غیاث الدین تغلق شاہ (۱۱) محمد تغلق

اس فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان غلامان کا نیر اقبال ان کے سامنے نادر نظر فروز ہو کر غروب ہوا، خلجیوں کا تابناک دور بھی ختم ہوتے دیکھا۔ اور خاندان تغلق کی ابتدا و شباب کا دور بھی کسی حد تک دیکھا۔

تمام عمر وہ دربار سے وابستہ رہے لیکن بایں ہمہ ملازم رہتے اور اوراد و اشغال میں کبھی فرق نہ آتا۔ خود اپنی یادداشت کے مطابق ۷ بادشاہوں کی رفاقت کی (۱) شاہزادہ محمد سلطان (۲) معز الدین کیقباد (۳) فیروز الدین خلجی (۴) علاؤ الدین خلجی (۵) قطب الدین مبارک خلجی (۶) غیاث الدین تغلق (۷) سلطان محمد تغلق۔

ان کی تصانیف میں اکثر و بیشتر چیزیں کسی نہ کسی قدر افزا فرمانروا کی خواہش یا تحریک سے لکھی گئی تھیں اور تقریباً جملہ تصانیف کسی نہ کسی بادشاہ کے نام معنون ہے، ان کی تصانیف کی ایک خصوصیت ہے کہ ہر کتاب کے دیباچہ میں نغمۂ توحید شہادت رسالت اور حضرت محبوب الٰہی کی منقبت، سرائی کے بعد ایک پورا باب سلطان عصر کی مدحت گذاری و ثنا گستری میں وقف کیا ہے لیکن کبھی کسی کی تعریف و ثنا میں جادۂ اعتدال سے قدم باہر نہیں نکالا۔

امیر خسرو کے چاروں دواوین، تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور اکثر مثنویات مختلف بادشاہوں کی تعریف و ترجیع بند اور قصائد سے مالامال ہیں، عناصر خسرو جان اربعہ عناصر کا مجموعہ ہے اس میں بھی ۲۱ قصائد موجود ہیں کہا جاتا ہے کہ ایک انتخاب شاہزادہ مالستغر پسر شاہرخ مرزا نے بھی تیار کرنا چاہا تھا، لیکن ہمت شکن موم نے یاری نہ دی۔

.......❦.......

امیر خسرو نے ۱۶ ماہ کی مختصر مدت میں ۴ مثنویات اور ۳ سال کے اندر پورا خمسہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ختم کیا تھا اس لئے یہ پانچوں مثنویات علاء الدین خلجی کے نام معنون کیں، مطلع الانوار نظامی کے جواب میں مخزن اسرار لکھا تھا اس مثنوی میں اخلاق و تصوف کے غوامض و نکات تو شریعت و طریقت و معرفت کے اسرار و رموز کے ساتھ عمدہ دلکش پیرایہ میں سمجھایا ہے یہ مثنوی تاریخی حیثیت سے بہت ارفع ہے اور امیر خسرو کی سب سے پہلی کوشش ہے، ابتدائے شوق کی یادگاری ۱۴ دن میں مکمل ہوئی تھی۔

خضر خاں سلطان علاء الدین کا بڑا بیٹا اور خسرو کا پیر بھائی تھا، اس کی محبت کی کہانی دول رانی خضر خاں (عشقیہ) میں بیان کی گئی ہے یہ مثنوی بہت بے نظیر ہے واقعات بہت دلچسپ دلکش اور انجام کے لحاظ سے دردناک اور عبرت خیز ہیں یہ باکمال سحر طراز مصنف کا اعجاز ہے کہ اس مثنوی کو پڑھ کر آج بھی لوگ آنسوؤں کے ہار　　کی غیر فانی محبت پر نثار کرتے ہیں، تاریخی حیثیت سے بہت قابل قدر ہے۔ قران العدس تاریخی حیثیت سے ان کی پہلی مثنوی ہے، اس میں ناصر الدین بغرا خاں اور سلطان معز الدین کیقباد سے ملاقات کا حال درج کیا ہے یہ مثنوی کیقباد کی فرمائش سے لکھی گئی تھی، مجنون لیلی اور شیریں خسرو بھی اپنے طرز کی بے نظیر مثنویاں ہیں، آئینہ سکندری میں معلومات اور تحقیقات کا اچھا مواد موجود ہے، ہشت بہشت پند و اخلاق کی عمدہ کتاب ہے، خزائن الفتوح یا تاریخ علائی کا مرتبہ جملہ تاریخی مثنویات میں بہت ارفع ہے، سر ہنری الیٹ نے اس کی بہت تعریف کی ہے، اب علیگڈھ یونیورسٹی کے باکمال استاد تاریخ محمد حبیب صاحب نے اس کو ایک بے نظیر مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ نہ سپہر قطب الدین مبارک شاہ کے نام پر معنون ہے یہ اسی بادشاہ کے عہد کی ایک حد تک تشنہ تاریخ کہی جا سکتی ہے۔

رسائل اعجاز نثر میں ۷۰ سال کی عمر میں خسرو نے مرتب کی اس کو اعجاز خسروی بھی کہتے ہیں سابق گذشتہ دور میں اس کو پڑھانے میں بہت مشہور تھے، نثر کی بھی کتاب ہے جو منظومات پر ہر طرح وزنی ہے۔ تغلق نامہ ان کی سب سے آخری مثنوی ہے جو عرصہ سے مفقود تھی اور ہندوستان کے مختلف کتبخانوں میں جہانگیر نامہ کے نام سے موجود تھی، میں نے عرصہ ہوا مولوی رشید احمد سالم کے مقدمہ کے ساتھ ان کے خاندان کے خزائن محفوظات میں دیکھا تھا اور اس سے مستفید بھی ہوا تھا، اب وہی مخطوطہ حیدر آباد کی انجمن تاریخی نے آب و تاب سے شائع کر دیا ہے سنہ ۱۳۲۴ء میں غیاث الدین تغلق صوبہ دار بنگال کی تحقیقات کے لئے لکھنوتی گیا، خسرو ہمرکاب تھے، بادشاہ تو ایک برس کے بعد سنہ ۱۳۲۵ء میں دہلی واپس آ گیا، لیکن خسرو وہاں کچھ عرصہ رہے واپسی کی صورت نظر نہ آتی تھی، لکھنوتی کا قیام حسرت و حرمان و اضطراب، دہلی سے دوری مفارقت و جدائی کی ایک مستقل داستان تھی، غیاث بھی قید حیات سے رہائی پا چکا تھا، ادھر حضرت محبوب الٰہی کی وفات کی بھی خبر خسرو کو ملی، اس حادثہ جانکاہ سے ان پر جو کچھ گذری وہ خود ایک مثنوی کی محتاج ہے، کسی نہ کسی طرح دارالسلطنت پہنچے آنکھیں روتے روتے پتھرا چکی تھیں، پیشانی زخمی تھی، سر منڈوایا چہرہ پر سیاہی لگا کر آستانہ عالیہ پر بایں ہیئت گدائی حاضر ہوئے بے اختیار گریہ طاری ہوا مزار مبارک سے سر ٹکرانا شروع کیا، ہوش آیا تو تمام عمر کا اندوختہ فقرا و مساکین کو دے دیا، اور مزار پر انوار کی مجاوری شروع کی، لیکن اصح تر روایت یہ ہے کہ جیسے ہی مزار مبارک پر پہونچے انتہائی شوق میں وفور گریہ سے قفس عنصری سے طائر روح پرواز کر گیا۔ یہ حادثہ ۱۷ شوال (ستمبر ۱۳۲۵ء) کا ہے چنانچہ دہلی میں شوال کی سترہویں کو اب بھی بڑا عرس ہوتا ہے۔

(۲)

جس جگہ خسرو کی نشو نما ہوئی اور جہاں حصہ عمر زیادہ گذرا اس سے ایک خاص محبت و عقیدت تھی چنانچہ جہاں کہیں خسرو نے دہلی کا تذکرہ کیا ہے عجیب والہانہ انداز سے کیا ہے کہ آج بھی ان اشعار میں ایک کیفیت موجود ہے قران السعدین میں ایک جگہ تذکرہ ہے۔

حضرت دہلی کنف دین و داد
جنت عدن ست کہ آباد باد

معلوم نہیں جنت عدن کی دعا مقبول ہوئی یا نہیں بہر حال آباد باد تو یقیناً قبول ہوئی اسی طرح قران السعدین میں ایک جگہ اور بھی والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

اے وصل ورے بتان سادہ
یک بستہ مدیشہ کج نہادہ

یا مرشد برحق کے قدموں میں مثنوی دول رانی خضر خاں میں دفن ہونے کی تمنا کی ہے۔

کلامش را بتارم نام گیرم　　زہے بخت ار تہ پایش بمیرم

منتخب التواریخ میں حسب ذیل تبصرہ خسرو کی راست بازی و درست گوئی و شان ثروت نگاہی پر کیا گیا ہے۔

"کلام متقدمین بعد ظہور کو کبہ خسرو شاعران حکم وجود نتا رہا
در وقت ارتفاع اعلام نیر اعظم پیدا کردہ و مانند سحاب
ہنگام وحی منزل خیر البشر سید عالم علیہ السلام دو پردہ توار ی
ماندہ از من ہا کہ می گویند و می نویسند بلکہ نمی نمایند۔"

اخبار الاخیار میں خسرو پر حسب ذیل تبصرہ کیا گیا ہے۔

"(امیر) خسرو (دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) سلطان الشعراء برہان الفضلاست در وادی سخن یگانہ عالم و نقادہ نوع بنی آدم ست و سے در سخن عالمی است از عوالم خداوندی کہ پایان ندارد و او را از مضامین و معانی در اطوار سخن و انواع آن در مادہ کہ ہیچ کس را از شعرائے متقدمین و متاخر ندادہ۔"

ایسی جامع کمالات ہستیاں روز پیدا نہیں ہوا کرتیں، ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ ایسی ہمہ گیر قوتوں کا مالک ہندی نژاد تھا، اور یہیں کی خاک میں مستور بھی ہو گیا۔

ناظر علوی

(۹)

قلعہ کالنجر

(از جناب احمد الدین صاحب مارہروی ایم اے ہسٹری اسکالر الہ آباد)

آج کل جبکہ جنگ وپیکار کا قریب قریب خاتمہ ہو چکا ہے اور معاشی حالات کی تبدیلی نے اصول حرب میں بھی عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے، ہم کسی قلعہ کی سیاسی وحربی افادیت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے، لیکن اگر قرون وسطیٰ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے جب چنگیز ہلاکو یا امیر تیمور جیسے فاتح صفحۂ ہستی سے طوفان کی طرح اٹھتے سیلاب کی طرح بڑھتے اور بڑی بڑی سلطنتوں اور حکومتوں کو بساط شطرنج کی طرح الٹتے چلے جاتے تھے تو معلوم ہوگا کہ یہی معدودے چند قلعے تھے جو میخوں کی طرح اٹل ہو جاتے، حملہ آوروں کے طوفان کو روکتے اور مظلوم قوم کی پشت پناہ بنجاتے تھے، ہندوستان چونکہ بیرونی اقوام کا مستقل آماجگاہ تھا اسلیئے بہ نسبت دیگر ممالک کے یہاں قلعے بھی زیادہ تھے اور نسبتاً مستحکم بھی گو اس امر میں مورخین کو اختلاف ہے کہ انکی صحیح تعداد کیا تھی اور کونسا قلعہ سب سے زیادہ مستحکم کہلائے جانے کا مستحق ہے

چتوڑ، گوالیار، رنتھمبور، رائسین، دولت آباد، چندیری، اور کالنجر ہندوستان کے اس طین مشہور ہوتے تھے اور گو ان میں سے ہر قلعہ کسی نہ کسی فاتح کے ہاتھوں تسخیر ہوا، مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس مدافعت کی وجہ سے نہ صرف حملہ آوروں کو ان کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو گیا بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میدان میں ایک لشکر عظیم کو شکست دیدینا آسان ہے مگر ایک قلعبند دستہ فوج سے پیش جانا کارے دارد کا مصداق ہے۔

مجھکو ان قلعوں میں سے اکثر کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، لیکن باوجود کمال بے سروسامانی شکستہ حالی اور کس مپرسی کے جو عظمت میرے نزدیک قلعہ کالنجر کو حاصل ہے وہ شاذ ہی کسی دوسرے قلعہ کو نصیب ہوگی، اس کی رفعت، اس کا استحکام، اس کی مرکزی حیثیت سب اس رائے کی تائید کرتی اور اس کو دوسرے قلعوں پر فوقیت دیتی ہے۔

محل وقوع

یہ قلعہ سلسلۂ بندیاچل کی ایک تنہا پہاڑی پر واقع ہے جو قریب وجوار کی زمین سے سات سو فٹ اور سطح سمندر سے ۱۲۳۰ فٹ بلند ہے اس کے مشرقی جانب ایک دوسری مگر نسبتاً کم بلند پہاڑی ہے جس کو عرف عام میں کالنجری کہا جاتا ہے اور یہی ایک مقام ہے جہاں سے قلعہ پر گولہ باری کی جاسکتی ہے۔

ابتدائی تاریخ

جس طرح دنیا کی ابتدائی تاریخ پردہ اخفا میں ہے اور محض آسمانی صحائف یا مقدس روایات ہی اس پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہیں اسی طرح کالنجر بھی اس زمانہ سے مشہور ہے جب تاریخ کا فن ایجاد نہ ہوا تھا، اور علوم وروایات سینہ بہ سینہ چلتے اور یاد رکھے جاتے تھے۔

ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اس مقام کو کب اور کس نے مذہبی اہمیت دی، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کو ویدک زمانہ ہی سے ایک بڑا تپسیا استھان تسلیم کیا جاتا ہے اور پرانوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔

کالنجر ضلع باندہ میں الہ آباد سے ۹۰ میل جانب جنوب ومغرب واقع ہے سڑک کا راستہ باندہ سے نرینی تک غنیمت ہے لیکن اس کے بعد بہت ناہموار اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ جھکو اثنائے سفر میں موٹر الٹ جانے سے دو حادثے پیش آئے، اور اگر سڑک تنگ نہ ہوتی تو شاید جان ہی سے ہاتھ دھونا پڑتا راستہ میں ایک ندی ملتی ہے جس پر تہ زمین پل بنا ہوا ہے، لیکن پانی ہمیشہ پل کے اوپر بہتا ہے اور برسات میں تو قطعاً ناقابل عبور ہو جاتی ہے۔

مہابھارت میں مذکور ہے کہ جو شخص کالنجر کی مقدس جھیل میں اشنان کرے اس کو اتنا ہی ثواب ملیگا جتنا کہ ایک ہزار گئوں کے نذرانہ سے ملتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی مشہور ہے کہ پانڈوں نے دوران بن باس میں چند روز کیواسطے اس پہاڑ پر قیام کیا تھا۔ ایک روایت جو سیتا جی سے متعلق ہے بتاتی ہے کہ رام چندر جی نے بھی لنکا سے واپسی کے وقت یہاں اقامت اختیار کی تھی۔

اب نفس واقعہ خواہ کچھ ہی ہو مگر اس میں شک نہیں کہ سنہ عیسوی کے شروع ہونے سے قبل بھی کالنجر ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اور لوگ دور دور نزدیک سے اس جھیل میں جس کو اب کوٹ تیرتھ کہتے ہیں، اشنان کرنے آتے تھے۔

قلعہ کی تاریخ

قلعہ کی ابتدائی تاریخ بھی ماضی قدیم میں پنہاں ہے اور اب اس کے چہرہ فراموشی کا نقاب اٹھانا دشوار ہے، اگر ایک طرف روایات اس امر کی شاہد ہیں کہ اس کو چندر ورمانے جو مہوبہ کا بانی ہے، بنایا تھا، تو دوسری طرف گپتا زمانہ کے کتبے اور سلطنت چیدی میں اس کا شمول قلعہ کے قدیم ہونے کا ثبوت دیتے ہیں، فرشتہ اس کی تعمیر کو ساتویں صدی سے وابستہ کرتا اور بانی کا نام کیدار راج بتاتا ہے جو بہرا ج کا بیٹا اور قنوج کا راجہ تھا، مگر گمان غالب یہی ہے کہ موجودہ قلعہ کی بنیاد چندر ورماں کے ہاتھوں پڑی اور چندیلوں کے عہد حکومت میں یہ ان کا حربی مستقر تھا، پھر جب پرمال کو زوال ہوا، اور سلطنت کا آفتاب عروج گہن میں آگیا، تو اس نے مہوبہ کو چھوڑ کر کالنجر کو دارالحکومت بنایا اور اس طرح تینوں شہر[1] یکے بعد دیگرے چندیلوں کی راجدھانی بنے۔

مسلمانوں کی کالنجر پر فوج کشی

اس مقالہ کی ابتدائی سطور میں قلعہ کی سیاسی اہمیت کا ذکر کیا جا چکا ہے، اہل اسلام نے جب سلطان محمود غزنوی کے زیر علم ہندوستان پر فوج کشی کی تو ان کو نہ صرف قلعوں کی افادیت ہی کا پتہ لگا بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوستان کا ہر قلعہ بطور خود ایک ریاست یا سلطنت کا دارالحکومت ہے اور ان کو ہر قلعہ سے فرداً فرداً مشت آزمائی کرنی پڑی، ان کو ابتدائی حملوں میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ کالنجر ہندوستان کے اساطین میں سے ہے چنانچہ منہاج سراج اور فرشتہ نے جیپال کے حلیفوں کی فہرست بتاتے ہوئے راجہ کالنجر کا بھی ذکر کیا ہے۔

یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ جب جیپال نے محمود کو بجائے اپنے تمام قوم وملت کا دشمن قرار دیکر نہ صرف حلیفوں بلکہ حریفوں سے بھی استمداد چاہی تو بیجو اور راجاؤں کے کالنجر کے فرمانروا نے بھی اپنی بے شمار افواج کے ساتھ محمود کا مقابلہ کیا اور تو جے پال کے ساتھ اس کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا (جس کا ذکر ہم مہوبہ کے سلسلہ میں کر چکے ہیں) لیکن جب انند پال نے بھی اس دشمن قوم وملت سے نبرد آزمائی کرنے کے لئے ایک اتحادی لشکر فراہم کیا تو گنڈا نے بس میں اپنی کسر شان سمجھی کہ وہ جہاد میں شرکت سے گریز کرے نتیجہ اس مرتبہ بھی وہی ہوا جس کی توقع تھی، اتحادیوں کی شکست کے اسباب بذات خود نہایت دلچسپ ہیں لیکن چونکہ ان کا اس مضمون سے تعلق نہیں اس لئے ہم ان سے اس جگہ اعتنا نہیں کر سکتے، باہمی منافرت، جو ہندوستانی تاریخ کا تاریک ترین پہلو رہی ہے اس وقت بھی کارفرما تھی۔ اور اس امر میں مورخین متفق الرائے ہیں کہ مسلمانوں کی ان پہلے دو پے فتوحات کا باعث اگر ایک طرف خود اہل اسلام کی جانبازی سرفروشی اتحاد اور اخوت تھی تو دوسری طرف اہل ہند کا باہمی اختلاف اور عدم اتحاد۔

پھوٹ کی اس سے زیادہ نمایاں مثال شاید مشکل ہی سے ملے گی کہ اس وقت جبکہ محمودی حملوں کا طوفان ہندوستان پر مسلط تھا اور بندیا چل سے ادھر کا کل علاقہ اس کی جولانگاہ بنا ہوا تھا کالنجر کے راجہ نے قنوج کے اس فرمانروا پر جو محمود کا مقرر کردہ تھا، فوج کشی کر کے اس کو قتل کر دیا، یہ فعل اخلاقی نقطہ نظر سے خواہ کتنا ہی مستحسن ہو لیکن سیاسی عواقب کو دیکھتے ہوئے خودکشی کا مصداق تھا، محمود نے جب اس خبر کو سنا تو قدرتاً اس کو نہایت ناگوار ہوا، اور اس مرتبہ ہمیشہ سے زیادہ لشکر فراہم کر کے ننداکی سرزنش کے واسطے روانہ ہوا، راجہ نے بھی مقابلہ کی تیاریاں کیں، مگر جب دونوں لشکر مقابل ہوئے تو اس پر کچھ ایسا خوف طاری ہوا کہ بلا لڑے میدان جنگ سے فرار ہو گیا۔

محمود کو چونکہ خود اپنے مستقر کی طرف سے کھٹکا تھا اس لئے اس نے اس[2] زمنی کامیابی کو غنیمت سمجھا اور غزنی واپس چلا گیا، مگر دوسرے سال گوالیار کی فتح کے بعد پھر کالنجر کی طرف رجوع کیا اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا، لیکن اس مرتبہ بھی راجہ نے اپنی بزدلی کا ثبوت دیا اور لڑائی سے قبل ہی صلح کی گفتگو شروع کر دی، محمود کو بھی چونکہ ہندوستان میں مستقل سلطنت کرنے کا خیال نہ تھا اس لئے اس نے ٦٠٠ ہاتھی لیکر نہ صرف راجہ کو امان دیدی بلکہ مضافات میں جتنے قلعہ تھے وہ سب بھی

---

[1] یعنی کالنجر اور کھجراہو اور مہوبہ جنکی تاریخ علی الترتیب پیش کی جائے گی۔

راجہ کے سپرد کر دیئے۔

اس موقع پر ایک دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے، ہم اپنے مضمون متعلقہ قلعہ گوالیار[۱] میں اس ضرورت کو ظاہر کر چکے ہیں جو اس قلعہ کو بطور سیاسی محبس استعمال کرنے میں لاحق ہوئی تھی، وہی مشکلات اس وقت محمود کو پیش نظر تھیں اور اس قلعہ کو سب سے زیادہ مستحکم پاکر اس نے اپنے وزیر احمد بن حسن میمندی کو بجائے غزنی کے یہاں محبوس کرنا زیادہ مناسب سمجھا چنانچہ معتوب وزیر ۱۴ برس تک مقید رہا اور بالآخر سلطان مسعود نے اس کو رہا کیا۔

دولت غوریہ کے ابتدائی زمانہ میں قطب الدین ایبک نے جو شہاب الدین غوری کا سپہ سالار تھا کالنجر پر حملہ کرکے راجہ کو شکست دی اور قلعہ فتح کرلیا، لیکن یہ فتح دیرپا ثابت نہ ہوئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ چھ برس بعد ۱۲۰۸ء میں اس کو کالنجر پر دوبارہ فوج کشی کرنی پڑی۔

اس وقت پرمال راجہ تھا جو اپنی برگشتہ قسمت پہ آٹھ آٹھ آنسو رو رہا تھا ظاہر ہے کہ اس بے سروسامانی کی حالت میں ایک لشکر ظفر موج کا مقابلہ کرنا تحصیل لاحاصل تھا، اس لئے اس نے معمولی مدافعت کے بعد صلح کی گفتگو شروع کردی مگر اس کو ختم کرنے سے پہلے خود ختم ہوگیا۔

ایسے نازک موقع پر پرمال کی موت مورخین کے نزدیک کچھ معنی ضرور رکھتی ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ صلح کے معاملہ میں اہل الرائے کو اختلاف تھا، پرمال تو دل شکستہ ہونے کی وجہ سے مزید تذلیل سے گریز کرتا تھا، لیکن اس کے وزراء خصوصاً آج دیو مسلمانوں سے صلح کرنے کے خلاف تھے چنانچہ راجہ کے انتقال کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ تک جنگ کو جاری رکھا، لیکن جب قلعہ میں پانی کا ذخیرہ ختم ہوگیا تو ان کو بدرجہ مجبوری ہار ماننا پڑی۔

۱۲۳۴ء میں التمش نے نصرت الدین کو قلعہ کی فتح کے واسطے مقرر کیا لیکن اس مرتبہ بھی کامیابی عارضی ہی ثابت ہوئی کیونکہ ۱۲۵۱ء میں ناصر الدین محمود کو ازسرنو قلعہ کی تسخیر کے واسطے جانا پڑا۔

چندیلوں کے دور حکومت میں جب سلطنت کا دارالخلافہ مہوبہ تھا کالنجر ایک وائسرائے کے زیر حکومت رہا کرتا تھا، لیکن اس کی حیثیت وائسرائے سے زیادہ ایک باجگذار راجہ کی سی تھی، چنانچہ جو کتبے اب تک دریافت ہوئے ہیں ان میں کالنجر کا حکمران، راجہ مہوبہ کا باجگذار بتایا گیا ہے نہ کہ وائسرائے[۲]

مغلیہ خاندان میں سب سے پہلے ہمایوں نے بابر کے عہد حکومت میں اس قلعہ کا محاصرہ کیا، لیکن قبل اس کے کہ لڑائی شد و مد کے ساتھ شروع ہو خود بابر مرض الموت میں مبتلا ہوا اور ہمایوں کو دہلی واپس جانا پڑا، آئندہ سال ۱۵۳۱ء میں ہمایوں نے اس حملہ کی تجدید کی، اور گمان غالب یہی تھا کہ آذوقہ ختم ہونے پر اہل قلعہ ہتھیار ڈال دیں گے، لیکن جونپور کے نواح میں افغانوں کی شورش نے محاصرہ میں پھر خرابی پیدا کردی اور بادشاہ نے سہل شرائط پر صلح کرلی، وہ کتبہ جو پاتال گنگا میں نصب ہے غالباً اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

کالنجر پر شیر شاہ سوری کا حملہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے اس اولوالعزم فرمانروا نے اپنی مدت العمر میں جس قدر قلعہ جات فتح کئے اور جن عجیب و غریب ذرائع سے کامیابی حاصل کی اس کی مثال ملنی مشکل ہے اور مینجر کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ "شیر شاہ کو قلعہ جات کی فتوحات کا خبط تھا" لیکن ہمیں یہ بھی کہنا چاہئے کہ اس فن میں اس کو کمال بھی حاصل تھا ۱۵۴۵ء میں، چتوڑ اور رنتھمبور کی تسخیر کے بعد اس نے کالنجر کی فتح کا ارادہ کیا اور چونکہ طرف ثانی سے پوری مدافعت کی جا رہی تھی اس لئے شیر شاہ نے بھی جدید ترین اصول حرب کو کام میں لاکر قلعہ کی فصیل اڑانے کا ارادہ کیا، مگر قبل اس کے کہ کوئی نمایاں کامیابی حاصل ہو، شیر شاہ بارود میں آگ لگ جانے سے جل گیا، اور قلعہ کی فتح سے قبل ہی انتقال کرگیا، مقامی روایات کالنجر کے دامن میں ایک مقام کو اس کی سپردگاہ بتاتے ہیں جہاں سے بعد میں اس کی لاش سہسرام کو منتقل کردی گئی

لیکن قلعہ بہر نوع اہل اسلام کے قبضہ میں آگیا، اور شیر شاہ کے جانشین اسلام شاہ کی تخت نشینی بھی یہیں عمل میں آئی، اس کے بعد پھر ردعمل شروع ہوا اور سوریوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر رام چندر بگھیلے نے وہاں کے قلعہ دار بجلی خاں کو اس امر پر راضی کرلیا، کہ قلعہ سستے داموں اس کے ہاتھ فروخت کردے چنانچہ ۱۵۶۹ء تک اسپر وہی قابض رہا۔ لیکن جب اکبر کے حکم سے مانکپور کے جاگیردار مجنوں خاں نے کالنجر پر فوج کشی کی تو رام چندر یہ سوچ کر کہ جب چتوڑ جیسا مضبوط اور مستحکم قلعہ اکبر کے ہاتھوں فتح ہوگیا تو کالنجر کی کیا حقیقت ہے حکومت سے دستکش ہوگیا۔

۱؎ دیکھو ادبی دنیا۔ ۲؎ ان میں سے ایک کالنجر کے قلعہ میں موجود ہے، اور راج دیو (۱۱۴۳ء) کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو کالنجر کا حکمران اور مدن ورمن فرمانروائے مہوبہ کا باجگذار لکھتا ہے دوسرا اجے گڑھ کے مقام پر دریافت ہوا ہے اور اس میں بھی اسی قسم کا مضمون پایا جاتا ہے۔

کالنجر کو کچھ عرصہ تک راجہ بیربل کی جاگیر رہنے کا بھی فخر حاصل ہے مگر جب اکبر نے صوبوں کی تقسیم کی تو یہ قلعہ ایک فوجی عظمت کا حامل تھا اس لئے اس کو ایک سرکار (کمشنری) کا مستقر قرار دیکر الہ آباد کے صوبہ میں شامل کر دیا گیا اور بندیلوں کی فتوحات تک الہ آباد ہی کے ماتحت رہا۔

بندیلوں کا قبضہ

اورنگ زیب کی وفات کو سلطنت مغلیہ کے انحطاط کی ابتدا تصور کرنا چاہئے جانشینوں کی کمزوری، اہل ہنود کی بیزاری اور مقامی سرداروں کی چیرہ دستی نے متفق ہو کر تمام ملک میں ایک قسم کی طوائف الملوکی پیدا کر دی، جگہ جگہ سے مدعیان حکومت اٹھ کھڑے ہوئے اور چونکہ عیش پسند شاہان دہلی کو نہ تو مملکت کے انتظام کی فکر تھی اور نہ اس کی اہلیت رکھتے تھے اس لئے مقامی جاگیرداروں سرداروں اور زمینداروں کو موقع مل گیا کہ وہ گردو پیش کے علاقوں کو لوٹیں اور پھر مرہٹہ سردار شیواجی کی سنت پر عمل پیرا ہو کر خود مختار راجہ بن بیٹھیں چنانچہ وسطی ہندوستان میں بندیلوں کا عروج بھی اسی اصول کے ماتحت ہوا، اور ان کے سردار چھتر سال نے علاوہ دیگر مقامات کے کالنجر کو بھی فتح کر لیا لیکن جب اس کا انتقال ہوا تو والی پنا نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا، اٹھارہویں صدی کے آخری نصف میں جب اس علاقہ میں خانہ جنگیاں عام ہو رہی تھیں، یہ قلعہ عرصہ تک مختلف فریقوں کے درمیان متنازعہ بنا رہا حتیٰ کہ مرہٹے شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے اور علی بہادر نے جس کے متعلق مشہور ہے کہ باجی راؤ پیشوا کا ناجائز فرزند تھا، اس کا محاصرہ کر لیا، بندیلوں نے متواتر دو سال تک لڑائی کو جاری رکھا، آخر ۱۸۰۲ء میں علی بہادر کا انتقال ہو گیا، اور مرہٹہ فوجیں منتشر ہو گئیں،

اس وقت دو بھائی گنگا دھر اور دریاؤ چوبے قلعہ کے مالک تھے، اور گو انگریزی سلطنت شمالی ہندوستان میں نئی نئی ہی قائم ہوئی تھی لیکن ان دونوں نے پیش بینی سے کام لے کر ان کی اطاعت قبول کر لی اور جس طرح آج دیسی ریاستیں قریب قریب خود مختار ہیں، اسی طرح ان کو خود مختاری کا پروانہ دیدیا گیا۔

مگر سرجان شور کی غیر مداخلانہ پالیسی کو جاہل اور لوگوں نے انگریزوں کی کمزوری پر محمول کیا وہاں چوبوں نے بھی ان کی طاقت کو حقیر تصور کرنا شروع کیا۔ یہ حال دیکھ کر ۱۸۱۲ء میں کرنل مارٹنڈل کو اس غرض سے روانہ کیا گیا کہ وہاں لوگوں کو راہ راست پر لائے، اور اگر وہ تمرد و سرکشی سے کام لیں، تو قلعے پر گولہ باری شروع کر دیجئے چنانچہ افسر مذکور نے پہلے تو نامہ و پیام سے چوبوں کو رو براہ کرنے کی کوشش کی، مگر جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے موقع کا معائنہ کر کے کالنجری پر اپنی توپیں نصب کیں اور گولہ باری شروع کر دی، چوبوں نے پوری مدافعت کی اور محاصرین کی جانب جانوں کا بیحد اتلاف ہوا، لیکن آخر قلعہ تسخیر ہو گیا۔

ایام غدر میں راجہ پنا نے اپنی افواج کو قلعہ میں متعین کر دیا تھا کہ باغی اس پر قبضہ نہ کر سکیں، پھر لفٹنٹ رمینگٹن نے عین موقع پر پہنچ کر ان سپاہیوں کی مدد سے حصار کی محافظت کی اور باغیوں کو بے نیل و مرام واپس جانا پڑا۔ ۱۸۶۶ء تک قلعہ میں انگریزی فوج کا ایک دستہ رہا کرتا تھا، لیکن جیسا کہ ہم ابتدائی سطور میں بتا چکے ہیں جب اصول حرب میں تبدیلی واقع ہو جانے سے قلعوں کی اہمیت بمنزلہ صفر کے رہ گئی تو وہ دستہ واپس بلا لیا گیا، اور جو بارکیں سپاہیوں کے واسطے بنائی گئیں تھیں ان کو مسمار کر دیا گیا۔

(۲)

آثار و باقیات

قلعہ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ایک مرتفع پہاڑی پر واقع ہے جو ۷۰۰ فٹ بلند ہے اوپر جانے کا اب صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے جو سیڑھیوں کے انہدام چٹانوں کے گرنے اور زمانہ کی عام دست برد کی وجہ سے بہت دشوار گذار بن گیا ہے، تقریباً ایک ثلث مسافت طے کرنے کے بعد پہلا دروازہ ملتا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا رُخ پہلے سامنے کے پہلو میں تھا لیکن جب اورنگ زیب کے زمانہ میں فصیل کی مرمت ہوئی تو اس کا رُخ بدل دیا گیا، دروازہ پر اس زمانہ کا ایک کتبہ بھی ہے جو صاف پڑھا جاتا ہے۔

اللہ ہو الغنی

شاہ اورنگ زیب دیں پرور — شد مرمت چو قلعہ کالنجر
چوں محمد مراد از حکمش — ساخت دروا محکم و خوشتر
از خرد سال جنتش میگفت — سعد اعظم چو سد اسکندر

یہاں سے فصیل شروع ہوتی ہے جو پیچ و خم کھاتی ہوئی اوپر تک چلی گئی ہے اور باوجود امتداد زمانہ کے آج تک نہایت اچھی حالت میں ہے، مشرقی جانب البتہ کرنل مارٹنڈل کی گولہ باری سے اکثر حصہ منہدم ہو گیا ہے، دروازہ کے دونوں جانب نہایت مضبوط مورچے ہیں اور محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ ان پر اور مرمت شدہ فصیل کے اوپر چونہ اور گچھ کی تہہ اکثر ۲۵ فٹ دبیز ہے

اس سے آگے چل کر دوسرا دروازہ ہے جس کو گنیش جی کے نام سے معنون کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے ایک طرف ان کی تصویر کندہ ہے یہاں سے اصل چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ سیڑھیاں قریب قریب ایک دوسرے کے بالکل اوپر واقع ہیں، راستہ تنگ ہوجاتا ہے اور چونکہ چڑھائی بالکل عمودی ہے اس لئے نہ صرف اوپر جانے بلکہ اترنے میں بھی سخت دشواری پیش آتی ہے اور زائرین کو خاص طور پر محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اہل اسلام نے اس کو "کو فرکھائی" کا خطاب دیا ہے جو اب تک مشہور ہے اور اس میں شک بھی نہیں کہ غنیم کو ہلاک کرنے کے واسطے اس سے اچھا موقع نہیں فرد واحد کا زخمی یا خائف ہوکر نیچے گرنا گویا تمام فوج کی بربادی کا سامان پیدا کردیتا ہے۔

تیسرا راجا تک یا چندری دروازہ پہاڑی کے زاویہ میں واقع ہے اور اس پر سنہ ۱۱۹۹ء سے سنہ ۱۶۰۰ء تک کے مختلف کتبے کندہ ہیں آگے چل کر ایک بہت بڑی چٹان ملتی ہے جس پر سنسکرت کا ایک نامعلوم سا کتبہ اور لنگ کی شکل کندہ ہے گمان غالب یہ ہے کہ ابتداءً یہ چٹان اس جگہ نہ تھی بلکہ اوپر سے پھینکی گئی ہے۔

یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر بالکنڈی دروازہ ہے جو اب نیم منہدم حالت میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف کوئی خفیہ راستہ تھا جو کالنجری کے قریب کہیں نکلتا ہوگا، اور یہ دروازہ اس راستہ کے اختتام پر واقع تھا لیکن اب راستہ ہی کا پتہ ہے اور نہ دروازہ تک جانا ہی ممکن ہے قریب ہی ایک توپ کا مورچہ ہے جو غالباً نیچے میدان میں ایک چشمہ کی محافظت کرتی تھی، آگے چل کر پانچواں دروازہ ہے جو ہنومان کے نام سے معنون ہے اس کے سامنے پانی کا ایک ذخیرہ موسومہ ہنومان کنڈ ہے جو اب خشک ہوگیا ہے۔

یہاں سے چھٹے دروازہ تک راستہ بالکل صاف ہے اور دو جانب چٹانوں پر کالی چندرکا اور دوسری دیویوں کی تصاویر منقوش ہیں، راہ میں ایک کوٹھری ملتی ہے جو چٹان کو کھود کر بنائی گئی ہے اور سدھ کی گپھا کہلاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سنہ ۱۵۵۱ء اور سنہ ۱۵۸۹ء کے درمیان (کیونکہ یہ دونوں تاریخیں موقعہ کے ہر دو جانب کندہ ہیں) کوئی سادھو رہتا تھا اور یہ تصاویر انہی کے واسطے کندہ کی گئی تھیں یا شاید ان کی موجودگی ہی سادھو کے قیام کا باعث بنی ہو، چھٹا پھاٹک لال دروازہ کہلاتا ہے اور اس کے قریب بھی ایک تالاب ہے جسے بھیرون کنڈ کہتے ہیں۔

صدر دروازہ نسبتاً اچھی حالت میں ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں اس کی مرمت کی گئی ہے، سامنے کی طرف مورچہ ہے اور تین جگہ توپ کے گولوں کے نشانات بھی پائے جاتے ہیں۔

محلات

برخلاف گوالیار، رائسین وغیرہ کے جہاں پرانی عمارات اکثر و بیشتر موجود ہیں کالنجر بالکل اجاڑ ویران نظر آتا ہے اور محلات و قصور سے قطعی عاری ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر پختہ عمارات کبھی بنی ہی نہیں اور اگر بنائی بھی گئیں تو ان کو حملہ آوروں کے گولوں نے تباہ کردیا، بعض مقامات (مثلاً مقبرہ و چوبے کے قریب) پر عمارات کے محض آثار ہی باقی رہ گئے ہیں اور بعض کے متعلق صرف شک ہی ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانہ میں محل ہوگا۔

اس کی وجہ بڑی حد تک یہ ہے کہ کالنجر کو کسی بادشاہ کی جائے اقامت ہونے کا فخر حاصل نہیں ہوا، لہذا یہاں بجز فوجی بارکوں، چوکیوں یا قلعہ کے اہل کے مکانات کے اور کسی عمارت بنانے کی ضرورت لاحق نہ ہوئی بیش بریں تخریبی عناصر کی کثرت نے جو عمارتیں موجود تھیں ان کو بھی برباد کردیا۔ بعض محض مرمت کے فقدان کی وجہ سے نیست و نابود ہوگئیں اور بعض کو توڑ کر دوسری عمارات کے لئے مصالحہ بہم پہنچایا گیا[3]۔

اس وقت صرف تین محلات کے کھنڈر باقی ہیں، لیکن یہ تینوں بندیلوں اور چندیلوں کے زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، فن عمارت یا نقاشی کے لحاظ سے بھی ان کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں اور ہم ان کو "محل" کی بہ نسبت "مکان" کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔

(۱) صدر دروازہ سے نکل کر داہنی جانب ایک شکستہ مکان ہے جس کو عرف عام میں چوبوں کی بارہ دری کہتے ہیں چھت بالکل غائب ہوگئی ہے مگر چہار دیواری بدستور موجود ہے اور ایک صدی سے زیادہ پرانی نہیں معلوم ہوتی، ایک طرف کا حصہ زمانہ کی دستبرد سے بالکل محفوظ ہے اور اس میں ایک قبیلہ آباد ہے۔

(۲) موتی محل کے کھنڈرات۔ یہ محل قلعہ کے وسط میں واقع ہے اور باوجود شکستہ ہونے کے عمدہ عمارت ہے دونوں جانب محلات ہیں اور درمیان میں باغ کے واسطے جگہ چھوڑی گئی ہے، لیکن فطرت کی سرمستی نے اس کو

---

[3] کالنجر کی تمام عمارتوں میں اس قسم کے پتھر لگے ہیں جو اس عمارت سے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتے اور پہلی ہی نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کو کسی دوسری عمارت کے کھنڈر سے لیا گیا ہے۔

جنگل بنا رکھا ہے۔

(۳) کوٹھ تیرتھ کے جنوب میں چوبوں کے زمانہ کا ایک محل ہے اور بہت ممکن ہے کہ قلعدار کا مکان یہی ہو کیونکہ اول تو اس کی جائے وقوع نہایت موزوں ہے دوسرے اس کی وسعت بھی اس رائے کی تائید کرتی ہے یہ ایک سہ منزلہ عمارت ہے اور تمام قلعہ میں یہی ایک مکان ایسا ہے جہاں انسان کچھ عرصہ کے واسطے قیام کر سکے۔

پانی کے ذخائر اور چشمے

بندیلکھنڈ میں پانی کی قلت اگر ایک طرف مہوبہ کی متعدد جھیلوں کی ذمہ دار ہے تو دوسری طرف قلعہ کالنجر کے لاتعداد ذخائر آب کا موجب۔ عہد وسطیٰ میں جیسا کہ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے قلعہ کا محاصرہ ایک روزمرہ ہوگیا تھا اور اہل قلعہ کے واسطے لازم تھا کہ وہ ناسازگار زمانہ کے واسطے نہ صرف رسد بلکہ پانی کا بھی خاطرخواہ انتظام کریں، اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اس پہاڑی پر قدیم الایام سے ایک چشمہ تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ قلعہ کے بانی نے خاص طور پر اس پہاڑی کو منتخب کیا، کیونکہ جہاں تک مجھکو علم ہے گردونواح میں اور کہیں پانی کا قدرتی چشمہ موجود نہیں۔

قلعہ کے مشہور تالابوں اور ذخائر کی تعداد بیس سے متجاوز ہے جنمیں سے بجز چار پانچ کے سب خشک ہو گئے ہیں ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ سب کا حال فرداً فرداً لکھیں (گو اس میں شک نہیں کہ ہر ایک اپنی جگہ پر منفرد حیثیت رکھتا ہے) اس لئے صرف چند کے بیان پر اکتفا کی جاتی ہے۔

کوٹ تیرتھ۔ یہ دراصل وہی چشمہ ہے جو ابتدائے ایام سے موجود تھا اور جس کے متعلق مقدس وید کا بیان اوپر دیا جا چکا ہے بعد میں اس کو غالباً کیرتی ورمانے پختہ تالاب کی صورت میں منتقل کر دیا، جو تقریباً سو گز طویل اور ۰۰ گز عریض ہے چاروں طرف سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں اور گردوپیش کے چھوٹے چھوٹے مندر چشمہ کے مقدس ہونے کا بدیہی ثبوت پیش کرتے ہیں، جنوب کی طرف وہ محل ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور مغربی جانب ایک دوسرا تالاب ہے جو اب خشک ہو گیا ہے میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ بغلی تالاب غالباً مستورات کے واسطے بنایا گیا تھا، اور اس کا پانی اس تالاب سے لیا جاتا ہوگا دیواروں پر مختلف نقوش اور کتبے کندہ ہیں بعض چیزوں کی بابت تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ سے لا کر لگائے گئے ہیں اور بعض کے متعلق صرف شک ہی ہوتا ہے۔

چشمہ نیل کنٹھ۔ شیریں پانی کا یہ ذخیرہ قلعہ کے عجائبات میں سے ہے اور مندر نیل کنٹھ کے بانی نے ایک قدرتی منظر کو انسانی ہاتھوں میں دیکر ایسا نظارہ پیدا کر دیا ہے جو زائرین اور سیاحوں کو محو حیرت کر دیتا ہے، مندر جیسا کہ آگے چلکر بتایا جائے گا، ایک واحد چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے اور سب سے نچلی عمارت ہے اس کے اوپر پانی کا ایک ذخیرہ ہے جو اسی چٹان کو کھود کھلا کر کے بنایا گیا ہے اور بیرونی جانب ایک چوڑی سنگی پٹری بنی ہوئی ہے جس پر چلکر ہم ذخیرہ کے دہانہ تک پہنچ سکتے ہیں۔

مذکورہ صدر چٹان جو کئی ہزار ٹن وزنی ہوگی چند ستونوں پر قائم ہے جو حوض کے درمیان واقع ہیں اور غالباً اسی چٹان سے تراشے گئے ہیں، چشمہ اس چٹان کی بالائی چوٹی پر واقع ہے اور پانی مختلف درزوں سے رس رس کر حوض کے اندر پہنچتا رہتا ہے یہ نظارہ اتنا دلکش ہے کہ میں شام تک برابر اس کو دیکھتا رہا، اور ہر زاویہ سے ایک نیا منظر نظر آیا۔

پاتال گنگا۔ یہ ایک زمین دوز ذخیرہ ہے اور نیچے جانے کا راستہ بھی بالکل نئی وضع کا ہے حوض تقریباً ۴۰ فٹ طویل اور ۲۰ فٹ عریض ہوگا، دیواروں پر دو کتبے لگے ہوئے ہیں جن میں سے ایک سمت ۱۵۴۴ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا ہمایوں کے زمانہ کا فارسی کتبہ ہے جس پر سنہ ۹۳۶ھ کندہ ہے مگر مشکل پڑھنے میں آتا ہے۔

ان کے علاوہ "پانی کی امان"، "بڑھیا تلاو"، "مدار تلاؤ"، "سیتا تلاؤ" وغیرہ بھی مشہور ہیں لیکن یہ سب عموماً گرمیوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔

معابد و منادر

قلعہ کی بے رونقی کا ذکر کرتے ہوئے ہم نے بتایا تھا کہ کسی راجہ کا مستقل دارالحکومت نہ ہونے کی وجہ سے یہ مقام عمدہ عمارات و محلات و قصور سے ہمیشہ عاری رہا اور یہی وجہ ہے کہ یہاں (بجز نیل کنٹھ کے) کوئی قابل توجہ مندر بھی نہیں پایا جاتا۔

لیکن کالنجر کی قسمت میں چند روز کے واسطے دارالخلافہ بننا لکھا تھا اور اس کا اسلوب یوں ہوا کہ چندیل خاندان کے آخری فرمانروا پرمال کو جب چند نوں کے ہاتھ سے شکست ہوئی اور مہوبہ دشمن کے ہاتھ میں پہنچ گیا تو شکست خوردہ فرمانروا اپنی قلعہ میں آکر پناہ گزین ہوا، ہرچند کہ یہ قیام عارضی تھا اور مطلق جہاں داری کا پیش خیمہ الیکن کچھ تو اس مثل کے مصداق کہ مصیبت کے وقت خدا

یاد آتا ہے۔ اور کچھ اس عام شغف کی بدولت جو اس خاندان کو فن عمارت اور خصوصاً مندروں کے ساتھ تھا، پرمال نے قلعہ میں ایک مندر بنانے کا ارادہ کیا، گو فن میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، روپیہ کی بھی کمی تھی اور دل کو بھی اطمینان نہ تھا لیکن باوجود ان موانعات کے جو نقش پرمال نے چھوڑا ہے نہ صرف قلعہ ہی کی جان ہے بلکہ میری دانست میں چندیل تخئیل اور فن تعمیر کا بہترین مظاہرہ ہے۔

مندر نیل کنٹھ:۔ باقیات میں جو اہمیت نیل کنٹھ کے مندر کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے آثار کو میسر نہیں، اور گو پہاڑی کی بلندی، راستہ کی طوالت، اور کافر گھاٹی کی مشکلات سخت مانعات ہیں لیکن مجھکو یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ خوش عقیدہ لوگ گردونواح کے قصبات سے نذر، منت کے واسطے یہاں آتے ہیں اور ان میں بھی دوسری جنس کا تناسب زیادہ ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانہ عروج میں اور خصوصاً اس وقت جبکہ مذہب نہ صرف عوام بلکہ خواص کی بھی روح رواں تھا اور اس کا ثبوت ہم کو کھجراہو کے مندروں سے ملتا ہے اور اس مندر میں پجاریوں اور زائرین کی کتنی کثرت ہوتی ہوگی۔

یہ مندر نہ صرف نقاشی بلکہ اپنی نوعیت میں بھی ایک طرز جدید کا حامل ہے نقاشی کے متعلق میں زیادہ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اس کا مفصل بیان کھجراہو کے سلسلے میں کیا جائے گا، عمارت کی ساخت سے اعتنا کرنا البتہ لازمی ہے مندر قلعہ کی سطح سے کچھ نیچے واقع ہے اور اس کی جائے وقوع سے اندازہ ہوتا ہے کہ بانی نے اس کو نہ صرف ساکنان قلعہ کے واسطے بنوایا تھا بلکہ عوام کو بھی اس بات کا موقع تھا کہ وہ بالا بالا اس عبادت گاہ تک پہنچ سکیں۔

مندر میں داخل ہونے کے دو راستے ہیں ایک وہ جو اہل قلعہ کیلئے مخصوص تھا اور دوسرا وہ زمین دوز راستہ جس کے ذریعہ اہل شہر اور دوسرے زائرین آسکتے تھے، لیکن امتداد زمانہ کے ہاتھوں موخر الذکر برباد ہو گیا ہے اور اب صرف قلعہ ہی کا راستہ باقی ہے نیل کنٹھ قلعہ کے شمالی مغربی گوشہ میں واقع ہے، دس اوتار سے آگے بڑھکر ایک دروازہ ملتا ہے جس کو "پرمال پھاٹک" کہتے ہیں، اس پر ۱۵۴۰ء تا ۱۵۷۶ء کی تاریخیں کندہ ہیں قریب ہی ایک عمارت کے کھنڈرات ہیں جس کو پرمال نے بنوایا تھا اور اسی کے نام سے معنون ہے مگر چونکہ وہ انگریزوں کی یادگار قائم کرنے کے واسطے اسی عمارت سے پتھر لئے گئے تھے اس لئے اب اس کی حیثیت مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہیں

دوسرا پھاٹک "اماں دروازہ" کے نام سے موسوم ہے کچھ نشیب میں واقع ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس کو پنہ کے راجہ اماں سنگھ نے بنوایا تھا، یہاں سے مندر تک جانے کے واسطے سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے دیواروں پر مختلف دیوتاؤں اور مذہبی مناظر کی تصاویر کندہ ہیں سب سے پہلے لنکا کے راجہ راون اور اس کے دربار کا سین نظر آتا ہے، درباری اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوئے ہیں اور صنف نازک کی عشوہ طرازیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ایک جگہ نٹ راجہ کی تصویر ہے غرض اسی طرح مختلف نقوش کے ذریعہ سے مذہبی ماحول پیدا کیا گیا ہے۔

مندر جیسا کہ بادی النظر ہی میں معلوم ہوتا ہے پہاڑ کی ایک دیو قامت چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے، یہ عمارت غالباً دو منزلہ تھی اور بعض کا خیال ہے کہ ہفت منزلہ تھی مگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں اوپری منزل تاراج ہو گئی اور صحن میں جو ستون پڑے ہوئے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسی اوپری منزل سے تعلق رکھتے تھے، نچلی اور بالائی منزل کے اساطین کی نقاشی کا موازنہ کرنے سے ایک عجیب حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے مقدم الذکر کو ہم دو نمایاں گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اول سادہ قندیلہ نما (Caps) والے یہ اوپر سے نیچے تک یکساں چلے گئے ہیں اور درمیانی حلقے بھی بیلوں اور پھولوں کے اس تسلسل کو نہیں روکتے جو اساس (Base) سے قلہ تک چلے جاتے ہیں، قلہ نسبتاً بالکل سادہ اور دو پتھروں پر مشتمل ہے جو اوپر تلے رکھے ہوئے ہیں اب دوسرے گروہ کو لیجئے، ان کا قلہ ایک چہار جانبہ کندہ ہے اور ہر طرف بد وضع کی مورتیں اس طریقہ سے بنی ہیں کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے سقف کو روکے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بوجھ سے دبی جاری ہیں ستونوں کے نچلے حصہ میں بیلوں کی وضع وہی ہے جو دوسرے قسم کے ستونوں میں ہے گو نقوش میں تھوڑا سا فرق ہے لیکن یہ التزام صرف حصہ اساس تک ہی ہے اس اوپر فتیل سوز تک نقوش نسبتاً سادہ ہیں، لیکن یہ سادگی ایسی ہے کہ اس پر صناعی ہزار جان سے قربان ہوتی ہے، فتیل سوز کے اوپر ستون مدور ہو جاتا ہے، اور کسی گو تو عمارت کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

لیکن وہ ستون جو صحن مندر میں پڑے ہوئے ہیں ان دونوں سے مختلف ہیں اور قریب قریب اسی وضع قطع کے حامل ہیں جو استوپا ہائے سانچی کے دروازوں پر دکھائی دیتی ہے ہر حصہ میں نشست و برخاست کے کسی واضح پہلو کو دکھایا گیا ہے اور اکثر تصاویر تہذیب کے پایہ سے گری ہوئی نظر آتی ہیں۔

بالائی سطح میں انسانی اور نچلی منزل میں نباتاتی نقوش کی موجودگی اس امر کی دلیل ہے کہ اوپری منزل کو مذہبی حیثیت سے زیادہ سربلندی حاصل تھی

اور زائرین کے وقت کا زیادہ حصہ اوپر ہی صرف ہوتا ہوگا۔ اصل مندر تنگ سی ہے لیکن وہ ایک تاریک کوٹھری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ دیواریں بھی سادہ ہیں اور اصنام میں بھی کوئی بات جاذب توجہ نظر نہیں آتی بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مندر کا یہ حصہ قدیم الایام سے موجود ہے اور پرمال نے صرف بیرونی حصہ کو مرصع کار بنایا ہے۔

دروازہ کے اوپر ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہے جس پر کوئی عبارت کندہ ہے میں نے اس کا فوٹو لینے کی کوشش کی تھی لیکن تاریکی کی وجہ سے نقوش صاف نہ آسکے۔ سامنے تقریباً دو فٹ کا ایک مرصع لنگ رکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مندر مہادیوجی کے پرستاروں کی یادگار ہے۔ اور یہی امر ان حیاسوز تصاویر کی موجودگی کے راز کو بھی ظاہر کرتا ہے، جن کا ذکر ہم ابھی کر چکے ہیں۔ ؎

بالائی حصہ کی چھت کا نام و نشان بھی باقی نہیں، البتہ گرد و پیش کے سنگین شہتیر باقی رہ گئے ہیں جو ابھی تک اپنی جگہ قائم ہیں، مگر ان کا محل وقوع دیکھتے ہوئے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ چھت پاٹی گئی نہ تھی بلکہ غالباً کھجراہو کے منادر کی طرح مخروطی ہوگی، لیکن اس نظریہ کو تسلیم کرنے سے اس عام خیال کا ابطال ہو جاتا ہے کہ مندر دو منزلہ تھا۔

میں نے اس معاملہ پر دونوں زاویوں سے نظر ڈالی ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مندر بوجوہ ذیل یک منزلہ تھا۔

(۱) دوسری منزل کا عام طور پر منادر اور خصوصاً چندیلی منادر میں فقدان

(۲) دوسری منزل اس "جنت نظارہ" کو جو چشمہ نیل کنٹھ میں نظر آتی ہے عوام کی نظروں سے پوشیدہ کر دیتی ہے۔

(۳) منادر کی چھت عام طور پر کسی قسم کے گنبد اور کلس پر مشتمل ہوتی ہے، جو بصورت اولیٰ ناممکن ہے۔

اب سوال صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ اگر مندر یک منزلہ ہی تھا تو ان ستونوں کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے جو باہر پڑے ہوئے ہیں، کھجراہو کے چندیل منادر کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بجز چونسٹھ جوگنی اور نندی وغیرہ کے باقی تمام منادر دو یا دو سے زیادہ منڈپوں پر مشتمل ہیں اور یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ مذکورہ مندر میں بھی بیرونی منڈپ ہو جو اب منہدم ہو گیا ہے اور یہ ستون اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

وراہا اوتار

چندیلوں کے نزدیک وراہا کو ایک خاص عظمت و تقدیس حاصل ہے اور کھجراہو کے منادر کا ذکر کرتے ہوئے ہم اس کی ایک عدیم النظیر تشکیل کا ذکر کریں گے کالنجر کے قلعہ میں بھی دو مجسمے موجود ہیں جن میں ایک تو صدر دروازہ سے نیل کنٹھ کو جاتے ہوئے راستہ میں ملتا ہے اور دوسرا کوٹ تیرتھ کے قرب میں ہے یہ مجسمے جو وشنو کے خنزیری اوتار کی تشکیل ہیں ایک سنگ احد کو تراش کر بنائے گئے ہیں پتھر کی جلا اور جانور کے خد و خال صناعی کے کمال کا بہترین مظاہرہ ہیں۔

چرن۔ کوٹ تیرتھ سے کالنجری کی سمت کو جاتے ہوئے اکثر چھوٹے چھوٹے مٹھ ملتے ہیں جن میں چرن (قدم شریف) بنے ہوئے ہیں اور غالباً وشنو کی پرستش سے تعلق رکھتے ہیں، مگر جھاڑ جھنکاڑ کی موجودگی سے پتہ چلتا...کہ عرصہ سے اس طرف کوئی نہیں آتا۔

اسلامی باقیات

اہل اسلام نے بھی اپنی چند یادگاریں چھوڑی ہیں جو مقبروں اور مساجد کی صورت میں رونما ہیں صدر دروازہ سے مغرب کی طرف ایک وسیع قبرستان ہے جہاں غالباً ان شہدا کی قبریں ہیں جو قلعہ کی فتح میں شہید ہوئے تھے، انہیں کے مابین ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جو غالباً اورنگ زیب کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئی تھی، بعض شہداء میں سے بھی تین کے مقبرے اسی نواح میں واقع ہیں۔

وانچوپ کا مقبرہ

مسٹر وانچوپ بندیلکھنڈ کے کلکٹر تھے اور چونکہ ان کا انتقال اسی قلعہ کے اندر ہوا تھا لہٰذا مناسب یہی معلوم ہوا کہ ان کی لاش کو کسی دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے، مقبرہ بالکل معمولی ہے اور صرف ایک کتبہ ان کی تاریخ وفات وغیرہ کو ظاہر کرتا ہے۔

ڈاک بنگلہ سیاحوں کے ٹھہرنے کے واسطے پرانی عمارات کے پتھروں سے ایک ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا ہے جو نہایت پر فضا جگہ پر ہے اور اس جنگل میں قیام کے واسطے بہت مغتنم معلوم ہوتا ہے۔

احمد الدین مارہروی

؎ حیاسوز تصاویر کا فلسفہ کھجراہو کے منادر کے سلسلہ میں بتایا جائے گا۔

(۱۰)

اردو شاعری میں عورت کا تخیل

از ساحرِ الفکار جناب اختر حسین رائے پوری بی اے (علیگ)

ذیل کا مضمون محققین و تنقید نگاران ادب کی توجہ کے قابل ہے اگر اس سے کسی صاحب کو اختلاف ہو تو وہ اپنے خیالات سے نیرنگ خیال کے صفحات کو ضرور مزین فرمائیں۔ ایڈیٹر

لٹریچر سوسائٹی کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا لٹریچر کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جس زمانہ کا لٹریچر ہو اس زمانے کی سوسائٹی کو بھی سمجھا جائے، کیونکہ جب تک سوسائٹی کو نہ سمجھ جائے گا لٹریچر کو سمجھنا مشکل ہے جب تک ہم یہ سمجھ لیں کہ متعلقہ سوسائٹی کی معاشرت اور تمدن کیا تھا؟ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اس زمانے کے لوگوں کے افکار و خیالات کیا تھے؟ چنانچہ اردو شاعری کی "عورت" کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے سماج کو سمجھیں اور یہ دیکھیں کہ اس سماج میں عورت کی حالت کیا تھی۔

بیسویں صدی کے پہلے کا اردو ادب زیادہ تر افسانوں اور شاعری تک محدود تھا، تقریباً سبھی شاعر اور انشا پرداز شہروں کے باشندے تھے وہ نوابوں اور رئیسوں کے دامن کرم میں پرورش پاتے تھے، شہروں میں بالعموم امراء اور متوسط طبقے کے لوگ رہا کرتے تھے ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں یا تو معمولی درجے کے خدمتگار تھے یا فقیر فقراء شامل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری روساء اور امراء کی لونڈی بنی رہی! اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس طبقہ کی معاشرت کیا تھی، اور اس سوسائٹی میں عورت کا کیا مقام تھا؟ یہ معلوم کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجائیگی کہ اردو شاعروں کے افکار و خیالات نے کس فضا میں پرورش پائی!!!

اودھ کی تاریخ بتاتی ہیں کہ اس زمانہ میں عورت کی زندگی کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مرد کی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

ایک ایک امیر کی کئی کئی بیویاں اور لونڈیاں ہوتی تھیں اور ان کا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ جس امیر سے ان کا تعلق ہے وہ اسکی خوشنودی مزاج کا خیال رکھیں، چنانچہ وہ رات دن بناؤ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہتی تھیں امراء کی عورتیں گھر کا کوئی کام نہ کرتی تھیں، تمام گھر کا کام لونڈیاں اور باندیاں انجام دیتی تھیں، اس زمانہ میں مرد عورت کو اپنی غیر منقولہ جائداد سمجھتا تھا، عورت کو کہیں گھومنے پھرنے کی اجازت نہ تھی البتہ وہ کبھی کبھی پالکی، میانہ، ڈولی میں بیٹھکر اپنی کسی سکھی سہیلی سے ملنے جایا کرتی تھی، مکان کے مردانے اور زنانے حصے کے بیچ میں اونچی دیوار کھنچی ہوتی تھی اور پھاٹک پر زبردست پہرہ لگا رہتا تھا اکثر مکان دو منزلہ ہوتے تھے اور اوپر کی منزل کی کھڑکیوں پر چلمن پڑی رہتی تھی۔

عورتوں کی سخت نگرانی کی جاتی تھی، تاکنا جھانکنا تو کجا اُن کا ہنسنا بولنا بھی برا سمجھا جاتا تھا، متوسط طبقہ کے لوگ عموماً متجردانہ اخلاق کے قائل تھے صنفی خواہشات کی یہ روک تھام اپنی انتہائی حد تک پہنچ چکی تھی، اگر کبھی کوئی راہ چلتا نوجوان کسی دوشیزہ کو دیکھ لیتا تو اس کی دبی ہوئی نفسانی خواہشات یکایک بھڑک اٹھتیں، وہ رسم و رواج کی کڑی پابندیوں کی وجہ سے باہمی میل جول کو برا سمجھتا اور عورت سے کبھی میل جول کا اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے "عورت" اور "عیاشی" کو ایک ہی چیز سمجھتا تھا، ان نوجوانوں کو چھیڑنے کی خاطر کبھی کبھی البیلی اور چنچل چھوکریاں چلمن کی آڑ میں آکر کھڑی ہو جاتیں اور ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر پھر چھپ جاتی تھیں ہائے یہ نوجوان وہیں کلیجہ تھام کر بیٹھ جاتے اور نعرہ لگاتے تھے ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

آتشِ شہوت کو بجھا سکنے کی وجہ سے کسی نوجوان کو جنون ہو جاتا اور وہ جب کسی حسینہ کو دیکھتا تو بالکل بیتاب ہو جاتا اور اسے حاصل کرنے کے لئے لاکھوں جتن کرتا۔ عام لوگ اس بیماری کو "مرض عشق" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جب وہ دیوانہ آپے سے باہر ہو کر اس حسینہ کے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتا تو دربان اسے گردنیاں دے کر باہر نکال دیتا تھا!

کوچۂ یار سے ہم ایسے نکلوائے گئے
پا بدست دگرے دست بدست دگرے

اگر غور سے دیکھا جائے تو اردو شاعری میں شروع سے آخر تک دبے ہوئے صنفی رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اردو شاعر کے سامنے سرے سے کسی شریف عورت کا نمونہ تھا ہی نہیں۔ وہ جن عورتوں کو دیکھتا تھا وہ کوٹھے، ڈولی یا نقاب میں سے للچائی ہوئی نگاہوں سے عاشقوں کے جم غفیر کو دیکھنے کی عادی تھیں!! ایک اردو شاعر کہتا ہے۔

بن سنور کر گھر سے نکلے سیر کو جانے لگے
جب ہجوم عاشقاں دیکھا تو گھبرانے لگے

یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی "معشوقہ" کوئی شریف عورت نہیں، بلکہ ایک بازاری رنڈی ہے جس کی محفل میں اغیار کا جمگھٹ لگا ہوا ہے۔ "بیچارے" "عاشق" کا یہ حال ہے کہ یا تو دروازہ پر دربان اسے چپت لگاتا اور گھسنے ہی نہیں دیتا اور اگر خوش قسمتی سے اندر جانے کا موقع ملا تو پھر اس رقیبوں سے بھری ہوئی محفل میں اسے بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں ملتی، اگر جگہ ملتی بھی تو وہی معشوق کی جوتیوں کے پاس کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اوپر بام پر معشوق بال کھولے کھڑا مسکرا رہا ہے اور نیچے رقیبوں میں جوتیوں دال بٹ رہی ہے کوئی آہ سرد بھرتا ہے اور کوئی سسکیاں لیتا ہے غرضیکہ ایک عجیب ہنگامہ برپا ہے۔

آپ کو اردو شاعری میں اکثر "شام جوانی" کے جانے اور "صبح پیری" کے آنے کا ماتم بھی ملیگا! کبھی کبھی عاشق ہجر و فراق کی مصیبت جھیلتے جھیلتے اس قدر نحیف و زار ہو جاتا ہے کہ بیچارہ کھٹملوں کے ساتھ بستر کے بخیوں میں چھپ جاتا ہے

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہئے

اردو شاعر کے نزدیک "عشق" و "ہوس" میں کوئی فرق نہیں، اس کے نزدیک عورت خواہش نفسانی کو پورا کرنے کا آلہ ہے جب وہ عیاشی کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو کہنے لگتا ہے ؎

کہاں پیری کہاں گلچھیاں باغ جوانی کی
خزاں کا وقت ہے بیٹھے ہوئے کوتے اننتے ہیں

اس کے بعد روحانیت کا دور آتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس ملک میں خواہشات نفسانی پر کڑے پہرے بٹھائے جاتے ہیں جہاں عورت پیدائشی طور پر ناپاک تصور کی جاتی ہے، جہاں مرد اور عورت کا ملنا برا سمجھا جاتا ہے وہاں روحانیت کا بڑا زور ہوتا ہے دنیا دی خوبصورتی سے فائدہ نہ اٹھانے والے کسی خاص تخیل سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس چند روزہ زندگی کی فانی مسرتوں کے بدلے کسی اور دنیا کی ابدی مسرت کے خیال سے دل خوش کیا کرتے ہیں!! ایران ہندوستان اور چین میں اسی قسم کی شاعری کے سینکڑوں نمونے ملیں گے! یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر حالتوں میں جوانی ڈھلنے کے بعد ہی شاعر میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ یا اگر یہ نہ ہو تو پھر اردو کا باکمال شاعر ادب و اخلاق کو بالائے طاق رکھکر کچھ ایسا کھیل کھیلتا ہے کہ علمائے کرام اور صوفیوں کی محفل میں صف ماتم بچھ جاتی ہے، آخری دور کے لکھنؤی شاعر، مثلاً امانت و رشک . . . . وغیرہ اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

امانت کہتا ہے ؎

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری
یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری
للہ قدم غم کے کوچے سے نکالو
بازار میں سب دیکھتے ہیں راہ تمہاری
عاشق کو خوشی اور رقیبوں کو الم ہو
جائے جو سواری کبھی درگاہ تمہاری

رشک کہتا ہے ؎

باغ میں جاتے ہو پہنے ہو گلابی ٹوپی
بلبلِ بے ادب آ بیٹھے نہ اے جان سر پہ

اس بیہودہ شاعری کے نام لیوا اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں، ہندوستان کی ضرورت سے زیادہ سخت ترین قید نے دو خوفناک بیماریاں پیدا کر دیں۔

اول رنڈیوں کی گرم بازاری، اور دوسرے حسین لڑکوں سے ناجائز محبت

آرٹ کی جان حسن ہے۔ آرٹ کا مفہوم و مقصد غیر فانی حسن کی تلاش ہے۔

حسن فی الحقیقت فطرت اور عورت کی ذات میں پنہاں ہے، مگر اردو شاعر فطرت کے دلکش رنگ حسن کو دیکھنے سے اس لئے معذور تھا کہ وہ شہر میں رہتا تھا اور

فطرت کے رنگین نظاروں سے اس سے بہت دور تھے، اب رہی عورت "تو شریف "عورت" پہلے ہی گھر کی چار دیواری میں بند تھی، اس کے حرم میں آدمی کا کیا ذکر آفتاب کی روشنی بھی نہ پہنچ سکتی اور پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا! اس لئے اردو شاعر کو جن عورتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا وہ زیادہ تر بازاری عورتیں تھیں یا ہرجائی معشوق تھے علاوہ بریں اردو شاعروں نے اپنی شاعری کو غزل و مثنوی اور اسی طرح کے دو چار اصناف سخن سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ان غزلوں و مثنویوں میں عشق و محبت کے چند پیش پا افتادہ خیالات اور بیوفا معشوق کے عشق میں بکا، ہائے و اویلے کے سوا اور کچھ بھی نہیں رکھا ہے اب رہے مرثیے اور سلام تو ان کا تعلق مباحث اور بد معاش نوابوں اور رئیسوں کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ ان کا مقصد بخشش کر کے دولت بٹورنے کے سوا اور کچھ نہ تھا اس لئے ان کا ایک بہت بڑے حصے کو شاعری کہنا خود شاعری کی توہین ہے!! القصہ ہمارے اردو شاعروں کے دامن میں حقیقی شاعری کے گلہائے رنگا رنگ خال خال نظر آتے ہیں۔

تقریباً تمام اردو شاعر متوسط طبقے Middle class سے تعلق رکھتے تھے، یہ سب کو معلوم ہے کہ اس طبقہ کی معاشرت کیسی ہوتی ہے؟ اس طبقہ کی روایات رسم و رواج اور رہنے سہنے کے طریقے قریب قریب ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں چنانچہ اس طبقے کے لوگوں کی زندگی میں آپ ہی آپ ایک طرح کی یک رنگی پیدا ہو جاتی ہے ان کی زندگی میں کوئی تنوع نہیں ہوتا۔ وہ زندگی جس میں کوئی تنوع نہ ہو کتنی تکلیف دہ اور الم انگیز ہوتی ہے؟ روزانہ ایک ہی کام ہوتا ہے روزانہ ایک ہی طرح کی بات کہی جا رہی ہے؟ روزانہ ایک سی چیزیں دیکھی جا رہی ہیں، اسی لئے اردو شاعر کی معشوقہ بھی "ایک گڑیا" کی حیثیت رکھتی ہے جس کے ناز و بھاؤ میں کوئی ندرت نہیں معلوم ہوتی، تمام شاعروں کی شاعری کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ دربان کا خوف ہے ورنہ ابھی کمند لگا کے دیوار پھاند جاتے اور دھڑام سے معشوق کے قدموں پر جا گرتے!!

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہونگا صاحب سلام میرا

تمام شاعر بستر مرگ پر پڑے ہیں، ساری دنیا مریض غم کو دیکھنے چلی آ رہی ہے گھر ماتم سرا بنا ہوا ہے، سب کو مریض عشق کی زندگی سے مایوسی ہو چکی ہے، مگر اب تک عاشق کا دم اس لئے نہیں نکلا کہ وہ اس دنیا سے جانے سے پہلے ایک بار معشوق کے درشن کرنا چاہتا ہے، جب معشوق کسی طرح نہیں آتا اور عاشق کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی ہے تو ملک الموت کو اس پر رحم آ جاتا ہے چنانچہ وہ اس کی روح نکال لیتا ہے اور اس طرح اسے انتظار کے مرض سے نجات بخشتا ہے جیتے جی رقیبوں سے جوتم پیزار ہوتی رہی تھی کہ آخری وقت بھی ظالم معشوق کا دیدار نہ ہو سکا اور نتیجہ یہ نکلا کہ قبرستان پہنچ گئے اب بیوفا معشوق آتا ہے چنانچہ وہ بال بکھرائے "گور غریباں" پر دیا جلانے اور فاتحہ پڑھنے پہنچتا ہے کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی شریف خاندان کی شریف الطبع لڑکی ایسی ظالم اور بے رحم نہیں ہو سکتی۔

عاشق اور معشوق زندگی کے دو حصے ہیں ان کے ملنے ہی سے زندگی مکمل ہوتی ہے اور اس کے پہلے وہ نامکمل رہتی ہے۔ مگر اردو شاعر اسے نہیں سمجھ سکا اس کا معشوق، ہرجائی اور بیوفا ہے اسے سچی محبت کی کوئی قدر نہیں، وہ [illegible] کے آغوش کی زینت ہے اور سچے عاشق کو جلانا اور تڑپانا اس کی عادت میں داخل ہے اس کی نظروں میں سچا عاشق اور ہوس پرست تماش بین دونوں برابر ہیں اس کے نزدیک محبت کی قیمت روپیہ ہے!! اور بیچارے سچے عاشق کا یہ حال ہے کہ روپیہ تو پہلے ہی اس کے پاس نہ تھا اور اب تو وہ دامن و گریباں بھی تار تار کر چکا ہے اس لئے ہرجائی معشوق اسے پوچھے بھی تو آخر کیوں پوچھے!

چونکہ ہمارے ہاں عورت گونگی تھی وہ اپنے شوہر کے منہ سے بولتی اور شوہر ہی کی آنکھوں سے دیکھتی تھی اس لئے اردو شاعری میں عورت کے حقیقی جذبات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلتا چونکہ مرد اپنے خیال کے مطابق عورت کے جذبات ظاہر کرتا ہے اس لئے اردو شاعری کا کیا ذکر اردو نثر میں بھی بہت بڑی حد تک عورت کے حقیقی جذبات و احساسات کا کوئی نشان نہیں ملتا، عورت کی زندگی چار دیواری تک محدود ہے اور یہی عورت کی دنیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک مسلمانان ہند میں کوئی قابل ذکر شاعرہ یا انشا پرداز خاتون پیدا نہ ہو سکی!! جب تک ہماری سوسائٹی یہ سمجھتی رہے گی کہ مردوں اور عورتوں کے جذبات میں کوئی فرق نہیں، اس وقت تک ہماری قوم میں کسی زبردست شاعرہ یا انشا پرداز خاتون کا پیدا ہونا مشکل ہے۔

قدیم اردو شاعری میں تو بے ریش و بروت لڑکوں نے عورت کا مقام چھین لیا تھا، اردو شاعروں نے یہ نقل ایران سے اڑائی تھی ایرانی میکدوں میں حسین لڑکے ساقی گری کا کام کرتے اور رندان لم یزل کے عیش کا سامان بنتے تھے اردو شاعری میں کبھی کبھی یہ تو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ معشوق کوئی عورت ہے یا لڑکا؟

مغربی زبان والے اس ٹیڑھی چال کی وجہ سے اردو شاعری پر جائی حملے کر رہے ہیں۔

اردو شاعروں کا دوسرا نفرت انگیز رویہ یہ ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم لڑکیوں سے عشقبازی کرتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کی جوانی شاعروں کی نظر سے نہیں گذرتی اس لئے وہ ان کے بچپن ہی کا ذکر کر کے جی بہلا لیتے ہیں ؎

بچپن میں ان کو شوق ہوا میرے قتل کا
ننھی سی اُن کے واسطے تلوار چاہئے

بھلا اس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی
کبھی کم سنی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

جو بچپن میں یہ ضد ہے جانی تمہاری
ابھی دیکھنی ہے جوانی تمہاری

اس مقام پر یہ کہدینا بیحد ضروری ہے کہ اس قسم کی گندگی وہی شاعر اچھالتے ہیں جنہیں خواہشات نفسانی کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

اصل میں انسانی زندگی کے دو حصے ہیں ایک بھوک اور دوسرے صنفی خواہشات۔ ان دونوں کی تکمیل کے لئے ہی سوسائٹی پیدا ہوئی ہے۔

ہمارے سوشیل ریفارمروں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ذیل کی تین بیماریوں نے ہمارے سماج کو جہنم کدہ بنادیا ہے۔

(۱) صنفی خواہشات پر بے انتہا دباؤ Sex repression
(۲) صنفی بیراگ۔ sex abandonment
(۳) صنفی تھکاوٹ۔ Sex Fatigue

ان بیماریوں پر صرف رونے دھونے سے کام نہیں چل سکتا زخم اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ مرہم پٹی کی حد سے گذر چکا ہے اب ضرورت ہے ایک ایسے تیز نشتر کی جو قومی زندگی کے اس پھوڑے کو چیر کر فاسد مادے کو بالکل خارج کر دے

بیسویں صدی کے آغاز سے اردو ادب میں انقلاب رونما ہے۔ اردو شاعر چلمن کی آڑ میں معشوق کو دیکھکر غش کھا کر گرنا چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی طرح تعلیم یافتہ عورت کی حالت بھی بدلتی چلی جا رہی ہے اور وہ زمانہ دور نہیں جب اردو شاعری کی "معشوقہ" عصمت باختہ بازاری عورت کا لباس چھوڑ کر ایک باعصمت اور شریف طینت دردمند خاتون کا لباس پہن لے گی۔

اختر حسین۔ بی اے علیگ

(۱۴)

اصلاح ادب

از جناب اظہر علی صاحب آزاد

اردو اخباروں کے ذریعہ سے بعض غلط الفاظ، غلط محاورے یا ناپسندیدہ ترکیبوں کا رواج عام ہوتا جا رہا ہے۔ بہی خواہان اردو کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس خس و خاشاک سے گلزار ادب کا دامن پاک کرنے میں ساعی ہوں ضرورت اس کی ہے کہ ہمارا لہجہ نرم اور شیریں ہو، ناقدانہ اصلاح نہ ہو، بلکہ دوستانہ مشورہ۔ فقیر اس میدان میں پہلا قدم رکھتا ہے چاہتا ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھے۔ زبان کی ترقی میرا مقصد ہے حرف گیری اور دل آزاری سے غرض نہیں۔

"غنڈے" ۔ "غ" عموماً علامت عربی "ڈ" ہمیشہ ہندی نژاد، اصل یہ ہے "گنڈا" ہندی بھاشا ہے، جمع "گنڈے" ہوگا۔ یہاں "غ" کا کوئی محل نہیں ہے۔

"ساڑھی" مستورات کا لباس، اس میں "ھ" نہیں ہے "ساڑی" صحیح ہے۔

"گھملا" یہاں بھی "ھ" نہیں ہے۔ گملہ یا گملا فرمائیے۔

"کمبل" یہاں "ب" بے محل اور بے ضرورت ہے۔ کمل، کملی صحیح ہے میاں میرٹھی مرحوم فرماتے ہیں ع کملی والے مجھے کملی میں چھپا لے آ جا"

"لیمپ" اگرچہ انگریزی "بارب" سے یہ لفظ بنا ہے لیکن اردو لفظ "بم" ہے نہ کہ "بمب"۔

ہمارے پنجابی بھائی ذیل کے معروضات پر توجہ فرمائیں۔

"تار" مذکر ہے۔ تار آیا نہ کہ تار آئی "تار" کی جمع "تاریں" "ٹکٹ" کی جمع "ٹکٹیں" نہیں بلکہ "تار" اور "ٹکٹ" دونوں واحد بھی ہیں جمع بھی مثلاً بہت سے تار آئے ہم نے بارہ ٹکٹ خرید لئے "پارچہ" کی جمع "پارچات" نہیں "پارچہ جات" ہے بجائے اس کے "کپڑے" کہنا پسندیدہ ہے،

"گندم" مونث نہیں مذکر ہے۔ گیہوں کی جگہ پر عادتاً گندم بولنا یا لکھنا خلاف ہے۔

"بجراہ" مثلاً تمام بیماریوں کی "بجرہ" میں "ہ" بے ضرورت ہے صحیح لفظ "جڑ" ہے نہ کہ "جڑہ"۔

برعکس اس کے "دودھ" کو "دود" لکھنا بھی غلط املاء ہے "دود" بمعنی "دھواں" فارسی ہے۔

"زبائش" کوئی لفظ نہیں، استعمال نہ فرمائیے "بہانہ" اردو ہے۔ "ئش" فارسی الفاظ سے آتی ہے۔ مثلاً "زبان" سے "زبانش" وغیرہ۔ ہندی نژاد الفاظ کے ساتھ جب یہ قاعدہ برتا جائے گا تو مضحک صورت پیدا کرے گا۔

"فکر" اور "سانس" فصحا کے نزدیک مونث ہے، دہلی اور لکھنؤ کے جھگڑے میں نہ پڑیے، اگر فصاحت لطافت اور حلاوت بار خاطر نہ ہو تو یہی راہ ہے، ورنہ آپ مختار ہیں۔

"غپ شپ" "پ" عموماً علامت ہندی بھاشا "غ" عموماً علامت عربی اصل یہ ہے کہ لفظ فارسی ہے "گپ" "گپ زدن" فارسی لغات میں ملاحظہ فرمائیے "گپ" سے "غپ" یقینی غلط ہے لہذا "گپ شپ" صحیح ہے۔

"کندھا" گفتگو میں کوئی بولے تو بول لے ورنہ صحیح "کاندھا" ہے۔ "ناک" دہلی میں مذکر نہیں مونث ہے

"تتلانا" "تتلے پن کا علاج" اس لفظ کے معنی غلط سمجھے گئے ہیں، چھوٹے بچے جو ش ق، س وغیرہ کا صحیح تلفظ ادا نہیں کر سکتے مثلاً "رب الناس" کو "رب الناچ" کہتے ہیں یہ "تتلانا" ہے زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے بچے یا بالغ مرد و عورت اگر بعض الفاظ بمشکل ادا کر سکیں، مثلاً "تمہارا" کہنا ہو تو "تم۔ تم۔ تم۔ تم۔ ہارا" کہیں تو اسے "تتلانا" نہیں "ہکلانا" کہتے ہیں۔ "تتلا" نا ہونا کوئی مرض ہے نہ اس کا علاج ممکن ہے۔

"چوہدری" "گاہڑا" "مہنائی" ان کا صحیح تلفظ ہمارے پنجابی بھائی بالکل ہماری ہی طرح کرتے ہیں، پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لکھتے وقت "ہ" کیوں بیشتر آنے دیتے ہیں "چودہری" "گاڑھا" "مٹھائی" لکھنا کیوں نہیں شروع کر دیتے، اس میں کون سی قباحت ہے؟

"نا علم" اور "بے علم" میں فرق ہے۔ "نا علم" بمعنی ناواقف ہے مثلاً میں قطعی نا علم ہوں کہ وہاں کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ "بے علم" بمعنی جاہل آیا ہے۔ نا کہ بے علم تو ہاں ضدا نشاخت۔ (سعدیؒ) یعنی بغیر علم حاصل کرنے کے۔

"چھکتا ہے" "چھنتا ہے" "ہوا ہوا ہے" پنجابی طرز ادا ہے بجائے اس کے کہنا چاہئے۔ جلتا ہے، جلتا ہے ہو چکا ہے۔

"گھٹا ٹوٹ بادل" صحیح محاورہ "گھٹا ٹوپ" ہے۔ گھٹا مثلاً ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہے۔

"منہ کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے" "باگ" کہنا چاہئے باگ ڈور اس رسی کو کہتے ہیں جو گھوڑے کی باگ میں باندھ دیجاتی ہے، اور جسے پکڑ کر سائیس گھوڑا ٹہلاتا ہے۔ قابو میں رہنے کے معنی میں "باگ" مستعمل ہے نہ کہ باگ ڈور۔

"ایک آنکھ" اور "ایک نظر" میں فرق ہے۔ مثلاً یہ بات مجھے ایک آنکھ اچھی نہیں لگتی، یعنی مطلق پسند نہیں۔

"ایک نظر" مثلاً ذرا میں بھی یہ کتاب ایک نظر دیکھ لوں۔

اظہر علی۔ آزاد

سیدی کٹی

از جناب سید طالب علی صاحب عابد ایم اے الہ آبادی

وہ دیکھئے سیدی کٹی دہی ہے۔

دو آدمی موٹر سے نیچے اترے، رات بھیانک تھی اندھیرا اور رنج کی سردی، دونوں کانپے جاتے تھے، ابھی کچھ ہی دور آگے بڑھے ہونگے کہ ندر ندر کرتی ہوئی کوئی چیز کان کے پاس سے جاتی ہوئی جان پڑی، دونوں چونک پڑے، ان میں کانا پھسکی ہونے لگی۔

بجلی کی ہاتھ بتی جلائی گئی، تو پاس والے پیڑ کے تنے میں سرکنڈے کا ایک بان چل تک گڑا ہوا دکھائی دیا، دونوں دہک سے ہو گئے، ادھیڑ لے گردے کہا، آدمیوں یہ لچھن تو اچھے نہیں ہیں، دوسرے نے کہا، ہاں بھائی جا بچے تو ٹھیک ہو۔

اب دونوں پھونک پھونک کر پاؤں دھرنے لگے، کٹی کے سامنے پہنچکر رکے، ادھر اُدھر دیکھا اور کنڈی کھٹکھٹائی، کواڑ اندر سے جکڑا ہوا تھا، کسی نے پوچھا، پہچان دکھاؤ۔

ادھیڑ نے کوٹ سے ایک پرچہ نکالا اگر ونے بتی جلائی، دیکھنے والے نے دیکھ لیا۔ کواڑ ہنس پڑا، دونوں اندر آ گئے۔

گھر والا، تھر تھر کانپ رہا تھا، مٹی کا ایک دیا کونے میں ٹمٹا رہا تھا، مانو کوئی سندری سوگ میں تھی۔

گھر والا، آپ آ گئے جی میں جی آیا، اس بندہ گئی، یہ دیکھئے بچھونے پر تکئے کے نیچے یہ پرچہ ملا ہے۔ جالم اور کمتا چار پانچ دن ہوئے پانچ برس جوگ کر آئے ہیں اب آپ ہی بچائیں، تو میری جان بچ سکتی ہے۔

ادھیڑ نے پرچہ پڑھا تو ابھرے ہوئے لال حرفوں میں لکھا تھا۔

نربل، تم نے سرکاری گواہ بن کر، ہم کو قانون اور حکومت کے ہاتھ معنت بیچ ڈالا، ہمارے زخم بھرے نہیں ہرے ہیں، ہماری جو سانس اندر آتی ہے وہ دبی ہوئی چوٹ کو ابھارتی ہے اور جو باہر نکلتی ہے وہ انتقام انتقام پکارتی ہے، ہم لٹ گئے، تباہ ہو گئے، تم خود چھوٹ گئے، اور اب تو خدا رکھے گاؤں کے مہاجن ہو، سیدی کٹی، کوٹھی ہو گئی ہے۔

آج رات کو ٹھیک بارہ بجے کٹھل کے درخت کے نیچے تم اکیلے آؤ، اور ڈیڑھ روپیہ ساتھ لاؤ، اگر تم نے دیر کی، کوئی چال چلی، پولیس کو خبر دیدی، یا کوئی اور دغا کی تو یاد رکھنا ۲ گھنٹے کے اندر تم بے جان اور سیدی کٹی سنسان ہوگی، تم ہماری ہمت، قوت، پھرتی، اور صفائی سے اچھی طرح واقف ہو" ع۔ ا۔ د۔ م

جاسد مسکرایا، سفید دانت موتی سے چمک گئے، آنکھیں انگارہ ہو گئیں، سنو

نربل۔ تم کا اپنا تھر تھرانا چھوڑ دو۔ اُڑخونی، ظالم، ڈاکو، کے دس ہاتھ ہیں تو سپاہیوں کے دات، غریبوں کے مالک، ہم سب کا پالنے والا ہزار ہاتھ رکھتا ہے، جب تک وہ نہ چاہے بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔

نربل۔ ٹھیک ہے مگر دونوں پتھر کا دل رکھتے ہیں، اور آگ کے بنے ہوئے ہیں، لوٹ لینا، مار ڈالنا، لوہا گرم کرکے پیٹھ پر سینکے داغنا، سارا بدن چھلنی کر دینا۔ ان کے آگے لڑکوں کا کھیل ہے۔

اُشے۔ (جوش میں تن کر) وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ مگر شرط یہی ہے۔ کہ جو کچھ ہم کہیں وہی کرو۔

نربل۔ میں آپ لوگوں سے کسی حال میں باہر نہیں۔

اب تینوں نے مشورے کئے، تجویزیں سوچیں اور سو گئے۔

ساڑھے بارہ بجے، دھرم گھڑی نے ایک بجایا، اور چپ ہو گئی کسی نے گلا گھونٹ دیا، نربل جاسد اور اُشے تینوں کھٹکے کی نیند سے چونک پڑے، آہٹ اور سرسراہٹ معلوم ہوئی جیسے سانپ اِدھر اُدھر چلتے سرکتے ہوں۔

تینوں کے بچھونے ایک ساتھ تھے تینوں کی عادت تھی کہ منہ بند کرکے سوئیں، دو قرولیاں ہوا میں لپکیں، بجلی چمکی، اس کی روشنی میں سوتے ہوئے جاگتوں نے دیکھا، کہ تین نقاب پوش کمرے کے اندر ہیں، دو نے قرولیاں اور تیسرے نے برچھی سنبھالی رکھی ہے، تینوں مسکرائے۔

قرولیاں اور برچھی کھبا کھب سونے والوں کے سینوں میں اتر گئیں، ٹوٹیں، لوہے کی لچکدار کمانیوں سے کھٹا کھٹ نکلیں، اور تینوں ہاتھ چور شکنجوں میں جکڑ گئے۔

زخموں سے ایسا خون نکلا کہ حملہ کرنے والے بے رحم قاتل خون کے گرم فوارے میں نہا گئے، جاسد نے بجلی جلائی، گبرو نے انگڑائی لی اور نربل نے قہقہہ لگایا۔

اور میں نے دیکھا، تو نہ لاشیں تھیں نہ قاتل نہ مکان تھا نہ مکیں، ایک عدالت تھی اور تین ملزم، میں نے آنکھیں ملیں ہوشیار ہو گیا، اب نہ عدالت کا پتہ تھا نہ ملزم تھے، نہ جج، نہ وکیل تھے، نہ پیشکار، ہو کا عالم تھا اور سناٹا۔

مگر ہاں صرف ایک جگہ یہ سب چیزیں دھندلی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھیں، ہر نقش مشتبہ تھا ہر تصویر مشکوک تھی صرف دیکھنے والے کی ذات یقینی تھی۔

جس طلسمی محل میں یہ سب کچھ ہو اور کچھ نہ ہو جہاں فنا اور بقا، ایک جھولے میں جھول رہے ہوں جہاں ہستی اور نیستی ہم آغوش ہوں۔ جہاں شعر اور حقیقت دست و گریباں نظر آئیں۔

کیا آپ اس عالم کا نام جاننا چاہتے ہیں، بوجھئے، سوچئے . . . ."

صاف صاف سننا ہو تو سنئے ———— خیال۔

مزاحیہ افسانہ:-

کرکٹ میچ

از جناب مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی بی. اے ایل ایل بی

(۱)

کرکٹ اور کرکٹ میچ پر آج کل برسات کے موسم میں کوئی مضمون لکھنا "بے فصلی" سی چیز ہے. بالخصوص جبکہ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ کرکٹ کے واہیات میچوں کا حال اور ان کی خبریں چھاپتے چھاپتے اخبار والوں نے پبلک کو پست کر دیا. اور پھر اب تو ایم سی سی والے بھی ہندوستان سے "آوٹ" ہوگئے ورنہ بہت ممکن ہے کہ یہ مضمون اگر کچھ پہلے شائع ہوتا تو ہمارے ہندوستانی کھلاڑی کرکٹ کا ایک ایسا گر جان جاتے کہ ایک ہی مقابلہ میں ایم سی سی کی عقل راہ پر آجاتی.

بہت ممکن ہے کہ آپ یہ سوچیں کہ یہ ایک مضمون نگار دغریب کیا جانے کرکٹ اور کرکٹ کی باتیں! مگر عرض ہے، اکثر میدان کارزار میں لٹھ کام آتے ہیں، اور تلواریں دھری رہ جاتی ہیں، اور پھر میں کرکٹ میں ایسا گمنام یا اناڑی بھی تو نہیں. مجھے تسلیم ہے کہ اسکول کی ٹیم کے کپتان سے ہمیشہ جھینک رہی جس کی بنا پر ٹیم میں مجھے کبھی شریک نہیں کیا. مگر ویسے درجنوں میچوں میں جھگڑا میں نے کیے. آوٹ اور ناٹ آوٹ کے قضیوں میں ہمیشہ پیش از پیش رہا. کالج میں پیچکر وزیر علی اور نذیر علی کا کلاس فیلو رہا. سینکڑوں میچیں دیکھ ڈالیں. رن گن ڈالے، امپائروں کی غلطیاں نکالیں. ولایتی بالوں میں خرابیاں لیں، بلکہ ایک تو چرا لیا. علیگڈھ میں جب ایم سی. سی والے آئے تو گلیگن کو مرتسر اور نیشتہ کے سامنے ایک میچ کا چیلنج دیا اور اگر وہ منظور کر لیتے تو اپنی شکست کو عمر بھر نہ بھولتے. قصہ مختصر کرکٹ کی فضا میں رہا، بڑھا، اور پلا اور محض اپنی جدت سے کرکٹ میں وہ ترکیب دریافت کی جس سے میچ ہارنے کا امکان ہی جاتا رہا ایک نہیں اسی ترکیب سے دس میچ کھیلے اور جیتے ہیں خود ہم نے!

(۲)

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جب ہم اسکول میں پڑھتے تھے تو ہمارے کپتان تھا: دوڑ دھوپ کرکے مل ملا کر کسی نہ کسی طرح ایک میچ گوروں سے طے کر آئے یہ گورے تو ویسے میچ کے بھوکے ہوتے ہیں. اس میچ میں کپتان صاحب نے "نہ تو ہمیں کھلاڑیوں میں شامل کیا اور نہ "مدفاضل" میں رکھا جو ہر جگہ گھس گھس کر میچ دیکھتے. رن گنتے بلے تولتے. یا اور طرح خصوصیت جتاتے اور ریفرشمنٹ کے انتظامات میں بھی پیش از پیش رہتے. گوروں کی فوج کی طرف سے میچ کا خاصا انتظام تھا، حد یہ کہ ایک خیمہ میں ریفرشمنٹ کے بہانہ سے "معلوم کیا کیا" لوگ "ریشم" اور "کلابتوں" اٹھایا گئے اور ہم دیکھا کئے! یعنی ہم اور ہمارے دوست واقعی وہ ہی سے معمولی میچ دیکھنے والوں کی طرح میچ کو ہچ پچ "دیکھتے" ہی رہ گئے. نتیجہ ہمارے اسکول کی ہار رہی. بری طرح ہارے، "دوڑتے" "دوڑتے" اور "پدتے" "پدتے" "سویرا ہوگیا. کھلاڑیوں کا گوروں نے فشار نکال لیا، ایک سے ایک تگڑا وہاں گورا موجود، ایسا کہ اوپر گیند پہونچی نہیں کہ اس نے "ہٹ" کردی. قصہ مختصر لڑکوں کو رپٹا مارا. جتنا کھلایا تھا سب وصول کرلیا، پھر عنایت ہی سمجھئے جو گوروں نے بخش دیا، کیونکہ ان کے رن اتنے ہوگئے تھے کہ آگے کھیل کی ضرورت ہی نہ رہی. کئی وکٹ اور بہت سے رنوں سے اسکول کی ٹیم ہار ہی.

میچ کا انتظام، ریفرشمنٹ وغیرہ کا انتظام ایسا نہ تھا کہ اس کی دلکش اور سہانی یاد کسی نیک اور پاک دل طالب علم کے معصوم دل سے محو نہ ہوسکے چنانچہ ہمیں بھی فکر پڑا کہ کسی طرح ان گوروں سے میچ طے کریں.

چنانچہ ہم اس تاک میں تھے کہ ایک روز اسی رجمنٹ کا گورا ہمارے نگر کی طرف نکل آیا، یہ رجمنٹ ہائیلینڈرس کا تھا. اس گورے کے ساتھ ایک کتا تھا اور ہمارے یہاں بلا مبالغہ اچھے سے اچھے کتے موجود تھے، اور کتوں کے

ڈاکٹر اور قدردان نہیں بلکہ عاشق زار بیا شیصاحب بھی موجود، کچھ تو کتا پسند اور کچھ گورا پسند لہذا فوراً گورے صاحب کو رد کرنے کا بہانہ ہاتھ آیا۔ نتیجہ یہ کہ بہت جلد قبلہ گورے صاحب بنگلہ کے مختصر لان پر پہنچے کتوں کی دیکھ بھال کر ٹہے سنے بیہاں اپنا یہ حال کہ باتیں تو کتوں کی ہو رہی ہیں مگر جی ہے کہ جو اب میچ کے ریفر شمنٹ میں۔ گورے صاحب کو کرکٹ کے ذول پر لانا چاہا تو معلوم ہوا وہ کرکٹ کے قطعی شوقین نہیں، سوڈا برف سے ان کی خاطر خواہ مدارات کی ان کے یہاں کتے دیکھنے آنے کو وعدہ کیا، اور یہ بھی برسبیل تذکرہ عرض کر دیا کہ میچ کا معاملہ بھی وہیں طے کریں گے۔

دو چار روز بعد رجمنٹ میں جو پہنچے تو پایا تو اس بیہودہ گورے کا ہم نام بھول گئے یا دس بیس گورے اسی نام کے اور موجود تھے، پتہ لگا کر پہنچے جو سہی تو اسی نام کا ایک سخت بدتمیز گورا ملا۔ جو ہمیں دیکھتے ہی آنکھیں نکالنے لگا، اور اچھل پھاندنے لگا اور اس کے ساتھ ہی لگے قہقہہ اڑانے۔ پھر آگے بہت نہ پڑی جو اس منحوس کی تلاش کے سلسلہ میں کسی اور بھی "خراب" گورے سے ملتے چنانچہ طے کیا کہ میچ طے کریں۔

باضابطہ ٹائپ شدہ چیلنج ایک فرضی کلب کے کپتان کی طرف سے لائے تھے کسی رجمنٹ سے میچ طے کرنا معمولی بات نہیں، گھنٹوں ادھر سے ادھر دوڑے۔ درجنوں افسروں اور نہ معلوم کن کن سے ملے اور نتیجہ یہ کہ جواب باصواب نہ ملا، خط پر پتہ چھوڑ کر آئے کہ اس پتہ پر ہم مطلع ہوں۔

بات گئی گذری سی ہو گئی تھی کہ دس پندرہ دن بعد ایک اطلاعنامہ آیا کہ ہم فلاں دن میچ کے لئے تیار ہیں، فوراً ہم پھر رجمنٹ پہنچے اور میچ منظور کر لیا۔ ایک شرط پر وہ یہ کہ کھیل کا سامان ہماری دوسری ٹیم اسی روز ایک اور جگہ لے جائے گی، لہذا سامان وغیرہ آپ کا ہی رہے گا، دراصل یہاں یہ حال تھا کہ ٹوٹا بلا چھوڑ، "اس کو رنگ" پنسل تک نہ تھی، گوروں کے یہاں قاعدہ ہے کہ روز تو وہاں قواعد پریڈ اور اسی قسم کے فضول دھندے رہتے ہیں میچ کیلئے خاص طور پر دن نکالا جاتا ہے ساری رجمنٹ کی چھٹی ہو جاتی ہے چنانچہ ہم سے پابندی وقت پر پہنچنے کا بھی اشارہ کر دیا گیا تھا، یہ معاملہ طے کرکے جو ہم آئے ہیں تو یار دوست مارے خوشی کے دیوانے ہو گئے ناچنے لگے اور یہ حال کہ تمام کے تمام دوست میچ کھیلنے کو تیار، ایسے ایسے اناڑی کہ گیند پھینکنے سے پیشتر ہی آؤٹ ہو جائیں، بڑی مشکل سے ہم نے انتخاب کیا اور گھری دوستی ہی کو مجبوراً معیار قرار دیا، ایک صاحب کو محض اس وجہ سے رکھنا پڑا کہ انہوں نے اپنے دو سوٹ دوسرے کھلاڑیوں کو دینے کا وعدہ کیا، دراصل یہ بے حد ضروری تھا کہ ہم ٹھاٹ سے جائیں، ایک موٹر کرایہ کیا اور راستے قبل از وقت ہم وہاں پہونچے ہیں کہ سوائے مزدوروں اور خلاصیوں کے کوئی بھی نہ تھا موڑ پڑا نا بیکار گیا، اس دوران میں سب آپس میں پرشوی راج کی فوج کی طرح ایک دوسرے سے عہد پیمان کرتے رہے کہ بیحد اچھا کھیلیں گے جب تک جان میں جان ہے اور بلا ہاتھ میں ہے گیند کو وکٹ کے قریب بھی نہ جانے دیں گے، خواہ کتنے ہی زور سے گیند آتی ہو گی، ہرگز ہرگز "گریز" نہ چھوڑیں گے دراصل دو تین ایسے ہی تھے اُن سے قسمیں لیں۔

(۳)

بہت جلد خدائے عزوجل نے مہربانی کی اور میدان بھر گیا، سیکڑوں گورے بقول کسے "گورے پہ گورے" اور میمیں اور ادھر ادھر کے لوگ آ جمع ہوئے، میلے کا سا مجمع ہو گیا اور انتظام وہ زوردار کہ ریفرشمنٹ کے خیمہ کی طرف دیکھ کر ہم لوگ آپس میں جب آنکھ کا اشارہ کرکے مسکراتے تو اندر سے دل کھنچنے لگتا، کہنا ناہی کون منحوس کھا کر آیا، کسی نے کہا کہ بھیا میں تو دو بسکٹ کھا کر آیا ہوں، کوئی روٹی کا ایک ٹکڑا کھا کر اوپر سے بہت سا پانی پیکر آیا تھا میں نے خود صرف ایک انڈے پر اکتفا کی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ ڈٹ کر کھایا ہو کہ یاد کریں گورے بھی کہ آئی تھی کوئی ٹیم کرکٹ کھیلنے، میچ تھا گوروں سے کوئی مذاق۔

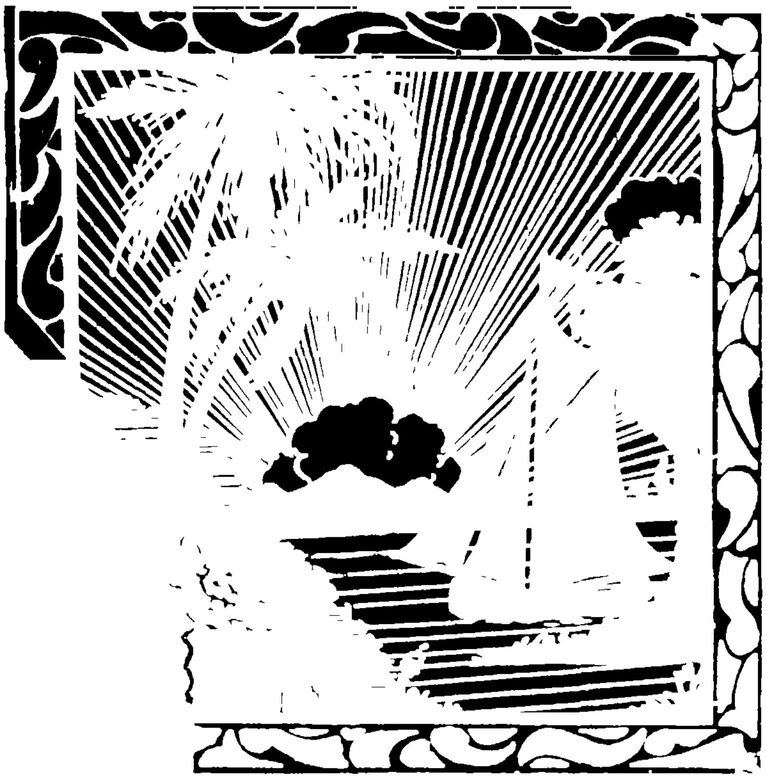
ہم آپ سے سچ عرض کرتے ہیں کہ سہم ہی تو گئے، جب گوروں کے کپتان نے کہا کہ "ٹاس" گویا یہ طے ہو کہ کون پہلے کھیلے۔ ہم نے کہا کہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں عموماً ہم دو میچ کھیلتے ہیں، اس میچ میں ہم پہلے کھیل لیں اور دوسرے میچ میں آپ پہلے کھیل لیجئےگا۔ ایک گورے نے چون و چرا کی تو ہم نے کہا کہ "صاحب ہم لوگ آخر کو ہندوستانی اور وہمی آدمی ہیں، شگون اور استخارہ سے کام چلاتے ہیں اگر اس کے خلاف ہوا تو اپنے عقیدہ کے نہ صرف ہم ہار جائیں گے بلکہ اور کوئی افتاد سے سابقہ پڑے گا"۔ شگون اور استخارہ کے پاکیزہ اصول جب ان بیوقوف گوروں کو سمجھائے تو وہ بہت ہنسے اور راضی ہو گئے۔

جلدی جلدی اور چپکے چپکے ہم نے کھلاڑیوں کو قسمیں دے دے کر تاکید کی کہ دیکھو گڑبڑ نہ ہونے پائے۔ شامت، وٹ کے کھیلنا وغیرہ وغیرہ ہمارے دو گھٹیا قسم کے کھلاڑی بلا لیکر میدان میں تالیوں کی گونج

TWO MORE SILHOUETTES.



فجر صبح



غروب آفتاب

کما اچھے۔ یہ دونوں دیکھنے میں بڑے عمدہ کھلاڑی معلوم ہوتے تھے، مگر اصلیت
یہ تھی کہ گلی ڈنڈے سے آگے کچھ نہ جانتے تھے تیار ہو کر کھڑے ہوتے ادھر
سے گیند جو آئی تو ان کا وعدہ تھا کہ بالکل نہ ڈریں گے، چنانچہ وعدہ پورا کیا انھوں
نے وہ کس کر ہٹ لگایا کہ اگر گیند پر بلا پڑ جاتا تو تارا ہو جاتی، مگر وہ تو کمبخت وکٹ
اڑا لے گئی، انہیں پہلے ہی سے سکھا دیا گیا تھا، اور باوجود آوٹ ہونے کے جگہ
سے نہ ہٹے، پوچھا تو کہنے لگے یہ تو "ٹرائی بال" تھی گورے فوراً راضی ہو گئے
مگر یہ حضرت تیسری گیند پر آوٹ ہو گئے دو خالی نکل گئیں۔

چوتھا شخص جو ہمارا بھیجا ہے تو اس نے گوروں کو پریشان کر دیا، اچھا
کھلاڑی تھا، ساتھی بھی اچھا ملا، چو طرفہ ہٹ لگائے اور کسی طرح گوروں کے
قبضہ میں نہ آیا تاوقتیکہ اس نے چونتیس رن نہ کر لئے، کل ملا کر ہمارے رن
قریب پچاس کے پہنچے تھے کہ یہ خاکی پتلا اٹھا، یار لوگوں کو سکھا دیا تھا، ٹیم
کا کپتان تھا مذاق؟ خوب چیرز دیئے گئے، اور میں اس ٹھاٹھ سے "کریز"
پر پہنچا ہوں کہ بس دیکھا ہی کیجئے، پہنچتے ہی اول تو میں نے چاروں طرف ایسے
نظر دوڑائی گویا یہ دیکھ رہا ہوں کہ کس گورے کو زیادہ دوڑانا چاہئے، دیکھ
بھال کے بعد میں نے کریز ناپی، اس کے بعد ان کے امپائر سے بڑے شان
کے ساتھ سنٹر مانگا، اپنے امپائر کو بھی آنکھ مار دی، آدمی سکھایا پڑھایا اور بہت
پیشتر سے عقلمند تھا! وہ بھی پہنچا اور انتظام میں شریک ہو کر اس نے سائنٹیفک
طریقہ پر غلطی نکال کر نئے سنٹر کی تصدیق کی، اور وہ بھی اتنی جانچ پڑتال کے بعد
کہ غالباً لوگ تنگ آ گئے ہوں گے، اس کے بعد رومال جو میں "پچھ" میں
قصداً چھوڑ آیا تھا وہ اٹھا، فوراً ایک سدھایا ہوا ساتھی بکٹ لے
دوڑا آیا، اب جو دیکھتا ہوں تو سامنے گوروں کا خطرناک "بولر"، ایک گٹھا
ہوا، انتہا سے زیادہ سرخ اور سخت مضبوط خود گیند کی طرح گول مول گورا تھا،
جو اس زور سے بھاگ کر گیند پھینکتا تھا کہ معلوم ہو میکسم گن کا گولا ہے کہ چلا آ رہا
ہے! میں نے اس بدتمیز کو دیکھا کہ چلا وہ ادھر سے گیند لے کر اور ادھر قبل اس
کے کہ اس کے ہاتھ سے گیند چھوٹے میں "ناٹ ریڈی" کہکر کریز کو چھوڑ کر
پرے ہٹ گیا، گیند بیچ کا وکٹ اڑاتے چلی گئی، میں نے معذرت کی، کچھ نہیں
ایسا ہی ہوتا ہے، میں نے اس گیند کی رفتار بھی معلوم کر لی اب میں یہ سوچ رہا
تھا کہ اگر کہیں لگ گئی یہ گیند میرے سر پر تب کیا ہوگا، دل نے کہا کہ بیٹا مرزا
کھیل گیا چولہے میں، یہ بلا جو خدا نے تمہیں اس وقت عنایت کیا ہے، اسے غنیمت
سمجھو یہ لکڑی کے بیجان وکٹوں کی کوری اور بیکار حفاظت کے لئے نہیں ہے بلکہ

دراصل حملے سے اپنا سر بچانے کے لئے ہے اب رہ گئے وکٹ تو ان کے بچانے کی فکر
تھا جو تم بھول کر بھی پڑے تو یاد رکھو خیر نہیں، ایسا نہ ہو کہ سر کو بھول جاؤ، یہ گیند نہیں
گولا ہے جسے ایک موذی پھینک رہا ہے سب کپتانی دھری رہ جائے گی جو
پھوٹ گیا سر تو ریفریشمنٹ کے خیمہ کے بجائے یہی نامعقول گورے تمہیں
خالی پیٹ ملٹری ہسپتال نہ پہنچا دیں تو ہمارا ذمہ اور پھر کیک پیسٹری کے بجائے
صرف کھاری سوڈا ہاتھ آئے گا۔

چنانچہ ان امور کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے بادل ناخواستہ گیند پھینکنے
کی اجازت دی، دل دھڑکنے لگا، وہ منہ بنا کر اور بدن کو جھٹکا دیکر وہ کمبخت
لپکا ہے کہ گیند تو اس کے ہاتھ سے چھوٹتے نظر آئی، میں نے جھجکا کر بلا
مضبوط پکڑ لیا تھا، اور ذرا اٹھا کر ہٹ لگانے کے امکان پر غور کرنے ہی کو تھا کہ
"کھٹکا" ہوا، میں چونک پڑا! آوٹ ہو گیا! مگر نہیں گیند بلے پر پڑی تھی
اپنی جگہ سے ہٹا ہی نہ تھا، لوگوں نے نعرہائے تحسین بلند کئے "ویل پلیڈ"
"ویل ڈن" "ویل جوڑ" ان معقول آوازوں کے ساتھ ہی "اوور" ختم ہو گیا
اب دوسرے کھلاڑی کی باری تھی، ان کا ویسے ہی دم سوکھ رہا تھا، ادھر میں
نے ان سے کہا "اسٹڈی" اور دھڑ سے وکٹ ان کا غائب۔

نیا کھلاڑی آیا، اس نے بھگتان بھگتا ہی تھا کہ پھر میرا نمبر آیا میں
نے دل میں کہا کہ اگر یہ "اوور" کھیل لئے خیریت سے تو پھر ایک سرے سے
کرکٹ ہی کھیلنا کم کر دیں گے، ادھر بولر جھومتا چلا اور ادھر دل میں سوچا کہ گیند
یا تو میری طرف آئے گی اور یا وکٹوں کی طرف اگر میری طرف آئی تو وکٹ محفوظ
اور وکٹوں کی طرف آئی تو میں محفوظ، اور میرے ہاتھ میں جان بچانے کی وہ
شے بھی تو موجود ہے جسے عرف عام میں بلا کہتے ہیں! الغرض اگر ہٹ نہ لگا تو
کیا ہے گیند بھی تو نہ لگے گی، بس یہ دیکھنا ہے کہ گیند خود اپنی طرف تو نہیں
آ رہی ہے، یہ سوچ کر میں تیار ہو گیا۔ ادھر سے گیند جو آئی دندناتی ہوئی تو سچ
عرض کرتا ہوں کہ جس وقت بولر کے ہاتھ سے چھوٹی ہے میرا قطعی ارادہ کہ اس پر
باؤنڈری لگاؤں گا کیونکہ وہ وکٹ کی طرف آ رہی تھی، مگر جبتک گیند آدھی مسافت
طے کرے میں "چوٹ پیشنٹ" کے امکان پر غور کر چکا تھا، وکٹوں کی طرف...
میری طرف . . . . . وکٹ محفوظ، مگر نہیں وہ تو دونوں طرف آتی ہوئی معلوم
ہوئی، وکٹ گئے چولہے میں کوئی چارہ کار نہ تھا سوائے اس کے کہ استغفار پڑھ کر
آنکھ بیچ کے بلے کی ڈھال بناتے ہوئے جگہ سے "نو بال" کہکر اچھل کے دور
گروں، اس کارروائی میں بلے کی جگہ میرے پیر نے لی اور اسپرنگ دے گیند

گی اِدھر اُدھر ہیں۔ "نو بال"۔ کہکر ہینڈ چکا تھا، سکھایا پڑھایا امپائر اپنا تھا دونوں طرف سے اپیل ہوئی، ہماری طرف والے بولے "ناٹ آوٹ" امپائر بھی بول اٹھا "ناٹ آوٹ" گورے بھنا کر رہ گئے، قاعدہ اچھا ہے جو امپائر کہے وہ سچ اور ہم نے تو اپنے امپائر سے کہدیا تھا، اگر تمہاری وہاں کسی نے کرکری کی تو حسب دستور جھگڑا کرکے میچ بند کر دیں گے۔ اب دوسری گیند جو آئی تو میری ہمت ہی بازی کھا رہی تھی، آنکھ میچ کے یا علی کہکر جو بیٹ بڑھکر چلایا تو ہوا تھالی اور گیند شانہ کو چاٹتی ہوئی ٹوپی اڑا لے گئی۔ میں پھر چیخا۔ "نو بال"۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، اب سوائے جان پر کھیل جانے کے چارہ نہ تھا، اس کے بعد پھر جو گیند آئی تو کیا عرض کروں، جما کے تولکر بیٹ بھی لگایا، نشانہ بھی صحیح بیٹھا مگر وکٹ غائب، بس یہ معلوم ہو کہ ٹینس کا بغیر تانت کا بلا تھا جو گیند اس میں سے نکل گئی، پورے بیس منٹ کرکٹ کھیل کر بغیر ہٹ لگائے یا رن کئے ہوئے چلے آرہے ہیں۔

میرے بعد پھر جو باقی بچے وہ بہت برا کھیلے، ڈر کے مارے کریز پر پہاند پہاند پڑے ادھر ادھر کی جاتی گیندوں کو مردانہ وار رانوں اور پشت پر لیا اور جو سیدھی آئی وکٹ لئے چلی گئی۔ کل ہمارے ساٹھ ستر رن کے قریب ہوئے، اور سب آوٹ ہم بھی اس حماقت سے چھٹی پاکر سوچے کہ چلو خوب ہوا، اب اصل کھیل تو شروع ہوگا، ریفرشمنٹ والا، اب دیکھیں یہاں کون کون ہٹ اور باونڈری لگاتا ہے۔

(۳)

ناشتہ کی میزوں پر گھمسان کا معرکہ رہا۔ گورے خود بے تکلف اور ہم سب بے تکلف اور مزید براں بھوکے، الم غلم جو سامنے آیا ہڑپ کیا۔ بعض چیزیں تو اس گڑبڑ اور دوا دوش کے عالم میں کھائیں کہ نمک ڈالنا بھول گئے۔ اور بعض کا ذائقہ یاد نہ رہا۔ دل کو سمجھایا کہ یہی انگریزی کھانے پھیکے سنے تو ہوتے ہی ہیں، میں خود پورا ایک کیک کھا گیا گوروں نے بمشکل فی کس اتنا کھایا ہوگا کہ اس کا چوگنا ہمارے یہاں اس شخص نے کھایا ہوگا جس نے سب سے کم کھایا، اس پر چائے، اور کس کس کی پائی، پان کے بجائے نارنگیاں غرض وہ ڈٹ کے کھایا کہ اب پانی جو پیتے ہیں تو جی یہی چاہا کہ اب "باقی پھر" مگر نہیں، نہیں تو میچ کھیلنا" اور "جیتنا" تھا۔

غرض ہے کہ یہ خاکسار وکٹ کیپری میں قدرے ماہر ہے، لہذا جب گوروں کے کھیلنے کی باری آئی، تو ان فرائض کا بار گراں اپنے ہی کندھوں پر رکھا، اپنے کھلاڑیوں کو قرینہ سے کھڑا کیا، کسی کو خواہ مخواہ ذرا سا ادھر ادھر ہٹایا، کسی کو ادھر ہٹایا، کسی کی جگہ بدلی، اس کے بعد بندہ نہایت ہی ہوشیاری سے بڑی شان کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہوگیا۔

ہماری طرف سے پہلی ہی گیند آئی ہے کہ غدر مچ گیا، گورے نے لیکر ہٹ لگایا، ہٹ اوچھا پڑا اور بڑا عمدہ "سلپ"، نکلا، ایسا کہ گیند اٹھ گئی اور سیدھی ہمارے ایک ہوشیار کھلاڑی کے سینہ کی طرف ایک بہترین "کیچ" کا امکان لئے ہوئے آئی مگر کھلاڑی ایک ہوشیار ٹھہرا صاف بچا گیا، سر پر ہاتھ رکھکر بیٹھ گیا اور گیند اوپر سے نکل گئی، اور پرے گری، لپک کر ہمارے ایک بہادر نے لی، گورا رن کر رہا تھا، لہذا انھوں نے بڑے زور سے وکٹ کیپر یعنی میری طرف پھینکی تاکہ میں وکٹ میں ماروں اب میرے پاس جو گیند آئی تو اول تو بہت ہی قریب سے پھینکی گئی تھی اور پھر اس زور سے پھینکی تھی کہ الامان لہذا قصداً اور غیر قصداً گیند مجھ سے نکل گئی، اور میں اپنی ڈیوٹی چھوڑ چھاڑ ایک نعرہ مار کر گیند کے پیچھے! مگر مجھ سے پہلے ایک اور ہمارے کھلاڑی نے اٹھالی اور زور سے جو وکٹوں کی طرف پھینکی یا ماری ہے تو وہ گولی کی طرح وکٹوں سے کچھ فاصلہ سے ہوکر نکل چلی گئی وہاں روکتا کون میں تو یہاں تھا، اب میں پھر لوٹا اور بجائے وکٹوں پر رکنے کے گیند کی طرف دوڑا، وہاں گیند دور پہنچی تھی، ایک صاحب نے اٹھاکر مجھے دی، میں نے دیکھا کہ میری جگہ ایک اور ہمارے کھلاڑی آگئے ہیں اور گیند کے منتظر ہیں کہ پہنچے تو وکٹوں کو گرادیں، لہذا میں نے اپنی پوری قوت سے گیند ان کی طرف پھینکی، انھوں نے ویسے تو بڑی تیاری کی تھی لیکن جب گیند قریب آئی تو آدمی یہ بھی سمجھدار تھے صفا اپنے پیر بچانے کے لئے اچھل گئے، اور پھر گیند نکل چلی گئی، اور اس درمیان میں گورے ہیں کہ کر رہے ہیں دنادن رن پہ رن۔ میں پھر گیند کی طرف لپکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہمارے دو کھلاڑیوں کے درمیان سے گیند نکل گئی ہے ایک نے اپنی ہی جگہ تڑپ کر کہا "مان لینا . . . . " دوسرے "ہر نوش! اپنی بلا میرے سر، خود کیوں نہیں دوڑتے، جب میں نے یہ دیکھا تو میں خود دوڑا، بمصداق سب کا آقا سب سے کمتر، ہم ہی تو ٹیم کے کپتان تھے، عزت ہمارے ہاتھ تھی، دوڑ کر گیند کو پکڑا اور نہ باونڈری ہو جاتی، مگر اب گھوم کر جو دیکھتے ہیں تو گوروں نے رن کرنا بند کر دئے ہیں کوئی بیس بائیس رن تو ہو چکے تھے اور اگر وہ کئے جاتے تو دس بارہ اور

...جب میں نے یہ دیکھا تو گیند ہاتھ ہی میں لئے لپکتا آیا، دونوں کھلاڑی اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر میری طرف آ گئے تھے تیوری پر ان کے بل تھے۔ ایک گورے نے بڑھ کر مجھ سے کہا "وہاٹس اٹ کیپٹن" بجائے جواب کے میں نے گیند کو وکٹ پر چھواتے ہوئے امپائر سے پوچھا "ہاؤزدیٹ امپائر" ہمارا امپائر بولا "آوٹ" اس پر پویلین سے ایک شور سا ہوا، ہم خود قاعدہ قانون سے واقف اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ ہم قصداً رن بنانے کا غنیم کو موقع دیے رہے تھے تو اس کے یہ معنی تو نہیں کہ رن کرنے والے رن کرتے کرتے نہ صرف رک جائیں بلکہ ادھر اُدھر افیونیوں کی طرح گھومنے لگیں۔ خود ان کے امپائر سے ہم نے کہلوا لیا کہ کھلاڑی آوٹ ہو گیا بحث اور حجت تک نوبت پہنچی، ہم نے بھی کہا کہ صاحب ہم بہترین فیلڈنگ کر رہے تھے آپ رن کئے جائیے آپ کو ہماری فیلڈنگ سے کیا بحث چاہے ہم زیادہ رن بنوا دیں یا تھوڑے آپ کون؟ آپ کو رن کرنے سے مطلب چنانچہ اب جو گورے صاحبان کھیلنے کھڑے ہوئے ہیں تو ہماری فیلڈنگ کا رنگ ہی اور تھا، وہ کھلاڑی جو "ہٹ" پر تھا جیب میں تاش لایا تھا اور کنارے بیٹھا "باؤنڈری مین" کے ساتھ "چانسس" کھیل رہا تھا، جو کھلاڑی "آف" پر تھا وہ ہاتھ بجا بجا کر گنگنا رہا تھا "موٹر کا پہیہ تیز سیاں ہم نہیں بیٹھیں گے موٹر کا . . . . . ." لانگ وکٹ کیپر بیٹھا ہوا تھا پوچھا کیوں، تو بولا "ہم اوپر سے گیند ہرگز نہ جانے دیں گے، تمہاری بلا سے نہیں یا لیٹیں" ظاہر ہے باقی جو ان سے زیادہ مستعد تھے وہ بجائے علیحدہ علیحدہ کھڑے ہونے کے باتیں کرنے کے لئے دو دو اکٹھے کھڑے تھے یا لیٹے تھے کچھ مٹک مٹک چلیاں تونگ رہے تھے۔ بھلا اتنا کیا تھا کہ چلنا مشکل تھا۔ فیلڈ کی یہ حالت اور ادھر ہمارا بولر بار بار کھلاڑیوں کو پکار کر کہہ رہا تھا کہ "ریڈی پلیز" اور ادھر ہم بھی اپنے "ڈگ ٹانگوں پر چڑھا ہے" "یس . . . . یس . . . ." کہہ رہا تھا اور ادھر گورے صاحبان بیچارے کھیل کے حجت اور بحث پر آمادہ آگ بگولہ ہو کر مجھ سے گورے نے کہا "تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟" اور ہمارے دو مستعد کھلاڑیوں کی طرف انگلی اٹھائی جو اس وقت بڑی تندہی سے [illegible] رہے تھے۔ میں نے جواب دیا کہ ہمارے کھلاڑی دراصل اپنی ذمہ داری خوب سمجھتے ہیں، آپ کو تکلیف کی کوئی ضرورت نہیں ہماری ٹیم ایک جگہ نہیں سینکڑوں جگہ جیت کر آئی ہے۔ قصہ مختصر میں نے اور ہمارے بولر نے تقاضہ کر کر کے گورے کو راضی کیا، ہمارے بولر نے قصداً گیندیں بچا بچا کر دینی شروع کیں ایسی کہ گورے کے پیچھے سے نکل چلی جائے کچھ بحث نہیں کہ نو بال ہے یا کیسی۔ چوتھی گیند گورے نے بڑھ کر کس کر ٹھونک دی اور اسی پر ہم میچ جیت گئے۔

گیند میں بٹ جو لگا اور میں نے جو کہا ہے کہ "لینا" تو اب ہمارے کھلاڑیوں کی مستعدی ملاحظہ کیجئے کہ جو جہاں تھا وہیں سے دوڑ پڑا! گیند کی طرف! اور وہ بھی اس قدر بے تحاشا کہ بس دیکھا ہی کیجئے۔ مگر گیند چونکہ آگے جا چکی تھی اور دوڑنے والوں نے قدرے دوسری سمت اختیار کی، لہذا بہت جلد وہاں سے لوگ پکارے "نہیں ملتی" اور پھر فوراً یہ روح فرسا پیام آیا کہ "کھو گئی" انا للہ وانا الیہ راجعون یہ سنکر ہمارے بولر نے نعرہ مارا . . . . "کھو گئی . . . . دوسری گئی میرا داؤں" اب گوروں کی حماقت ملاحظہ ہو کہ رن نہیں کرتے میں نے ہاتھ جھٹک کر ترغیب دی "گو آن سر . . . . . رن آن" پویلین سے قہقہے بلند ہوئے اور سیکڑوں آدمی چلائے "رن آن" "رن آن" مگر توبہ کیجئے گڑبڑ ہو گئی تمام لوگ پویلین پر سے اتر پڑے، ان میں سے کچھ غصہ تھے لیکن باقی ہنس رہے تھے، مگر خود کھلاڑی گورے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ سوائے دو تین کھلاڑیوں کے جو میری پیٹ ٹھونک کر کہنے لگے "ویل پلیڈ کیپٹن" اور میں حجت کر رہا تھا کہ آپ لوگ کیوں کھیل بند کئے ہوئے ہیں، ہمارے سب کھلاڑی آن موجود ہوئے، بحث شروع ہو گئی، جن دو گوروں نے رن کئے تھے ان کا ہمیں اور لڑکیاں اتنا مذاق اڑا رہی تھیں کہ خود اپنی حماقت پر انہیں ہنسی آنے لگی، بہتیرا ہم نے کہا کہ کھیلو مگر گورے نہ مانے جب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو ہم نے امپائر سے "رول" مانگا۔ نتیجہ یہ کہ ہم قریب پچاس ساٹھ رن سے جیتے اور بوجہ فریق مخالف کے نہ کھیلنے سے یہ میچ ختم ہو گیا۔

اس کامیاب میچ کے بعد ہم نے کانپور میں دو تین اسی طرح سے میچ کھیل ڈالے حتیٰ کہ ایک میچ میں زد و کوب تک کی نوبت پہونچی، پھر تو یہ مشہور ہو گیا کہ جو بھی ٹاس جیتا وہ میچ بھی جیت گیا۔ پھر جب علیگڈہ میں ایم سی سی کا میچ ہوا تو نہ صرف ایک ٹیم تیار کر لی تھی بلکہ ہماری ٹیم کے سرپرست اعلیٰ اور دوسرے احباب ایک ہزار تک روپیہ بھی ایم، سی، سی، کو دینے کو تیار تھے اور میں اس سلسلہ میں بہت کچھ دوڑا دھوپا۔ مگر کپتین نے وقت کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ انکار کر دیا ورنہ ہم صحیح عرض کرتے ہیں کہ اسی میدان پہ ان کو شکست دیتے جس جگہ انھوں نے ہماری یونیورسٹی کو شکست دی تھی۔

"بوز بجری قیات"

افسانہ

نورِ عصمت

از محترمہ جمیلہ جمال بریلوی

(۱)

منورما کا یاسمن کی طرح نازک دل دھڑک رہا تھا۔ خود بہ خود اس کی مست و مخمور سی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، اور تمام جسم پر پسینہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی رو دوڑ رہی تھی جس سے حنا و سہاگ کے عطر کی بھینی بھینی خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں وہ بے مست و مخمور خوشبو جو ایک عروس نازنین کے پیکر حجاب و طلسم ہر رخ سے آیا کرتی ہے۔

حسین دولہا شیام چندر نے کمرے میں آہستگی سے قدم رکھا، اور منورما کا دھڑکتا ہوا دل پوری شدت سے دھڑکنے لگا، اسے شرم و حجاب کے ساتھ محسوس ہوا کہ شاید وہ بیہوش ہوئی جا رہی ہے اور اس کا دماغ کہیں دور کسی گہرے پانی میں غوطے کھا رہا ہے بھولی بھالی منورما نہ جانتی تھی کہ اس کا معصوم دل شرم و حیا کے سمندر میں ڈوب رہا ہے۔

جوں جوں دولہا نرم قدموں سے اس کے قریب بڑھا منورما کی بیخودی حد سے بڑھتی گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جن کے خوبصورت ڈھکے ہوئے بادام جیسے پپوٹوں پر افشاں کے ننھے ننھے ستارے چمک رہے تھے، اور قرمز قمر پیشانی پر جھکتا ہوا ٹیکا ہلال عید کو شرما رہا تھا۔

دولہا قریب آ رہا اور وہ جھکتی چلی گئی جس طرح ایک ہری بھری ڈالی اپنے بوجھ سے خود ہی زمین بوس ہو جاتی ہے۔

شیام چندر نے آہستگی سے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر اس کا حسین چہرہ دیکھا اور چند منٹ تک ساکت اس پیارے ماہ کو دیکھتا رہ گیا، حسین دلہن کے چھلکتے ہوئے رخساروں پر جنت کی آبجو نگاہوں میں قربان ہو رہی تھیں بیخودانہ طور پر وہ جھکا اور منورما کا نازک حنائی ہاتھ اٹھا کر نور سنہری جڑاؤ انگوٹھیوں کا دل آویزی کو دیکھتا رہا۔ آخر اس نے کہا۔

"منورما، آج میں نے سنا ہے کہ تم اس شادی سے خوش نہ تھیں، تمہیں شیام چندر کے ہمراہ زندگی گزارنا مرغوب نہ تھی، بولو۔

منورما۔ کیا یہ بات سچ ہے تمہارا ایک لفظ سنا چاہتا ہوں، کیونکہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تم مجھے پسند نہیں کرتی ہو تو میں ابھی یہاں سے کسی دور دراز ملک میں جا کر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہوں۔ اگر تم خوشی سے مجھ کو قبول کرتی ہو تو میں تمہارے اس دلفریب چہرہ کی پرستش تمام عمر ایک پجاری کی طرح کرتا رہا ہوں گا۔ ۔ ۔ ۔ بولو ۔ ۔ ۔ منورما ۔ ۔ ۔ ۔ بولو ۔ ۔"

منورما نے ہر چند کوشش کی کہ وہ شرم و حجاب سے جھکی ہوئی نگاہیں اٹھائے اور آنکھیں کھول کر شیام چندر کی اس عجیب و غریب غلط فہمی کو دور کرے لیکن حجاب فطری نے اس کی بند آنکھوں کو بے حس کر دیا اس کے الفاظ حلق میں آ کر اٹک گئے اور اس کے پیارے پیارے گلابی ہونٹ کسی طرح نہ کھلے۔

شیام چندر نے گھبرا کر کہا۔ "منورما کیا بات ہے، تم جواب کیوں نہیں دیتیں۔ تمہیں یقین کرنا چاہئے کہ تمہارے خلاف طبع میں بھی کسی طرح تمہارے ہمراہ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ بتلاؤ آخری بات کرو۔"

منورما نے ایک بار پھر سخت کوشش کی کہ وہ شوہر کی اس فضول غلط فہمی کو دور کرے لیکن ایشائی شرم اور ہندوستانی غیرت نے اس کے ہونٹوں پر مہر ثبت کر دی، اس کا گلا گھٹنے لگا اور وہ ایک حرف بھی نہ کہہ سکی۔

دفعتہً شیام چندر نے گرج کر کہا۔ "منورما اتنی دیر سے تیری خوشامد کر رہا ہوں تو ہے کہ کسی طرح جواب ہی نہیں دیتی۔ کیا تو نہیں جانتی کہ میرا غصہ کیسا مشہور ہے اور میں اپنی توہین کے بدلہ میں اپنی جان دینے والا

شخص ہو، اس سے اس تیری خاموشی سے تصدیق ہو گئی کہ تو مجھے پسند نہیں کرتی، معاملات یہاں تک پہنچ گئے ہیں کسی طرح اپنی یہ تحقیر برداشت نہیں کر سکتا ہوں اب جا رہا ہوں خدا حافظ اسے بے وقت صحبت اب تمام عمر تجھ سے نہ ملوں گا۔ بلکہ بہت جلد تو سن لے گی کہ شیام چندر نے احساس غیرت میں جان دیدی یہاں یقین ہو گیا تو کسی اور شخص پر فریفتہ ہے۔ . . . . .

بجلی کی طرح شیام چندر کمرہ سے نکلا، اور چشم زدن میں غائب ہو گیا۔ منورما شرم و حجاب سب بھول گئی، اور دیوانہ وار اٹھکر اس کے پیچھے دوڑی مگر وہاں کیا تھا، کواڑ کھلے پڑے تھے اور وہ نہ تھا۔ منورما نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر دہلیز پر گر پڑی۔

(۲)

شیام چندر کے والدین زندہ نہ تھے، نہ کوئی بہن تھی، صرف ایک بھائی تھا جو الہ آباد کالج میں پڑھتا تھا، عزیزوں سے پریم چند شیام چندر کے چھوٹے بھائی کا پتہ معلوم کر کے منورما نے ایک تار اس کو دلوایا کہ منورما پر یہ مصیبت آ گئی ہے۔ پریم چند چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے شادی میں بھی نہ آ سکا، اور منورما بے حد مضطرب تھی، اگر وہ اس کے تار پر بھی نہ آیا، تو کیا ہوگا، میکے سے اس کے دونوں بھائی پہنچ گئے تھے۔ منورما کی والدہ کا اس کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اور منورما کا باپ سخت بیمار بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا، دو شادی شدہ بھائی تھے جو اسے لینے آئے تھے، لیکن منورما نے ایسی حالت میں یہاں سے جانا مناسب نہ سمجھا اسے یقین تھا کہ باپ اس کے اس صدمہ کی اطلاع سے یقیناً جانبر نہ ہوگا، اس لئے اس نے بھائیوں کو بھی منع کر دیا کہ وہ باپ سے تذکرہ نہ کریں۔

دونوں بھائی بھی شام کو واپس چلے گئے، گھر میں اس کی ایک ضعیفہ ساس تھی جو ایک کونے میں بستر پر پڑی ہر وقت بے تکی باتیں بکتی رہتی تھی۔

نصف چاند چمک رہا تھا اور خوبصورت ستارے ایک سنہری روشنی کے ضیا میں ڈبکیاں لگا رہے تھے ان کی اداس جھلک میں نوجوان حسینہ منورما چاند کے ٹکڑے سے زیادہ دلفریب اور دلکش تھی وہ صحن کے ایک گوشے میں پلنگ پر بے سدھ پڑی تھی، اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور سفید ساری بھی بالکل اس طرح چمک رہی تھی جیسے سفید بادل میں چاند اور آہ اس کی رس بھری متوالی آنکھیں کہ جن کے آنسو تاب رخساروں پر ایسی دلفریب تھیں جیسے شبنم گل کی سفید صبح میں نرگس کی مخمور کلی۔

وہ سوچ رہی تھی، خیالات کا ایک لامتناہی سمندر اس کے دل و دماغ میں موجیں مار رہا تھا . . . .

تمام رات گذر گئی، اور آخرکار اس صبح کی روشنی میں محروم خواب منورما آہستہ سے پلنگ سے اٹھکر منہ دھونے لگی۔

چائے کے چند گھونٹ زہر مار کرنے کے بعد وہ ایک گھنٹہ برآمدے میں ٹہلتی رہی، آخر تھک کر ایک آرام کرسی پر گر پڑی۔ قریب کی گول میز پر نوکر لڑکا تازہ اخبار لا کر ڈال گیا۔

اوقات گذاری کے لئے اس نے اخبار اٹھا لیا۔

"ہائیں"، وہ چونک پڑی۔

"علی گڑھ کا ہولناک حادثہ۔ آج شب کو بوقت دو بجے غازی آباد سے آنے والی ٹرین کی پٹری پر ایک نوجوان شخص کا اچانک حادثہ موت واقع ہو گیا یعنی جوں ہی ریل اسٹیشن سے کچھ فاصلہ پر آئی یہ نوجوان ایک دم کہیں سے آکر پٹری پر گر گیا، اور انجن کے نیچے آکر جان بحق ہو گیا، لاش کی صورت و حالت بیحد خراب ہو گئی تھی، جیب سے صرف ایک کارڈ برآمد ہوا ہے جس پر "شیام چندر" بی اے درج ہے۔ (نامہ نگار)

✣

منورما نے چکرا کر سر پکڑ لیا، اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا کمزور دل ایک دفعہ دھک سے ہو کر ابدی نیند سو گیا ہے اور چند منٹ بعد پھر بڑی شدت سے دھڑکنے لگا، اتنی شدت سے کہ کل کائنات اس کے ہمراہ دھڑکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، نصف گھنٹہ وہ کلیجہ پکڑے بیٹھی رہی!! اور پھر ایک دم چیخ مار کر گر پڑی اور یاس و حسرت کی آخری منزل میں پہنچکر دفعتہ بیہوش ہو گئی . . . . . نصف گھنٹہ بعد منورما کو قدرے ہوش آ رہا تھا اس نے دیکھا کہ وہ مسہری پر لیٹی ہے خادمہ کھڑی ہے اور ایک خوبصورت بیس سالہ نوجوان اس کے سامنے کرسی پر سرنگوں بیٹھا ہے، وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی آنچل گھسیٹ کر گھونگھٹ کر لیا۔

"بھابی جان" (پریم چند منورما کے دیور نے کہا) کیا حال ہے" منورما کوئی جواب نہ دے سکی، موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے، پریم چند گھبرا کر کھڑا ہو گیا، اس نے منورما کے سر پر محبت سے ہاتھ رکھکر کہا۔

بھابی جان، بھائی صاحب کا مزاج تو ہمیشہ سے ایسا ہی عجیب ہے، آپ شاید کئی سال کے غور طلب کے بعد آئیں گے، آپ بالکل نہ گھبرائیں میں ہر طرح آپ کی خبرگیری کروں گا"، آواز کی شیرینی و نرمی نے منورما کی سماعت میں ایک جاذب گونج پیدا کی، اس نے قدرے آنکھیں بلند کیں اور ایک نگاہ پریم چند کے چہرہ لطیف پر ڈالی رعب حسن سے وہ ایک لمحہ کے لئے اپنا غم بھی بھول گئی، معاً وہ چونک پڑی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر اخبار پریم چند کی طرف پھینک کر کہا۔

"لو یہ پڑھ لو" پریم چند نے گھبرا کر وہ سطور پڑھیں اور خود اخبار فرش پر گر پڑا "ہائے غضب ہو گیا، ارے ہم برباد ہو گئے بھائی ... بھائی" وہ اٹھکر چیخیں مارتا ہوا باہر دوڑ گیا۔

(۳)

شام کا اداس دھندلکا، فضا، خاموشی پر پھیل چکا تھا، سبزہ پر شام کی غمناک ویرانی محیط تھی اور ہری بھری ڈالیوں پر ایک پریشان سناٹا چھا رہا تھا۔

بدنصیب منورما خوبصورت گملوں کے قریب صحن مکان میں ایک زنانہ کرسی (میڈیم چیئر) پر پڑی تھی، دو آنسو اس کے ابریشمی پلکوں میں تاروں کی طرح چمک رہے تھے اور سفید ساری کا آنچل کرسی کے تکیہ سے نیچے ڈھلک گیا تھا وہ خیالات میں بالکل اس طرح غرق تھی جس طرح برسات کے بادلوں میں آفتاب اور اس کی براق پرنور گردن بے ترتیبی سے ڈھلک گئی تھی۔

پریم چندر آج کالج سے فارغ ہو کر ہمیشہ کے لئے مکان آرہا ہے آہ کیا میں اس مکان سے چلی جاؤں، یہاں رہوں گی تو اس سے ضرور ملنا پڑے گا، ملنا کیا ہر وقت ہی ساتھ ہو گا، پھر کیا ہو گا۔ نہیں۔ نہیں، میں اس کی حسین آنکھوں کی سنہری بجلیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی، وہ جادوگر ہے زبردست ساحر، اس کی ایک ہی نگاہ نے مجھ پر سخت ترین جادو کر دیا ہے، اس کی کیف آور آواز کی پہلی گونج ہے، میرے دل و دماغ کو ہمیشہ کے لئے بیکار کر دیا ہے، آہ ... پریم ... پریم ... دلفریب و خوبصورت ... ساحر و جادوگر پریم ... کیا کروں ... ...

کل جو اس کا خط آیا ہے اس میں ایک فقرہ ایسا ہے جس سے شک پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی اس الجھن میں مبتلا ہے، اس نے لکھا ہے "بھابی جان، حیران ہوں کہ وہاں پہنچکر ایام زندگی کس امید پر گذریں گے ... "

✣

بھابی جان آداب ... " کی محبت بھری اور رسیلی گونج سے وہ چونک پڑی اور گھبرا کر کھڑی ہو گئی، قدرے گھونگھٹ نکال کر اس نے کہا "جیتے رہو بیٹا تم آ گئے، خیر اس الم نصیب زندگی میں تمہاری باتوں ہی میں کچھ وقت گذر جائے گا"

پریم۔ بھابی جان۔ میں آپ کی تفریح کے لئے بہت سی دلچسپ کتابیں بھی لایا ہوں، آپ کا ارادہ فی الحال میکے جانے کا تو نہیں ہے۔

منورما۔ نہیں بیٹا، بھائی تو کئی مرتبہ آئے مگر میں جا کر کیا کروں گی، کسی کو یہ منحوس صورت دکھلانا نہیں چاہتی میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ بقایا زندگی کے سوگوار ایام اسی بے وفا اور بے پروا انسان کی دہلیز پر رو رو کر گذار دوں جس نے میری تمام زندگی برباد کر دی"

آخری فقرہ پر اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر پڑے، اور پریم بھی حسرت سے کرسی پر بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔

(۴)

منورما نے بظاہر انتہائی ضبط و تحمل سے کام لیا، وہ حتی الامکان پریم سے دور رہتی اور ہر بات و ہر انداز سے بے اعتنائی اور بے نیازی کا اظہار کرتی، تمام دن بالکل علیحدہ کمرہ بند کئے پڑی رہتی، صرف شام کے وقت صحن میں ضرور پریم خود ہی اکثر اس کے سامنے بیٹھ جاتا، پریم کی گفتگو میں ہمیشہ یاس کا دردناک انعکاس ہوتا اس کی باتوں میں محبت کی پوشیدہ چاشنی اور مخفی حلاوت ہوتی جس کو منورما بظاہر بالکل محسوس نہ کرتی۔

باوجود ہر ممکن کوشش کے منورما اپنے دل سے پریم کی دلدوز محبت کی چمکتی ہوئی چنگاری نہ نکال سکی، اس پنہانی کرب و اندرونی تپش نے اس کا سوختہ جگر شمع کی طرح پگھلا دیا اور پروانہ کی طرح اندر ہی اندر سوخت ہوتی چلی گئی مگر آہ نہ کر سکی۔

۶ ماہ گذر گئے پریم کا جمال رعنائی اور حسن دیدہ زیب اس کے قلب کی گہرائیوں میں ایک نقش دلآویز بن کر کندہ ہو چکا تھا، وہ سنہرا نقش جو کبھی کسی طرح نہ مٹ سکتا تھا، ساتھ ہی ساتھ پریم کے بہترین عادات و خصائل اعلیٰ ترین اخلاق نفیس و پاکیزہ خوش مزاجی اور اس کی شیریں بول کی دلفریبی اس کے ٹھنک قہقہوں کی یاد گشت منورما کو ہمیشہ کیلئے مضطرب

کر چکی تھی، وہ جس قدر سوچتی اسے اپنا مستقبل اتنا ہی بھیانک نظر آتا، محبت کی آگ نے احمد کے پیکر لطیف کو بالکل سونے کی طرح پگھلا دیا تھا، اور اب صرف خاکستر باقی تھا، پریم دیکھتا رہتا کہ منورما دن بہ دن پژمردہ اور مرجھاتی چلی جا رہی تھی، مگر وہ اسے اپنے حق میں ایک پارۂ سنگ کی طرح سخت سمجھتا تھا۔

چاندنی رات تھی اور پیاری پیاری سنہری روشنی بالاخانہ کے صحن پر نور کا پرتو ڈھال رہی تھی، منورما ٹہل رہی تھی، اور اس کی سفید ساڑی کے آنچل سے اس کا گندھا ہوا خوبصورت جوڑا باہر نکل آیا تھا، سادگی کی بہترین رعنائیوں میں وہ ایک بہشتی حور معلوم ہوتی تھی جو شاید عالم بالا سے فرش خاکی کی سیر کو اتر آئی ہو۔

خیالات کے سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے وہ چونک پڑی، اس کی نرگس نصیب آہو جمال آنکھوں سے دو سفید موتی ٹپک گئے، اور ہونٹوں سے نکلا "آہ پریم۔"

"جی بھابی جان" پریم نے جواب دیا، جو چپکے سے آکر ایک نازک سی پرنیم قد ہو گیا تھا، آہ اس لفظ بھابی جان میں کس غضب کی لطافت تھی، منورما نے بےچین ہو کر نگاہ پھیر لی، پریم کی آنکھوں میں یاس و حسرت کی غمناک سی دھجکا اس کی پرخمار رسیلی انکھڑیوں میں ایک خاموش آبدار قطرہ چمک گیا۔

"پریم تم کو رات کی تنہائی میں میرے پاس نہیں آنا چاہئے" پریم، بھابی جان آٹھ ماہ گذر گئے کہ بھائی صاحب آپ کو اور مجھ کو دونوں کو ایک ذرا سی غلط فہمی کی بدولت برباد کر گئے، مگر . . . . مگر . کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنی قسمتوں کو تبدیل کر لیں۔

منورما۔ پریم۔ میری قسمت تو اب تبدیل نہیں ہو سکتی، تمہاری شادی اگر کر دی جائے تو تمہارا دل کچھ بہل جائے گا۔

پریم۔ سوچ کر۔ شادی! تو بھابی جان میری شادی کہاں ہو جائے،

منورما۔ کسی اچھی حسین و تعلیم یافتہ لڑکی سے۔"

پریم۔ ناممکن بالکل ناممکن، جب تک میں زندہ ہوں میری شادی کہیں نہ ہو گی، بھابی جان محبت کی پوشیدہ چنگاری نے اندر ہی اندر میری روح و جسم کو سوخت کر دیا ہے، مجھ میں اب کسی اور لڑکی سے محبت کرنے کی توانائی نہیں ہے، اگر آپ مجھے اپنی غلامی اور پرستاری کے قابل نہیں سمجھتیں تو یوں ہی ایک دن زندگی ختم ہو جائے گی۔"

منورما۔ پریم کیا جواب دوں، میں عہد کر چکی ہوں کہ زندگی شیام چندر کے نام پر گذار دوں گی، اب میں کچھ نہیں کر سکتی، جاؤ میرے پاس سے جاؤ اور اس خیال خام کو دل سے نکالنے کی کوشش کرو، یہ کیا بےتکی محبت شروع کی ہے"

پریم۔ جانے کو تو جا ہی رہا ہوں، محبت ہمیشہ بےتکی ہی ہوا کرتی ہے مگر میں کہتا ہوں کہ آپ اپنے فیصلہ پر ایک مرتبہ پھر غور کر لیں، کہ آیا آپ ایک نوجوان کی قاتل بننا پسند کرتی ہیں، یا نہیں۔

منورما۔ پریم کیا باتیں کرتے ہو، قاتل اور قتل کیسا؟ دیکھنا چند ہی روز میں تمہاری کیسی چاند سی دلہن لاتی ہوں، حوروں سے زیادہ حسین، اور دیویوں سے زیادہ جمیل۔

پریم گھبرا کر کھڑا ہو گیا، بس، رحم میں اب کچھ اور نہیں سن سکتا، اور دوڑ کر زینہ سے اتر گیا، یاس و حسرت کے بھیانک سناٹے میں منورما اس کے چپل کے نشان کو دیکھتی رہ گئی۔

(۵)

پریم کی تمام کوششیں بیکار ہو چکی تھیں کسی منت و خوشامد نے منورما کے سنگین دل میں نرمی نہ پیدا کی اور اس کا انکار پتھر کی لکیر سے زیادہ مضبوط و مستحکم رہا، پریم چندر نے اس کے قدموں پر سر تک رکھ دیا، مگر وہ نہ مانی پریم چندر نہ سمجھ سکتا تھا کہ منورما ایک سولہ سالہ حسین کس قدر ارفع اور منزہ سرشت کی تصویر ہے، وہ کس قدر غیور اور بلند جذبات کی مالک ہے وہ جس قدر اس کی شان عصمت و علو طبیعت پر غور کرتا منورما اسے اسی قدر اور بلند دیوی بن کر نظر آتی، وہ یقین کر چکا تھا کہ منورما درحقیقت ہندوستان کی پدمنی ہے۔

پریم چندر کمرہ سے نکلا تو اس کے رخساروں پر آنسوؤں کے نشان صاف چمک رہے تھے اور اس کی گلاب جیسی سرخ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام رات ایک منٹ بھی نہیں سویا، خادم نے اسے سربند فرفری لفافہ پیش کیا، جسے وہ کھولتا ہوا دوبارہ کمرے میں واپس آ گیا۔

"عزیز دل پریم! اگرچہ میرے لئے یہ القاب بالکل غیر مناسب ہے لیکن اس کو کیا کروں کہ تم مجھے حقیقت میں دل و جان سے زیادہ عزیز تھے اور آج میں تم سے کہتی ہوں کہ بظاہر میں کتنی ہی بےرحم اور [illegible]

رہی ہوں لیکن دراصل تمہاری بے پناہ محبت نے میرے جسم و جان کو سوخت کر دیا ہے لیکن پریم!! شادی! جو ایک ناممکن الحصول صورت ہے میں اسے کسی طرح گوارا نہیں کرتی اور اسی لئے ہمیشہ کو اس مکان سے رخصت ہو رہی ہوں، کہ میرے جانے کے بعد تمہارے دل سے رفتہ رفتہ میری یاد دور ہو جائے گی اور کچھ عرصہ بعد تم انسان بن سکو گے!!

اس کے علاوہ تمہاری دردناک حالت دیکھنے کا بھی ضبط اب دل ناکام میں باقی نہیں ہے، اور کیا لکھوں سوائے اس کے کہ تمہاری محبت میرے سینہ میں ہمیشہ ایک پوشیدہ چنگاری بن کر مجھے خاکستر کرتی رہے گی۔ فقط والسلام

سوگوار محبت ناکام تمنا منورما

پریم چند کے ہاتھ کانپ کر خط چھوٹ پڑا، اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

(۶)

پریم نے تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، ہر ممکن کوشش اور ہر امکانی سعی کر لی، لیکن غائب شدہ منورما اسے کسی طرح بھی نہ مل سکی، آخر کار وہ دیوانہ وار گھر سے نکل گیا، اور بے خودانہ طور سے ہر جگہ ڈھونڈتا پھرتا کامل ہم سال گذر گئے، اور پریم چندر کو وہ من موہنی دیوی اچھوتی حور اور طبیعت ملک کہیں نظر نہ آئی۔

متواتر اور مسلسل ناکامیوں نے اُسے بالکل دیوانہ بنا دیا تھا، وہ مجنونوں کی طرح بڑبڑاتا اور ساون کے بادلوں کی طرح ہر جگہ روتا پھرتا، ایک ایک پتھر سے منورما کا پتہ دریافت کرتا، مگر کوئی دل خوش کن جواب نہ ملتا۔

سنسان اور ویران راتوں میں چاند اس کی حالت برباد پر آنسو بہاتا، پھول اس کی دردناک کراہ سن کر زخمی جگر ہو جاتے اور فطرت کا ہر ذرہ و قطرہ اس کے غم آفریں بین سن کر تڑپ اٹھتا مگر آہ منورما حسین و جمیل دیوی پاک و منزہ ناطورہ کسی گوشے میں اسے نہ مل سکی ——————

چاندنی رات میں سہ قلی تال کی حسین و روپہلی جھیل کوثر کی نشیلی کیفیت پیدا کر رہی تھی، سفید لہراتا ہوا نورانی پانی چمک رہا تھا اور لہروں کی گونج میں محبت ایک دردناک راگ الاپ رہی تھی۔

اس سحر آگین فضا میں چاند کی چمکتی ہوئی جھیل سے کچھ فاصلہ پر پریم چندر ایک چھوٹی سی خس پوش جھونپڑی کی دیوار کے سہارے بیٹھا بانسری بجا رہا تھا، بانسری کی جگر خراش اور دل دوز راگنی کا زیر و بم جھیل کے روشن اور [illegible] کے دھیمی دھیمی سروں میں مل کر ایک یاس آفریں ویرانی پھیلا رہا تھا اور محبت کا پجاری پریم چندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہتان چھیلا اپنے خون چکاں دل کا ایک ایک ٹکڑا پیش کر رہا ہے۔

دفعتہً وہ چونک پڑا، جھونپڑی کے اندر سے اسے سسکیوں میں ڈوبی ہوئی گھٹنے کی آواز سنائی دی۔

پریم کہاں ہو، دل سے نہاں ہو، پریم کہاں ہو، دل سے نہاں ہو،
دل میں بھری ہیں، عشق کی ٹیسیں، لب پر آہیں، دل میں کراہیں
کوئی نہیں ہے اپنا ہمدم۔ اپنی بیتی کس کو سنائیں
پریم کہاں ہو
جان بھی کھوئی، جسم بھی کھویا، تجھکو کھویا، خود کو کھویا
اپنے حق میں آہ محبت میں نے خود ہی کانٹا بویا
پریم کہاں ہو
جینے کا کچھ ارمان نہیں ہے تن میں اب کچھ جان نہیں ہے۔
پہلا سا خلجان نہیں ہے عشق میں اب ہیجان نہیں ہے
پریم کہاں ہو
جل کر بجھنا کام ہمارا، شمع سے سیکھا ضبط کا یارا
لو وہ چمکا صبح کا تارا، خاکستر انجام ہمارا
پریم کہاں ہو . . . . " (ہچکی)

پریم ہچکی کی بازگشت سے پہلے پہلے دیوانہ وار منورما۔ منورما چیختا ہوا جھونپڑی میں گھس گیا۔

دیئے کی مدھم اور غم نصیب روشنی میں زرد اور کانٹے کی طرح لاغر منورما چٹائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی سیاہ کمبل کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا اس کے نیچے بچھا ہوا تھا اور اس کا وہ حسین اور کندن سے زیادہ آبدار جھلکتا ہوا رنگ اب ہلدی سے زیادہ زرد اور صبح کے چاند سے زیادہ پھیکا اور بے نور ہو چکا تھا راگ کے ختم پر اس نے ایک دردناک ہچکی لی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف جوڑ لئے۔

"پرمیشر اب آخری وقت ہے منورما کی شمع حیات گل ہو رہی ہے اے پاک پرمیشر تو گواہ ہے کہ میں نے پریم سے محبت ضرور کی، لیکن مثل عشق شیشہ کی طرح روشن اور شہر سے زیادہ شفاف تھا، دنیاوی حرص و ہوا کی نفسانی آلودگیوں نے اس کی صفائی اور جلا میں کبھی کسی قسم کا زنگ نہیں لگایا اے حقیقی پاک محبت تو نے میری روح کو صیقل کر دیا اور اسے بے لوث جذبہ

عشق تو نے میری رگوں میں شرافت کا خون موجزن کر دیا۔

رخصت اے چار سال کی رفیق بدنصیب جھونپڑی رخصت اے زندگی کی پریشان تمنا کہو۔ رخصت اے شعلۂ خاموش محبت رخصت اور آہ اے پریم پیر کھنو کے دیوتا رخصت . . . .

پریم دوڑ کر دیوانوں کی طرح منورما کے دبلے کمزور نحیف قدموں پر گر پڑا۔ "منورما . . . منورما . . . پریم کو چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو، محبت کی بلند سیرت ملکہ اور عصمت کی اچھوتی حور!! آنکھیں کھولو۔ پریم تمہارا پجاری اور ادنیٰ ترین پرستار حاضر ہے۔"

منورما چونک پڑی "پریم تم آ گئے یہ کیا غضب کیا، شائد تم کو دیکھ کر میں دوبارہ منزل حیات کی جانب معود کر آؤں، جاؤ پریم جاؤ، مجھے مر جانے دو، میں اب محبت کی غیر فانی آگ میں تقریباً خاک ہو چکی ہوں" پریم نے جھک کر اس کا سرد اور نحیف ہاتھ اٹھا لیا، منورما نے چونک کر ہاتھ گھسیٹ لیا۔

"نہیں پریم، ایک غیر شخص ہو کر میرا ہاتھ پکڑو، آہ اس ہاتھ کو صرف ایک ہی مرتبہ ایک شخص نے پکڑا تھا، اور پھر ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا، مگر میں ابھی تک اسی عہد و وفا کو نباہ رہی ہوں۔"

پریم "آہ منورما" میں تیرا بدترین مجرم ہوں، زبردست گنہگار، آہ منورما میں نے تجھے بڑا بھاری فریب دیا ہے، ایک سخت دھوکا، معصوم منورما میں ہی شیام چندر ہوں، اور میں ہی پریم چندر، میں نے سنا تھا کہ تو اس شادی سے ناراض ہے، لہذا میں نے صرف تیری محبت حاصل کرنے کے لئے یہ فریب کیا تھا، مگر آہ منورما یقین کر مجھے یہ خیال بھی نہ تھا کہ تو گھر سے غائب ہو کر چار سال میں مجھ کو دیوانہ بنا دے گی۔ آہ اسی دن جس دن کہ یہ راز میں منکشف کرنا چاہتا تھا تو گھر سے غائب ہو گئی، اور عرصہ چار سال میں اپنی حالت اس درجہ تباہ کر لی، معصوم دیوی، پاک شہزادی، تیرا گنہگار دست بستہ معافی چاہتا ہے۔"

وہ جھک کر منورما کے سرد قدموں سے آنکھیں ملنے لگا، منورما نے ایک چیخ ماری . . . . . "شیام چندر . . . یا پریم چندر . . . . ." اور بیہوش ہو گئی۔

شیام بجلی کی طرح تڑپ کر اس کے قدموں پر گر پڑا۔ اُسے یقین آ گیا منورما اب اسے ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ رہی ہے دنیا اس کی آنکھوں میں بھیانک گرہ لیقہ سے ناچ رہی تھی وہ تڑپ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد . . . دفعتاً منورما کے زرد چہرہ پر زندگی کی سنہری چمک محسوس ہوئی اس نے گل فریب نگاہیں آہستہ سے کھول دیں اور ایک نگاہ شیام چندر کے سراپا پر ڈالی، اور اس کے رخساروں کی نزاکت پر شبنم کے قطروں کی طرح شفاف موتی ٹپک گئے، اس نے ایک مرتبہ پھر پہلے دن کی طرح شرما کر گھونگھٹ کھینچ لیا، لیکن، آج اس کا ہاتھ چپکے چپکے بڑھتا رہا، یہاں تک کہ اس نے آہستہ سے شیام چند کے قمیص کا دامن تھام لیا۔ اور چپکے سے کہا۔

"میں تمہیں پریم کہا کروں گی۔"

بلقیس جمال بریلوی



ناول ہما خانم کے ختم ہو جانے کے بعد
ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب ل۔ احمد کا شاہکار

محبت کا افسانہ

جنوری ۱۹۳۵ء سے شائع ہونا شروع ہوگا۔ محبت کی کہانی ۲۴ ابواب پر مشتمل ہے ہر ماہ دو باب شائع کئے جائیں تو یہ سلسلہ ۱۹۳۵ء میں ختم ہوگا۔ اس دلچسپ افسانے کو کتابی صورت میں شائع کرنے پر اس کی قیمت دو روپیہ ہوگی۔ مگر ناظرین نیرنگ خیال کو ہر ماہ رسالہ کے ساتھ ہی ملتا رہیگا۔ افسانہ اس قدر دلچسپ ہے کہ آپ پڑھ کر عش عش کر اٹھیں گے۔ محترمی جناب لطیف الدین احمد صاحب اس کی تقریب میں لکھتے ہیں۔

خطاب بہ قارئین

دریا کے عمق میں جا حبابوں کو نہ دیکھ — اوراق چمن الٹ کتابوں کو نہ دیکھ
بکھرے ہوئے ایک ذرۂ خاکی کے حضور — ڈوبے ہوئے لاکھ آفتابوں کو نہ دیکھ
(جوش ملیح آبادی)

ایک جویائے لطف و تفریح انسان سمندر کی سطح پر صرف موجوں کا ناچ ان کی پیچ و تاب اور ان کے اندر انعکاس نور کا نیرنگ دیکھتا ہے، کف بحر پر آفتاب کی شعاعوں کا مچلنا اور ان کی رنگ طرازی کا تماشا کرتا ہے اور مطمئن ہو جاتا ہے اس کے لئے یہ طلسمی نظارہ بس ہے، کہ اسے اتنے ہی کی تلاش و آرزو تھی!

لیکن، کہیں نہ کہیں کوئی ایسا بھی نکل آتا ہے جسے اس سے زیادہ کی جستجو ہے، ان عارضی و سطحی دلچسپیوں اور لذتوں میں اس کے لئے کوئی دلکشی و جاذبیت نہیں، وہ ان سطحی موجوں کی تہ میں، عمق بحر کی اس موج زنی کو دیکھتا ہے جو سمندر کو زندہ و ولولہ ناک رکھتی ہے جو ایک قطب سے دوسرے قطب تک زمین کا دورہ کرتی رہتی ہے! ان گہرائیوں میں وہ ان جادو وائی کیفیتوں اور عظیم حقیقتوں کے عکس دیکھتا ہے جو سطح کے تماشائی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتیں ——— وہ کیفیتیں اور حقیقتیں جو بے نیاز تعریف ہیں، کہ ورائے تعریف ہونا ہی ان کا جوہر ہے! وہ راز ہائے عالم کے جلوے دیکھتا ہے، اور پکار اٹھتا ہے:-

میں ہوں دیوانہ نیرار بہار اے مانی
یہ تو سب دیکھے ہوئے ہیں چمن آرائی ہے!
(مانی جائسی)

میں نہیں جانتا کہ آپ کس قبیل کے نظارگی ہیں، لیکن آپ جس قبیل میں بھی آتے ہوں، آپ مجاز ہیں کہ ان صفحات سے اپنی آسودگی ذوق حاصل کریں!

گر بہ معنی نرسی جلوۂ صورت چہ کم است
خم زلف و شکن طرف کلاہے دریاب!
(غالب)

خدا حافظ!

ل۔ احمد

محبت کی کہانی کی پہلی قسط جنوری ۱۹۳۵ء کے پرچہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ ایڈیٹر

افسانہ

دل کی کروٹیں

از مظہر انصاری دہلوی۔ بی اے آنرز

چلتی ریل۔ ایک ڈبہ۔

چار مسافر ——— پہلا بنگالی، دوسرا لکھنوی، تیسرا پنجابی، چوتھا ایک نوجوان (وضع قطع سے وطن ظاہر نہیں ہوتا)

کچھ دیر سے "خیالی امراض" پر گفتگو ہو رہی ہے۔

لکھنوی۔ (نوجوان سے مخاطب ہو کر) تو حضرت، گویا مطلب آپ کی گفتگو کا یہ نکلا کہ یا تو ایک سرے سے ان امراض ہی کو نہ مانا جائے جو خیال کی پیداوار ہیں یا اگر مانا جائے تو علاج کے ناقابل سمجھا جائے۔

نوجوان۔ دیکھئے مہربان میں نے نہ تو ان کے وجود سے انکار کیا نہ علاج سے۔

لکھنوی۔ ہائیں! اماں عجیب آدمی ہو یار!! ابھی ابھی تو کہا تھا۔

نوجوان۔ میں آپ سے صرف ایک بات دریافت کرنی چاہتا ہوں۔

لکھنوی۔ اجی ایک نہیں، آپ دو دریافت فرمائیے۔

نوجوان۔ حالات کے کرشموں کو آپ مانتے ہیں؟

لکھنوی۔ یعنی؟

نوجوان۔ یعنی تقدیر کو۔

لکھنوی۔ اے صاحب کیوں نہیں!

بنگالی۔ کسمت تو جرور ہے مشاب۔

نوجوان۔ تو آپ کو میری اس بات کا یقین کرنا چاہئے کہ بعض امراض کا علاج صرف حالات کے ہاتھوں میں ہے۔

لکھنوی۔ (سوچتے ہوئے) ہوں!!!

نوجوان۔ جی۔

لکھنوی۔ ثبوت؟

نوجوان۔ واقعات۔

لکھنوی۔ واقعات کی صحت کا آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟

نوجوان۔ واقعات کی صحت کا میرے پاس یہ ثبوت ہے کہ ڈاکٹر اور مریض دونوں سے ذاتی واقفیت رکھتا ہوں۔

پنجابی۔ کوئی سچا واقعہ ہے جی؟

نوجوان۔ جی ہاں۔

پنجابی۔ تو پھر سنائیے جی۔

لکھنوی۔ سنائیے قبلہ۔

بنگالی۔ کیا مریج بنا مڈشن اچھا ہو گیا؟

نوجوان۔ جی ہاں۔

پنجابی۔ کسی آملے اُولے سے؟

نوجوان۔ جی نہیں۔

بنگالی۔ ہپنا ٹجم لگایا ہوگا، ہپنا ٹجم؟

نوجوان۔ بالکل نہیں۔

بنگالی۔ نربس کیس تھا؟

لکھنوی۔ یہ نربس کیا بلا ہوتی ہے صاحب؟

پنجابی۔ نروس ہے نروس۔ یعنی اعصاب کی بیماری۔

لکھنوی۔ اچھا!!!

بنگالی۔ (نوجوان سے) ہاں بابو۔

لکھنوی۔ (نوجوان سے) کیوں صاحب کوئی مریضہ تھی؟ عورت تھی؟

نوجوان۔ جی نہیں مرد۔

(لکھنوی مایوس نظر آتا ہے)

بنگالی۔ (نوجوان سے) تو بابو کیسے ہوا وہ کشتہ؟

نوجوان۔ آپ لوگ سننا پسند کریں گے؟

لکھنوی۔ یعنی نہیں کیوں؟

بنگالی۔ اور ہم آپ کے ڈاکٹر کا ایڈریس بھی نوٹ کرے گا، ہم انگلش ایجا کو کمبر دیتا ہے۔ اس کی ماشوری کر دے گا۔

لکھنوی۔ (نوجوان سے) سنائیے صاحب، آپ قصہ سنائیے (آہستہ سے) ماشوری کا بچہ۔

نوجوان۔ سنئے۔ ۔ ۔ ۔

نواب عظمت جاہ الہ آباد کے ایک خاندانی رئیس گذرے ہیں۔ ان کے خاندان میں قدو قامت ہی نہیں عمریں بھی دراز ہوا کرتی تھیں، لڑکا رکا شوق ان لوگوں کی گھٹی میں پڑا تھا، بچے سے لے کر بڑے تک بجٹے یکھو لنگا رکا دیتی، خالباً اسی واسطے چوڑی ہڈی اور مضبوط کلا جبڑا اس خاندان کی خصوصیات میں سے ہو گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

عظمت جاہ کے اکلوتے لڑکے شوکت جاہ بھی باپ دادا کی طرح بلند قامت کشادہ شانوں اور بھاری ڈیل کے آدمی تھے مگر تھے کچھ ایسے ڈھیلے ماٹھے کہ ان کی ذات خاندان کی صفات کو جھٹلاتی معلوم ہوتی تھی۔ ۔ ۔

چھوٹی بیگم صاحبہ جن کے بطن سے شوکت تھے نواب صاحب کی سب سے چھوٹی، چوتھی آخری اور سب سے زیادہ چہیتی بیوی تھیں، خدا ان کی روح کو نہ شرمائے، بڑے بوڑھوں سے یہ سنا ہے کہ ساری عمر میں ماما کا سہارا لئے بغیر کبھی چھپر کھٹ سے نیچے نہیں اتریں۔ دسترخوان پر دونوں وقت نواب صاحب بجائے اپنے ہاتھوں سے نوالے بنا بنا کر ان کے منہ میں دیا کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ اور پانی اس طرح نوش کیا کرتی تھیں کہ نقرئی کٹورا تو نواب صاحب کے ہاتھ میں ہے اور بیگم ان کے شانے پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھے گھونٹ لے رہی ہیں، دو گھونٹ لیتی ہیں منہ ہٹا لیتی ہیں ـــــ "یا اللہ تیرا شکر"، دو لقمے تو حلق سے نیچے اترے تو بہ ہے نواب صاحب) تم نے کٹورا کس بری طرح تھام رکھا ہے"۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ نواب صاحب جواب میں ہنس دیتے ہیں ـــــ "اچھا تم یوں تو سہی، میں ٹھیک طرح تھامے لیتا ہوں"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیگم صاحبہ کٹورے کو منہ لگاتی ہیں، اب کی دفعہ ایک ہی گھونٹ لے کر منہ ہٹا لیتی ہیں۔ "ناک بھوں چڑھ جاتی ہیں ـــــ "کیوڑا تو اس میں ہے ہی نہیں، کسی دن اس قطامہ شہبانہ کے اتنی جوتیاں رسید کروں گی کہ سیدھی ہو جائے گی۔"

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نواب صاحب ہاں میں ہاں ملاتے جاتے ہیں اور بچوں کی طرح بہلا بہلا کر بیگم کو کھانا کھلاتے جاتے ہیں۔

پنجابی۔ لاحول ولا قوت۔ عورت تھی کہ کانچ کا گلاس!

(لکھنوی کی تیوری پر بل پڑ جاتے ہیں)

نوجوان۔ بیگم صاحبہ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو نواب صاحب کبھی کے ٹھکرا بھی چکے ہوتے، مگر بیگم صاحبہ بلا کی حسین اور بڑے چاؤ چوچلے سے بیاہ کر لائی گئی تھیں، نواب ان پر دم و ہوش دیوانے تھے، جس کروٹ چاہتیں سلاتیں، جس رخ چاہتیں اٹھاتیں، سارا گھر ان کے اشاروں پر ناچتا تھا مجال کیا کہ کوئی ماما یا چھوکری ان کی مرضی کے خلاف کام کر کے نواب صاحب کے ہاں کھڑی پانی پی سکے۔ ادھر کسی نے اف کی اور ادھر اس کا پلندہ کسا گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر بدلہ لینے میں اس قدر تیز ہونے کے باوجود انہیں ہمیشہ کمزوری دل کی بیماری لاحق رہتی تھی، بیٹھتیں پھولوں کی سیج پر، اور لیٹتیں کلیوں کے خرمن پر، مگر اٹھتیں تو آہ کے ساتھ، اور کروٹ بدلتیں تو ہائے کر کے، مامائیں اور چھوکریاں جو اپنے آدھے کی خبر سنائی، آٹھ پہر ہاتھ بچھاتی تھیں، اپنے اپنے گھر جا کر نواب کی حماقت پر خوب ٹھٹھے لگاتیں ڈاکٹر اور حکیم جو ہر وقت ڈیوڑھی پر موجود اور صحت کے نسخے سیدھے کرتے تھے، اس تماشے پر دل ہی دل میں ہنستے۔

پنجابی۔ بیگم صاحبہ کی ان عادات کا اثر شوکت جاہ پر ضرور برا پڑا ہوگا؟

نوجوان۔ آپ نے بات میرے منہ سے چھین لی، میں یہی کہنے والا تھا، خاندانی ڈیل ڈول کے باوجود بھی ماں کا شوکت میں اثر آ گیا، وہ بھی خود کو پیدائشی مریض گرداننے لگا، ہر روز کوئی نہ کوئی ٹھسکا چلا جاتا، آج کھانسی، کل بخار پرسوں نزلہ، اترسوں سردی، چنانچہ جب سولہواں برس کے سن بلوغ میں پہنچے تو چھوٹے میاں کے متعلق یہ بات عام ہو چکی تھی کہ انہیں دل کی بیماری حضور چھوٹی بیگم صاحبہ سے ملی ہے، اسکول تو کیا جاتے، غنیمت سمجھو کہ انہوں نے گھر پر رکھے ہوئے استادوں سے چند کتابیں الٹی سیدھی پڑھ لیں، خاندان کے لوگ زیادہ تر فوج میں رہے تھے، یہی پیشہ خاندانی سمجھ لیا گیا تھا، مگر چھوٹے میاں اس سے معذور رکھے گئے اور نہ بھی رکھے جاتے تو کہیں بنکے جاتے ان کا دل چوکر مرد تھا، اور اکیسویں برس تو یہ بات مسلم ہو چکی تھی کہ شوکت جاہ

پھیپھڑوں کے بالکل ناقابل ہیں، ڈاکٹروں نے فتویٰ صادر کر دیا کہ انہیں چھ مہینے پہاڑ اور چھ مہینے سمندر پر رہنا چاہئے۔ چھوٹے میاں نصف سال وہاں اور نصف سال یہاں رہنے لگے۔

لکھنوی۔ لیکن قبلہ اگر واقعی میں کہیں شوکت علیل ہو تو؟

نوجوان۔ آپ رائے قائم کرنے سے پہلے واقعات کو سمجھ لیجئے، حقیقت تو کیا دیکھنے میں بھی شوکت بیمار نہیں معلوم ہوتا تھا، خرابی اصل میں خیال کی تھی، یہ وہم ہو گیا تھا اُسے کہ میں بیمار ہوں، ہر وقت چھوٹے میاں کے آگے تیمارداری کے لئے دس پانچ نوکر چاہئے تھے، ایک پیٹ کو سینکنے کے لئے روئی میں لپٹی ہوئی اینٹیں گرم کر رہا ہے، دوسرا گلے میں پیٹنے کے لئے فلالین کی پٹیاں بنا رہا ہے، تیسرا ڈاکٹر صاحب سے رات کی کیفیت کہنے گیا ہے، چوتھا دوائی کا قدح لئے کھڑا ہے۔ ۔ ۔ ۔ تیمارداری کیا تھی، اچھا خاصا سوانگ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی اثناء میں بڑے نواب بیچاروں کا چراغ حیات ٹمٹمانے لگا اور بیگم صاحبہ کے چہرے بھی گورستان کی خاک سے گلے ملنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انہوں نے سوچا، چل چلاؤ کا وقت ہے اور ساری عمر کی کمائی لے دیکر یہی ایک شوکت ہے، اولاد دیکھنے کو تو کون جیتا ہے، شادی ہی کی بہار دیکھ لیں، کوشش کر کرا کے ایک شریف گھرانے میں نسبت ٹھیرالی چند مہینے بعد بیاہ ہو گیا، مریض شوکت جورو والے بن گئے۔

لکھنوی۔ ایسے کونسے بٹھے کے اندھے مل گئے تھے جنہوں نے بغیر آگا پیچھا دیکھے بیٹی دیدی؟

نوجوان۔ دنیا میں سبھی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

پنجابی۔ آہو جی آج کل پیسے پہ بیٹی دیتے ہیں۔

نوجوان۔ اب اسے اتفاق سمجھئے یا شوکت کی قسمت کہ عورت ایسی ملی جو شوہر پر جان چھڑکنا اپنا ایمان سمجھتی تھی اس نے نوکروں کو تو ہٹایا الگ خود شوکت کی تیمارداری میں لگ پھر ایک ٹانگ سے پھرتی، دیکھنے والے شوکت جاہ کی خوش نصیبی پر رشک کرتے اور کہتے بیوی ہو تو ایسی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کامنی سا بدن، گورا گورا رنگ، ستواں ناک خوبصورت نقشہ، نرگس کو شرمانے والی آنکھیں، گلاب کو پھیکا کرنے والے رخسار، بیچارا تھا اگر سیجوں کی زینت بنتی اور حقدار تھی اگر چار چوچلے ہوتے مگر نیک بختی دیکھو مریض شوہر ملا تو ہمت کی کمر کس کے خدمت پہ اس طرح تیار ہو گئی کہ گیا کوئی زر خرید لونڈی ہو گی۔ ادھر نواب صاحب کی سنئے، تیمار دار کیا ملی انہیں بیماری کا دوامی پٹہ مل گیا، خدمت کرنے والی جو ملی تو انہوں نے صحت کے معاملے میں اور بھی ڈھیل ڈال دی، پہلے اگر نزلے کی شکایت ایک مہینے میں ایک دفعہ ہوتی تھی تو اب دو دفعہ ہونے لگی، گٹھیا کے آثار پہلے اگر غیر یقینی تھے تو اب بالکل یقینی ہو گئے، بدہضمی یا تو چار ہی تھی یا اب ایکا ایکی آن ہی ٹھیری۔

پنجابی۔ لاحول ولا کوٹ۔

نوجوان۔ شادی کے چند ہی مہینے بعد بڑے نواب اور بیگم صاحبہ دونوں اس دنیا سے سدھار گئے، شوکت جاہ تمام املاک کے جائز وارث قرار پائے روپیہ ہی روپیہ ہو گیا، اب وہ آزاد تھے جو چاہیں کریں، بہت سے ڈاکٹروں نے مل کر یہ طے کیا کہ نواب صاحب سمندر کا سفر کریں اور ایک مستقل ڈاکٹر نوکر رکھیں جو ہر وقت ان کے ساتھ رہے۔

(سننے والوں کی آنکھیں چمک رہی ہیں)

احمد زماں الہ آباد کا ایک نوجوان، میڈیکل کالج سے تازہ تازہ امتحان پاس نکلا تھا، وہ شوکت کا عزیز بھی تھا اور اس خاندان کے پوست کندہ حالات سے واقف بھی، شوکت نے اس کی خدمات حاصل کرنی چاہیں، کچھ تو شوق سیاحت اور کچھ جذبۂ ہمدردی، زماں راضی ہو گیا، اور سفر شروع ہوا۔

بنگالی۔ اس کا عورت نے ہیں گیا اوس کا شات؟

نوجوان۔ کس کا؟

بنگالی۔ سوکت زا کا۔

نوجوان۔ عورت گیا تو ـــــــ شوکت اس کی بیوی عطیہ اور ڈاکٹر زماں تینوں سوار ہوئے۔

بنگالی۔ وہ تینوں کہاں کو شفر کیا؟

لکھنوی۔ (آہستہ سے) جہنم کو۔

نوجوان۔ سب سے پہلے قفقاز گئے۔

پنجابی۔ جاڑا تو وہاں خوب پڑتا ہے۔

نوجوان۔ جی ہاں۔

پنجابی۔ مگر آندھیاں بھی بہت آتی ہیں۔

نوجوان۔ جی۔ اور انہی آندھیوں نے شوکت کو وہاں زیادہ عرصے قیام نہ کرنے دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اول اول تو ڈاکٹر زماں نے بڑی سرگرمی سے

علاج شروع کیا، مگر چند ہی دن میں اسے معاملے کی اصلیت معلوم ہو گئی، کہ مریض اتنا بیماری کے اثر میں نہیں ہے جتنا بیماری کے وہم کے اثر میں ہے تفریح کی آب وہوا نا پسند آئی، مدیرا پہنچے، یہ جگہ بھی سمجھ میں نہ آئی، ما لٹا ہوتے ہوئے قاہرہ آئے،

لکھنوی۔ (سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) قاہرہ؟

نوجوان۔ جی۔

لکھنوی۔ یہ تو وہی شہر ہوا جو دریائے نیل کے کنارے پر واقع ہے؟

نوجوان۔ جی ہاں۔

لکھنوی۔ سنا ہے بڑی دلفریب جگہ ہے، اور عشق و محبت کے افسانے بھی وہاں خوب ہوتے ہیں؟

(پنجابی مسکراتا ہے)

نوجوان۔ شوکت کے تلون سے زماں ذرا بددل سا ہو گیا تھا، مگر مصر کی خوشگوار آب وہوا اور نیل کی پر کیف فضا نے اس کی ڈھارس بندھا دی کہ میں اپنے مریض کو اچھا کر لوں گا۔ لیکن اس عرصے میں وہ اور باتوں کے ساتھ ہی اس پر بھی غور کیا کرتا کہ عطیہ کوئی پتھر کی مورت تو نہیں۔ عورت ہے، اور عورت کے سینے میں بھی آخر دل ہی ہوتا ہے یہ انسان جو مردے سے بھی بدتر ہے، اسے کیا حق ہے کہ ایک عورت کے لئے قضا کا فرشتہ بنے۔

(لکھنوی سنبھل کے بیٹھ جاتا ہے، پنجابی پر اسرار مسکراہٹ سے مسکراتا ہے بنگالی پان چبا رہا ہے)

کنار نیل پر "خانۂ مینا" نام ایک عمارت میں وہ مقیم ہوئے، نیل کا ساحل جس کے ذرّوں کو حوریں چوم چوم کر اپنی فردوسی ردا میں اٹھاتی ہیں جو اق کے تخیل کے لئے اپنی فضا میں بڑے خطرناک جراثیم پوشیدہ رکھتا ہے، نیل دلکش، ظالم نیل، اس راز کو طشت از بام کر دیتا ہے، جو ہر عورت اور مرد کے سینے میں دل بن کر چھپا ہوا ہے قاہرہ آنے سے پہلے زماں کے دل و دماغ مریض کو اچھا کرنے میں مصروف تھے، فضائے نیل کے آغوش میں پہنچ کر دماغ کھلایا، اور دل نے ایک کروٹ لی، اسے محسوس ہونے لگا کہ میرے دل کو عطیہ سے ایک طرح کی درد آمیز ہمدردی ہے۔

(لکھنوی کی آنکھیں چمک رہی ہیں، پنجابی اشتیاق سے سن رہا ہے، بنگالی پان چبا رہا ہے)۔

مصر کی سنہری فضا، نیل کا رومانی حسن اور صنموں کے دیس کی دل پروری ہوا۔ ——— ان چیزوں سے دوچار ہونے کے بعد بھی انسان مریض رہے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا، وہ سمجھ نہ سکتا تھا کہ شوکت کس دل کا آدمی ہے؟ نسخے لکھتا مریض کی دیکھ بھال کرتا، مگر دل الجھن میں پڑ گیا تھا، اور دماغ سوچ بچار میں۔ اب اگر وہ شوکت کی "وہم پرستی" پر غور کرتا تو ساتھ ہی اپنے دل سے یہ بھی پوچھتا کہ آخر عطیہ اپنے اوپر خود یہ ستم کیوں توڑ رہی ہے، وہ نرم و نازک گٹھے گوٹے ہاتھوں کو ایک وہمی کے گلے میں پٹیاں لپیٹتا دیکھ کر وہ بیقرار ہو جاتا، چاہتا کہ لپک کر آگے بڑھے، وفا و مہر کی اس سندر مورت کے آگے دو زانو ہو جائے، پٹیاں چھین لے، چھین کر پھینک دے اور عشق کا ایک دلدوز نغمہ گاتے ہوئے ان ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا لے۔ . . . . . . ایک شام جب رات کے استقبال میں چاند آسمان پر کچھ دور جا چکا تھا، زماں ہاٹل باغ میں چہل قدمی کرنے نکلا، اتفاقاً عطیہ بھی پھرتی پھراتی وہاں آ نکلی، گفتگو ہونے لگی، اور خبر نہیں کیونکر ہوتی ہوتی شوکت کی بیماری پر آ گئی۔ . . . . . . پریاں اس وقت قاف کے کسی فردوسی گوشے میں ہاتھ باندھ کر چھم چھم ناچ رہی ہوں گی، ستارے ہنس ہنس کر آسمان پر نقرہ کی دھاریں اڑا رہے تھے، نیل کی موجیں آہستہ سے کروٹ لیتیں، اور ہوا کے خنک جھونکوں سے گلے مل کر بستر فرش آب پر سو جاتیں۔ . . . . . زماں نے عطیہ کو دل کی کہانی کہ سنائی۔ . . . . . شوکت قریب ہی ایک خیمے میں لیٹا ہوا تھا۔ . . . . ڈاکٹر کو اس بات کا خیال نہیں رہا، اس نے اپنی کتاب دل کا ہر وہ صفحہ محبوب کے سامنے پیش کیا جس میں آرزو کی بہاریں آسودہ تھیں آنسوؤں کے موتی بکھیرے، نیاز کے تحفے گذارے، درد انگیز التجائیں کیں، غم آمیز درخواستیں کیں کہ عطیہ اپنی حسین زندگی وہم کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھائے۔ . . . . ابھی زماں میں جب حسن کے حضور میں عشق ہاتھ جوڑ جوڑ کر دل کا تحفہ پیش کر رہا تھا۔ عطیہ نے اشارۃً اپنی انگلی خیمے کی طرف اٹھائی۔ اور بولی،

"دیکھئے ڈاکٹر، وہ وہاں سو رہے ہیں"۔ . . . . . زماں کا جوش فوراً ٹھنڈا پڑ گیا، اسے اپنی زبان کی گستاخی کا احساس ہوا، آخر وہ تھا کون؟ ایک نوکر کیا نوکر مالکہ سے یونہی مخاطب ہوا کرتے ہیں؟ کیا نوکروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ مالک اور مالکہ کے تعلقات پر رائے زنی کریں، تبصرے گذاریں اور . . . . . اور . . . . ؟

مگر عطیہ کا طرزِ عمل واہ واہ! اپا وہ اس پر بگڑی نہیں، گویا اس بات کا اعتراف
کہ محبت کا ظلم مجھ پر ہوا ہے مگر اس کے ساتھ ہی ایک اشارے میں
یہ بھی بتا دیا کہ زندگی کے ہنرمندوں نے اس ظلم کو ناگزیر بنا رکھا ہے۔ اس
نے بتا دیا کہ میں کون ہوں اور تو کون ہے۔ اور کوئی اور ——— ایک
تیسری شخصیت ——— وہ کون ہے . . . . . یہ گویا ایک
سلیقہ مند اور ذکی تھی جس کے بعد پہلا خیال زماں کے دماغ میں یہ آیا
کہ اگر شوکت نے یہ گفتگو سن لی ہے تو میرا انجام کیا ہوگا؟ عطیہ کو وہیں
چھوڑ کر وہ خیمے کی طرف چلا ——— یہ معلوم کرنے کہ آیا نواب بیدار
ہے یا سوتا ہے؟ ——— چلتے وقت اس نے عطیہ پر ایک نگاہ
ڈالی ——— وہ نگاہ جو کیوپڈ کے صحیفۂ محبت میں کسی زرکار
صفحے کی زینت ہوگی ———

. . . . . . خیمے کے اندر، شوکت ایک صوفے پر لیٹا تھا، اس
کی آنکھیں بند تھیں، بظاہر سوتا تھا . . . . . . ڈاکٹر حبیب چپ چاپ کھڑا
ہوگیا اور اسے دیکھنے لگا . . . . . دفعتاً کسی طرف باجے بجتے
سنائی دیئے . . . . . شوکت نے کروٹ لی، آنکھیں کھولیں، سامنے
زماں تھا، بولا "کیا ہوا؟ کیا ہے؟" زماں نے جواب دیا "کچھ نہیں
میں یونہی آپ کا حال دیکھنے" شوکت بولا "اچھا ہوں، ذرا سو گیا تھا"
. . . . . زماں کو اپنے پہلو میں ایک برچھی پیوست ہوتی معلوم ہوئی
——— اچھا ہوں! مریض اچھا ہونا چاہتے ہیں! کب؟ جب ڈاکٹر کا
مریض دل سے اسے صدا بیمار دیکھنا چاہتا ہے!!! ——— . . .
. . . شوکت نے پوچھا "کیا بج گیا؟" زماں نے بتایا کہ سات بج چکے ہیں
اور پھر پوچھا "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" شوکت نے کہا "پہلے سے
تو کسی قدر بہتر ہی ہے" . . . . . . زماں کے دل پر ایک گھونسہ
لگا، یہ معلوم ہوا جیسے پرندے نے اڑنے کے لئے پر تولے ہی تھے جو
اس پر جال پڑ گیا، اور صیاد نے ہاتھ بڑھا کر گردن مروڑ دی . . . . .
"آپ صوفے پر بے آرام ہو رہے ہیں، لائیے میں سہارا دے کر پلنگ تک
پہنچا دوں" مگر اس کی مدد کا انتظار کئے بغیر شوکت خود ہی پھرتی کے
ساتھ صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا، اور بولا "نہیں آپ تکلیف نہ کیجئے
میں خود لیٹ جاؤں گا" پھر پوچھنے لگا "بیگم کہاں ہیں؟" زماں
نے کہا "یہیں کہیں ہوں گی، بلوایا جائے . . . ." بولا "نہیں رہنے

سے کہئے میں نفرت کرتی ہوں گی" . . . .
خیمہ چھوڑتے وقت زماں کو یکایک یقین ہوگیا کہ شوکت نے "میری" درد فراق
کا ایک ایک حرف سن لیا ہے، مگر جب عطیہ ملی، اور ڈاکٹر نے اس کی نگاہوں
میں سوال جھلکتا دیکھا تو سوا اس کے اور کچھ نہ کر سکا کہ چوروں کی طرح
کہہ دے "سو رہے تھے"، کس دل سے وہ کہہ دیتا کہ محبت کی فریاد میرے
جرم کا اقرار بن کر عدالت کے کانوں تک پہنچ چکی ہے، کیسے وہ اسے
بتا دیتا کہ تیرے شوہر نے وہ اظہارِ محبت سن لیا ہے جو میں نے ابھی
تیرے حضور میں پیش کیا تھا، کیونکر وہ یہ منہ سے نکالتا کہ تیری نسوانیت
پر نادانی کا جو وار میں نے کیا تھا، اس کی صدا تیرے شریکِ زندگی
نے گوش زد کر لی ہے ———

پروانہ چراغ کے گرد چکر کاٹتا ہے گھومتے گھومتے قریب جاتا ہے جلتا
ہے اور گر پڑتا ہے، مر جاتا ہے، خاکستر ہو جاتا ہے، اگر تم پوچھ سکتے اور
وہ جواب دے سکتا تو غالباً اس حالت پر بھی وہ اپنی کامرانی ہی کا راگ
الاپتا، حقیقت اس کے خلاف سہی، مگر محبت تو حقیقت کو مانتی ہی نہیں ——
شوہر کو سوتا سن کر عطیہ کی آنکھوں میں آسمانی نرمی کی ایک جھلک نمودار ہوگئی
زماں کے دل نے ایک لمحے کے لئے یہ تمنا کی کہ باغ کی شاداب زمین
شق ہو جائے، اور میں اس میں سما جاؤں . . . . . عطیہ نے اُسے
نظر بھر کے دیکھا، گویا کہا "جاؤ معاف کیا" اور چل گئی . . . . . .
دوسرے دن شوکت نے قاہرہ سے اسوان جانے کا خیال ظاہر کیا . . .
. . . سفر سے پہلے ہی مریض میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے۔
مرض کی شکایت روز بروز کم سننے میں آنے لگی، ہوتے ہوتے وہ چلنے
پھرنے بھی لگا، اسوان پہنچ کر عطیہ کے ہمراہ معبد عظیم دیکھنے اور خوب
دوڑا دوڑا پھرا، اور شام کو واپس تکان کی شکایت بھی نہ کی، کھانے
پر کچھ کہنے کو ہوا، مگر پھر کسی فوری خیال سے گفتگو کا رخ بدل کر بات کو
ٹال گیا . . . . اب وہ عطیہ کے ہمراہ ساحل پر ٹہلتا بھی، اور جب
رات کو سوتے وقت وہ اس کے گلے سے پٹیاں لپیٹنی چاہتی تو "نہیں
رہنے دو" کہہ کر انکار کر دیتا، نوجوان ڈاکٹر رات کے سناٹے میں حالات
کی روش پر سر کھپایا کرتا، ایک مضبوط جوان ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے
آپ کو ایک ضعیف بچہ محسوس کرنے لگتا، نیل کے سکوت میں چاندنی
کے نقرئی تیروں سے اس کا سینہ چھد جاتا، وہ نیل کے خداؤں کو حاضر

کی صحت میں اپنی فریادیں بھیجا شوکت کی اچانک تبدیلی نے اس کے حواس پر ایک کاری حملہ کر دیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا تھا گویا زیست کی خنک راتیں اسے مجنوں بنا دیں گی، مصری دنوں کی تمازت میرا سینہ جلا کر دہکتی ملاحوں کے رسیلے گیت میرے سر کو کسی ابدی سودا سے محبت سے لبریز کر دیں گے۔ اسے نظر آنے لگا تھا کہ عطیہ کا قرب مجھے وحشی بنا دے گا ...... آصوان کی آب و ہوا قاہرہ سے کچھ ایسی بہتر نہیں ہے مگر وہاں پہنچے ہوئے دو ہی دن ہوئے ہوں گے جو شوکت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہاں میں پہلے سے اچھا ہوں شام کو جب عطیہ نے پٹیاں کھولنی چاہیں، تو اس نے پھر انکار کر دیا۔ عطیہ نے بھی اصرار نہ کیا مگر انہیں میز پر چھوڑ دی گئی کہ شاید ضرورت ہو، دوسرے دن صبح کو جب ڈاکٹر نے وہ پٹیاں اسی طرح رکھی ہوئی دیکھیں تو اس کا خیال پھر چلا اور دماغ میں پھر کھلبلی پڑ گئی کہ واقعات یہ کیسی بھیانک شکل اختیار کرتے جاتے ہیں اور حالات اپنے اندر یہ کیسے خوفناک معانی پیدا کرتے ہیں مگر اس نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ حالت عارضی ہے وہم دماغ پر پھر قبضہ جماتے گا۔

. . . . . دن یہ دن گذرتے گئے شوکت کی حالت بہتر ہوتی گئی، آہستہ آہستہ وہ کوئی کھوئی چیز حاصل کر رہا تھا۔ کبھی کبھی چند منٹ کیلئے وہ اپنے ایام علالت کی طرف لوٹتا اور اپنی حالت کے متعلق کچھ کہنا شروع کرتا، مگر پھر دفعتاً رک جاتا، اور گفتگو کا موضوع بدل جاتا . . . . .

تغیر برابر اپنا رنگ جماتا رہا یہاں تک کہ ایک دن وہ آیا جب عطیہ پلنگ پر لیٹی تھی اور شوکت اس کا سر دبا رہا تھا۔ نوجوان ڈاکٹر عین اسی وقت کھڑکی کے سامنے سے گزرا اس نے یہ منظر دیکھا، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے دل کی دھڑکن لرزنے لگیں محبت نے ایک چیخ ماری اور ڈکرا ڈکرا کر رونے لگی۔ مگر ضمیر نے آواز لگائی خبردار کسی خودغرضانہ سوال کا جواب نہ دیا جائے، اپنی محبت کی کامیابی کے لئے دوسرے کا گھر بگاڑنا انسانیت کے خلاف ہے . . . .

اسی دن ڈاکٹر نے نوکری سے استعفیٰ دیدیا . . . .

. . . . تھوڑی دیر بعد . . . . . .

ایک اسٹیشن آتا ہے۔ گاڑی ٹھہرتی ہے

. . . . . نوجوان اپنا اسباب سنبھالتا ہے . . . .)

پنجابی۔ آپ یہیں اتریں گے۔

نوجوان۔ جی ہاں۔

پنجابی۔ میں نے بھی یہیں اترنا ہے میں یہاں پوسٹ آفس میں ہوں۔

. . . .

. . . .

. . . . (چند دن بعد . . . .

ایک سب پوسٹ آفس میں پنجابی اپنے ایک دوست سے باتیں کرنے میں مشغول ہے

نوجوان سامنے سے گذرتا ہے)۔

پنجابی۔ (اپنے دوست سے) تم ان صاحب کو جانتے ہو؟

دوست۔ (نوجوان کو دیکھتے ہوئے) کیسے؟ نہیں؟ ہاں، ایک دفتر میں ہیں۔

پنجابی۔ ابھی جب میں مصر سے آتا تھا۔ ریل میں ان کا ساتھ ہو گیا۔ انہوں نے ایک بڑا عبرت آموز واقعہ سنایا، سچ مچ میں تو رو پڑا۔

دوست۔ کیوں نہ ہو۔ انھوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی بھی تو پیا ہے۔

(پنجابی اپنے دوست کو تعجب سے دیکھتا ہے)

معلوم ہے پہلے یہ کیا کرتے تھے؟

پنجابی۔ نہیں۔

دوست۔ ڈاکٹر تھے۔

(ریتلی سڑک پر بگولا اٹھتا ہے اور چند پتے اس میں اڑنے لگتے ہیں)۔

منظر انصاری



(افسانہ)

گمنام عورت کا خط

از جناب ظفر قریشی دہلوی بی اے

سویڈن کی مشہور علمی انجمن جو نوبل پرائز کا انعام دیتی ہے۔ اس کے ایک نامور رکن استفہان تزوبگ نے ایک افسانہ لکھا ہے جو یورپ کی ہر زندہ زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ اردو زبان میں سب سے اول بزم خیال اس کا کامیاب ترجمہ پیش کر رہا ہے۔ ایڈیٹر

باب ۱
افسانہ نویس

ر ——— مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس چند دن کے لئے کوہستان فرانس میں بالغرض تفریح چلا گیا تھا اور آج ویانا واپس آیا تھا اسٹیشن پر اس نے ایک روزانہ اخبار کا پرچہ خریدا، تازہ خبروں پر نظر ڈالی اور اخبار کی لوح پر تاریخ دیکھی، تاریخ دیکھنے سے اسے معلوم ہوا کہ آج اس کا یوم پیدائش ہے، اس کی اکتالیسویں سالگرہ، مصنف نے اپنے دل میں اس خیال کو کئی بار دہرایا اور اخبار جیب میں رکھ کر اسٹیشن سے روانہ ہو گیا۔

ایک ٹیکسی میں سامان رکھا اور گھر پہنچا، گھر پہنچنے پر ملازم نے بتایا کہ پچھلے ہفتہ کی غیر حاضری میں جو خطوط اور رقعے ڈاک کے ذریعہ اور دستی طور پر آئے تھے وہ سب ایک انبار کی صورت میں کمرہ کے ایک طرف میز پر رکھے ہیں، مصنف نے اس انبار کی طرف کسی قدر خوف کے جذبہ کے ساتھ دیکھا اور چاء تیار کرنے کو کہا خود غسل کر کے آیا اور چاء پینے لگا، میز کے قریب بیٹھ گیا اور بے پروائی سے خطوط چاک کر کے پڑھنے لگا، دو تین خط یونہی اٹھا کر دیکھے، کچھ اخبار اور رسالے بھی تھے، انہیں ایک طرف سرکا دیا، یکایک اس کی نظر ایک غیر معمولی حجم کے لفافہ پر پڑی، جو نہایت کس مپرسی کی حالت میں خطوط کے ڈھیر میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا رسم الخط زنانہ تھا، اور ایسا تھا جو مصنف پہچان نہیں سکتا تھا، تھوڑی دیر تک مصنف نے اس لفافہ کی طرف دیر تک دیکھا، اور پھر چاء ختم کر کے سگار سلگایا، اور اس لفافہ کو نکالا آرام کرسی پر اطمینان سے لیٹ کر اس لفافہ کو چاک کیا۔

خط کو ایک اچھا خاصا مضمون یا افسانہ کہا جا سکتا تھا، لیکن ضمیر متکلم میں لکھا گیا تھا اور مصنف کو خطاب کر کے لکھا گیا تھا اس لئے اسے خط کہنا بھی بیجا نہ ہوگا، اور درحقیقت وہ خط ہی تھا یہ خط تین درجن صفحوں پر پھیلا ہوا تھا، رسم الخط زنانہ تھا اور بہت عجلت کی حالت میں لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا بے اختیاری ایک ایک حرف سے ٹپک رہی تھی۔

خط پر القاب و آداب کی قسم میں سے کوئی چیز نہ تھی، مضمون یا خط کے ہمراہ کوئی اور تعارفی رقعہ تھا جس سے بھیجنے والی کا پتہ یا نام معلوم ہو سکتا، مصنف نے کسی قدر متعجب ہو کر اور اشتیاق کے ساتھ لفافہ کو اپنے ہاتھ میں الٹ پلٹ کر دیکھا کچھ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔

لفافہ پر یہ سرخی درج تھی۔

"آپ کے نام ——— جو مجھے نہیں جانتے"

مصنف کو اور بھی زیادہ حیرت ہوئی اور کسی قدر بیتابی کے ساتھ انہوں نے لفافہ چاک کر کے اس گمنام اور نامعلوم عورت کا خط پڑھنا شروع کیا جسے یہاں بجنسہ درج کیا جاتا ہے۔

باب (۲)
خط

میرے لڑکے کا کل انتقال ہو گیا [illegible] تین دن اور تین راتیں

مجھے جاگتے ہوئے گذر گئیں میں سوچ کر انفلوئنزا ہوا سخت کرب دے چینی اور شدید بخار میں تین رات تڑپ تڑپ کر گذاریں میں اس کی لاش کے قریب کرسی پر تنہا بیٹھی ہوں، بچہ سے جس وقت وہ دنیا میں موجود تھی اس کی روحانی و جسمانی اذیت کو سکرات موت کو اپنی آنکھ سے دیکھا۔ آہ! کمبخت! بد نصیب کی موت کیوں دائمی میری محبت اور تمناؤں کا مرکز ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے میرے سامنے اس وقت یہ لڑکا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہے، بالکل اس حالت میں جیسے سو رہا ہو، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن سے ذہانت اور لیاقت کا نور جھلکتا تھا اب ہمیشہ کے لئے بند ہو گئی ہیں، میں نے اس کے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر سفید چادر ڈال دی ہے اور قریب کی میز پر بیٹھی ہوئی یہ خط آپ کو تحریر کر رہی ہوں۔

دنیا میں اب صرف ایک ہستی ہے جس کا مجھ سے کوئی تعلق باقی رہ گیا ہے ——— وہ آپ ہیں! یہ بات کسی قدر تعجب انگیز معلوم ہو گی، کہ میرا اور آپ کا کوئی تعلق ہو لیکن آپ حیران نہ ہوں، میں ابھی بتاتی ہوں۔ آپ غور کر رہے ہوں گے کہ میں تو اس عورت کو جانتا بھی نہیں کہ کون ہے، نہ اس خط میں اس کا نام ظاہر ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ مجھے جانتے ہیں خوب جانتے ہیں ——— لیکن بھول گئے!!

میں نے میز پر پانچوں موم بتیاں جلا دی ہیں، کمرہ میں روشنی بڑھ گئی ہے اور مردہ لڑکے کے سفید و سرد چہرہ پر یہ تیز روشنی پڑ رہی ہے، اس کے چہرے کے خط و خال، اس کی زندگی کے واقعات اور اپنی حیات المیہ کے تمام نقشے ایک فلم کی صورت میں میری ذہنی آنکھ کے پردہ پر حرکت کر رہے ہیں۔

مجھے خود بھی بخار چڑھ رہا ہے۔ آجکل تمام شہر میں انفلوئنزا کا دور دورہ ہے میرا سر چکرا رہا ہے کنپٹیاں سن سا رہی ہیں اور اختلاج بھی ہو رہا ہے، میں اس صدمہ کو یقیناً برداشت نہیں کر سکتی، اس خط کے ختم ہونے پر میری روح ہڈیوں کے پنجرہ کو توڑ کر باہر نکل جائے گی ——— بہت اچھا ہوگا: ——— جس قدر جلد منزل قریب آجائے، مسافر کو آرام ملتا ہے۔

آج میں صرف آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہوں میں زندگی میں پہلی مرتبہ سب کچھ کہہ دینے پر آمادہ ہوئی ہوں، اس وقت تک جس راز کو امانت کی طرح حفاظت سے رکھا تھا اسے اس شخص کے حوالے کر رہی ہوں جس کا وہ مالک ہے دنیا میرے راز سے آگاہ نہیں ——— اور آپ آگاہ ہیں لیکن بھول گئے!!

جس وقت آپ کو یہ خط پہنچے گا میں ختم ہو چکی ہوں گی، بہت ممکن ہے اس وقت آپ رنجیدہ و خاطر ہوں، اور جواب دینے کے لئے میری تلاش کریں مجھ سے ملنے کے خواہشمند ہوں لیکن میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی، آپکی پشیمانی یا شاید پریشانی میرے کس کام کی

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا (غالب)

اگر میں اس مہلک مرض سے بچ گئی تو اس خط کو چاک کر دوں گی، اور جس طرح آج تک اس راز کی حفاظت کی ہے اسی طرح یہ راز پھر محفوظ ہو جائے گا میں پھر خاموش زندگی بسر کرنے لگوں گی، اگر زندہ نہ رہی تو یہ خط کسی نہ کسی طرح ڈاک میں ڈال دیا جائے، جس کا میں نے انتظام کر لیا ہے۔

جس وقت یہ تحریر آپ کے ہاتھ میں پہنچے گی اس وقت میں مر چکی ہوں گی۔ اور آپ اس تحریر کو یہ سمجھ کر پڑھیں کہ یہ ایک مردہ عورت کی پہلی اور آخری تحریر ہے ادبیت سے دور، دلکشی سے معرا، اور شاعری سے خالی، مگر دل کی کہانی ہے دل کی زبانی ہے، اس لئے اس میں واقعیت ہے جسے آپ اپنے ناولوں میں ڈرامائی کیفیت کہتے ہیں، اس میں جوش ہے، سچے واقعات کا نشہ ہے، پاک الفت کا سوز ہے، دلفگاری محبت کا، غرض سب کچھ ہے! آپ کو ایک مردہ عورت کی تحریر سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں، وہ نہ آپ کی محبت کی طلبگار ہے نہ آپ سے شفقت و توجہ کی اپیل کرتی ہے، نہ کسی تالیف قلبی کی محتاج ہے ——— وہ اس دنیا ہی میں نہیں ہے: یہ تو ایک کہانی ہے اس عورت کی جس کی زندگی اول سے لے کر آخر تک آپ کے لئے وقف رہی، وہ آپ کی خاطر سانس لیتی تھی، اور اب جان بھی آپ کے ہی لئے دی ہے میں آپ سے صرف ایک چیز کی طالب ہوں، وہ یہ کہ آپ اس خط کو پڑھئے اور اس پر یقین کیجئے، اسے جھوٹ نہ سمجھئے، آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک ماں اپنے لڑکے کی لاش کے پاس بیٹھ کر کبھی جھوٹ نہیں بولے گی ——— بہرحال اسے پڑھئے اور اسے سچ سمجھئے۔

میں اپنی زندگی کا فلم آپ کو دکھانا چاہتی ہوں، پوری داستان میں مناظر کی گھبرانے نہیں، یہ وہ زندگی ہے جو دراصل اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا، میں اس سے پہلے بھی دنیا میں تھی، لیکن اس عہد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتی: میری زندگی دراصل اسی وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا، اس سے پہلے میری زندگی کیسے گذر رہی تھی اس کی یاد اب ذہن سے محو ہو چکی ہے اس لئے بیان نہیں کی

جا سکتی۔ پہلے یاد کرنے سے کوئی فائدہ ہے، پہلی بار جب میں نے آپ کو دیکھا اس وقت میری عمر کیا تھی۔ ہوا ہو گی تھی اور آپ اسی مکان میں رہتے تھے جس میں اس وقت ہیں، یعنی جگہ جہاں اس وقت میرا خیال ——— میری زندگی کا آخری سانس ——— آپ پڑھ رہے ہیں۔

آپ جس بالاخانہ میں رہتے ہیں اس کے اوپر کے زینہ کے عین سامنے کے کمرہ میں ہم لوگ رہا کرتے تھے وہ چھوٹا بالاخانہ جس میں طوطے کا پنجرہ لٹکا رہتا تھا ہمارا ہی تھا۔ یعنی میرا اور میری ماں کا، میں اس وقت اسی جگہ رہتی تھی آپ کہیں اور ہوں ——— بتانے سے کیا فائدہ!

باب ۳

پہلا تیر

آپ مجھکو یقیناً بھول گئے ہوں گے، میری ماں کو بھی بھول گئے ہوں گے جن کے ساتھ میں آپ کے کمرہ کے سامنے والے کمرہ میں رہا کرتی تھی، شاید آپ کو یاد ہو کہ اس کمرہ میں ایک فوجی جمعدار کی بیوہ اور اس کی اکلوتی جوان لڑکی رہا کرتی تھی، اب میری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، میں بھی ایک بچہ کی ماں تھی، مگر اب یہ بچہ مر چکا ہے، اور اب میں بھی مرنے والی ہوں۔

آپ کو بھلا کیسے یاد آ سکتا ہے؟! کہ میں کون تھی، شاید آپ کو میرا نام بھی معلوم نہ ہو کیونکہ ہمارے کمرہ پر کوئی بورڈ اور نام کی پلیٹ نہ تھی، اور نہ ہمارے ہاں کوئی ملنے جلنے آیا کرتا تھا، ہم لوگ بہت خاموش زندگی بسر کرتے تھے، زیادہ باہر نہیں جاتے تھے، آپ کو پندرہ برس پہلے کی بات بھلا کیسے یاد رہ سکتی ہے آپ یقیناً بھول گئے ہوں گے۔ لیکن مجھے وہ واقعات جو اس طویل وقفہ کے دوران میں گذرے بخوبی یاد ہیں، میں کس طرح بھول سکتی ہوں! جس وقت سے آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی میں اس وقت سے اس وقت تک کے واقعات نہایت صفائی اور خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر سکتی ہوں۔

آپ جس کمرہ میں مقیم ہیں، وہاں آپ کے آنے سے پہلے دو میاں بیوی رہتے تھے، بڑے جھگڑالو لوگ تھے، ہر وقت آپس میں گالی گلوچ کرتے رہتے میاں شرابی تھے، اور جب شراب کے نشہ میں چور ہوتے تھے تو بیوی کو اٹھا کر مارتے تھے غرض آئے دن یہی شور و شغب رہتا تھا، اور ہم لوگوں کے لئے خاص طور پر تکلیف کا باعث ہوتا تھا، جس وقت ہم نے یہ سنا کہ سامنے والے کمرہ میں ایک مصنف اور شریف آدمی آنے والے ہیں تو ہماری خوشی کی کوئی حد نہ رہی ہم سمجھے کہ اب مصیبتوں کا خاتمہ ہوا۔ پاجی پڑوسی کی وجہ سے جو تکلیف اور کوفت ہوتی تھی اب دور ہو جائے گی۔ آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی، بڑا بالاخانہ اور اس کے ارد گرد کے چھوٹے کمرے صحن دروازہ وغیرہ صاف کرائے گئے، اور ایک دن نیچے سڑک پر اسباب کا ایک ٹھیلہ کھڑا ہوا نظر آیا میں نے اپنے برآمدہ میں کھڑے ہو کر فرنیچر کے اترنے اور اوپر لیجانے کا تماشہ دیکھا، آپ کا خاندانی ملازم ڈرن ہمراہ تھا، اس نے سامان اتروایا، کمرہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی وہاں اس سامان کو رکھوایا، تصویریں دیواروں پر لگوائیں کٹہروں اور چوکھٹوں پر روغن کرائے، غرض تمام گھر چند دن میں جنت بنا دیا، دوسرے روز آپ کی کتابوں کا ٹھیلہ آیا کیا کہوں آپ کی کتابوں کا انبار دیکھکر دل کو کس قدر خوشی ہوئی، چھوٹی بڑی مجلد اور غیر مجلد کتابوں اور اخباروں اور رسالوں وغیرہ کا ایک ڈھیر تھا! میرے پاس بھی چند کتابیں تھیں، چھوٹی چھوٹی اور بے حقیقت کتابیں۔ میں جب اپنی ان کتابوں کا آپ کی کتابوں کے اس انبار سے مقابلہ کرتی تھی تو دل ہی دل میں خفیف ہوتی تھی، نہ معلوم کیوں؟!

آپ جانتے ہیں یہ سب تفصیلات اور جزوی واقعات میں کیوں لکھ رہی ہوں ——— صرف یہ دکھلانے کے لئے کہ آپ میری زندگی میں کیونکر داخل ہوئے، آپ نے میری حیات اور میرے ذہن پر پہلی بار کیسے اثر ڈالا، کیونکر تسلط قائم کیا، ان حالات نے میری زندگی پر آئندہ کیا اثر کیا اس کی داستان آگے ہے۔

جب تک میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا یہ سمجھتی تھی کہ آپ ایک بوڑھے آدمی ہوں گے سر پر لمبے لمبے بال ہوں گے، ایک طویل و سفید ڈاڑھی ہوگی آنکھوں پر عینک لگی ہوگی۔ لکھنے پڑھنے کی وجہ سے کمر خمیدہ ہو گئی ہوگی، غرض آپ کہنگی اور کمزوری کا اعلان اور نمونہ ہوں گے، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی یہ دیکھکر کہ سامان آنے کے تیسرے روز آپ ایک ٹیکسی میں بیٹھکر آئے، سب سے پہلے آپ کے ملازم نے اتر کر ٹیکسی کا دروازہ کھولا۔ اور آپ پچھلی نشست پر سے اٹھے، باہر نکلے، ایک طویل قامت جوان العمر خوش رو نوجوان ——— اور اتنے نامور اور اتنے بڑے مصنف، اور اتنی عمر میں اتنی شہرت و توقیر حاصل کر لی، بیسیوں ناولوں کے مصنف اور مشہور افسانہ نویس کا یہ حلیہ دیکھکر میں دنگ رہ گئی۔ آپ نے نہایت تیزی سے زینہ پہ قدم رکھا، اور پھرتی کے ساتھ چڑھنا شروع کر دیا میں آپ کی اس برق رفتاری، چستی اور جسمانی سج دھج کو دیکھکر بہت متعجب ہوئی

پھر متاثر ہوئی۔ آپ کی یہ ادا مجھے بہت بھائی اور اب تک آپ کی چال، بجزت پھرت کو دل و جان سے چاہتی۔ دل و دماغ سے کام کرنے والے کتابوں کے کیڑے، مصنف کے لئے کھلاڑیوں کا سا جسم اور پہلوانوں کی سی چستی میرے لئے ایک ایسا معمہ تھی کہ اس وقت جبکہ میری عمر صرف تیرہ سال کی تھی، آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہ آسکتی تھی، اور نہ آئی۔ میں کسی قدر متعجب اور قدرے خوش ہوئی اپنے کمرہ میں واپس آگئی اور اس وقت کا انتظار کرنے لگی، آپ دوبارہ باہر نکلیں اور میں دیکھوں۔ آپ کو دیکھنے کے لئے میری بیقراری ایک معصوم بچہ کی بیچینی و متجسس طبیعت کا نتیجہ تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور جذبہ یا پوشیدہ حس کام نہیں کر رہی تھی۔

باب ۴

خاموش الفت

آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کو دیکھکر میری حالت کیا ہوئی تھی، میرے جذبات کا کیا عالم ہوتا تھا، ایک لڑکی جو ابھی دنیا کے کسی معاملہ سے آگاہ نہ تھی، ایک شہرۂ آفاق مصنف کو اپنا پڑوسی دیکھ کر کس قدر مسرور و شاداں ہو سکتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو کبھی مصنفوں کے ہمسایہ میں رہے ہیں۔

میں روزانہ آپ کو آتے جاتے دیکھا کرتی تھی، لیکن آپ نے مجھے کبھی نہیں دیکھا، اور نہ دیکھنے کی کوئی وجہ تھی، میرے برآمدہ سے آپ کے آنے جانے اور آپ کے پاس آنے والے ملاقاتیوں کا پورا اندازہ ہو سکتا تھا لیکن کوئی شخص مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا، اگر اس وقت آپ مکان کی بناوٹ کو پھر اپنے تصور میں لائیں تو یہ امر واضح ہو جائے گا۔ آپ کے پاس زیادہ تر کالجوں کے لڑکے آیا کرتے تھے، غل مچاتے، گاتے، اور آپس میں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے زینہ پر چڑھا کرتے تھے آپ ان لڑکوں سے گھنٹوں باتیں کیا کرتے تھے ان کے ساتھ کھانا کھاتے، ڈراموں کے مناظر اور مکالمے لکھواتے تھے غرض ہر وقت ایک پر لطف، ادبی و تعلیمی گروہ پیش میں رہتے تھے، اکثر اوقات آپ کے پاس نوجوان لڑکیاں بھی آتی تھیں، جو آپ کے ناولوں کی شہرت سنکر آتی تھیں آپکے پاس تعریف کرنے اور آپ سے میل ملاپ بڑھانے آیا کرتی تھیں، مجھے اس وقت معلوم نہ تھا، کہ لڑکیوں کا اور جوان عورتوں کا آپ کے تصنیفی مشاغل سے کیا تعلق ہے، لیکن اب اس کا مطلب سمجھ گئی ہوں، اس وقت مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوتی تھی کہ آپ کے مداحوں میں جوان لڑکیاں اور جوان عورتیں بھی شامل ہیں اور آپ کو عورت سے ملنے جلنے میں کوئی عذر اور تکلف نہیں ہوتا۔ اس حقیقت سے مجھے ایک اندرونی خوشی بھی ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی دن میں بھی آپ کے حرم ادب میں باریاب ہوں گی۔ اور آپ کے ناولوں اور افسانوں کے متعلق میں بھی کسی دن ایک اچھی رائے آپ کے سامنے پیش کر سکوں گی۔

اس وقت میری عمر صرف تیرہ برس کی تھی، جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکی ہوں، اس لئے میں اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس اندرونی جستجو اور لگاؤ کا سبب دریافت کر سکتی جو مجھ میں آپ کے لئے پیدا ہو گیا تھا ——— مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ جستجوئے خموش دراصل "الفت" تھی!

باب ۵

پہلی ملاقات

میں نے آپ کو معصومانہ الفت کی نظروں سے تو پہلے ہی دن سے دیکھنا شروع کر دیا تھا، یعنی آپ کے قدموں میں دل اس دن نثار کیا جس دن آپ کسی جگہ سے اپنے گھر کو واپس آ رہے تھے، اور میں بالاخانہ کے نیچے پیڑھی پر کھڑی تھی ——— یاد ہے وہ دن!

میں سکول کے ایک ہمراہی کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی کہ یکایک ایک موٹر آکر رکی اور آپ اندر سے نکلے۔ تیزی اور چستی کے ساتھ آپ کی یہ چال مجھے اس وقت بہت پسند آئی، اب بھی پسند ہے۔ میرے دل میں فوراً یہ خیال آیا کہ زینہ کا دروازہ آپ کے لیے کھول دوں اور کسی طرح آپ کی راہ میں آکر جسم سے متصادم ہو جاؤں، شاید اسی طرح ایک دلچسپ تعارف ہو جائے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، جھپٹ کے آگے آئی اور زینہ کا دروازہ کھول دیا، اسی اثنا میں آپ بھی آگئے، اور میں آپ سے بھڑ گئی، اور آپ نے "شکریہ" کا لفظ کہکر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ مگر جاتے جاتے میری طرف مد بھری نظروں سے دیکھا، ان نظروں میں کیا جادو تھا، کیا قیامت تھی، کیا بجلی تھی کہ میرا سارا وجود آپ کے لئے وقف ہو گیا۔ آپ کی یہ نظریں میرے لئے ایک پرحیات آغوش کا کام دے گئیں، اور میں بھی خجل ہو کر بلکہ گھبرا کر پیچھے ہٹی، میرا گھبرانا قدرتی تھا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح آپ سے دوچار ہوئی، میرے سکول کے ہمراہی نے مجھے کسی قدر گھبرایا ہوا دیکھکر کہا "آپ انہیں دیکھکر

کبھی مجھ سے پوچھتیں، یہ کون صاحب ہیں؟ کیا آپ ان سے متاثر ہیں؟! میں نے کبھی شرم کے مارے ان بیہودہ سوالات کا جواب دیا، اور کہا آپ میرے معاملہ میں دخل نہ دیں، یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں واپس آ گئی، اور گھنٹوں آپ کے تصور میں گزار دیئے —————— ! یہ تھی محبت کے پہلے تیر کی تراوش!

باب ۶

میرے ذاتی حالات

میں اس روز سے آپ سے محبت کرتی ہوں، آپ نے "محبت" اور "چاہ" کا لفظ اس سے پہلے بیسیوں عورتوں کی زبان سے سنا ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ انہیں واقعی طور پر آپ سے الفت بھی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جیسی محبت مجھے ہوئی تھی اور جو اس وقت تک قائم ہے نہ کبھی پہلے ہوئی نہ ہوگی نہ آپ سے آج تک کسی نے ایسی محبت کی ہے میں نے جس ایثار والہانہ عقیدت صبر و رضا اور غلامانہ الفت کے ساتھ آپ کو چاہا ہے، اس کی شدت اور عروجی کیفیات سے آپ واقف نہیں کیونکہ آپ نے کبھی کسی عورت سے حقیقی معنوں میں عشق نہیں کیا، ایک لڑکی ایک مشہور مصنف کے لئے اپنے دل میں جس خاموش الفت کی پرورش کرتی ہے اور اس پر جس سرگرمی و سرجوشی سے قائم رہتی ہے اس کی مثال بہت کم جگہ ملے گی، میں ایک انجان لڑکی تھی، اکیلی، اور بے یار و مددگار تھی، میرا کوئی دوست یا میری کوئی سہیلی ایسی نہ تھی جس سے اپنا حال کہہ سکتی، مشورہ کر سکتی، یا محبت کے باب میں ان سے اچھی بری رائے لے سکتی میری دنیا بس مجھ تک محدود تھی، دوسری عورتیں آپ سے محبت کی دعویدار تھیں لیکن در اصل وہ آپ سے حقیقی محبت نہیں کرتی تھیں، میں بے لاگ اور بے غرض محبت کرتی تھی، کسی کو اس کا علم نہ تھا، خود آپ کو علم نہ تھا —————— میں خود بھی نہیں جانتی تھی، کہ آپ کی طرف بڑھنے کا یہ جذبہ یہ شوق، تجسس دیدار طلبی سے بڑھ کر اب محبت کی حد تک کیوں پہنچ رہا ہے

میں نے یہ خیال کر کے کہ آپ ایک مصنف ہیں اور کتب بینی کے دلدادہ اچھی کتابیں اور زیادہ شوق سے پڑھنی شروع کر دیں، باہر کی کتابیں بہت سی پڑھیں، غرض ہر وقت پڑھنے لکھنے میں لگی رہتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں مدرسہ میں بہت ذہین مشہور ہو گئی، اور یکایک میری لیاقت کا چرچا شروع ہو گیا، میں دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی کہ یہ سب آپ کے لئے ہو رہا ہے اور آپ کی وجہ سے ہوا ہے، میں اپنی جماعت میں اول آئی، اور والدہ نے مجھے پیار کیا، استانیوں نے تعریف کی —————— لیکن آپ کو معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کی ایک بے حقیقت پرستار کس منزل میں جا رہی ہے، اب میں ہر وقت آپ کا ہی خیال کرتی تھی، دن بھر اپنی زندگی کے آئندہ مناظر کی خیالی تصویریں بناتی رہتی تھی، ان میں بے حقیقت خوابوں کے پردے طلسمی تصورات کی رنگ کاریاں، اور نیا سی خوبصورتی اگر کاغذ پر منتقش ہو سکتیں تو میں ضرور آپ کو دکھاتی —————— میں نے اس دور الفت میں کیا کیا طفلانہ حرکتیں نہیں کیں! آتے جاتے آپ کے دروازہ کے ہینڈل کو چومتی تھی یہ سمجھ کر کہ آپ اسے چھوتے ہیں کبھی کبھی اس دروازہ پر آنکھیں ملتی تھی، اگر زمین پر سگرٹ کا کوئی ٹکڑا پڑا ہوا مل جاتا تھا تو اسے اٹھا کر لے آتی اور چھپا کر رکھ لیتی تنہائی میں گھنٹوں اسے دیکھا کرتی تھی، اور پیار کرتی تھی، غرض اس قسم کی سینکڑوں باتیں ہیں جنہیں میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔

میرے والد کو عرصہ ہوا انتقال ہو چکا تھا، والدہ کو ایک چھوٹی سی پنشن ہمارے والد کے زمانہ کی ملتی تھی جس پر ہمارا گذر تھا، اتفاق سے ہمارے ایک رشتہ دار انسبرک میں رہتے تھے جو ایک مالدار آدمی تھے کبھی کبھی اس شہر میں بھی آتے تھے ایک دن وہ آئے اور ہمارے ہاں ٹھہرے کئی دن تک رہے مجھے ان کے آنے کی کوئی خوشی نہ ہوئی نہ ان کے جانے کا رنج ہوا، کیونکہ میں آپ کے خیال میں ہر وقت لگی رہتی تھی، اور اسی حال میں مگن تھی خواہ کوئی آئے خواہ کوئی جائے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔

ایک دن میری والدہ نے مجھے بلایا اور کہا "بیٹی! میں آج تم سے ایک خاص بات کہنا چاہتی ہوں"۔ میں جملہ سن کر کسی قدر پریشان اور خوفزدہ ہوئی کہ شاید اماں کو میری حالت کا علم ہو گیا ہے، وہ میری محبت سے واقف ہو گئی ہیں اور مجھے سخت سست کہیں گی، میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب گئی انہوں نے بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا "بیٹی تمہیں معلوم ہے ہم بہت غریب آدمی ہیں، اس پنشن پر گذارا نہیں ہو سکتا، اور مجھے تمہاری شادی کی بھی فکر ہے، اگرچہ ہماری مالی حالت اچھی نہ ہو کچھ بھی نہیں ہو سکتا، ہمارے ہاں انسبرک سے جو صاحب آ کر رہے تھے وہ ہمارے عزیز ہیں اور تمہارے والد کے دوست ہیں اور مالدار آدمی ہیں، انہوں نے

کہا ہے کہ وہ اپنے بنگلہ میں ایک چھوٹا سا حصہ ہم لوگوں کے لئے آسانی سے دے سکتے ہیں، اور وہاں پر تمہاری تعلیم وغیرہ کا بھی نہایت اعلیٰ انتظام ہو جائے گا، ابھی میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مہینے کے آخر میں یہ شہر چھوڑ دوں۔ اور انشاءاللہ چلی چلو وہاں ہم ایک رشتہ دار کے یہاں رہیں گے اور بہتر زندگی کا آغاز ہوگا۔

میں یہ سنکر سناٹے میں آ گئی! کیا واقعی مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا وہ پیارا شہر جس میں ہر وقت آپ کے دیدار ہوتے تھے . . . جہاں ایک ایک لمحہ میں آپ کے انتظار کی لذت میں کا متی تھی، وہ شہر جس کی سڑکوں پر آپ چلتے پھرتے تھے اور جو میرے لئے دنیا کی مقدس ترین سرزمین تھی۔ کیا مجھے ایسا شہر چھوڑنا پڑے گا ———— یہ تھے وہ خیالات جو اس وقت میرے ذہن میں پے در پے آئے اور میرا سر چکر لانے لگا مگر میں فوراً سنبھل گئی، کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھکر چلی گئی، میری متالم نظروں سے میری والدہ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مجھے اس شہر چھوڑنے کا بے حد رنج ہے ———— لیکن آہ! انہیں کیا معلوم تھا کہ ان کے فیصلہ سے میرے دل پر کیا بیتی میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہ تھے، میں اپنے چھوٹے برآمدے میں آکر بیٹھ گئی، اور دونوں ہاتھوں سے چکرانے والے سر کو پکڑ لیا، یہ خیال کہ میں اپنی والدہ کو اسی شہر میں رہنے پر مجبور کروں بالکل فضول تھا۔ کیونکہ میری والدہ کے فیصلے بہت کم بدلتے تھے اور میں تو ان کے فیصلوں میں کبھی ترمیم کرا ہی نہیں سکتی تھی، علاوہ ازیں اس شہر میں غربت کی زندگی بسر کرنے پر اصرار کرنے کے لئے میرے پاس کوئی معقول دلیل نہ تھی جو انھیں قائل کر سکتی، بہر حال میں ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، ہاں رات بھر اپنے دل سے باتیں کرتی رہی اور بہت دیر تک باتیں کرتی رہی اور روئی ———— مگر آپ کو کیا معلوم ہے ————!!

ناکام انتظار

یہ آخری دن تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ آج آپ سے ضرور ملاقات کروں گی خواہ کچھ بھی ہو جائے آج میری والدہ ایک تماشہ میں گئی ہوئی تھیں۔ مکان پر کوئی نہ تھا اس لئے آپ تک پہنچنا میرے لئے آسان ہو گیا تھا۔ میں آپ کے دروازہ تک پہنچی جسم پر لرزہ طاری ہو گیا، شوق دید اور خوف رسوائی سے کسی قدر مضطرب تھی میں نے دروازہ پر پہنچ کر چپکے چپکے انگلیوں سے گھنٹی بجائی جس کے بجنے کی آواز میرے کانوں میں [illegible] آپ اس وقت آجاتے تو میں یہ کہتی کہ مجھے اپنی کنیز بنا کر رکھ لیجئے ایک خادمہ کی حیثیت سے اپنے گھر کی چار دیواری میں مجھے پناہ دیجئے مگر مجھے اس شہر سے ہرگز ہرگز نہ جانے دیجئے ایک نوجوان لڑکی کے منھ سے یہ الفاظ سنکر آپ بہت حیران ہوتے بلکہ ہنستے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا دلی مدعا یہی تھا کہ تمام عمر آپ کے قدموں میں ایک کنیز کی طرح بسر کروں، مگر افسوس کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی، گھنٹی بجتی رہی، آپ باہر تھے نوکر بھی گھر پر موجود نہ تھا، میں آزردہ ہو کر واپس آ گئی اور اپنے پلنگ پر لیٹ گئی چادر اوپر سے ڈال کر پھوٹ پھوٹ کر روئی، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس وقت میرے دل میں سوائے آپ کے دیکھنے اور آپ کی صورت کو تکنے کے اور کوئی جذبہ کام نہیں کر رہا تھا، اس وقت تک جنسی رغبت ایک ذرہ حقیر کی طرح میرے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی، ایک عرصہ بعد تک مجھے اس کا احساس نہ ہوا، میں تو صرف آپ کی شکل اور آپ سے بات کرنے کی مشتاق و طلبگار تھی۔

تمام ہولناک رات یونہی گذر گئی، اور میں آپ کے انتظار میں لیٹی رہی ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھتی تھی، اتنی دیر میں میری والدہ آگئیں اور آتے ہی سو گئیں، میں نے یہ موقع غنیمت جانا اور کمرہ سے باہر نکلی اور آپ کے کمرہ کی طرف آئی سخت سردی تھی، جنوری کا پہلا ہفتہ تھا کیسے غضب کی خنکی تھی جسم اور روح دونوں منجمد ہو جانا چاہتے تھے، میں آئی گھنٹی پھر بجائی مگر آپ کے ہاں سے پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا، سوچا اب صبح ہونے میں صرف ڈھائی گھنٹہ ہیں آپ کے آنے تک اس ہی جگہ انتظار کروں جہاں آپ کے دروازہ تک راستہ جاتا تھا، وہاں ایک ٹاٹ بچھا ہوا تھا میں اس سردی میں وہیں لیٹ گئی!! زینہ میں لیٹنے کا خیال اس وجہ سے بھی آیا کہ جس وقت آپ اندھیرے میں آئیں گے تو ٹھوکر سے مجھے ضرور مس کریں گے اور اس وقت میں اٹھکر آپ کے قدم چوم لوں گی، میں سردی میں کانپ رہی تھی، لیکن آپ کو دیکھنے اور آپ کے پیر چھونے کے شوق میں سب تکلیفیں سہنے کے لئے تیار تھی ———— میں نے دو گھنٹہ تک بلا خیز سردی میں آپ کے آنے تک انتظار کیا ایک موت سے زیادہ شدید تکلیف برداشت کی۔

———— آخرکار آپ آئے، صبح صادق کا وقت تھا میں نے نیچے کا

یہ اور جمکنا کی آواز سنی آپ اوپر آ رہے تھے سیڑھیوں پر آپ کے پیروں کی نازک چھاپ تھی میں نے چاہا کہ آپ کے قدم چوم لوں لیکن ہمت نہیں ہوئی اتنے میں ایک عورت بھٹ گئی آپ آگے بڑھے اور میں نے دل پہ ہاتھ رکھا یکایک مجھے ناگہاں میرے پوڈر کی خوشبو اور ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز آئی میں نے غور سے دیکھا کہ آپ کے ہمراہ کوئی عورت بھی ہے ———— وہ عورت آپ کے ہمراہ اندر چلی گئی، اور باقی رات اور دن کا بیشتر حصہ آپ کے ساتھ گزرا۔ لیکن میں نے یہ دیکھ کر کہ آپ کسی اور عورت کو بھی التفات کی نظروں سے دیکھتے ہیں اپنے دل میں ایک ایسا انتقامی جذبہ محسوس کیا کہ جس کی حرارت سے میں رات بھر جلتی رہی، اور صبح نو بجے میں نے اپنے بستر پر سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ تکیہ گرم آنسوؤں سے تر ہے۔

اسی روز ہم لوگ انسبرک روانہ ہو گئے، مجھ میں اب طاقت نہیں تھی کہ جانے کی مخالفت کر سکتی۔

باب ۸

دو سال کا فراق

میرے لڑکے کا کل شب انتقال ہو ا ہے تھوڑی دیر میں لوگ آئیں گے ایک تابوت لائیں گے اور اسے بند کر کے لے جائیں گے، قبر میں رکھ دیں گے، قبر پہ پھول چڑھائیں گے، اگر میں زندہ ہوئی تو مجھے دلاسا دیں گے طرح طرح کے لفظوں سے میری ڈھارس بندھائیں گے لیکن الفاظ کیا کر سکتے ہیں۔ الفاظ! الفاظ!! الفاظ!!! ———— ہاں صرف الفاظ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔

سب تسلی اور دلاسا دے کر چلے جائیں گے لیکن اگر میری بے غیرت زندگی قائم رہی ———— اور خدا کرے وہ نہ رہے ———— تو میں اکیلی اور تن تنہا ہوں گی انسانوں میں رہ کر تنہائی محسوس کرنا، مجمع میں رہ کر اکیلا رہنا ایک ایسی تکلیف ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا، صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال میں جب انسبرک پہنچی سولہ سال کی عمر تھی اور اٹھارہ سال کی عمر تک یعنی دو سال وہاں رہی میرے رشتہ دار واقعی ایک نیک دل آدمی تھے وہ بچاری ہر طرح مدد کرتے تھے لیکن میرا دل کسی تفریح اور کسی خیال اور کسی آرام کی طرف نہیں جاتا تھا، میں اسی دو سال کے عرصہ میں کبھی تھیٹر نہیں گئی کسی سیر میں شریک نہیں ہوئی، ناچ گانے کی کسی محفل میں جانے کی ہمت نہیں ہوئی، ہم عمر لڑکیوں سے ملنا ایک ناممکن بات تھی، میں ہر وقت مغموم اور افسردہ خاطر رہتی تھی، ہر شخص میری اس حالت سے آگاہ ہو گیا تھا اور ابتدائی ہدایات اور تسلی بخش جملے اب سرد مہری بے پروائی اور خاموش بے تعلقی میں تبدیل ہو گئے تھے اور میں خوش تھی کہ لوگوں نے مجھے اپنے حال پر چھوڑ دیا میں دن بھر آپ کے خیال میں غمگین اور آبدیدہ رہنا پسند کرتی تھی اور دنیا کے سارے شیریں قہقہے اور فرحتیں اس آلامِ حیات پر قربان تھیں گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ اور اس دو سال کے عرصہ میں شاید پانچ چھ گلیوں سے زیادہ نہیں دیکھیں۔

جوان لڑکے میری طرف محبت کرنے کی منشا سے دیکھتے تھے لیکن سوائے مجھے ناراض کرنے اور کوئی اثر میری طبیعت پر نہیں چھوڑتے تھے، میں ان کو بعض اوقات جھڑک بھی دیتی تھی واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے سوا اور کسی کو محبت کی نظر سے دیکھنا ایک ناقابلِ معافی جرم سمجھتی تھی، روزانہ آپ کے تصور میں وہ تمام واقعات دہراتی تھی جو اس اثنا میں آپ کے متعلق میرے ذہن میں محفوظ ہو گئے تھے، آپ کے متعلق جب کسی اخبار یا رسالہ میں کوئی بیان یا مضمون پڑھتی تھی تو دل ہی دل میں باغ باغ ہو جاتی تھی آپ کے تمام ناول کئی کئی دفعہ پڑھے تھے اور اس طرح پڑھے تھے کہ ازبر ہو گئے تھے، سوتے ہوئے اگر کوئی مجھ سے کسی ناول کا پلاٹ پوچھتا یا کوئی فقرہ آدھا کہہ کر رک جاتا تو میں اس وقت بھی پورا پیراگراف سنا سکتی تھی اس وقت بھی جبکہ اس بات کو تیرہ سال گذر گئے ہیں صفحہ کے صفحہ سنا سکتی ہوں، یہ دلی تعلق کا نتیجہ تھا مگر آپ کو کیا معلوم کہ میں آپ سے محبت کرنے میں کس درجہ تک پہنچ چکی تھی۔

اب میری عمر اٹھارہ سال کی ہو چکی تھی اور ایک جوان عورت کے دل میں جوان مرد کے متعلق جو رغبت ہوتی ہے وہ میرے دل میں پیدا ہو رہی تھی اور اس لئے میں نے اب آپ کو ایک نئے زاویہ اور جذبۂ خیال سے دیکھنا شروع کیا اور ایسا بلا خیز طوفان جذبات میرے سینہ میں امنڈنا شروع ہوا کہ جو بچپن کی معصوم شوق و جستجو کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتا تھا ———— میں اپنا سارا جسم آپ کے حوالہ کر دینا چاہتی تھی اس وقت صرف روح تڑپتی تھی اب جسم بھی جراحت محسوس کرتا تھا۔

میری اب صرف ایک تمنا تھی کہ کسی طرح انسبرک چھوڑ دوں، اور سیدھی ویانا پہنچ جاؤں جتا مجھ ایک دا ، ا ، م ا ، و انتظامات کر سکنے روانہ ہو گئی اور

دیا۔ اپنا سامان ریلوے کے مسافر خانہ میں رکھا اور ٹرام میں بیٹھ کر سیدھی آپ کے مکان کی طرف روانہ ہوئی دور سے آپ کے مکان کی کھڑکی میں سے روشنی نظر آئی، یکایک مجھے محسوس ہوا کہ تمام شہر جو اس سے پہلے میرے لئے مُردہ تھا بیدار اور ذی حیات ہو گیا ہے اور تمام دنیا میرے گرد خوشی سے رقص کر رہی ہے میں نے کھڑکی کی روشنی کو اس طرح دیکھا جس طرح ڈوبتا ہوا جہاز روشنی کے مینارے کو دیکھتا ہے میرے اور آپ کے درمیان شیشہ کی ایک دیوار حائل تھی میں سردرات میں کئی گھنٹے سڑک پر کھڑی رہی اور ٹکٹکی باندھ کر آپ کے مکان کو دیکھتی رہی جب آپ کے ہاں روشنی گل ہوئی تو میں بھی روانہ ہوئی اور اسٹیشن واپس چلی گئی۔

باب ۹

دریچۂ دوست

ویانا میں آ کر میں ایک دکان میں ملازم ہو گئی، رات کو ۹ بجے دکان بند ہو جاتی تھی اور میں آپ کے مکان کی طرف جاتی تھی پٹڑی پر کھڑی ہوئی گھنٹوں آپ کی کھڑکی کو دیکھا کرتی تھی، کبھی کبھی آپ مکان سے نکلتے ہوئے یا داخل ہوتے ہوئے نظر آتے تھے تو آپ کے دیدار بھی نصیب ہو جاتے تھے آپ سے ملنے کی از حد آرزو مند تھی ایک دن میں آپ کے مکان کی کھڑکی کے سامنے کھڑی تھی کہ آپ دور سے آتے دکھائی دیئے میرا ارادہ ہوا کہ بڑھ کر ملاقات کروں لیکن ہمت نہ ہوئی میں ایک تیرہ سال کی لڑکی پھر بن گئی اور گھبرا کر ایک طرف چلی گئی اور اس طرح فرار ہوئی گویا کوئی شخص میرے پیچھے پکڑنے کے لئے آ رہا ہے، میرا معمول ہو گیا تھا کہ روزانہ آپ کو آ کر دیکھوں، جس دن آپ نظر نہیں پڑتے تھے میری تکلیف بڑھ جاتی تھی ایک روز آپ ایک عورت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے نکلے، میں ایک عورت کو آپ کے ساتھ اس قدر قریب ملتفت دیکھ کر سخت پریشان ہوئی، جسم میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی، اور دل میں رقابت کی جلن پیدا ہو گئی، روح کی ہلاکت کو برداشت کر سکتی تھی لیکن جسم کی سوزش دردوں کو برداشت کرنا اندرونی بیکلی کو سنبھالنا میرے بس کا کام نہ رہا میں نے تہیہ کر لیا کہ آپ کو دیکھنے کے لئے پھر کبھی نہ آؤں گی اور آپ جیسے بے وفا کو دیکھنے کی کبھی پروا نہیں کروں گی، دوسرے روز میں نہیں گئی تیسرے روز میں مجبور ہو گئی بیقرار ہو گئی اور پھر اسی جگہ پہنچی جہاں سے سخت سردی اور ویانا کی برف باری بھی مجھے نہیں ہٹا سکتی تھی۔

دوسرے روز میں کھڑی ہوئی تھی کہ آپ حسب معمول گذرے اور میری طرف دیکھا، آپ کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ میں تھر تھر کانپنے لگی، آپ کی آنکھوں میں ایک عجیب خواب تھا میں آپ کو دیکھ کر گھبرا گئی، آپ مسکرائے اور میرے قریب سے ہو کر چلے گئے، دوسرے دن پھر یہی اتفاق ہوا لیکن آپ نے مجھے پہچانا نہیں، آپ مجھے قطعی بھول گئے تھے، آپ نے مجھے اچھی طرح دیکھا کب تھا جو... میری شکل آپ کو یاد رہتی، تیسرے روز آپ نے مجھے مخاطب کیا، اور میں نے آپ کو جواب دیا ڈرتے ڈرتے، دلی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں اور آج جب شرف ہمکلامی ہوا تو میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا، آپ نے کہا، کہ میرے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں چلئے ہم دونوں ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے، آپ کو تو ریسٹورنٹ یاد نہ ہوگا مجھے خوب یاد ہے، وہاں ہم نے کھانا کھایا، جب بہت رات ہو گئی تو آپ نے کہا کہ کیا آپ کو گھر جانے کی جلدی ہے، کیا تھوڑا سا وقت گفتگو کے لئے دے سکتی ہیں؟ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میرا سارا وجود ہمیشہ کے لئے وقف ہونے کو تیار ہے۔

میں نے فوراً چلنے پر اظہار رضامندی کر دیا، جس سے آپ کسی قدر متعجب ہوئے کیونکہ تجربہ نے آپ کو بتا دیا تھا کہ گھر چلنے کے لئے اگر کسی عورت کو آمادہ کیا جائے تو اس کے لئے مختلف حیلے ہوتے ہیں، جھوٹ بولنا، التجائیں کرنا، بہانے بازی وعدے، سبز باغ، سرد آہیں وغیرہ وغیرہ بازاری سے بازاری اور بدترین عورت بھی ہو گی تو وہ ایک دفعہ انکار ضرور کر دے گی، آپ نے میرے فوری اقرار سے سمجھ لیا کہ میں کوئی آبرو باختہ عورت نہیں بلکہ الھڑ لڑکی ہوں جسے دنیا کے کسی نشیب و فراز سے واقفیت نہیں، آپ نے کہا میرے کمرہ پر چلئے وہاں کچھ دیر باتیں کریں گے۔

میں نے فوری رضامندی ظاہر کی، اور آپ مجھے اپنے کمرہ پر لے گئے، میں انکار کیونکر کر سکتی تھی، عرصہ کی دبی ہوئی تمنائیں برسوں کی آرزوئیں اور دلی چاہتوں کے بر آنے کا وقت آیا، خوف، خوشی، اور خود اعتمادی کے جذبات پے در پے میرے سینہ میں پیدا ہو رہے تھے!!

باب ۱۰

تین راتیں

میں اپنی محبت کا راز سینہ میں چھپانے کے لئے مصر تھی، میں ہرگز نہ چاہتی تھی کہ آپ مجھے پہچانیں یا میرے دلی جذبات سے واقف ہوں، نہ معلوم کیوں

وجود میرے شکم میں پیدا ہوا، اور نہ معلوم کیوں اسے آخر وقت تک پرورش کرنے پر آمادہ ہو گئی، جس وقت اپنے پرانے زینہ پر قدم رکھا تمام پچھلے واقعات مجھے یاد آگئے جس وقت آپ کے کمرہ میں قدم رکھا میرا جسم خوشی اور حیرت کے جذبات سے اس طرح مجروح ہوا کہ میں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی، خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میری اس حالت کو غور سے نہیں دیکھا ورنہ الفت آشکارا ہو جاتی۔

میں نے وہ رات آپ کے ساتھ گذاری، اب آپ کو کس طرح بتاؤں کہ اس رات سے پہلے کسی مرد نے نہیں چھوا تھا، میرے جسم کو کسی غیر نے نہیں چھوا تھا آپ نے میرے ساتھ جو کچھ سلوک کیا اس کے لئے میں آپ کو دوش نہیں دیتی کیونکہ میں نے خود اپنے آپ کو سپرد کیا تھا، بغیر کسی ترغیب کے میں آپ کے ہاتھ میں آگئی تھی، دوسرے روز صبح جب میں چلنے لگی تو آپ نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر میری آنکھوں کی طرف دیکھنا شروع کیا، شاید آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے، مگر آپ نے مجھے کبھی اچھی طرح نہیں دیکھا تھا، علاوہ ازیں عمر اور جوانی اور لباس کی تبدیلی عورت کو کچھ سے کچھ بنا دیتی ہے اس لئے شناخت آسان نہ تھی، میں چپ چاپ کھڑی رہی، اس کے بعد آپ نے ایک بلوریں گلدان کی طرف اشارہ کر کے کہا "کیا آپ ان پھولوں کو اپنے ہمراہ لیجائیں گی"، اس گلدان میں چار سفید گلاب رکھے ہوئے تھے جنکی بھینی بھینی خوشبو مجھے مست کر رہی تھی، اور رات کا زریں خواب مجھے اور بھی گدگدا رہا تھا، میں نے شکریہ کے ساتھ وہ گلاب لے لئے، دوسری رات ملنے کے لئے پھر مقرر ہوا، میں پھر آپ کے ساتھ رہی، تیسری رات کو بھی رہی اس رات آپ نے مجھ سے کہا کہ آپ کسی غرض سے ویانا سے باہر جا رہے ہیں۔ میں آپ کے سفروں کو ہمیشہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی، اس رات سفر کا نام سنکر مجھے سخت اذیت ہوئی، بہرحال آپ نے وعدہ کیا کہ میں خط بھیجا کرونگا مجھے اپنا پتہ دیدیجئے، میں نے ایک فرضی نام اور ڈاکخانہ کی معرفت پتہ دیدیا۔ اور آپ نے تیسری رات کے بعد مجھے ایک عرصہ کے لئے بھلا دیا، دوبارہ جب ملاقات ہوئی تو آپ نے مجھے نہیں پہچانا !!!

باب ۱۱
طفلِ محبت

کل میرے لڑکے کا انتقال ہوا ہے، یہ ہمارا بچہ تھا، یعنی آپ کی اولاد تھی!

"طفلِ محبت" ——————!

میں نے آپ کو کبھی اس کی اطلاع نہیں دی کہ آپ کا ایک لڑکا پیدا ہوا ہے مجھے یقین ہے کہ آپ مجھپر اعتماد نہ کرتے اور شاید یہ بھی سمجھتے کہ مجھے مالدار آدمی سمجھکر یہ ایک دوسرے شخص کی اولاد میرے ذمہ ڈال رہی ہے، میں محبت کی یہ توہین کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی، اگر آپ کو مجھپر اعتماد بھی ہوتا تو آپ سے میں روپے دینے اور اس بچہ کی پرورش کے لئے کچھ مالی مدد حاصل کرنے کے لئے آمادہ نہ تھی کیونکہ میں آپ کو اولاد کے جھگڑے میں پھنسانا نہیں چاہتی تھی، نہ دوبارہ آپ کے سامنے جانا چاہتی تھی نہ کسی طرح اپنی الفت کے اس المناک مگر شیریں انجام سے آپ کو آگاہ کرنا چاہتی تھی، اس لئے میں نے آپ کو کبھی اس لڑکے کی بابت نہیں لکھا، اکثر ہم کو مالی مشکلات پیش آئیں، لیکن میں نے آپ کے آگے دست سوال دراز کرنا، اور اس بچہ کے نام پر بھیک مانگنا گوارا نہ کیا، اگر میں چاہتی تو اپنا جسم اوروں کے ہاتھ فروخت کر کے بہت خوشحال زندگی بسر کر سکتی تھی، لیکن جس جسم کو آپ نے چھوا تھا اسے کسی دوسرے کے سپرد کرنا میں انتہائی ذلت اور دنیا کا سب سے بڑا گناہ سمجھتی تھی، اس لئے میں نے تمام عمر تنگی اور مالی مصائب میں گذاری، اس جگہ میں اس کی شکایت نہیں کر رہی بلکہ صرف ایک واقعہ بتا رہی ہوں تاکہ راز کا کوئی اہم پہلو آپ کے ملاحظہ سے نہ رہ جائے۔

آپ نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، آپ مجھے بھول گئے، میں نے آپ کو دل سے نہیں بھلایا، لڑکا آپ کا ہمشکل تھا ہو بہو آپ کی تصویر تھی، وہی آنکھوں کی چمک وہی لبوں کا قوس زریں وہی مسکراہٹ، اور جب وہ بڑا ہوا تو بہت ہی خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔

میں ویانا کے تھیٹروں میں، سیناؤں میں، باغوں میں، بازاروں میں بارہا آپ کے قریب سے گذرتی تھی، لیکن افسوس کہ آپ مجھے نہیں پہچان سکتے تھے کیسی بھول تھی !!!

ایک روز ایک جگہ ناچ تھا، آپ نے مجھے دیکھا لیکن اس طرح گویا میں ایک اجنبی ہوں، بیشک میں ایک اجنبی تھی، آپ کو دیکھکر میرے جسم میں لرزہ پیدا ہو گیا میں قریب آگئی، آپ نے کہا "کیا آپ میرے ساتھ کھانا کھا سکتی ہیں"، میں نے کسی قدر جھک کر "ہاں" کہدیا، میں نے دیکھا کہ آپ کی نظروں میں پھر وہی اجنبیت تھی، مگر آہ کس قدر کشش تھی، میں نے آپ کے ساتھ کھانا کھایا، آپ مجھے باتوں باتوں میں اپنے گھر لے گئے، ایک ندین شب پھر آپ کے ساتھ گذری

مگر افسوس کہ آپنے اب بھی مجھے نہ پہچانا آپ نہیں پہچان سکتے تھے کیونکہ آپ جوان لڑکیوں کو اپنی نگاہوں کی ساحری سے ورغلا کر مکان پر لانے کے اس طرح عادی ہوچکے تھے کہ اب یہ روز کا معمول ہو گیا تھا، اور کسی خاص لڑکی کی شکل یاد رکھنا آپ کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ اتفاق کی بات جس دن ہم نے آپ کے ساتھ دوبارہ زندگی بسر کی، وہ آپ کا جنم دن تھا اور دوسرے روز صبح میں نے دیکھا کہ بلورین گلدان میں سفید گلاب کے چار پھول رکھے ہوئے ہیں، میں انہیں دیکھکر خاموش ہو گئی کیونکہ یہ وہی پھول تھے جو میں نے ایک روز پہلے آپ کو بھیجے تھے میرا معمول ہو گیا تھا کہ ہر سال آپ کی سالگرہ کے روز چار سفید گلاب آپ کو روانہ کرتی تھی، یہ ایک نامعلوم عورت کا جو آپ کے قلم کی مداح اور تحریری خوبیوں کی دلدادہ تھی، ایک تحفہ ہوتا تھا، لیکن دراصل یہ یادگار تھی میری پہلی رات کی! جس کی صبح کو آپ نے مجھے اپنے پیارے ہاتھوں سے چار سفید گلاب دیئے تھے، میں اس ہدیئہ دل کو ہمیشہ ایک خزانہ سمجھتی تھی اور سال کے سال یہ یادگار الفت آپ کو بھیجتی تھی۔

آج جب مجھے پھر پھول پیش کئے گئے، اسی اہتمام و مسرت کے ساتھ جس طرح آپنے مجھے پہلی رات کے بعد دیئے تھے! میں نے اپنے ہی بھیجے ہوئے پھول دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لئے، میں نے پوچھا "یہ پھول کس نے بھیجے تھے؟" آپ نے بے پروائی سے جواب دیا "ہر سال آتے ہیں، ایک نامعلوم عورت بھیجتی ہے، آپ انہیں لیجائیے میرا تحفہ ہے شاید ان کے ذریعہ سے آپ مجھے یاد رکھیں!"

اس جملہ سے میرے تن بدن میں ایک مسرت کی لہر دوڑ گئی، اور پوچھا کیا آپ اس عورت کو نہیں جانتے جو ہر سال یہ پھول بھیجکر آپ کی سالگرہ کی رونق بڑھاتی ہے"

میں نہیں جانتا وہ عزیزہ خاتون کون ہیں" آپ نے جواب دیا میں نے آپ کو یاد دلانے کی منشا سے کہا "شاید آپ اس کو بھول گئے ہوں، کوئی ایسی عورت جسے آپ جانتے ہیں لیکن بھول گئے!"

آپ نے اس جملہ پر مجھے غور سے دیکھا اور میری نظروں نے پکار پکار کر کہا "ہاں! ہاں! مجھے پہچانو میں کون ہوں، میری محبت کی توہین نہ کرو اپنی عزیزہ خاتون کو پہچانو!"

لیکن افسوس کہ آپ کی آنکھوں کی چمک تھوڑی دیر کے بعد غائب ہو گئی اور آپ مجھے پھر بھی نہ پہچان سکے، میں آپ پر کوئی الزام نہیں رکھتی، نہ آپ پر کوئی ذمہ داری عائد کرتی ہوں لیکن آپ کی محبت اور بے وفائی دونوں کی شاکی ہوں۔

میرے لڑکے کا انتقال ہو گیا ہے اور اب میرا کوئی باقی نہیں رہا، مجھے دوبارہ کبھی نہیں دیکھیں گے، آپ نے مجھے نہیں پہچانا، مگر میں آپ کو کوئی الزام نہیں دیتی، میں نے الفت کی لیکن غلط طریقہ سے، میں نے آپ سے محبت کی اطمینان سے لیکن آپ کی یاد ہمیشہ ستائیگی۔ شاید دوسری دنیا میں بھی آپ کو ستائے گی۔

میں بھی مر جاؤں گی آپ نہ میرا اصلی نام معلوم کر سکیں گے نہ شبیہ پہچان سکیں گے ———— !

میرا ہاتھ بیکار ہو گیا ہے اب زیادہ نہیں لکھ سکتی، جسم میں لرزہ بخار چڑھ رہا ہے اور عقل جواب دے چکی ہے، دل پہلے ہی پاش پاش ہو چکا اب کیا لکھوں، مجھے یہ خیال ہے کہ آپ کی اگلی سالگرہ پر کون سفید گلاب بھیجیگا، وہ گلاب جن سے ہر سال آپ کے کمرہ میں معطر حیات پیدا ہوتی تھی، یہ گلاب میری زندگی کی آخری نشانی تھے، میری پہلی اور آخری خواہش ہے کہ پیارے! ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر چند سفید گلاب اس گلدان میں رکھدیا کرنا اور میری روح کو یاد کرنے کے لئے اپنے خواب کے کمرہ میں لیا کرنا، گلابوں کو نہ بھولنا، مجھے بھول جانے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا گلابوں کی وصیت کو یاد رکھنا ورنہ دوسری دنیا میں بھی میری روح گرفتار تغافل رہے گی! میں آخر میں پھر اپنی محبت کا یقین دلاتی ہوں، ان عنایتوں کی شکر گذار ہوں جو آپ نے مجھ پر کیں اس تغافل اور بیخبری اور اجنبیت پر ہمیشہ کے لئے قربان ہوتی ہوں، میری محبت کی قدر، یہ چند اوراق جو بطور اعترافات تحریر کئے گئے ہیں قبول ہوں ———— رخصت پیارے

باب ۱۲

گمنام عورت کا خط

گمنام عورت کا خط افسانہ نویس کے ہاتھ سے گر پڑا، اور وہ کرسی پر اس طرح لیٹا رہا گویا مرمریں مجسمہ لٹا دیا گیا، ہاں، اس کے ذہن میں اب تمام واقعات ایک ایک کر کے آ رہے تھے، ایک پر ڈسن کی لڑکی۔ ایک عورت جس کو اپنے ہمراہ کمرہ میں لے گیا تھا، ایک عورت جسے اس نے ایک رقص گاہ

اپنے ساتھ لیا تھا۔ یہ تمام حالات اس طرح سامنے آ گئے گویا عکس تھے جو آئینہ سے غائب ہو گئے تھے اور کسی طلسمی لمس کے ذریعہ دوبارہ نمودار ہو گئے تھے۔ اس کے سینہ میں جذبات کا طوفان برپا ہوا، خوف، انفعال و محبت کے جذبات اور تعاقب عشق کے خواب ہائے رنگین نظر آنے لگے"

آج سالگرہ تھی، اس نے گھبرا کر بلوریں گلدان کو دیکھا، وہ خالی تھا۔ گلدان کئی سال سے برابر بھرا رہتا تھا، سالگرہ کے روز نظر آنے والے سفید گلاب کا گلدان میں ہونا ایسا ہی یقینی تھا جیسے خود سالگرہ کے دن کا ہر سال آنا، لیکن آج یہ گلدان خالی تھا یعنی دنیا سے وہ ہستی اٹھ گئی تھی جو ہر سال پھول بھیجا کرتی تھی، معلوم ہوا کہ آج وہ پڑوس کی لڑکی جس نے ساری زندگی مصنف کے لئے وقف کر دی تھی ہمیشہ کے لئے دوسری دنیا میں پہنچ گئی۔

مصنف نے ایک سرد آہ بھری، اس کے سینہ میں کوئی چیز اٹکتی ہوئی معلوم ہوئی، آواز بھرائی ہوئی تھی۔

سفید گلاب! میری از لیلا! ہاں میں نے تجھے پہچان لیا، ہمیشہ کیلئے جان لیا، میں تیرے پاس ابھی آتا ہوں۔

مصنف اس کے بعد اپنی کرسی پر سے نہیں ہلا، اسکی آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت عورت کھڑی تھی، اسکے ساتھ اس کا بچہ تھا، مصنف نے اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور گمنام عورت کا خط اپنے سینہ پر رکھے ہوئے رخصت ہوا، آسمان کی کھڑکی کھلی اور یکے بعد دیگرے تینوں روحیں آہستہ آہستہ داخل ہوتی نظر آئیں!

ظفر قریشی

گناہ کی تجارت

از جناب مولانا جمیل مظہری ایم اے۔ کلکتہ

تنویر کے گداز اور نیم عریاں شانوں پر لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ . . . . .
پروفیسر ریحان نے ان بکھری ہوئی لٹوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "تنویر! تمہارے یہ اچھوتے خیالات، یہ سلجھا ہوا دماغ، یہ تجربات کی فضا میں تربیت پائی ہوئی بصیرت . . . . . اور پھر ان تمام صفات کے ساتھ یہ گناہ کی دوکانداری یہ معصیت کا پیشہ ———— میری سمجھ سے باہر ہے، تم دنیا پر تنقید کرتی ہو، کاش تھوڑی دیر کے لئے اپنے ماحول، اپنی زندگی اور اپنی مصروفیتوں پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالتیں، گناہ کی راتیں کتنی ہی دلچسپ کیوں نہ ہوں۔ . . . . . لیکن کیا ان راتوں کی فکر پر در تنہائی میں تمہارا نفس سلیم کبھی تم پر ملامت نہیں کرتا؟" تنویر نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں کچھ دنوں سے تو کر رہا ہے ———— اور میں خود بھی اس حقیقت کی کڑواہٹ کو بری طرح محسوس کر رہی ہوں کہ میرا یہ کاروبار اب گناہ کی تجارت ہو چلا ہے"
پروفیسر نے گھبرا کر بات کاٹ دی۔ "اب گناہ کی تجارت ہو چلا ہے"؟ "ہاں اب گناہ کی تجارت ہو چلا ہے۔" تنویر نے بے پروائی سے اسی جملے کی تکرار کی، اور پاندان کھول کر پان بنانے لگی:

پروفیسر نے خلوت گاہ شاہ کی ملاقاتوں کو مباحثے کی تلخیوں سے بدل جانے کا فیصلہ کرتے ہوئے، ایک ذرا ایکھے لہجے میں کہا۔ "اب گناہ کی تجارت ہو چلا ہے، گویا اس سے پہلے آپ کا یہ کاروبار گناہ کی تجارت نہ تھا؟" "شاید نہیں،" تنویر کے اس مختصر جواب سے پروفیسر کی تسکین نہ ہوئی اور نہ ہونے کی کوئی وجہ تھی، اس نے اپنے لہجے کو ضرورت سے زیادہ متحیرانہ بنا کر پوچھا۔ "آخر کیوں نہیں ————" تنویر نے پاندان بند کر دیا، گویا مباحثے کی دعوت کو قبول کرنے کا اعلان تھا۔

تنویر۔ میرے صاحب! جب گناہ کے بازار میں پہلے پہل اپنی دوکان سجائی، اس وقت میری ضرورت بھوکی تھی، اور آج ضرورت کا دامن بھرتا جا رہا ہے . . . . . ضرورت کا دامن بھر جانے کے بعد نیتوں کو سیر ہو جانا چاہئے نہ ہو تو جرم ہے ملک و قوم سے غداری ہے کہ مجھ ہی پر منحصر نہیں ہر تاجر کے پیش نظر یہی نظریہ رہنا چاہئے اور اسی نظریئے کے ماتحت ضرورت کا دامن بھر جانے کے بعد ہر تاجر کو اپنی تجارت کا سلسلہ بند کر دینا چاہئے۔ . . . .
بہر کیف میری نیت سیر ہوتی جا رہی ہے اس لئے میں اس کاروبار کو یعنی دوکانداری کو اس حسن و عشق کی دوکانداری کو بقول آپ کے گناہ کی دوکانداری سمجھنے لگی ہوں ورنہ اس تمدن کے بازار میں۔

پروفیسر: ٹھہرئے، آپ جدھر جا رہی ہیں مجھے ادھر جانا منظور نہیں ہے۔ یہ میں سن چکا کہ جب آپ اس پیشے میں داخل ہوئیں اس وقت آپ کی ضرورت بھوکی تھی لیکن آپ کی ضرورت اور اس کی بھوک نے ایک فعل قبیح کو اپنے لئے جائز کیوں قرار دے لیا۔ . . . .
میرے سوال کا مفہوم یہ تھا۔ سمجھیں آپ! گناہ مجبوریوں کے عالم میں نیکی نہیں ہو جایا کرتا،

تنویر: معاف کیجئے، میں یہ سمجھ سکتی تھی اگر آپ مذہب کے نمائندے بن کر یہ سوال کرتے ہیں۔ بیشک گناہ مجبوری کے عالم میں نیکی نہیں بن جایا کرتا لیکن جب ضرورت بھوکی ہو اور ضرورت کی تمام راہیں بند ہوں، دماغ کے چاروں طرف اندھیرا ہو اور امید کا چراغ اپنی روشنی چرا رہا ہو . . . . . . اس وقت گناہ و ثواب کا فلسفہ سمجھنے کی صلاحیت کب ہوتی ہے، دماغ میں اور بفرض محال کچھ ہو بھی تو ضرورت خود اپنی تاویلیں پیش کر دیتی ہے جو قوت فیصلہ کو گمراہ کر دینے کے لئے کافی ہو جایا کرتی ہیں۔

پروفیسر۔ وہ کونسی تاویل تھی جس نے آپ جیسی عورت کو اس گناہ کا مرتکب ہونے کے لئے آمادہ کر دیا . . . . . آخر میں بھی تو سنوں۔

تنو: یہ دنیا پہچانے شاید آپ ان کی تردید نہ کر سکیں۔

پرو: ہو سکتا ہے لیکن میری طرف سے اتنا سوءِ ظن آخر آپ کو کیوں ہے!

اس لئے کہ آپ خود ضرورت کے ماتحت ہیں اور آپ کی ضرورت خود آپ سے گناہ کی تجارت کرا رہی ہے۔

پرو: (قہقہہ لگا کر) یہ ایک رہی واللہ، میرا پیشہ گناہ کی تجارت کیونکر ہے

وہ اس طرح کہ ضرورت سے مجبور ہو کر تمدن کے بازار میں آپ اپنا دماغ بیچ رہے ہیں ——— بیچ رہے ہیں اور اپنے زعم میں سمجھ رہے ہیں کہ یہ گناہ کی تجارت نہیں ہے۔

پر: تو آپ دنیا کے سامنے ایک بالکل ہی نیا نظریہ پیش کرنا چاہتی ہیں کہ دماغ کی تجارت گناہ کی تجارت ہے۔

بیشک میں نتائج کی روشنی میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہوں۔ . . . نہ معلوم اس کردہ تجارت کے لئے آپ کی ضرورت نے آپ کے سامنے کون سی تاویل پیش کی تھی۔

پر: کوئی تاویل نہیں، دماغی محنت کی اجرت ہمیشہ سے کسب حلال سمجھی جاتی ہے، یہ ایک مسلمہ امر ہے میرے لئے تاویل کی ضرورت ہی کیا ہے میں رات کی تاریکی میں نہیں دن کے اجالے میں اپنی دماغی کاوشوں کی مزدوری وصول کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ میرا حق ہے۔

بات تو آپ نے نہایت مختصر کر دی، پھر یوں ہی سمجھئے کہ ایک حسن فروش عورت بھی پبلک سے دن کے اجالے میں نہیں رات کی تاریکی میں اپنے حسن کا خراج وصول کرتی ہے اور سمجھتی ہے کہ یہ میرا حق ہے، تمدن کے بازار میں جب ایک پروفیسر اپنا دماغ بیچ سکتا ہے، جب ایک اڈیٹر اپنا قلم بیچ سکتا ہے جب ایک وکیل اپنا حافظہ اور اپنی چرب زبانی بیچ سکتا ہے، جب ایک زاہد اپنا زہد اور اپنی پاکیزگیاں بیچ سکتا ہے، جب ایک عالم شریعت اپنے مقدس معلومات وہ مقدس معلومات جو اس کی ملکیت نہیں بلکہ ساری دنیا کی امانت ہیں بیچ سکتا ہے جب ایک ادیب حسن کے فتوحات کی داستانیں اور عشق کے جذبات کی تفسیریں بیچ سکتا ہے تو پھر ایک حالات سے مجبور عورت اپنا حسن کیوں نہیں بیچ سکتی . . . . . . وہ بھی ایک ایسی حالت میں جبکہ اس کی جھولی میں بیچنے کے لئے کچھ نہ ہو اور تمدن کے بازار میں بغیر کچھ بیچے روٹی نہ پا سکتی ہو ——— جب ہمارے پاس اس تمدن کی بنیاد ہی سوداگری پر ہے تو کسی کو کیا حق حاصل ہے حسن کی تجارت کو گناہ کی تجارت کہے اور بفرض محال یہ گناہ کی تجارت ہو بھی تو نیکی کا کیا؟ اب یہ ہے کہ ضرورت کا احساس بھوک کی ماریوں کے سامنے یہ تاویل پیش کرتا ہے کہ دوسروں کے پاس نیکیاں ہیں وہ نیکیاں بیچ رہے ہیں تیرے پاس نیکیاں نہیں تو گناہ ہی بیچ ———

مسز ریحان! دوزخ بھرنے کے لئے مہیا نہیں کرتی . . . . اچھا یونہی سہی آج گناہ بیچنے والے گناہ نہیں بیچتے لیکن کیا نیکیاں بیچنے والے اپنی نیک کمائی سے روٹی کا ایک ٹکڑا ان کی طرف پھینک دیں گے، آپ کہیں گے کہ گناہ بیچنے والے "نیکیاں" کیوں نہیں بیچتے، میں کہوں گی اس ناقص تمدن اور اس کے فرسودہ نظام کے ماتحت ہر شخص نیکیاں بیچنے پر قادر نہیں، آپ کہیں گے کہ حالات سے مجبور عورت نکاح کیوں نہیں کر لیتی، میں کہوں گی کہ جہاں آپ کا تمدن ہر شخص کی روزی کا ذمہ دار نہیں ہے وہاں آپ کی خود غرض سوسائٹی بھی ہر عورت کے لئے ایک شوہر مہیا کرنے کے فرض کو محسوس نہیں کرتی، وہ بھی ایک ایسی عورت کے لئے جو مصیبت زدہ ہو جو حالات کی ماری ہو جس کے کنبے کے پاس جہیز اور تلک کے لئے کچھ نہ ہو، گناہ کے اس پیشہ میں آنے سے پہلے خود مجھ پر یہ حالتیں گزر چکی ہیں کہ میرے حسن اور میری اٹھتی ہوئی جوانی سے فائدہ اٹھانے کے لئے تو محلے کا ہر مرد اور برادری کا ہر نوجوان بیتاب تھا لیکن مجھے باقاعدہ بیوی بنا لینے کے لئے کوئی آمادہ نہ تھا، کیونکر آمادہ ہوتا، جب خاندانی وجاہت کا پاس، نسبی شرافت کا لحاظ اور مستقبل کی سنہری امیدوں کے دلفریب خواب ان کے دماغ کو اوپر لئے جا رہے تھے۔

پروفیسر۔ آپ کی تقریر دائرہ بحث سے باہر ہوتی جا رہی ہے، شاید آپ بھول رہی ہیں کہ تمدن اور سوسائٹی پر اعتراض کرنے سے پہلے آپ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ ہمارے دماغ کی تجارت گناہ کی تجارت ہے۔

تنویر۔ یہ تو میں اس وقت ثابت کروں گی جب آپ یہ ثابت کر چکیں گے کہ حسن کی تجارت گناہ کی تجارت ہے۔

پروفیسر اس کی ضرورت ہی کیا جب آپ کی تقریر سے خود ظاہر ہے کہ آپ اسے جائز نہیں سمجھتیں۔

تنویر میں کیا سمجھ رہی ہوں اور کیوں سمجھ رہی ہوں، اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا پہلے آپ ایک ایماندار معترض کی طرح یہ ثابت کریں کہ حسن کی تجارت کیوں گناہ کی تجارت ہے۔

تو کوئی حرج نہیں ہے فطرت نے جس چیز کو تجارت کے لئے نہیں پیدا کیا، اس کی تجارت گناہ کی تجارت ہے۔

یہ ایک خوبصورت فلسفہ ہے گو اس کی تخلیق میں آپ کی کمزوری نے فطرت کے دامن میں پناہ لینے کی ضرورت محسوس کی ہے تاہم ایک خوبصورت فلسفہ ہے اور اسی خوبصورت فلسفے کا سہارا لے کر مجھے بھی یہ کہنے کی جراءت ہوتی ہے کہ دماغ کو اور علی الخصوص آپ کے جیسے غیر معمولی دماغ کو فطرت نے اس لئے نہیں پیدا کیا کہ اس کی تجارت کی جائے بلکہ اس لئے کہ اس کی روشنی میں آپ خود راستہ دیکھیں اور انہیں راستہ دکھلائیں منزل کا نشان جن کے لئے گم ہو چکا ہے ——— یا یوں سمجھئے کہ علم و فضل کی امانت کو تجارت کی بنا پر پھیلا دینا علم و فضل کی توہین اور علم و فضل بیچنے والے کی نقدری ہے . . . . میں آپ کے اس خوبصورت فلسفے سے جاگنے کے لئے یہ بھونڈا فلسفہ سر کر رہی ہوں ——— اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟

یہ کہہ کر تنویر نے اپنے تیور کو سوالیہ بنا لیا کچھ اس خوبصورتی کیساتھ کہ اس کا جواب کچھ اور ہی طرح سے ممکن تھا، لیکن پروفیسر ریحان شکست کھا چکے تھے اور شکست کی ندامت اس وقت ان کی فطرت میں احساس حسن سے زیادہ قوی ہو رہی تھی، اس لئے انہوں نے پروانہ کی اور ایک شکست خوردہ آواز میں ایک ایسی شکست خوردہ آواز میں جو عموماً افلاس کی دلیل کا اعتراف ہوا کرتی ہے، کہا، یہ تو بڑا ظلم ہے تنویر! اگر اہل علم اور ارباب فکر و نظر اپنی دماغی کاوشوں کی کوئی اجرت نہ لیں تو آخر اپنے پیٹ کو کس طرح سمجھائیں؟

پیٹ کو کس طرح سمجھائیں" ؟ تسلیم ——— یہی میں کہلوانا چاہتی تھی آپ سے، اچھا تو سنئے، یہی وہ تاویل تھی جس نے مجھے بھی آخر گناہ کی تجارت پر آمادہ کیا ——— لیکن اس سوال کا جواب مجھ سے آپ کیوں مانگتے ہیں، اس سوال کا جواب آپ اپنے تمدن سے مانگئے اپنے تمدن کے موجودہ ٹھیکیداروں سے مانگئے ان لوگوں سے مانگئے جن لوگوں کا اس نظام تمدن پر ایمان ہو ———

شاید آپ بھول گئے ہیں کہ میں ایک معترض ہوں ——— ہاں تو آپ کی جیب میں میرے اعتراض کے لئے کوئی چلتی ہوئی دلیل نہیں ہے۔

پروفیسر نے بازی کو اتنی جلدی ہاتھ سے جاتے دیکھ کر وعظ و پند کا پہلو اختیار کر لیا ——— تنویر بہانے سے حقیقتیں بدلنے کی جگہ صرف مغالطے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن حقیقت پھر بھی حقیقت ہے۔ تم اپنی گرمیٔ تقریر سے اس کا مضحکہ اڑانا چاہتی ہو یہ تمہاری ستم ظریفی ہے، یہی یہ بات کہ دماغی محنت کی مزدوری لینا یا تمہارے لفظوں میں دماغ کی تجارت کرنا اس لئے گناہ نہیں ہے کہ یہ منصب گناہ نہیں ہے اور تمہاری...

تنویر یہ منصب کی ایک ہی رہی آپ نے میرے اعتراض سے بچنے کے لئے اب لفظوں کی سپر بنانی شروع کر دی ہے ——— یہ منصب آخر کیا بلا ہے۔

پروفیسر یہ نہایت لغو حرکت ہے میری تقریر کا سلسلہ توڑ دو ——— ہاں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تمہاری حسن فروشی کا دوسرا نام ہے عصمت فروشی اور عصمت نفس منصب ہے

تنویر پھر وہی منصب

پروفیسر خاموش رہو اب یہاں سے خیر و شر کے پیچیدہ ترین مسئلے کی حد شروع ہوتی ہے ارسطو نے

تنویر معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اب علمی اصطلاحات سے مجھے مرعوب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور یہ آپ ارسطو کو اپنی کمک کے لئے کیوں بلاتے ہیں ——— ارسطو سے میرا دور کا بھی تعارف نہیں ہے۔

پروفیسر لاحول ولا قوۃ

تنویر لاحول ولا قوۃ پڑھنے سے کام نہیں چلے گا، میں وہ شیطان نہیں جو لاحول سے بھاگ جاؤں، اس خیر و شر کے مسئلے کو آپ اپنے کالج کے لونڈوں کے لئے رکھ چھوڑیئے میں ایک جاہل عورت ہوں، مجھے سیدھی سادی اردو میں یہ جواب عنایت فرمائیے کہ دماغ کی تجارت کیوں جائز ہے اور حسن کی تجارت کیوں جائز نہیں۔

پروفیسر اچھا تو سنو اس لئے جائز نہیں ہے کہ حسن کی تجارت سے سوسائٹی میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو نظام معاشرت کو پراگندہ کرنے والی ہے ——— اور دماغ کی تجارت اس لئے جائز ہے کہ اس سے جہالت دور ہوتی ہے نیکیوں کی اشاعت اور سچائی کی تبلیغ ہوتی ہے۔

تنویر: کاش کوئی آئینہ ایسا مل سکتا جس میں حقیقت اور اس کی بگڑی ہوئی شکلیں وہ بگڑی ہوئی شکلیں جنہیں دماغ کے تاجروں نے اپنے مقاصد اور مصالح کی بنا پر بگاڑ دیا ہے نظر آسکتیں تو میں اُس آئینے کو آپ کے سامنے رکھ کر پوچھتی کہ کیا دماغ کی تجارت سے سوسائٹی میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ ——— حضرت تاجر بہرحال میں تاجر ہے اس کی بساط تجارت پر ہمیشہ ایسی ہی چیزیں نظر آئیں گی جن کی خریداروں میں مانگ ہو، جنہیں خریدار شوق سے خریدتے ہوں جن سے خریداروں کی جیب ہلکی کی جا سکتی ہو، تاجر کو اس سے کیا بحث کہ اس کی جنس تجارت خریدار کے لئے مفید ہے یا مضر ہے ——— یہی حال دماغ کے تاجروں کا بھی ہے ———

اور یہی وہ تلخ حقیقت جس کی بنا پر دماغ کی تجارت کو مشرق سے مغرب تک بند ہو جانا چاہئے قطعاً بند ہو جانا چاہئے، اب رہی آپ کی سچائیوں کی تبلیغ اور نیکیوں کی اشاعت تو صاحب سچائیوں کی تبلیغ اور نیکیوں کی اشاعت صحیح معنوں میں صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب معلم انھیں چیزوں کو متعلمین کے سامنے پیش کرے جن کی صداقت اور واقعیت پر خود اس کا ضمیر گواہی دے رہا ہو اور یہ موجودہ نظام تعلیم کے ماتحت ممکن نہیں، کالج کے منظور شدہ نصاب کی سچائیوں کا احساس کبھی آپ کے دماغ کو بھی ہوا ہے یا نہیں، پھر کیونکر اب تک آپ جو کچھ اپنے شاگردوں کو پڑھاتے اور سکھاتے آئے ہیں کیا اُن کی سچائی پر ہمیشہ آپ کا ایمان رہا ہے کیا وہ سب اپنی جگہ سچائیاں تھیں خالص سچائیاں کیا ان میں جھوٹ ملا ہوا نہ تھا گناہ کی آمیزش نہ تھی؟ اگر تھی تو پھر آپ کے ضمیر نے یہ کس طرح گوارا کر لیا کہ قوم مدرسہ اور خام دماغوں کے ساتھ ایسا خود غرضانہ سلوک کریں . . . آپ خفیف نہ ہوں آپ کے لئے مجبوری تھی وہی پیٹ کی مجبوری جس کی بنا پر میں گناہ کی دوکانداری کر رہی ہوں . . . لیکن خدا کے لئے یہ تو نہ کہئے کہ دماغ کی تجارت سے سوسائٹی میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اس سے بڑھ کر اور کیا خرابی ہو گی کہ ملک کے مستقبل کے معمار اس کی بنیاد پر جان بوجھ کر مزدوری کے لالچ میں کچی اینٹیں رکھے جاتے ہیں ——— (مسکراکر) اور ہاں پروفیسر صاحب انسانیت کو بنیادی نقصان ہماری تجارت سے پہنچ رہا ہے یا آپ کی؟

پروفیسر کی پیشانی سے پسینہ آ رہا تھا ——— تنویر نے اُن کی غیر مطمئن خاموشی کو دیکھ کر اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا، اور ہاں کیا رائے ہے آپ کی ان ناولوں کے متعلق جو عموماً نوجوان طلبا کے ہاتھ میں رہا کرتے ہیں ان کے مصنف اور ناشر کیا میری طرح گناہ کے تاجر نہیں ہیں؟ . . . . .

. . . لیجئے میں آپ کی خاطر سے تسلیم کئے لیتی ہوں کہ میری تجارت سے سوسائٹی میں خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں لیکن کیا اُس ایڈیٹر کی تجارت سے خرابیاں نہیں پیدا ہوتیں جو آپ ہی کی طرح دماغ کا تاجر ہے جو دماغ کے ساتھ اپنا قلم اور قلم کے ساتھ اپنا ضمیر بھی اخبار کی پالیسی کے ہاتھ بیچ دیتا ہے جو اخباری مصالح کی بنا پر سچائیوں کو توڑ مروڑ کر اپنے زعم میں سیاست کہتا ہے جو اکثر ایسی راہ چلتا ہے جس میں کانٹے نہ بچھے ہوں پھانسیاں نہ کھڑی ہوں نہ زنجیریں نہ ہتھکڑیاں ہوں ——— حالانکہ جانتا ہے کہ اس کی یہ راہ منزل تک نہیں پہنچتی لیکن چاہتا ہے اور صرف چلتا ہی نہیں اپنے ساتھ جماعت کی جماعت کو منزل کے قریب دیکھ دو ڈراتے لئے جاتا ہے ——— ہاں ہماری عصمت فروشی سے گناہ دلیر ہو رہا ہے لیکن کیا اس وکیل کی قانون فروشی سے گناہ دلیر نہیں ہوتا جو اپنی گرمیٔ تقریر سے انصاف کو دھوکا دینا چاہتا ہے قانون کی روشنی میں دھوکا دینا چاہتا ہے جس کی زبان گناہ کی پشت پناہی کا ٹھیکہ لئے بیٹھی ہے جس کا دماغ قانون سے حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرنے کی اعزازی سند حاصل کر چکا ہے۔

اور ہاں کیا فتویٰ ہے آپ کا ان علمبرداران شریعت کے متعلق جو پیسے لے کر نصیحت کرتے ہیں جو درود و تکبیر کے ہیچ میں شہرت و عظمت کے لالچ میں مصافحوں اور قدم بوسیوں کے لالچ میں اپنے سامعین کے دلوں سے کھیلتے ہیں۔ اور جان بوجھ کر ان کو خوش کرنے کے لئے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دماغ کے لئے افیون کا کام کریں، انا للہ وانا الیہ راجعون ———

کیا ان کی سخن فروشی سے آپ کی جماعت میں خرابیاں نہیں پھیلتیں اور ہاں ——— کیا فرماتے ہیں آپ اپنے اس ادیب اور شاعر کے متعلق جو خواب کے پیچھے آوارہ ہے جو خواب دیکھتا ہے اور خواب دکھلاتا ہے جو گناہ کی حقیقت کا منکر ہے اور استعارے کے پردے میں گناہ کی تبلیغ کرتا ہے جو تخلیق حسن کا مدعی ہے اور الفاظ کے پیرایہ میں حسن بیچتا ہے ——— ہماری طرح حسن بیچتا ہے فرق بس اتنا ہے کہ ہم اپنی جنس کی قیمت میں روپے چاہتے ہیں اور وہ اپنی جنس کی قیمت میں شہرت چاہتا ہے، شہرت کیا ہے اس کے خود کا خواب اور رد چلے کیا ہیں، ہماری عزت اور ان کے متعدد سوالوں کا تنہا جواب ——— اور ہاں کیا رائے ہے آپ کی ادبی رسائل کے ایڈیٹروں کے متعلق جو اس قسم کے حسن فروشوں کے ایجنٹ ہیں ———

اور کیا تاویل کر سکتے ہیں آپ ان مقدس اداروں کے نقطہ نگاہ کی جنہوں نے سگریٹ فروش، سینما اور شراب فروش حاجی صاحب کے چندے کو تو خیرو برکت کی کنجی سمجھ کر قبول کر لیا، لیکن ایک حسن فروش مغنیہ کے چندے کو بیگناہ کی کمائی سمجھ کر واپس کر دیا۔ غرض کتنی مثالیں گنواؤں اس تمدن کے بازار میں وہ کون سا دوکاندار ہے جو گناہ کا تاجر نہیں ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ سوسائٹی کی چھری ہمیشہ ہی خلاف کیوں چلتی رہتی ہیں۔

پروفیسر نے اب اپنی فتح اعتراف شکست ہی میں سمجھی، اور بڑی فراخدلی سے اپنی معنوی ذہنیت کا اعلان کیا۔ تنویر! جو کچھ تم کہہ رہی ہو تجربہ اس کی تصدیق کئے بغیر نہیں رہ سکتا، میرے دماغ میں بھی اکثر اس قسم کی خلش پیدا ہوتی رہتی ہے لیکن چونکہ میں عمر خیام کا معتقد ہوں اس لئے ایک پیالہ اس کی دماغ کو سلا دینے کے لئے کافی ہوتی ہے بہرکیف میں یہ تسلیم کئے لیتا ہوں کہ دماغ کی تجارت اپنے تلخ اور ناگوار نتائج کی بنا پر گناہ کی تجارت کہی جا سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہے دوں کہ یہ اور اس قسم کی تجارتیں اب دنیا کی فطرت ثانیہ بن گئی ہیں بہت مشکل ہے کہ زمانہ کا رجحان طبیعت ان سے جدائی گوارا کرے۔

تنویر یہ آپ کا عقیدہ ہے اور عقیدے اور مباحثے میں کبھی کوئی رشتہ قائم نہیں ہو سکتا ——— بہرکیف زمانے کے رجحان طبیعت پر بھروسا نہ کیجئے، ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اس کے رخ کو پھیر دے گا اور جب اس کا رخ پھر جائے گا تو پھر سب کچھ ہو جائے گا خود بخود ہو جائیگا۔ دنیا آج بے چین ہے اپنی شکایتوں کے علاج کے لئے، بے چین ہے، بے چین ہے اور اس مقصد کے لئے نئے نئے نسخے ڈھونڈ رہی ہے ——— بہت ممکن ہے کہ اس سلسلے میں اس کی نظر اس حقیقت تک پہنچ جائے کہ اس کی تمام بدامنیوں کا سبب اس کا تاجرانہ تمدن ہے ——— وہ تاجرانہ تمدن جس کی بنیاد غرض اور احساس (رقابت) پر مبنی نہیں رکھی گئی ہے بلکہ۔ نفع اور استحصال پر

. . . .

. . . .

. . . .

بہرکیف یہ گفتگو کرنا منظور نہیں آپ کے اس تاجرانہ تمدن کے علاج کو دنیا ایک حد تک سمجھ چکی ہے اور سمجھتی جا رہی ہے۔ یہیں تک بس نہیں ہے

تو اس بیماری کا علاج جسے آپ عصمت فروشی کہتے ہیں اور ہم حسن فروشی ——— قانون نے اس کے مقابلے میں سپر ڈالدی۔ زبان خلق تھک کر چپ ہو گئی ——— مذہب نے مایوس ہو کر صبر کر لیا اور کس نے تو اور ہو کر اپنی دوکان اونچی کر دی جو اس نئی تہذیب کے زیر سایہ ہمیشہ انشاءاللہ اونچی ہو گی اور اونچی رہے گی اور حسن فروشی کا بازار ہمیشہ دنیا تک سرد رہیگا اس لئے سرد رہیگا کہ دنیا کے پاس اس کے انسداد کا کوئی نسخہ نہیں ہے۔

پروفیسر۔ کیوں نہیں ہے فرض کرو کہ آج کوئی ایسا تمدن ظہور میں آجائے جو ضرورتوں کی پیدائش میں تخفیف کر دے اور جس حد تک ضرورتوں کی پیدائش ناگزیر ہو اس حد تک ان کی کفالت کا ذمہ دار ہو جائے، تو پھر ایسی حالت میں کیا تمہارا یہ کاروبار خود بخود بند نہیں ہو جائے گا؟ ——— تم ابھی کہہ رہی تھیں عصمت فروشی ضرورت کی بنا پر ہوتی ہے

تنویر ہاں ضرورت کی بنا پر ہوتی ہے لیکن جب ضرورت نہ ہوگی جب بھی ہوگی اس شکل میں نہ ہوگی دوسری شکل میں ہوگی ——— عورت ہوٹل میں اپنی عصمت بیچے گی نہیں بیچے گی، تماشے کی بہن لٹائیگی جیسے مرد لٹاتے ہیں۔ آج روپے کے لئے یہ دھندا کرتی ہے کل خوشی کے لئے کرے گی ——— اور کیوں نہیں کریگی جب نئی تہذیب اور نیا نظام تربیت اس کے احساس وقت کو دلوں کی طرح قوی کر رہا ہے یاد رکھئے کہ اس کا وہ جنسی ذوق جسے تہذیب قدیم نے معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر معطل کر رکھا تھا، اگر اپنی غنودگی سے ہوشیار ہو گیا تو پھر آپ کے موجودہ نظام معاشرت اور اس کی خانہ ساز زندگی کی خیریت نہیں ہے ——— غرض آپ جو کچھ چاہتے ہیں آپ کا مذہب جو کچھ چاہتا ہے وہ کسی طرح نہیں ہو سکتا، اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان میں شعور حسن موجود ہے۔

پروفیسر (گھبرا کر) شعور حسن! شعور حسن کا تعلق عصمت نفس سے کیا ہے؟ تم بھی تو زمین و آسمان کے قلابے ملا رہی ہو

تنویر گھبرائیے نہیں اس زمین پر گناہ اور اس کے سامنے فتنے شعور حسن ہی کے تو اشارے ہیں یاد رکھئے کہ اس دنیا کی بستی میں شہوات کا سب سے [illegible] اس نے انسان کو حسن کے قریب ہی [illegible]

TWO SILHOUETTES.





کہ اس نے اس لذت کو ذوقِ حسن کے ماتحت کر دیا۔ مسٹر ریحان! اگر آج ہم میں شعورِ حسن موجود نہ ہوتا تو ہمارے جنسی تعلقات ہیجانِ جنسی کے ماتحت ہوتے۔ ہماری ازدواجی زندگی میں زن و شو ایک دوسرے سے ہرگز واقف نہ ہوتے۔ نہ مرد کو پروا ہوتی، نہ عورت فکر کرتی کہ [illegible] تک۔ عصمت فروشی کا بازار ہوتا نہ عصمت کے خریدار۔ ظاہر ہے ہیجانِ جنسی کو اس سے کیا بحث کہ یہ گوری ہے یا سانولی ہے، اس کی آنکھیں غزالی ہیں، اس کی نرگسی، اس کی ناک ستواں اور اس کی پیشانی اس کی رنگت گلابی ہے اور اس کی کھلی ہوئی ———— تو ویا اللہ انسانی جذبات کی یہ کتنی بڑی توہین ہے کہ اسے سطح پرستی پر محمول کیا جائے ———— کسی چیز کی خوبصورتی ہرگز منشائے فطرت نہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کا ایک مصرف رکھا ہے اور ہر چیز ایک مصرف کے لئے پیدا کی ہے۔ اس لئے ہر چیز کی اچھائی یا برائی کا معیار اس کی مصرفیت ہونی چاہئے نہ کہ اس کی ظاہری نوک پلک ———— شیطان کے مقابلے میں یزداں کی پہلی شکست" شاید یہی تھی کہ دنیا نے اشیاء کو اس کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ ورنہ دنیا ارتقا کی دوڑ میں بجائے آج کہاں سے کہاں پہنچی ہوتی۔

پروفیسر — تو کیا تم شعورِ حسن کو انسان کی فطرت نہیں سمجھتیں۔

تنویر — نہیں یہ ایک عادت یا زیادہ سے زیادہ فطرتِ ثانیہ کہئے یا یوں کہئے کہ ایک رجحان ہے، ایک ذوق ہے، ایک لت ہے جو موروثی بیماری کی طرح ہمارے بزرگوں سے چلی آ رہی ہے ———— اور اگر اس کی حقیقت کچھ ہو بھی تب بھی ہم اسے جھٹلا نہیں سکتے اس لئے کہ یہ ہمارے لئے مفید نہیں ———— ہم اس سچائی کو بھی کچل ڈالنا چاہتے ہیں جو ہمارے مستقبل [illegible] کے لئے کسی حیثیت سے ضرر رساں ہو ———— آپ کہیں گے کہ یہ ممکن نہیں میں کہوں گی کہ ممکن ہے ———— ہم فطرت کے غلام نہیں بلکہ فاطرہ نے ہمیں غیر معمولی قوتِ ارادی دے کر فطرت اور تمام عناصرِ فطرت پر حکمران بنایا ہے اس لئے حکمران بن جانا چاہئے کہ ہم پر فرض ہو گیا ہے کہ ان بیڑیوں کو جن میں جکڑے ہوئے ہیں توڑ کر دور کریں ورنہ یہ فطرت ہمارے [illegible] کا گریبان پکڑے گی

اور ارتقا کی راہ میں حائل ہو گی کچل ڈالی جائے گی، مسخ کر دی جائے گی ———— اور آپ کا شعورِ حسن تو فطرت نہیں، ایک کھلا ہوا شیطانی فریب ہے جس نے ایک طرف تو تمدن کے بازار میں حسن فروشی کی دکانیں کھلوا کر ہماری معاشرتی زندگی کی جڑیں ڈھیلی کر دی ہیں، دوسری طرف ہماری اقتصادی دانائی کو کمزور کر کے ہمارے پیچھے سینکڑوں ایسی چیزیں لگا رکھی ہیں جن کا حقیقت میں کوئی مصرف نہیں ———— خیر میں اقتصادیات میں الجھنا نہیں چاہتی یہ ہمارے دائرۂ بحث سے باہر ہے ہمارا موضوعِ گفتگو یہ ہے کہ "عصمت فروشی"، "عصمت بخشی" اور "عصمت ریزی" کا سلسلہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا ہے جب تک شعورِ حسن ہم میں موجود ہے۔

پروفیسر — تمہارے توہمات ہیں دنیا میں عصمت فروشی اور عصمت ریزی اس لئے ہو رہی ہے کہ ہم ضبطِ نفس کی عادت نہیں ———— اور ہمیں اب تک ضبطِ نفس کی باقاعدہ تعلیم بھی نہیں ملی۔

تنویر — دنیا کو ضبطِ نفس کی تعلیم کافی سے زیادہ مل چکی ہے اس افراط کے ساتھ مل چکی ہے اور برابر مل رہی ہے کہ دنیا آخرکار اس سے اکتا گئی ———— گو مجھے اس کا بھی اعتراف ہے کہ ضبطِ نفس کی تعلیم احساسِ ضرورت کے مقابلے میں ایک حد تک کامیاب ضرور رہی ہے مثال کے طور پر چوری ہی کے جرم کو لیجئے اس سلسلے میں ضبطِ نفس کی تعلیم نے انسان کو اتنا خوددار ضرور بنا رکھا ہے کہ وہ چوری کو ایک بدترین اخلاقی گناہ سمجھ کر اس سے متنفر رہتا ہے گو اندھیرے اجالے میں خیانت کر لیتا ہے لیکن کھلی چوری نہیں کرتا چنانچہ آج دنیا کی آبادی میں چوروں کی تعداد ۲۰ یا ۳۰ فی صدی سے زیادہ نہ ہو گی۔ ———— لیکن اس کے بالکل ہی برخلاف یہی ضبطِ نفس کی تعلیم جہاں تک جنسی جذبات کا تعلق ہے کیوں ناکام رہی ———— میرے دوست صرف اس لئے کہ اس کو برانگیختہ کرنے والے اسباب اور ابھارنے والی قوتیں ہمیشہ اس کے گرد و پیش رہیں۔ . . . . ان کو دور کرنے کی پرواہ نہ کی گئی . . . . . طبیب نے نسخہ تو کارگر تجویز کیا لیکن موسم کے خراب اثرات پر غور نہ کیا، نتیجہ ظاہر ہے کہ بیماری بڑھتی رہی اور وہ حقیقتِ کبریٰ جو مقامِ فطرت پر کھڑا کرنے کے لئے خلق کی گئی تھی اپنے جنسی جذبات کی غلام ہو کر رہ گیا۔

مسٹر ریحان: یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ بیماری سے شفا پانا بھی چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ان اسباب کو بھی برقرار رکھیں جن کی بنا پر بیماری پیدا ہوئی ہے ——— یا یوں کہیے کہ اور کچھ کہا جائے جنسی ذوق کو سرکش کیا ہے شعور حسن نے اور جب تک یہ شعور ہم میں موجود رہے گا اس کی سرکشی اپنی حالت پر بڑھتی رہیگی —— نہ تربیت نفس کی کوششیں کامیاب ہوں گی، نہ ضبط نفس کی تعلیم سے کچھ فائدہ ہوگا ——— نہ جنت کے لالچ سے کچھ ہوگا، نہ شعلہ ہائے دوزخ کے خوف سے ———

مجھے افسوس ہے کہ مذہب نے اس راز کو کیوں نہ سمجھا کہ فطرت انسانی "کس دیکھنے آج" کو قربان نہیں کر سکتی، افسوس ہے کہ ابتدائے تمدن میں ہمارے بزرگوں نے اس حقیقت کو تو سمجھ لیا کہ ضبط نفس کے بغیر اس دنیا میں سلامتی نہیں ہے لیکن نہ انھوں نے شعور حسن کے فتنے کو سمجھا نہ اس کو ابھارنے والے فنون کی خبر لی نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شعور رفتہ رفتہ ہمارے قوائے دماغی پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ شیطان نے ہمیں اس سراب آب و رنگ میں "خالق کائنات" کے جلوے دکھلائے ——— اور آج تو یہ شعور ہمارے دل و دماغ میں اس درجہ قوی ہے کہ ہم بغیر اس کے کسی شے کی خوبی کا تصور ہی نہیں کر سکتے ——— اس درجہ قوی ہے کہ اگر اس طلسم کو باطل کرنے کے لئے آج تمام تمدنی اور معاشرتی ماحول بدل دئے جائیں، تمام پرانے لٹریچر نیست و نابود کر دئے جائیں یا نظام تربیت اور نیا نظام تعلیم نئی بنیادوں پر قائم کیا جائے جب بھی نتیجہ شاید خاطر خواہ برآمد ہو۔

مگر بڑی مشکل ہے ——— شعور حسن کو فنا کرکے تو تم تمدن کی تمام نیرنگیوں اور دلچسپیوں کو فنا کرنا چاہتی ہو ایک ایسی نئی دنیا بنانا چاہتی ہو جس پر غالب "در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا" کی پھبتی کسے ——— میری روح تو اس عالم کے تصور سے بھی گھبراتی ہے جس میں حسن کی تمیز اور حسن پرستی کا رواج نہ ہو ——— ہمارے خیال میں تو انسان اور حیوان میں امتیازی شعور یہی تمیز حسن ہے اور تم اسی کو مسخ کرکے انسان کو حیوان صاف بنا دینا چاہتی ہو۔

مینا: آپ سے تو بحث کرنا عمر ضائع کرنا اور شاعری کا جواب ہمارے پاس کیا کسی کے پاس نہیں ہے شعور حسن کھوکر انسان جانور نہیں ہو جائیگا وہ اس لعنت سے نجات پاکر ارتقا کی راہ میں پہلے سے زیادہ گرم رو ہوگا ——— شعور حسن اور حسن پرستی اس کی راہ میں رکاوٹوں کا مجموعہ ہے وہ رکاوٹیں جنہیں شیطان نے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے وہ رکاوٹیں جو اس کی عمر کے بہترین حصے کو ناقابل عمل بنا دیتی ہیں جوانی عمل کا موسم اور جوان ہی اس سراب کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے ہیں اس بری طرح دوڑتے ہیں کہ ان کے کانوں میں مرض کی آواز سنائی دیتی ہے نہ وقت کی پکار ——— آپ کی روح اس عالم کے تصور سے جس میں تمیز حسن موجود نہ ہو اس لئے گھبراتی ہے کہ وہ شعور حسن کے ماحول میں احساس لذت کی لونڈی بن چکی ہے لیکن میری روح ابھی تو آزاد ہے اسلئے میری نظر میں انسان کا مقصد حیات زیادہ سے زیادہ لذت اٹھانا نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا ہے اس کی فطرت یکسر عزم ہے اور اس کے عزم کے لئے حقیقی لذت صرف طاقتوں کے احساس میں ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ اپنے اس احساس لذت کو برباد کر رہا ہے، جوانی طاقتوں کی پرستش میں دولت کا عزم کیا ہے ایک جھوٹی طاقت کا غلط احساس . . . .

پروفیسر: معاف کیجئے گا آپ پھر دائرہ تقریر سے باہر ہو رہی ہیں ——— بہرکیف آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ شعور حسن انسان کی فطرت اول نہیں ہے۔

تنویر: اس کے ثبوت کے لئے آپ کو اس دنیا کے ان گوشوں تک سفر کرنے کی زحمت اٹھانی ہوگی، جہاں آپ کے اس بدبخت تمدن کا سایہ نہیں پہنچا ہے ——— دنیا کے نقشے میں آپ کو ایسے مقامات ملیں گے جہاں کے بسنے والے ہنوز اپنی فطرت اول پر ہیں تشریف لیجائیے ثبوت کی روشنی بھی آپ کو وہیں ملے گی ——— آپ دیکھیں گے کہ وہ اشیاء کی صرف افادیت کو تو سمجھتے ہیں لیکن شعور حسن ان میں موجود نہیں ہے ——— اور متمدن دنیا سے آمد و رفت رکھنے کی بنا پر کچھ ہے بھی تو بہت کمزور یا مدہم ہی کیوں نہ جائیے گا اپنے ملک کے دیہاتیوں ہی کو دیکھئے ان میں بھی آپ اس شعور کو شہریوں کے بہ نسبت ضعیف تر پائیں گے ——— یہ سب آپ کے تمدن کے برکات ہیں، اس تمدن کے جس کی بنیاد تو خدا نے رکھی تھی لیکن ہمیشہ شیطان کی رکھی ہوئی

ہیں۔ اس تمدن کے جو ہمارے قویٰ کے اندر صرف احساس لذت کی پیدائش کر رہا ہے، شعور حسن ہم میں قوی کیونکر ہوا یہ ایک لمبی داستان ہے جس کے لئے وقت چاہئے، ممکن ہے اس کے سلسلے میں آپ کو اپنے فنون لطیفہ اور لٹریچر کے خلاف بھی کچھ تلخ اور صبر شکن باتیں سننی پڑیں اس لئے بہتر ہے کہ اس کو اٹھا رکھا جائے کسی اور وقت کے لئے۔

جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ دلچسپ ضرور ہے اور ایک حد تک قرین قیاس بھی لیکن بہت مشکل ہے کہ زمانے کا رجحان طبیعت تمہارا ساتھ دے۔

پھر وہی رجحان طبیعت، آپ بار بار زمانے کے رجحان طبیعت کا سہارا کیوں لے رہے ہیں، میں تو اس کی حقیقت ایک نادان بچے سے زیادہ نہیں سمجھتی، ایک ایسے نادان بچے سے جو ایک کھلونے سے کھیلتا ہے اور نادانستگی میں سمجھتا ہے کہ یہی ہمارے لئے سب کچھ ہے اور پھر جب جی گھبرا جاتا تو اس کھلونے کو چھوڑ کر دوسرے سے مشغول ہو جاتا ہے دنیا کی تو عادت ہی یہی ہے کہ وہ گھروندوں کی طرح اصول بناتی ہے ان سے کھیلتی ہے اور پھر جب ان میں اپنے لئے آسودگی نہیں دیکھتی تو توڑ ڈالتی ہے یاد رکھئے کہ آپ کی یہ دنیا نظریوں اور اصولوں سے کھیلتی رہے گی، اس وقت تک کھیلتی رہے گی جب تک کہ اس کا دماغ ایام طفولیت سے نکل کر بلوغیت کی سرحد تک نہ پہنچ جائے ———— مجھے تو یہ کبھی یقین نہیں ہوتا کہ زمانے کا فیصلہ جس چیز کو آج اچھا سمجھ رہا ہے کل بھی اسے اچھا سمجھیگا ———— زمانے کے رجحان طبع کی حقیقت سمجھنے کے لئے ایک دلچسپ مثال سے مدد لوں فرض کر لیجئے آج ہماری معاشرتی دنیا میں مردوں کی جگہ عورتوں کی حکومت ہو جائے، اور ان کا جنسی ذوق اپنی ضروریات کے لئے ایک یا دو یا چار شوہر ———— شوہر نہیں خدمتگار منتخب کر لیا کرے، اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد ایسے مردوں کی ایک بڑی تعداد جن کی شخصیت میں کسی قسم کی کوئی کشش نہ ہو کہیں پرستش ہونے کی بنا فاقہ تجرہ کرنے لگے ———— اور ان کی حالت قابل رحم حد تک پہنچ جائے، ایسے زمانے میں اگر کوئی فیاض عورت ان کی مجبوری اور بیچارگی سے متاثر ہو کر اپنے آپ کو ان کی فطری ضروریات کے لئے "وقف" کر دے تو اس خدمت کو زمانہ کا رجحان طبع "ایثار نفس" سے تعبیر کرے گا یا نہیں، اخبار کی زبان اس عورت کو ہیرو کا لقب دے گی یا نہیں ———— اتنا کہہ کر تنویر نے ایک قہقہہ لگایا ندامت اور جوش سے بھرا ہوا ایک فاتحانہ قہقہہ ———— تقریر کے دوران میں تنویر کی سنجیدہ ادائیں، اس کا نیم معشوقانہ اور نیم فلسفیانہ انداز بیان اور کبھی کبھی جوش اور غصے سے تمتمائے ہوئے رخسار پروفیسر ریحان کے جذبات کو بے قابو اور دماغ کو مضمحل کرتے جا رہے تھے اس بے ساختہ قہقہے نے تنویر کے خوبصورت گالوں پر کچھ ایسے نشیب و فراز پیدا کئے کہ غریب پروفیسر کا دماغ جذبات کے مقابلے میں قطعی مغلوب ہو گیا، اور اس نے غیر ارادی طور پر اس کے گالوں میں چٹکی لیکر کہا۔ تنویر جب تم حسن کے خلاف بول رہی تھیں اور تو تمہاری ہر ادا خود تمہارے فلسفے کی تکذیب کر رہی تھی کاش اس وقت میرے ہاتھ میں آئینہ ہوتا . . . . تنویر مسکرائی اور ہر عورت اپنے حسن کی تعریف سنکر مسکراتی ہے . . . . . . یہ تبسم پروفیسر کے لئے جرأت آموز ثابت ہوا اور ————

ظاہر ہے کہ ایسے نازک موقع پر اس قسم کے مباحثے کی کیا گنجائش باقی رہ گئی تھی ؎

بیار بادہ کہ آتش زنم بہ کعبہ و دیر
دماغ وسوسۂ شیخ و برہمن تا چند

جمیل مظہری

اڈیٹر

از جناب سید اسد الفدی، آئی ایف ایس۔ بی۔ ایس سی اے سی ایف اسسٹنٹ کنزرویٹر

شمیم صاحب کے بقول "اڈیٹر وہ۔۔۔ شے ہے جو اچھے مضامین کو ردی میں پھینک دیتا ہے اور نکمے اور ناکارہ مضمونوں کو ایک "پُرزور" تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کر دیتا ہے"۔ ممکن ہے آپ یا آپ کے کوئی بزعم خود عقلمند دوست ہمارے اس مضمون پر اعتراض کر بیٹھیں اور صغریٰ اور کبریٰ کے بے جوڑ ملا کے یہ نتیجہ نکالیں کہ یہ "جواہر ریزے" بھی ناکارہ قصہ سے زیادہ نہیں، سو عرض یہ ہے کہ یہ استثناء کلیہ کا ثبوت سمجھنا چاہئے اور یا پھر ہمارے اڈیٹر صاحب کو "اڈیٹر" کی تعریف سے مستثنےٰ۔

اس سے قبل کہ ہم اڈیٹر کی مزید تعریف کریں، یہ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس ہیولے کا تجزیہ تقسیمی کر لیں صوری اور معنوی، یا بقول رشید صدیقی صاحب ذاتی اور صفاتی تقسیم کے علاوہ اس مرکب کے قوام میں، ملکی، مقامی، قومی، شخصی اور مذہبی اجزاء بھی بافراط پائے جاتے ہیں، سیاست کی ملاوٹ بھی اکثر دیکھنے میں آتی ہے، اگرچہ یہ یوپی اخبار کے اڈیٹروں کے مقابلوں پر زیادہ اگتی ہے، مغالطے سے بچنے کے لئے یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اڈیٹر سے مراد محض اردو جرائد کے اڈیٹروں سے ہے اور اسی لئے ان کے دفتروں کو ہم نے بے دھڑک اور بلا خوف تردید مقامات کھنڈالا، یقین نہ آئے تو آپ بلا تکلف کسی بھی اردو رسالے یا اخبار کے دفتر میں جا دیکھئے، ردی کا ڈھیر، کاغذوں کا انبار، پرانے اخباروں کے فائلوں کے تودے، خس و خاشاک کی فراوانی اور دفتر کی "سازوسامانی" سے پوری پوری قنائیت برستی ہے، اکثر آپ کو اڈیٹر صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوگا، لیکن ہمیشہ آپ ان کو بے لگام پائینگے۔ وہ تو پریس والوں کا بل اور عملے کی تنخواہ کے کمر شکن تقاضوں کا خدا بھلا کرے کہ یہ حضرات اپنے آپ کو اس بستی کا باشندہ کہنے پر مجبور ہیں۔ اڈیٹر صاحب اور "مثو کانفرنس" کے ممبروں میں ایک وجہ مماثلت اور بھی ہے اور وہ یہ کہ تقریباً ہر اخبار کے اڈیٹر کو لیڈ (LEAD) کرنے کی خواہ مخواہ عادت ہو جاتی ہے، اور یہی وہ بیّن اثر ہے جو سیاسی بوٹی چرنے کا لازمی نتیجہ ہے۔

ذاتی تقسیم کے تحت میں بے شمار چہرے دکھائی پڑتے ہیں، فاضل الہیات اور کامل تاثرات کی مختصر گیری اور نازک اندامی سے لے کر مرحوم مولانا ہمدرد اور "ڈاکٹر سرگذشت" کی ؟ آبیت تک ہر ایک "فرما" موجود ہے، اکثر جگہ کرسی ادارت محض خالی سی نظر آتی ہے اور بعض جگہ صرف اڈیٹر صاحب ہی حدود بصارت پر حاوی ہو جاتے ہیں، پھر اونٹ اور بکری کا جوڑ بھی مفقود نہیں اگرچہ کمیاب ضرور ہے، جناب سہا کی ادبیت اور حضرت تبلیغ کے راجہ کی مہوائیت (خیال رہے کہ یہ لفظ محض لفظی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ شاید ہی کوئی رسالہ، دلی، گجرات، کاٹھیاواڑ، احمد آباد، برما اور ساؤتھ افریقہ سے ایسا نکلا ہے جو زیر سرپرستی حضرت خواجہ صاحب دہو) نوادرات میں سے ہے ویسے جوان سال نگین سیاہ بخت بلکہ قضاء بخت اکرم کی صوفیت اور ترک سامان دیدہ . . . . . خورشیدہ ڈاکٹر مرزا ابراہیم بیگ کی "ال بحیرت" بھی کچھ ایسے تضاد کی "سرگذشت" ہے کہ جس میں سوائے اڈیٹریت کوئی شے مشترک نہیں۔

رنگ روپ کی یہ تبدیلیاں عادات و خصلات پر بھی اثر ڈالے بغیر نہیں رہتیں، اس کو آپ ڈارون کا نظریہ ارتقا کہئے یا اللہ میاں کی قدرت مطلق، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ذہنی تبدیلی کے ساتھ جسمانی تبدیلی بھی ضروری ہے یا یوں کہو کہ جسمانی تبدیلی، دماغی تبدیلی کی پیش رو ہے، یہ مسئلہ ابتک معرض بحث میں ہے کہ یہاں بشیر احمد کی ادبیت ان کی ناسازی طبع کا باعث ہے یا ان کے مہین پن نے ان کو "مؤدب (ادیب)" بنا دیا ہے، اس موقعہ پر شاید کوئی صاحب "صد درجہ شاعرانہ" اور "صد درجہ غیر شاعرانہ" والی بحث کا اعادہ پسند فرمائیں تو ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ سب "خیال" کی "نیرنگیاں" ہیں ورنہ "نامہ نگار" کی "نیازمندی" ظاہر تھی۔ ہمارا پہلا نظریہ بہر صورت صحیح ثابت

ہوتا ہے یعنی معنوی تقسیم میں بہت کچھ صوری تفریق کا حامل ہے۔ اکثروں کی طرز فکر ، یا نکہت ، ان کی جسمانی حالت کا آئینہ ہوتی ہے ، ڈاڑھی کے وجود یا عدم وجود کی بابت آپ ایک دو صفحہ پڑھ کر سو فی صدی صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں ، اس مونچھوں کا معاملہ ٹیڑھا ہے (گو مونچھیں ہمیشہ سیدھی ہی ہوتی ہیں اور یا پھر صفاچٹ) کیونکہ اکثر کرزن فیشن اپ ٹوڈیٹ اور دقیانوسی سیناسی پنڈت میں مغالطہ سا ہو جاتا ہے۔

مزاج کی بشاشی بیزاری کیسر ہے ، کچھ تو اس وجہ سے کہ اڈیٹر صاحب بذات خود بہت کم ، ہجر خراشی ، فرماتے ہیں اور کچھ یوں کہ جب کبھی ، حروف دوزی ، کی بھی جاتی ہے تو اس پیرائے میں کہ جیسے آپ ، آپ ، نہیں ہیں بلکہ پریسیڈنٹ ہٹلر ہیں ، یعنی اڈیٹر لیا ہوئے بالکل ، نوپارٹی مین (NOPARTYMAN) ، ہو کر رہ گئے ، یا پھر آرٹ کبھر اصورت ، کہئے کہ خود سوچتے نہیں ، اگرچہ بولتے کافی زور سے ہیں ، پھر بھی جھلک ہی جاتی ہیں اور بعض دفعہ تو اس شان سے جھلک جاتے ہیں کہ آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں اکثر یہ ، سینا سوز ، صفہ اس درجہ تشخیص ہوتی ہے کہ مضمون بغیر ختم کئے بھی آپ ، ، نمیس التحریر ، کا پتہ لگا سکتے ہیں بعض کو جب تک وہ صبح و شام سوتے اور جاگتے صحت میں اور خواب میں بچے کی اماں کے ہاں بااختیاری میزبان راس سے مراد وہ خوش قسمت انسان ہے جس کے ہاں آپ بے بلائے نازل ہو جاتے ہیں) کے در دولت پہ نہ کھیں اور خوب بہت سا نہ کھیں اطمینان ہی نہیں ہوتا ، ایسے ، ، واقعان ، ، کا نام آپ کم از کم دس صفحہ پلٹنے سے پہلے ہرگز نہیں پا سکتے یہ حضرات ہم جیسے سلمی اور ضعیف المذہب لوگوں کے لئے کافی ورق گردانی کا باعث ہوتے ہیں کیونکہ ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ ، یہ دیکھو کہ کون لکھتا ہے اور یہ نہ دیکھو کیسا لکھتا ہے۔

اس کے بالکل برعکس ، کم گویاں ، اور ، مختصر نکمیاں ، ، کا فرقہ ہے ، یہ بقول ملا رموزی کے برسوں برساں میں بڑی ہمت اور جراءت سے کچھ لکھ لیتے ہیں اور پھر اس محنت سے ایسے نڈھال ہوتے ہیں کہ سالوں تک ایک حرف لکھنے کا دم نہیں رہتا ، میرے ایک ظریف کا خیال ہے کہ ان اصحاب کے لئے سنو ٹوجن ، پوسل وسفودین دنکارس ، خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا ، یا معزح اعظم کچھ بھی درست نہیں بلکہ جس چیز کی ان کو واقعی ضرورت ہے اور جو چیز ان کو اکثر اور زود لکھنے پر مائل کرے گی وہ خوراک فاقہ زدگی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ، ، یہ مختصر لکھ ، ، اصحاب بلا استثناء ، ، طوالت مجوزہ ، ، کے قسمل ہیں۔

جم کو چھوڑ کر نفس مضمون پر آیئے ، تو یہاں بھی آپ کو مختلف ٹولیاں صاف نظر آئیں گی ، بلکہ میں تو کہوں گا کہ ہر ایک کی ، ، طرز ، ، یا ، ، ادا ، ، یا ، ، طرز ادا ، ، یا جو کچھ بھی انجمن ترقی اردو والے STYLE کا ترجمہ کریں وہ بالکل مشخص اور ممتاز ہے سطحی طور پر ہم ان سب کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کریں گے ، سنجیدہ اور ظریف سنجیدگی کی حد ، ، سچ ، ، اور ، ، عرفان ، ، سمجھئے ، مولانا سچ کا فلسفہ اولاو مالبعد اگرچہ اجتماع ضدین کی ایک بین دلیل ہے ، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ، کہ آجکل ان کی صوفیت اردو کی سنجیدہ نگاری کا رکن عظیم ہے ، کہنے کو تو لوگ کہتے ہیں (اور کیا خبر سچ ہی کہتے ہیں) کہ آپ اس انسانی بستی سے کہیں اعلیٰ مقام پر تشریف فرما ہیں اور وہیں سے صحائف صداقت جاری فرماتے ہیں ، ، آپ کی تحریر سے آپ کے مافوق الانسان ہونے کا پتہ چلتا ہے مشتبہ ناظرین کو ہم بصد اصرار یقین دلاتے ہیں کہ دو شادیاں کرنا یا طلاق دینا انسان کو ماورائے انسان ہونے سے نہیں روکتا ، دیناوی آزدھرم کے بندوں کے لئے اللہ والے کے روح پرور وعظ عقبات میں سے ہیں۔

علم و عرفان ، کا ایک اور دریا ہے ، ، اعظم ، ، اردو سے نکلتا ہے اور شاید اردو ہی میں بہتا ہے اس حقیقی علمی سرچشمہ کے فیض سے اگر انکار ہو تو ملحد لیکن اس کے اڈیٹوریل کے تجاہل عارفانہ کو ہمارے اکثر احباب بہت زیادہ چٹخارے دار سمجھتے ہیں ، کسی مستشرق کی موت یا سالگرہ عربی کے مجوبہ اور کمیاب نسخہ جات اور کتب کی اطلاع اور مصری عالی کی تقریر تک تو خیر لیکن ، اسلامی انجمنوں اور جماعتوں پر دو شالے پوشش جتنے اور ان کے انجاد کا ہندی اور ہندوی اتحاد یوں کے ساتھ مقابلہ کچھ اس طرح فرماتے ہیں گویا آپ نہ ہندوستانی ہیں اور خدا نخواستہ) نہ مسلمان ، بلکہ آل وہائٹ سائمن کمیشن ہیں کہ کام کی ذمہ داری کچھ نہیں ہاں تبصرہ کرا لیجئے۔

سنجیدہ نویسی کا ایک ، ، واحد ، ، نمونہ دلی کے اس اجڑے کونے سے نکلتا ہے جو مغلی دور میں ، ، مشائخ ، ، زمانہ کا مسکن تھا ، یہ ، ، مشائخ کی تعلیم ، ، کا علمبردار خدا جانے کب سے نکل رہا ہے اور اسی شان سے نکل رہا ہے جیسا کہ شاید پہلے پہل نکلا ہوگا ، اس کی سنجیدگی واقعی قابل داد اور اس کی سادہ اور صلح جو روش لائق صد تحسین ہے ، کاش اس کی خشکی میں تھوڑا سا نمک بھی ہوتا ، تاکہ موجودہ ، ، زندہ دل ، ، اصحاب بھی دانستہ یا نادانستہ اس کے فیض سے فیضیاب ہو سکتے۔

، ، حق تو یہ ہے کہ ، ، اردو ، ، کی جو خدمت لوہے کے ٹائپ نے کی ہے وہ سنگ دل لیتھو کے بس کی نہ تھی ایک ، ، اللہ کے بندے نے زر ، زمین اور . . . . اس ایک مقصد کے پیچھے قربان کر دیئے اور بالآخر ثابت کر

دکھایا کہ اردو شعر و افسانہ کے علاوہ سنجیدہ علمی اور فنی تحریر کی بھی متحمل ہو سکتی ہے۔

ایک اور مقتدر تحریر بھی وقتاً فوقتاً آپ کی نظر سے گذری ہو گی "وقتاً فوقتاً" اس واسطے نہیں کہ خدانخواستہ آپ جو لذّ خرید نسیان کے پڑھنے میں بے قاعدہ ہیں بلکہ اسلئے کہ اکثر "ملک، وملت کی "ظفر" و نصرت شکست وزندان میں تبدیل ہو جاتی ہے" اور بے چارہ "ناظر" بھی مالک کے ساتھ روپوش ہو جاتا ہے کچھ یہ بھی ضروری نہیں کہ قید فرنگ ہی اس کی روپوشی کا باعث ہو، اکثر اور اکثر تر بار خانگی ملالت، تبدیلی مکان، انتقال مطبع، بقایا گذشتہ، فقدان مضامین اور کمیابی ناظرین اس کی عارضی غیر حاضری کی وجہ ہوتی ہے، یا پھر منیجر کی سخاوت یا مطبع کی عنایت سے آپ ایک ہی پارسل میں دو تین رسائل اکٹھے ہی پا لیں گے، اور بھی زیادہ آسان نسخہ یہ ہے کہ ایک ہی ٹائٹل پیج پر جنوری، فروری تاریخ لکھ دیا جائے گا، اور گویا آپ پر تثلیث و توحید کا پیچیدہ مسئلہ یوں واضح ہو جائے گا۔ پھر مضامین ملاحظہ فرمائیے تو سب تنقیدی، سیاسی، علمی، ادبی غرضیکہ کوئی ایسی مجلس یا تحریک نہیں جس پر اس کا نشتر تیز نہ رہتا ہو، آپ کتنا ہی اعلیٰ درجہ کا تعریفی مضمون لکھ کر بھیج دیکھئے، اس کے چھپنے کا انتظار گویا انتظار یار کا لطف دے جائے گا۔ ہاں تخریبی تنقید، نکتہ چینی طعن و تشنیع پہلی ہی اشاعت میں نمایاں جگہ پائیں گے۔

پھر ہمہ دان "نیاز مندی" بھی اپنی جگہ قطب مینار کی طرح مستحکم ہے (گو لوگ کہتے ہیں کہ قطب مینار کا سر تاڑ کر نیچے رکھ دیا گیا ہے کیونکہ وہ کچھ جھک سا گیا تھا) اور سچ تو یہ ہے کہ قطب مینار کے نقش و نگار بھی "نیاز مندی" "نگار" کے نقوش کے سامنے مات ہیں اپنی تو ہم کہتے ہیں کہ جب کبھی خوش قسمتی سے یہ صحیفہ منزل دیکھنے میں آیا۔ ایک غیر مرئی حس لاہوتی نے اس کالبد خاکی میں لا زمان و لامکان ارتعاش تنشیط کی لہر پیدا کر دی، پھر استفسارات اور ان کے جوابات کو ملاحظہ فرمائیے تو بقول گولڈ سمتھ عقل حیران ہوتی ہے کہ آخر اس چھوٹے سے سر میں کونسا ایسا علم ہے جو معہ اپنی توسیع و طوالت کل کا کل سمایا ہوا نہ ہو، حضرت عیسیٰ کی ولادت و وفات زیر بحث ہے یا شوپنہار کا فلسفہ، امریکہ کی اقتصادی تنظیم، ارجنٹائن کا نظام جمہوریت کنفیوشس کی تعلیم، ملیریا کے جراثیم، کرکٹ ٹسٹ میچ، بھاشا کی شاعری، ہولی وڈ کی مہوش ایکٹروں کے خانگی حالات گول میز کانفرنس، شادی کی ضرورت، ڈربی گھوڑ دوڑ، امام مالک کی کیا ب تصنیف، جنوبی افریقہ کی صنعتی پیداوار، شکسپیر کی ٹریجڈی، بچہ سقہ کے سوانح غرضیکہ کچھ ہو اور کیا ہی ہو مکمل اور علمی جواب سے سب کو نواز دیا جاتا ہے بعض حاسدوں کا خیال ہے کہ اڈیٹر صاحب کے گھر میں ایک انسائیکلوپیڈیا ایک Who's Who ایک سال نوال کا Almanack اور ایک Year Book اور قاموس ہمیشہ موجود رہتی ہیں، اور جو مضمون ان کتابوں میں بھی نہیں ملتا اس کا جواب "جگہ کی قلت اور سوالات کی کثرت" کی وجہ سے نہیں دیا جاتا۔

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ چند اہل نظر اصحاب نے سادہ اور ظرافت آمیز طرز تحریر کی اہمیت محسوس کرتے ہوئے اس کو رواج دینا چاہا تھا، ان کی کوشش قابل صد ستائش، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہر بوالہوس نے ظرافت نگاری پر ہلّہ بول دیا جس کو دیکھو "مارک ٹوین" کے کان کاٹنے پر مستعد اور "وڈ ہاوس" کو چٹانے پر ملازار بند لبستہ "یہاں تک کہ بیچارے رشید صدیقی حاجی لقلق، سلطان احمد جوش، پطرس، عظمت اللہ دہلوی اور آغا حیدر حسن جیسے امن پسند دل دگرفتہ کے طرح اپنا سا منہ لیکر ہو بیٹھے۔ بس شاباش ہے تو ایک ملا رموزی کو کہ دنیا بھر کی خرافات کا ترکی بترکی جواب دے جاتے ہیں اور سننے میں آیا ہے کہ ان کو اپنی فتح کا کچھ کچھ یقین بھی ہو چلا ہے خدا کرے یہ سچ ہو لیکن ہمیں تو اُس متمول چماری کی کہانی بیساختہ یاد آتی ہے جس کی شادی نسبتاً غریب چمار سے ہوئی تھی، یہ بیچارہ ابھی تک جوتے اور چمڑے ہی کا کام کرتا تھا نئی دلہن نے پہلے ہی دن ناقابل برداشت بدبو کی سخت شکایت کی اور ہر روز اس کا اعادہ کرتی رہی حتیٰ کہ ایک مہینہ بعد جبکہ بدبو کا عرکس کی قوت شامہ پر حاوی ہو چکی تو اس نے فخریہ اعلان کر دیا کہ یہ آنجناب کے قدموں کی برکت تھی کہ اس گھر سے اس مینی سوز بدبو کا خاتمہ ہوا۔

ہماری سمجھ میں ابھی تک یہ نہیں آیا ہے کہ موجودہ ظرافت اور ابتذال میں میں فرق کیا ہے، "موجودہ ظریف جرائد" کی شستگی مذاق کا پتہ پہلے ہی صفحہ سے چلتا ہے "گڑ بڑ گھٹالا" "گڑ و گھنٹال" "ٹر گزا" "چر چوں" جیسے سبک اور شیریں الفاظ ادب میں انمول اضافہ ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسے حضرات ظرافت سے اتنے ہی دور ہیں جتنے سنجیدگی سے، وہ مضمون کو دلچسپ نہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ بنا سکتے ہیں، بلکہ صرف الفاظ کو "بقدر ہمت خود" بیباکت اور سبل ڈھال کر خراج تحسین کے طالب ہوتے ہیں، گلابی اردو، نرالی اردو وغیرہ اتنی ہی مذاحیہ ہیں جتنی کہ بھانڈوں کی نقل یا بہت کہو تو نصیرا کا سوانگ، اصل میں وقت یہ ہے ہی جو کہ ہر وہ بد بہار فرزند بہارت جس نے چار جماعتیں پڑھ کر مردم شماری کے فارم پر اپنا نام لکھے پڑھوں میں درج کرا لیا ہے اپنے کو علامہ شبلی اور حضرت صدیقی سے کسی طرح کم نہیں سمجھتا میرے ایک مہربان (جو اس دفعہ ماشاء اللہ پانچویں دفعہ انٹرنس کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں) سات سو صفحات کی ایک

کتاب شائع کرنے والے ہیں، تھوڑی سی کسر بس یہی رہ رہی ہے کہ اب تک کوئی مناسب نام تجویز نہیں ہو سکا۔ میں نے پوچھا "بھائی جان کتاب ہے کس مضمون پر؟" فرماتے ہیں "واہ صاحب واہ۔ وقت تو یہی آ رہا ہے، ابھی مضمون کا پتہ نہیں چل رہا ہے ورنہ پھر نام رکھنے میں کا ہے کی دیر تھی"۔

ظریفوں کا فرداً فرداً تعارف کرانا اغلباً نہیں بلکہ یقیناً خوش مذاقی پر ظلم کرنا ہے ان سب کی ظرافت اکثر و بیشتر اپنی ہونے والی بیوی پر پھبتی اور فقرہ بازی پر محدود ہے ان حضرات کے بقول "ان" یا "اچھے کی اماں" کا استعمال ہر ایک حشو کو مزاحیہ تحریر بنانے کے لئے کافی ہے۔ پھر اس ضمن میں اس بیچاری پر ہر قسم کے اخلاقی، مذہبی، اور تہذیبی بہتان اٹھائے جاتے ہیں۔ اکبرآباد کے ایک مشہور رسالہ کے اڈیٹر کی حد ظرافت یہی ہے کہ وہ اپنی ان کو خودغرض اور چٹوری ثابت کریں، کبھی سنتروں کی چوری کی کہانی ہے تو کبھی حضرت کے علی گڑھ تک کے تھرڈ کلاس کے کرایہ میں سے بھی پان چھالیہ کا معاملہ، المختصر ان ظریف حضرات کی بیویاں بلا استثنا "کلے دراز، خودغرض، سیسری" "اپنے" "ان" پر حاوی اور دو ایک صورتوں میں تو مردمار بھی ہوتی ہیں جن سے نہ صرف "وہ" بلکہ ہم جیسے معصوم ناظرین بھی لرزہ براندام ہیں۔

بحیثیت ظرافت اور بحیثیت سنجیدہ نگاری کی درمیانی خلیج بہت وسیع ہے ملک کے اسی فی صدی ادیبوں کو اسی بستی کا باشندہ سمجھئے کہ وہ ظریف بھی ہیں اور سنجیدہ نگار بھی، بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ یہ ہمہ گیری خصوصیات ملکی میں سے ہے، اکثر و بیشتر رسالے بزعم خود منطقی، ادبی، فلسفی، اخلاقی، علمی، سیاسی، ظریفی، تنقیدی، صنعتی، طبی، مذہبی، تمدنی، تجارتی، معاشی، قانونی، زراعتی، تاریخی مضامین کی پوٹ ہوتے ہیں، گو تا تمثیل تاریخ کے علاوہ ان رسائل کے صفحات سوائے چند مہمل ترین اشتہارات کے اور کچھ پیش نہیں کر سکتے، اغلباً چچا مرحوم کا مصرع ؎ محتسب را درونِ خانہ چہ کار" ان حضرات کا مشعل راہ ہو۔

گالی گلوچ بھی ہمارے جرائد کی ایک شان امتیازی سمجھئے، اور واقعی جو جوہر ہیں اس پیشہ میں حاصل ہو گئی ہے وہ قابل صد ستائش ہے شبلی مرحوم نے الندوہ میں سب سے پہلے شذرات لکھکر واقعی جواہر پیئے اور موتی رولے ہیں، لیکن بیچارے کے فرشتوں کو بھی اس وقت معلوم نہ ہو گا کہ ان سونے کے ٹکڑوں کو تبع تابعین آہنی گولیوں میں تبدیل کر لیں گے اور ایک دوسرے پر نہایت سخاوت سے نچھاور کریں گے، اب وہ شذرات ہوں یا افکار و حوادث فیہ ما فیہ ہوں یا گذارش احوال، وہ دو باتیں ہوں یا رازونیاز یا ستم، تخریب رقیب کے لئے وقف ہوتے ہیں، ذاتی رنجشوں اور خاندانی اور نجی کدورتوں کے اظہار کا بہترین مواد بس انہی ابتدائی صفحات کو سمجھئے پھر اس کے رسائل میں بعض کو افضلیت کا فخر حاصل ہے۔

کام اور درجہ کے اعتبار سے بھی بتفصیل کئی طرح کے اڈیٹروں سے جناب کو نیاز حاصل ہو گا۔ کچھ عرصہ قبل میری طرح کئی ایک اور اصحاب بھی اس واہمہ میں مبتلا تھے کہ ہر ایک اڈیٹر کم از کم کچھ تو لکھنے کا اہل ہوتا ہی ہو گا، لیکن شکر ہے ہمارا یہ خوف جلد ہی زائل ہو گیا۔ اب صیغہ جمع متکلم استعمال کرنے والے اور ڈائری لکھنے والے معمولی اڈیٹروں کے علاوہ اور حضرات بھی اس کرسی کو زینت بخشنے لگے ہیں ان میں سب سے پہلی تو وہ صنف ہے جس کو تیز اعتراض کہوں گا، گو میرے بعض جھگڑالو احباب ان کو بھاڑے کا ٹٹو یا کرایہ کا بکرا کہنا زیادہ مناسب تصور فرماتے ہیں، یہ پریس ایکٹ کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آئے اور ان کا واحد مقصد یہی ہے کہ اہل قلم حضرات کو بے دھڑک لکھنے دیں اور وقت گرفت سیلے چونا و چراغ گردن آگے بڑھا دیں۔

پھر ایک نئی شق تجارتی اڈیٹر ہوں کی ہے ان حضرات کا مقصد اولی اپنے مطبع اور کتب خانہ کا اشتہار ہوتا ہے پیسے رسائل کا ذریعہ ہے، معلوم ہاں اشاعت عام کی خاطر "نئی روشنی" کے پردہ میں فلم ایکٹرسوں کی تصاویر اور ان کے نام سے خود نوشتہ مضامین مزید طبع کئے جاتے ہیں اور بس۔

ویسے اشتہاری یا آنریری (جن کو بعض اصحاب اناڑی کہتے ہیں) اڈیٹر بھی ناپید نہیں، ان حضرات کا یہ کام ہے کہ کبھی کچھ کام نہ کریں، بس ان کو کمپنی کا لیبل سمجھئے یا خیر ٹریڈ مارک سہی۔

اڈیٹروں کی اکثریت یا شاید نسبتی کو بھی تو ترا وہ اہتمام سے استعمال کرتی ہے جیسے کہ بہت زعفرین ہو ہو کر پاس ہونے والے گریجویٹ اپنے نام کے آگے بی اے لکھنا فرض سمجھتے ہیں، پھر اس ضمن میں وہ وہ گلفشانیاں نظر آتی ہیں کہ بے ساختہ کسی کی زرخیزی دماغ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نام کے علاوہ سکونت کو بھی مکون نہیں، مناسب مقام سے نسبت جتانی تو خیر جائز ہی نہیں، احسن بھی ہے، لیکن گونڈوی، بچھڑایونی قصوری، جہتکار پوری بنکنے سے تو کچھ نہ لکھنا اچھا ہے۔

بعض کے نزدیک حق اڈیٹری بھی امامت کی طرح موروثی ہے اور باپ کے بعد وہ بیش فرزند اکبر کے حصہ میں جانی چاہئے، دو ایک جگہ تو حضرت قبلہ حیات ہی ہیں

اس منصب جلیلہ کے حق پسر دست بردار ہو گئے ہیں اور اس کو "عصمت" کا نگہبان قرار دیا ہے، مگر بعض جگہ بضرورت صرف اس وقت لاحق ہوتی ہے جب "فیہ رنگ" "زمیندار" اول کو انصرام خدمت سے معذور کر دے۔

ایک دلچسپ صنف ادب بھی ہے جس کے سرسری حوالے کے بغیر مضمون ختم کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اور وہ ہے "کالج ایڈیٹر" اور تمام ایڈیٹروں سے کالج کا ایڈیٹر اکثر باتوں میں بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ایڈیٹر بالکل پہرے کے سپاہی کی طرح متفرق اوقات پر بدلے جاتے ہیں اور اسی لئے جو تنوع کالج کے رسالے میں ہوتا ہے وہ اور کہیں نہیں پایا جاتا۔ اڈیٹر کا انتخاب پرنسپل صاحب سے متعدد جاہ کی صحبتوں کے بعد یقینی سا ہو جاتا ہے۔ گو یہ ابھی سننے میں نہیں آیا کہ ان دعوتوں کا بار پرنسپل صاحب پر پڑتا ہے یا لائق امیدوار پر۔

اب صرف "اڈیٹرنیں" رہ گئی ہیں، سو ان پر یوں جادہ بے جا چلانے کرنا ہماری شان مردانگی سے کوسوں دور ہے، ہاں بشرط فرصت کسی اور صحبت میں بیوی کے نام کے پردے میں ہو کر ان شیکسپئر محل کی دیویوں کی بھی دعائی کی جائے گی۔

اسد انوری۔ فرید آبادی



حجّن بی

از جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صوفی

تمام دن موسلا دھار پانی پڑتا رہا۔ میں صبح سے کہیں نہیں نکلا تھا۔ اپنے کتب خانے میں ہی قید تھا کتابیں اس میں شک نہیں تفریح کا ذریعہ ضرور ہیں لیکن جب آدمی تمام دن پڑھے اور پڑھنے بھی مجبوراً وقت کاٹنے کو تو معلوم نہیں ان میں وہ دلچسپی کیوں نہیں رہتی !

شام کو خدا خدا کر کے بارش رکی، میں تو ادھار کھائے بیٹھا تھا فوراً باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

اتنی اچھی شام کو اکیلے ٹہلنے جانا۔ میں نے سوچا، ٹھیک نہیں لیکن ساتھ کس کو لوں !

جمشید کو نہیں وہ بہت دور رہتا ہے۔
بشیر کو وہ کمبخت پڑھ رہا ہوگا۔
حبیب کو اس کی بیوی اس کو کب چھٹی دیتی ہے۔
ہاشم کو دس منٹ میں تیار ہوگا۔

آخر بہت سوچنے بچارنے کے بعد فیصلہ کیا کہ حفیظ کو ساتھ لوں، میں اس سے کئی دن سے ملا بھی نہیں۔

میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوا وہ تو تھا نہیں، اس کا نوکر کمرہ صاف کر رہا تھا۔

میاں ہیں ؟ میں نے پوچھا۔

جی نہیں - وہ تو گئے

کب ! میں نے تعجب سے پوچھا۔

کوئی چار بجے گئے تھے صاحب !"

کہاں ؟ میں نے اس سے پوچھا کہ میں بھی وہیں جا پہنچوں۔

یہاں سے قمر صاحب کے ہاں گئے ہیں، وہاں سے وہ دونوں ریگل جائیں گے اور پھر وہاں اوپر سرکار ڈانس ہے۔ وہ وہاں جائیں گے۔

اچھا۔ ہم کو ایک پان لا دو۔ اور بیگم صاحبہ کو ہمارا سلام بولو۔

بیگم صاحبہ تو بیمار ہیں۔ صبح سے تین دفعہ تو مجھے ہی چھوٹی بیگم نے ڈاکٹر صاحب کے پاس بھیجا۔

تو پھر ہماری طرف سے مزاج بھی پوچھ لینا، ہم چلے۔

پان تو لے آؤں، صاحب ،

نہیں تکلیف مت دو، تمہاری چھوٹی بیگم پریشان ہوں گی۔

حضور میں ابھی لاؤں گا۔

تو پھر جلدی کرنا۔

شام خوبصورت تھی ——— میں روز تو سگرٹ نوشی پر لعنت بھیجا کرتا تھا لیکن آج اگر نہ پیتا ہوتا، تو اتنی اچھی شام سے ہرگز محظوظ نہیں ہو سکتا تھا میرے سگرٹ کیس میں پورے بیس سگرٹ تھے، اس لئے اطمینان و بے فکری کے ساتھ باغ چلا گیا، اور وہاں بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

واپسی کے وقت بالکل اندھیرا ہو چکا تھا میں بہت کافی راستہ طے کر چکا تھا اور کالج کے پل پر سے گزر رہا تھا۔

اللہ ! دے۔ دے . . .

نام دے۔ دے . . . .

غریب لاچار محتاج . . .

مالک الملک توتی الملک من تشاء . . .

ان ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ہوتی ۔

"اور یہ جو تیں ہم ۔ نہ ۔ نہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی ایک دفعہ اس زینہ پر سے گذرے ہوں لیکن میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں، میرے کان ان آوازوں سے جن میں خواہ مخواہ درد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے آشنا ہو چکے ہیں، کیونکہ میں تقریباً ہر روز وہاں سے گذرتا ہوں۔

میں سیڑھیوں پر سے اتر رہا تھا، کہ میرے کان میں ایک آواز آئی خدا جانے معلوم ہوا کسی نے حلق بند کر دیا ہے، آواز میں درد تھی، اور وہ ان سب تصنع آوازوں سے بالکل مختلف تھی میں کچھ متوجہ ہوا۔

میں نے دیکھا کہ پہلی سیڑھی پر، دیوار سے پیٹھ لگائے ہوئے ایک عورت برقعے میں چھپی ہوئی، سر جھکائے بے حس و حرکت کھڑی ہے۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی ۔۔۔ میں اسے جانتا تھا۔

کوئی دس سال کا عرصہ ہوا جب میں چھوٹا سا تھا، ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے، وہ بہت نیک تھے اور کسی چیز کی تجارت کیا کرتے تھے۔

میں اور بہت سارے بچے ان کے گھر میں جا کر کھیلا کرتے تھے گھر میں نیم کا درخت تھا اور اس میں بارہ مہینے جھولا پڑا رہا کرتا تھا، اگرچہ جاڑوں میں اور لو کے موسم میں دوپہر کو جھولنے کی ممانعت ہو جاتی تھی۔

اِسی گھر میں ایک بڑی بی رہا کرتی تھیں، بڑی نمازی اور پرہیزگار، کہا کرتی تھیں کہ اگر ایک نماز باجماعت پڑھی ہو تو پانچسو نمازوں کا اکٹھا ثواب ملتا ہے میں نے جتنی نمازیں باجماعت پڑھیں تھیں ان کو یاد تھیں، پانچسو سے ضرب دے کر رکھ چھوڑی تھیں، تاکہ اتنی نمازیں نہ پڑھوں اور حساب برابر کر لوں۔

میں ان کو نانی اماں کہا کرتا تھا، مجھ پر کیا موقوف ہے، گلی کے سب بچے ہماری اماں، بی ماما، نوکر اور محلے والیاں سب انھیں، نانی اماں کہا کرتے تھے، کوئی خالہ اماں، پھوپی اماں، آپا، بہن، نہیں کہا کرتا تھا، کیونکہ ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا تھا، صرف یہی ان کو اماں جان کہا کرتی تھیں۔

"آخر تمہیں پوچھکر کیا مل جائیگا؟"

بہت اصرار کے بعد راضی ہوئیں۔

"تم کو بھلا کیا یاد ہوگا، تم تھے ہی کتنے بڑے، اس زمانے میں جب ہم نے تمہاری گلی کا مکان چھوڑا اور اپنے مکان میں گئے، ہماری مصیبت کا آغاز ہوا، سب سے پہلے تو محمد احمد کے ابا کا انتقال ہوا۔"

محمد احمد کے نام سے میرے آنکھوں میں ایک شکل پھر گئی۔

"سچ پوچھو تو ہماری مصیبت کی ابتدا تھی، مصیبت تو میں نہیں کہتی، کیونکہ خدا نے عزت و آبرو کو ہمیشہ بچائے رکھا، میاں جب گھر کا کوئی سر دھرا نہ ہو تبھی پر مصیبت آتی ہے۔

میں نے محمد احمد کے ابا کا مرنا جیسا جتنی بھی توفیق تھی اچھی طرح کیا، نیاز نذر، مسجد، ملانوں، کسی سے بھی گریز نہیں کی۔

ایک دفعہ تو وہ اور میں حج کر آئے تھے، لیکن دل چاہتا تھا کہ ایک دفعہ اور اس پاک زمین کی زیارت کر آؤں، اور ان کا حج بدل بھی کروا دوں اپنے مالک کے قربان جاؤں، اس نے یہ خواہش بھی پوری کروا دی۔

واپسی میں میرا سہلاپا، ایک عورت سے ہو گیا، وہ ایسے مزے کی باتیں کرتیں کہ میں دن بھر جہاز میں انھیں کے پاس بیٹھی رہا کرتی، اٹھنے کو دل ہی نہ چاہتا تھا، اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی دلی کی رہنے والی تھیں، اور ہمارے گھر سے کوئی جیسے ڈولی پر رہتی تھیں، میرا ان کا دلی کے اسٹیشن تک ساتھ ہوا، جب دلی قریب آگئی تو میں نے کہا، "بہن کہیں ایسی طوطا چشمی نہ کرنا کہ ملو بھی نہیں۔"

انھوں نے وعدہ کیا اور کہا بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے!"

دِلی میں اُن کی آمد و رفت ہمارے ہاں ہو گئی، اور سہلاپا بڑھتا گیا۔

ایک دفعہ میں خرچ سے بہت پریشان تھی، کرایہ داروں نے کرایہ دیا نہیں تھا میرے پاس جتنے روپے تھے محمد احمد کے ہونے میں اٹھ چکی تھی، ٹیکس والے کمبخت ناک میں دم کئے دیتے تھے، آخر اشتہار لگ گئے کہ جائداد کے کواڑوں کا نیلام ہوگا۔

میں بہت پریشان تھی، کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی، آخر میں نے ڈولی بھیجکر انہیں بلایا۔

"اے ہے بہن، یہ بھی کوئی فکر کرنے کی بات ہے، ہر انسان پر ایسا وقت پڑتا ہے ـــــــ لیکن یہ بہنا پا آخر کس دن کیلئے

... تمہاری بہت ... کہیں سے اس وقت انتظام
کر دو ... اگر ... رہی تو کوئی ... بیان کرنے کی ... ہو
کرتا ... کو زندہ رکھے اور کبھی قابل کرے، اور ... ۔
تم کیسی باتیں کرتی ہو، سو ... کہ حقیقت ہی کیا ہے، تمہارے نقشے
پیسے تو ان کو ... کرنے آخر آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے۔
اچھا بہن۔ میں اپنے زیور سے رکھوا دوں گی۔
لاحول ولا، کیا مجھکو تمہارا اعتبار نہیں۔

مولوی قرآن شریف تو ختم کر ہی چکا تھا میں نے فتحپوری میں اس کو داخل
کرا دیا تھا، ہماری زندگی اطمینان سے گذر رہی تھی، بیرے اور جن بی کے تعلقات
روز بروز بڑھتے جاتے تھے۔ اسی طرح تین چار سال گذر گئے۔
ایک دن وہ آئیں اور کہنے لگیں: بہن تم سے ایک کام ہے۔
کہو، میں نے کہا، ایک کیا، ہزار بھی ہوں تو میں کرنے کو تیار ہوں۔
کہنے لگیں، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی لڑکی اور لڑکے دونوں کی شادی قرار پا گئی
ہے۔ آپ ہمارے ہاں کبھی نہیں آئیں، شادی میں تو ایک مہینے پہلے سے
آنا ہوگا۔

"اے ہے۔ تو خدا رکھے کب ہے؟
یہی رجب کے چاند۔ کل چھ مہینے تو رہ ہی گئے ہیں۔
آنکھ بند کرنے میں گذر جائیں گے
خدا تمہیں ... نصیب کرے، میں تو یہ دعا مانگتی ہوں۔
ہاں ... لیکن ابھی مولوی کسی لائق تو ہو جائے۔
... سب کچھ سکھا دے گی، اپنے ہم عمروں میں تو سب سے اچھا ہے۔
ہاں۔ ... خدا کا شکر ہے۔ مولوی صاحب بھی کہہ رہے تھے۔
اچھا۔ اصل کام جس کے لئے آئی تھی۔ وہ تو بھولی جا رہی ہوں۔
وہ کیا؟
آپ کی ... کو کچھ چڑھاوا کی بھی ... نہیں۔
اے ... تم چڑھاؤ۔
... کہ ... تم سے ... اس کام ہیت، اور پھر ... کو ... دکھانا ہے۔ کہ کسی بات میں سبکی نہ ہو

"اس میں کیا شک ہے۔
ابھی کر کر آتی ہوں کہ سنار کو بلا کر لائیں، اور گھر پر بٹھا کر سب ہاتھ
گلے کی چیزیں بنوائیں، بہنے تو آجکل کی سادہ کاری چیزیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں
روز ایک نہ ایک روگ رہتا ہے، آج یہ ٹوٹا، کل وہ خراب ہو گیا، بس تھوڑی دیر
کی سوبھا ہوتی ہے۔
"ہاں ——!
اپنے پرانے زمانے کی چیزیں بھی ایسی ہوتی تھیں کہ دادا لے اور پوتا برتے
آج کل کی نیتیں بھی خراب چیزیں بھی خراب، جیسے ایمان بودے ویسے ہر چیز
بودی۔
" یہ تو بالکل ٹھیک کہتی ہو۔
اب سب کہتے ہیں کہ وہ زمانہ نہیں، جیسا دیس ویسا بھیس، وقت کے
مطابق کام کرو۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ ارے ہم تو وہی ہیں، ہم سے تو جان
بوجھ کر یہ ہو نہیں سکتا، ان لوگوں کا کیا، آج کہتے ہیں یہ وضع پرانی ہے، یہ گنوار
کل کہیں گے، اماں نانی، دادی سب پرانی ہیں، بکواس ہے، ان کو بھی بدلو، نئی وضع
کی لاؤ، ہے نا بہن! کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔
"بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ بہن:
" لو بات کہاں سے کہاں جا نکلی، اصل مطلب کا بند تو یہ ہے کہ اگر تمہیں میرا
اعتبار ہو تو ——"
ہوں۔ اعتبار کیوں نہیں۔
—— تو آپ مجھکو اپنا کچھ زیور دیدیں تاکہ میں بھی ویسا ہی بنواؤں، میں نے
اپنی سب چیزیں سنار کو گلانے کے لئے دیدی ہیں کہ اول ان کی ... کیوں
نہ وقت پر دی جائے، ہمارا کیا ہے، اور اگر خدا چاہے تو خولانے کو نسی
دیر لگتی ہے۔
"تو آخر کیا کیا چڑھاؤ گی۔
چڑھاوا تو زیادہ نہیں دوں گی، میاں جب گھر آ جائے گی تو سب کچھ اسی
کا ہے۔ بس یہی ... نتھ، ایک چیز گلے میں، ایک ہاتھ میں، اور
زیور ... تو ... بس ایک ہی قسم کی چیزیں ... اور نتھ تو ... کے لئے
ہوتا ہے، سب چیزیں تو ایک جیسی ... کی ... ہوں، تہذیب کو البتہ
تمہارا ... دوں گی۔
"تو تم میرا صندوقچہ لے جاؤ۔

نہیں بنیں تو سب کا کہا کروں گی۔
تو کہاں روز روز ایک ایک چیز کے لئے آئی پھروں گی۔
۔۔ یہ تو ٹھیک کہتی ہو۔

اس کے بعد وہ تو کبھی کبھی آئیں، ورنہ روز روز جیسے کہ بقرے آتے تھے کہ آج اس بات کی سمدھیانے سے سوغاتی آئی ہے، اور آج اس کی منگنی آج مولود شریف تھا، آج کونڈے تھے، اور آج بی بی کی نیاز تھی، آج لڑکیاں ... سے آیا ہے۔

میں دعا کرتی تھی کہ اللہ جیسا اس کو سمدھیانہ ملا ہے، مجھ کو بھی ملے۔

رجب کا چاند آیا تو معلوم ہوا کہ لڑکے کے ابا گر پڑے شادی بڑھ گئی ہے، شعبان، رمضان، عید وغیرہ گزر گئے، کسی نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔

میرے دل میں کبھی کبھی خیال آتا، کہ زیور کا معاملہ ہے دل میں بدی آتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میں پھر اپنے اوپر لعنت بھیجتی کہ کمبخت تو کیسے سوا اس دل میں لاتی ہے، تیری اپنی ہی نیت بری ہے جو تجھ کو ایسا سمجھتی ہے شادی بیاہ کا کام تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے آپے کا ہوش نہیں رہتا۔

اسی طرح بہت دن تک دل کو سمجھاتی رہی، آخر ایک دن وہ نہ مانا اور میں نے محمد احمد سے کہا کہ بیٹا تیری خالہ جن کہاں سے دوسرے سے خیر خبر نہیں آئی معلوم نہیں وہ کیسی ہیں، خدا جا کر خیر صلاح تو لے آ۔

محمد احمد نے آکر کہا کہ ہاں خیریت ہے وہ خود کل آئیں گی، دوسرے دن وہ آئیں تو اپنی مصیبت سنانے لگیں کہ لڑکے کے ابا کے پاؤں میں گھٹنے سے ایسی موچ آئی کہ بیچارے چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے، سب قسم کے علاج معالجہ کر لئے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، اب کوئی آٹھ دن ہوئے کہ ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس نے کہا کہ معاملہ بہت بڑھ گیا ہے، ٹانگ کاٹے بغیر گزارا نہیں، ورنہ دو چار دشمن جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے، ایک عجیب مشکل میں سب گرفتار ہیں، اگر ٹانگ کٹواتے ہیں تو ایک تو عمر بھر کے لئے عیب لگ جاتا ہے دوسرے اس عمر میں ایسی تکلیف کیسے برداشت کر سکیں گے۔ میں نے تو کہہ دیا کہ جراح کا ہی علاج کراؤ ان کمبخت ڈاکٹروں کو تو بس ایسی ہی باتیں سوجھتی ہیں۔

میں بھول گئی، اور میں نے زیور کا تذکرہ تک نہیں کیا۔

کچھ دنوں کے لئے تو جی بالکل اطمینان ہو گیا، لیکن پھر وہی کھد بد شروع ہو گئی

آخر ایک دن میں نے کہار کے ہاتھ بے شرم بن کر کہلا ہی بھیجا کہ مجھ کو کل شادی میں جانا ہے اور ہاتھ گلے سے ننگی ہوں، بہن کی بڑی مہربانی ہو گی اگر وہ زیور کا صندوقچہ بھیج دیں اگر سب نہ بھیجیں تو ایک آدہ چیز تو ضرور بھیج دیں۔

انہوں نے اس کے جواب میں کہلا بھیجا کہ کیا کروں بہت شرمندہ ہوں کہ اس وقت نہیں بھیج سکتی، ایسی پریشانی میں مبتلا ہوں کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے اس وقت تو نہیں بھیج سکتی ہاں دو چار روز میں انشاء اللہ بھیج دوں گی۔

پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ میں تقاضا کرتی اور وہ وہاں سے انکار ہوتا وہ روز نئے بہانے کر بھیجتیں، کبھی کہتیں کہ سنار باہر پر دلیس گیا ہوا ہے جب وہ آجائے گا فوراً بھیج دوں گی، مرمت کریں، اپنا معتبر آدمی ہے کبھی شام کو بھیج دوں گی۔

غرض اس ٹال مٹول میں کئی مہینے گذر گئے، میں نے محمد احمد سے کہا کہ یہ انداز کچھ اچھے نہیں لگتے۔

وہ کہنے لگا ایسا بھی کیا اندھیر ہے ہم سرکار کے ذریعہ وصول کر لیں گے ابھی کچہری عدالت تو کھلی ہوئی ہے۔

میں نے کہا، بیٹا جب ایمان خراب ہو جائے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔

میرا تو ماتھا ٹھنک رہا ہے وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اس دن سے مجھے اور محمد احمد کو لاگ لگ گئی، کیونکہ خدا بخشے ان کی حق حلال کی عمر بھر کی کمائی بس وہ ہی تھی، مکان تو ایک آدہ ہی تھے، محمد احمد نے کئی وکیلوں سے مشورہ کیا، اور آخرکار ایک وکیل صاحب سے معاملہ ہو گیا، اور ہم نے جج بی بی پر دعویٰ دائر کر دیا، اب تک تو یہی تھا کہ صرف اپنی پونجی دوسرے کے پاس ہے لیکن دعویٰ دائر کرنے کے بعد سینکڑوں قسم کی اور مصیبتیں گلے پڑ گئیں، مقدمے کی بھاگ دوڑ اور محنت تو الگ رہی، اس کے اخراجات نے ناک میں دم کر دیا تھا، روز ایک ایک چیز کے لئے بھر مٹھی روپے چاہئے ہوتے، آج وکیل صاحب کی فیس دینی ہے آج منشی محنتانہ طلب کر رہا ہے، سمنوں کی تعمیل کے لئے روپے دو نوٹس کی فیس چاہئے، اسٹامپ خریدنے ہیں، اور رشوتوں کا تو ذکر ہی کیا، روپیہ لئے بغیر چپڑاسی تک سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔

ہمارا خیال تھا کہ تھوڑے دن میں فیصلہ ہو جائے گا، بات ہی کونسی لمبی چوڑی تھی، وکیل صاحب نے بھی کہا تھا کہ یہی دو چار پیشی میں مقدمہ ختم ہو جائے گا لیکن وہاں دو تین مہینے تو ایک پیشی ہوتی تھی۔

ہم کو ان باتوں کی کیا خبر تھی، ہم نے اس امید پر کہ جلدی سے اس ناگہانی آفت سے خلاصی ہو جائے گی، اور سرکار خرچہ بھی دلوائے گی ...

کچھ دنوں تک قرض لے کر کام چلتا رہا، لیکن جب وہ چار مہینے ہو گئے اور سود چڑھنے لگا تو ایک مکان کو اونے پونے رہن رکھوا کر اس کا قرضہ بیباق کیا، تھوڑے دن کے بعد دوسرا مکان بھی رہن رکھوانا پڑا۔

ہم عجیب مشکل و پریشانی میں گرفتار تھے، لیکن کیا کرتے خود یہ مصیبت مول لی تھی، مقدمہ چلانے کے لئے قارون کا خزانہ کہاں سے آتا، مکان رہن ہو چکے تھے قرضہ روز بروز بڑھ رہا تھا، اور ہمارے پاس صرف رہنے کا مکان باقی رہ گیا تھا۔

مقدمہ کو ادھورا چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا، اتنی محنت اور سب اثاثہ یونہی بیکار جاتا تھا، مقدمہ چلنے پر یہ امید تو تھی کہ آخر میں جیت جائیں گے، محمد احمد کا پڑھنا لکھنا برائے نام رہ گیا تھا، دن بھر پھرکی کی طرح پھرتا تھا، بعض دن تو مجھ کو بھی دن بھر کچہری میں ڈولی میں تنہا پڑا رہنا پڑتا، آخر کار رہنے کا مکان بھی ساہوکار کے ہاتھ رہن رکھوایا۔

کیا تک کہوں۔ ایک داستان ہے قصہ مختصر میری کمر تو جب ٹوٹ گئی جب میرا لاڈلا ساجوان بچہ محمد احمد بیٹھے بٹھائے تین گھنٹے میں موت کی نذر ہو گیا۔ . . . . . . ! . . . . . .

. . . . . . اس کے بعد مجھ کو تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا، وکیل صاحب خدا ان کو خوش رکھے خود ہی پیروی کیا کرتے تھے۔

رات۔

تاریک، بھیانک ہیبتناک۔

بارش، بجلی۔ کڑاک، سائیں، سائیں، اکیلا گھر اور میں۔

ماضی بجلی کی چمک کی طرح تابندہ، مستقبل رات کی طرح تاریک۔

دل بھرایا بھرایا ہوا، دماغ پراگندہ، اور خیالات پریشان۔

یہی گھر جس کی میں آج تک مالکہ ہوں ——— کل! — اور پھر میں —؟

در در ویران۔

——— فاقے ——— ٹھوکریں ——— دھتکار ۔۔

آسرا۔ سہارا۔ !

کس کا ؟

ایک چھوٹا دیا جل رہا ہے۔

وہ کون ہے ؟

وہی جو تیرگیوں کو مٹاتا ہے۔

ایک چراغ وہ بھی ٹمٹماتا ہوا میرا رفیق اور دمساز، اس کی زندگی اور میری عزت دونوں چند گھنٹوں کی مہمان، پھر وہ ختم ہو جائے گا، بجھ جائے گا، کبھی نہیں جلیگا۔

میں ہمیشہ جلوں گی اور یہی نہیں بجھوں گی۔

موت۔ کس بدنصیب کو آئی ہے، جو مجھے آئے۔

تم کہو گے دیوانی ہے، پاگل تھی جو ایسے وسوسے دل میں لائی میاں خدا دشمن پر بھی وہ وقت نہ لائے، اب بھی جب کبھی اس خوفناک رات کا خیال آتا ہے سہم جاتی ہوں، لیکن خدا کا شکر بھی کرتی ہوں کہ اس نے مشکلوں کے باوجود آرام و عزت سے گذار دی۔

ہاں! تو اس رات کو میں ان ہی خیالات میں گھری ہوئی تھی کہ آہٹ ہوئی میں خوش ہوئی کہ موت آئی، خدا نے مجھ دکھیاری کی سُن لی، لیکن نہیں وہ تو رحمت کا فرشتہ تھا، چراغ کی روشنی ہوتی ہی کتنی ہے، اور اس دن تو بالکل نہیں ہونے کے برابر تھی میں بالکل نہیں پہچان سکی کہ کون ہے جب وہ شکل بالکل ہی قریب آگئی تو میں نے پہچانا، وہ ہمارے وکیل صاحب سلیم تھے۔

میرے تعجب کی انتہا نہیں، اور میں نے پوچھا ہائیں آپ کہاں ؟ اور دل میں سوچنے لگی کہ دیکھئے اور کیا نیا شگوفہ کھلتا ہے۔

وہ بت کی طرح ساکت کھڑے تھے اور کسی گہری سوچ میں تھے میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

آپ بھیگ گئے ہیں، سردی بہت ہے میں آگ جلاؤں آپ تاپ لیجئے۔

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میرے پاس یہ چادر ہے آپ بدن پونچھ لیجئے۔

جی نہیں، شکریہ، وہ کہنے لگے، میں بالکل اچھا ہوں، صرف اسقدر بھیگنے سے بیمار نہیں پڑ جاؤں گا۔

میں آپ کے پاس، کچھ دیر کے بعد انھوں نے مشکل سے کہا، ایک ضروری کام کے لئے آیا ہوں۔

میں گھبرا گئی، لیکن ان کی آواز میں ہمدردی تھی۔

وہ میں بہت دنوں سے ایک بیماری میں مبتلا تھا، ایک روحانی بیماری میں ——— جس سے میرا آرام اطمینان اور چین سب جاتا رہا۔

میں شروع مقدمے سے آپ کا وکیل ہوں، اور مجھ کو سب باتیں معلوم

ہیں، اگر آپ یہ مقدمہ نہیں چلاتیں، تو نہ اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ نہ ہی یہ دن دیکھنا نصیب ہوتا، میں جانتا ہوں کہ کل یہ گھر جو آپ کا آخری سہارا تھا آپ کا نہیں رہیگا، کل جو سب سے زیادہ پیسے اس کے دیگا یہ اس کا ہوگا اور پھر آپ؟

میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ اندھیر

اندھیر نہیں، وہ کہنے لگے، یہ قانون ہے، اور اس قانون کے آگے میں، آپ حاکم اور سب بے بس ہیں۔ اور جسے میں نے اپنی عمر کا بیشتر اور سب سے بہتر حصہ خرچ کر کے پڑھا ہے۔

۔۔آپ کو اس کی طاقت کا کیا اندازہ؟ اس کے آگے کسی کی نہیں چلتی، میں جانتا تھا کہ آپ حق پر ہیں، میں لڑا، میں نے کوشش کی۔ لیکن ——"

تو پھر ایسے قانون سے کیا فائدہ؟۔

یہ مت پوچھنا میں بچپنے میں سوچا کرتا تھا، کہ میں وکیل ہوں گا۔ سچائی کے لئے لڑا کروں گا، بے بسوں اور بے کسوں کی مدد کیا کروں گا مظلوموں اور مجبوروں کی میری وجہ سے بہتری ہوگی، لیکن آہ میں غلطی پر تھا، مجھے یہ اتنی عمر کھونے کے بعد معلوم ہوا ہے، کہ یہی زبان جو کبھی سچی باتوں کے لئے عدالت میں لڑتی ہے اپنے پیٹ کی خاطر جھوٹ کے قلعے بھی تعمیر کرتی ہے۔

میں اس دفعہ کا مطلب خاک بھی نہیں سمجھی۔

میں اس لئے یہاں آیا ہوں، کہ آپ یہاں صبح تک کیوں ٹھہریں، میرے ساتھ چلی چلیں۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، ساتھ نہ جاتی تو کیا کرتی، ساتھ ہولی۔ وکیل صاحب بیچارے بڑے نیک آدمی تھے، انھوں نے بیزار ہو کر وکالت اور دلی دونوں کو چھوڑ دیا ہم دلی کے باہر جہاں وکیل صاحب کے مرحوم والدین کی کچھ زمین وغیرہ تھی رہنے لگے۔

میں وہاں بہت دن رہی وکیل صاحب ہمیشہ میرا خیال رکھتے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتے، ایک دن میں نے سوچا، میرا اس بیچارے سے کیا رشتہ؟ صرف یہی نا کہ شریف انسان ہے، مجھ دکھیاری کی خدمت اللہ واسطے کر دیتا ہے آخر اس کو بھی دنیا میں رہنا ہے، میں کیوں جونک بن کر اس کا خون چوسوں۔

لیکن پھر —— اگر میں یہاں سے چلی جاؤں تو میرا کیا حشر ہوگا۔ صرف خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

اسی سوچ میں کئی دن گزر گئے طبیعت ڈانواڈول تھی، کبھی ادہر کبھی ادہر آخر ایک دن میں نے دل کو کڑا کر کے فیصلہ کر ہی لیا، اور وہاں سے چلدی

صفوۃ اللہ بیگ

مُحبت

اے میری محبت! میں جس طرف نظر اٹھاتا ہوں تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی ہے۔ بجلی کی کڑک کانوں کو ایذا دے رہی ہے دل میں ایک عجیب و غریب احساس کی دنیا آباد ہے، عمیق تاریکی، رعد کی آواز، دھلا دینے والی قوتیں، ہیبناک فضا، یہ سب مجھے گھیرے ہوئے ہیں، مگر میں پھر بھی ہنستا ہوں ایک خاموش ہنسی۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جبکہ تیری برق حسن چمک چمک کر میری نگاہوں کو خیرہ کرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے، آج فضا میں جب بجلی چمکتی ہے تو در و دیوار دشت و جبل کانپ اٹھتے ہیں، ایک صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ مگر جس دن عرفان کی وہ بجلی کڑکی تھی اور خرمن ہستی پاش پاش ہوگئی تھی کوئی صدائے بازگشت نہ تھی، میں ایسی گستاخی کی ہمت نہیں کر سکتا، ہرگز نہیں۔

نہیں وہ دن یاد ہے کیونکہ یہ وہ دن تھا جب رنج و الم کی دنیا غیر آباد تھی اور میرے دل کی دنیا جس میں ظلمت کا گھر تھا تیرے نور سے معمور ہو گئی تھی، محبت! آہ! ایک لفظ بے معنی، کاش انسان اس سے انجان ہی رہتا۔

(ڈاکٹر) ایم۔ العزلی۔ پی ایچ ڈی

مزاحیہ مضمون

میں مونچھ رکھوں گا

از جناب سید ناظم صاحب ہاشمی گیاوی

آئینہ دیکھ رہا تھا ———— مونچھ مسٹر فلانی تھی، مسٹر فلانی اگر آپ نہیں سمجھے تو یوں سمجھئے کہ "مرغی کا پر آدھا ادھر آدھا ادھر" خیال گذرا کہ یہ فیشن متروک ہوجائے گا، کیوں نہ میں پہلے ہی سے پرانی وضع اختیار کرلوں۔ یعنی ایک لانبی رعب دار مونچھ رکھ لوں ———— رعب دار، بیشک سب کے لئے رعب دار ہی رہے گے ———— میں نے اسی خیال کی پذیرائی کرتے ہوئے بیگم صاحبہ سے نہایت مسرتانہ کہا کہ "میں مونچھ رکھوں گا" ———— ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، انھوں نے اسی طرح اچھل کر کہا کہ مجھے یہ شبہہ ہوگیا کہ شاید میری مونچھ میرے خیال کے مطابق بن گئی ———— لیکن ———— میں نے لیکن پر ذرا زور دیکر اور ان کی جانب اشارہ کرکے کہا، یہ مسٹر فلانی مذہبی اعتبار سے نہایت ناقص ہے ———— ہوگا۔ بلا سے مگر لانبی مونچھ نہ رکھو ———— بیگم نے کہا۔

میں رکھوں گا ———— میں نے نہایت متانت بھرے لہجہ میں کہا وہ سست ہوگئیں، یہ پہلا دفعہ تھا جبکہ میں نے ان کی رائے کی مخالفت کی تھی ———— اس ہفتہ حجام آیا، تو اس سے تاکید کردی کہ دیکھو میں مونچھ رکھنی چاہتا ہوں ———— ایک لانبی اور رعب دار مونچھ ———— نائی کو اس سے کیا بحث کہ میں لانبی مونچھ رکھوں یا مسٹر فلانی یا ساتھ ساتھ بھوں بھی بنوا لوں ———— اس کو تو غرض محض پیسے سے تھی ———— حجامت بنواکر غسل فرماکر اندر گیا، بیگم صاحبہ بیٹھی سلائی کر رہی تھیں ———— مجھے دیکھکر کہنے لگیں کہ آج کھانا نہیں پکاؤں گی ———— میں نے نہایت درد بھرے لہجہ میں کہا ———— کیوں آخر سبب وجہ کچھ ہو تو سہی ———— انھوں نے ہاتھ میں درد کا بہانہ لگا کر میرے چہرے کا مطالعہ کرنے لگیں ———— یعنی شاید وہ یہ دیکھنا چاہتی تھیں کہ لانبی مونچھ کا رعب کتنا اثر پذیر ہوتا ہے ———— آخر مجھ میں بھی شوہرانہ عظمت و وقار کا خیال پیدا ہوا ———— اور کہا، اگر درد تھا تو کہو ———— میں نے درد تھا کو تین دفعہ اس انداز سے کہا کہ وہ کہنے لگیں نہیں کر تھا ———— مگر سہی ———— "جناب اب آپ خود کریں تو میں کیا کہنے والا تھا اور یہ کیا سمجھ گئیں، سچ ہے جب دل کسی سے برگشتہ ہوتا ہے تو اچھی باتیں بھی خراب ہی پڑتی ہیں ———— میں قصہ کی نوعیت کو سمجھکر سیدھا باہر چلا گیا ہوٹل جاکر خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ اور ایک اطمینان کا سانس لیتا ہوا کام پر چلا گیا، لیکن جب کام سے واپس ہوا تو بیگم صاحبہ لحاف میں منہ لپیٹے پڑی تھیں میرے دل میں درد محسوس ہوا، اور لحاف کے نزدیک جاکر ان سے خیریت پوچھی، تو ایک جھڑک کے ساتھ کہا کہ مجھ چھوڑ دو! میں بھی ذرا ہٹ گیا کہ دیکھوں ان کا کیا ارادہ ہے ———— "ہوٹل جاکر خود تو کھانا زہر مار کرلیا اور گھر کا خیال نہیں رہا ———— یہ گھر کا خیال کیا معنی، بیگم صاحبہ! ———— میں نے نہایت محبت بھرے لہجہ میں کہا، تم تو بیکار غصہ ہو رہی ہو ———— "غصہ ہوئے میری بلا، یہ تھا خشک جواب میرے سوال ہمدردی کا، میں بھی تو آخر انسان ہوں ———— جاؤ دوسرا بیاہ کرلو، دوسرا بیاہ، دوسری شادی وہ تمہاری لونڈی بنکر کھانا پکایا کرے گی ———— میں نے غور کیا کہ اس وقت ٹل جانا زیادہ مناسب ہے، ورنہ یہ بخار نہ معلوم کس ڈگری پر جاکر ختم ہوگا، یہ سوچکر میں نے قدم ہی بڑھایا تھا کہ مجھے جرنیلی حکم سے روک دیا گیا۔ "ٹھہر جائیے ———— میرے قدم رک گئے اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہی، کیا حکم ہے؟ میں نے بھیگی بلی بنکر دریافت کیا ———— "مونچھ کٹوا دیجئے" ———— اگر نہیں کٹوایا تو؟ ———— تو بھوکے رہیگا ———— میں نے بہت چھا کہا، انھوں نے سمجھا کہ مونچھ کٹوانے کو بہت اچھا کہا ہے اس سے وہ وقت تو

تو بہت خوشی خوشی گئی۔ لیکن دوسرے دن میرے مونچھ رکھنے پر جس قسم کی صلواتیں سنائی گئی ہیں اس کا اعادہ کر کے میں اپنے کو دوبارہ شرمندہ کرنا نہیں چاہتا۔ میری مثال ایک خادم سے دی گئی تھی، جو مونچھ اور داڑھی رکھتا تھا۔ میری انگریزیت پر طعنہ زنی کی گئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ ——— لیکن نے تصور کیا کہ فرض کرو اگر آج میں نے ان کے کہنے سے مونچھ کترا دی تو کل داڑھی بھی منڈوانی پڑیں گی، اگر ان کے نقطۂ نظر سے بغیر مونچھیں رکھنے والا انسان بہترین ہے ——— فیشن پرستی کی حد ہو گئی، اس مغربی تہذیب نے معلوم کس طرح ایشیا میں اپنا سکہ جما لیا کہ موجودہ دور کی لڑکیاں بھی مغربی خیال کی پیدا ہونے لگیں۔

ایشیا کو ناز تھا تہذیب پر اپنی مگر
مغربی تہذیب نے آکر اسے مٹی کیا

ایک وقت وہ تھا جب کہ ہم کو اپنی عورتوں کی تہذیب پر فخر و مباہات حاصل تھے ——— ایک وقت یہ ہے جبکہ ہم انہیں زہریلے اثرات سے متاثر ہوتے دیکھ رہے ہیں ——— بھلا یہ کیا ضد ہے کہ میری سہیلی کے شوہر کی مونچھ نہیں، اس لئے تم بھی مونچھ نہ رکھو ——— اگر ان کی سہیلی کے میاں جان لنگوٹ باندھ کر برسرعام نہلیں تو کیں تو میں بھی ایسا ہی کروں اس لئے کہ ان کی سہیلی کرم کے شوہر محترم ایسا کرتے ہیں ——— غور کیجئے آپ کہ اگر آپ کی زوجہ محترمہ اس قسم کا حکم صادر فرمائیں، اگر آپ داڑھی رکھتے ہوں، اور ان کی خواہش ہو بغیر داڑھی کا چہرہ دیکھنے کی اور اس مغربی حسن کا نظارہ کرنے کی تو کیا کریں گے آپ؟ ——— اگر آپ کو اپنی شوہرانہ عظمت کا خیال ہوگا تو یقیناً ٹھکرا دیں گے اس تحریک کو، اور اگر آپ زن مرید ہوں گے یعنی بیوی آپ کی، آپ کی داڑھی سے پیاری ہوگی، تو یقیناً آپ ریش مقدس کی قربانی کرنے کو تیار ہو جائیں گے، لیکن میں ایسا کیوں کرتا جبکہ میں یہ جانتا ہوں کہ خدا نے میری عظمت و جلالت کا ذکر اپنی پاک کتاب میں فرمایا ہے لہذا میں نے صاف انکار کر دیا کہ مونچھ نہیں کترواؤں گا، چاہے کھانا پکے یا نہیں پکے ——— پہلے تو فیشن کی ہوس تھی، اب بات کی ہٹ بند ھ گئی یا ہٹ میں نے سنا تھا لیکن اب میں نے دیکھ لیا کہ واقعی عورت کی ہٹ کیا چیز ہے ——— چونکہ ہفتوں مجھے ہوٹل میں کھانا پڑا، اور گھر میں کھانے کی سعادت مشکل سے مل سکی۔ لیکن مجھے بھی ضد بندھ گئی تھی، اور ضد کی بات معقول تھی وہ میں نے مونچھ رکھی تھی یہ میری خوشی، میں مونچھ رکھوں یا کترواؤں یا بتر فلانی قسم کی مونچھ بناؤں، فیشن کا تعلق میرے ساتھ ہے نہ کہ ان کے ساتھ ———"

جب مونچھ کی تکرار کو دو ہفتے گذر گئے، اور ہوٹل میں کھانا کھاتے کھاتے آنتوں میں گڑبڑ پیدا ہونی شروع ہوئیں، تو مجھے احساس ہوا کہ مونچھ کٹوا لوں مگر ایک تو شرم و ندامت دوسرے دبنے کا احساس کچھ ایسا پریشان کن نکلا، کہ ایکدم سے میری پیشانی کی رگیں تن گئیں، اور خود ہی ایک اضطراب کے ساتھ بول اٹھا ——— مونچھ نہیں کٹواؤں گا ———

وہ قریب کے کمرے میں بیٹھی تھیں، آواز سن کر کہنے لگیں میری جوتی سے ——— یہ سن کر میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا کہ اس جوتی سے کا مزہ چکھاؤں ——— مگر غصہ پی کر رہ جانا پڑا۔ اب آئے دن ایک نہ ایک مصیبت نازل ہونی شروع ہوئی ——— ہر روز ایک نہ ایک بات پر تو تو میں میں ہونے لگی، اور میں بھی اس کا عادی ہو گیا جب باہر سے گھر جانا ہوتا تو یہ ارادہ قائم کر لیا کہ اگر وہ جھگڑنا چاہیں گی تو باتوں کا جواب ملاطفت سے دوں گا ——— نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھے نرم دیکھ کر کہنے لگیں، کہ کھانا آج گھر میں پکے گا، باہر کھانا نہ کھائیگا۔ ——— میں از حد باہر آیا اور آئینہ دیکھنے لگا کہ کہیں میری مونچھ مرغی کا پر تو نہیں بن گئی، مگر خدا کا شکر تھا مونچھ اپنی جگہ پر تھی، اور بیگم صاحبہ راہ راست پر آ چکی تھیں ——— ایک دن محبت بھرے لہجہ میں کہنے لگیں۔ کہ سنا ہے ———؟ میں نے کہا سناؤ تو سنوں ——— وہ کہنے لگیں کہ میری سہیلی کے شوہر نے بھی آپ کے ایسی مونچھ رکھ لی ہے۔ بعد میں مجھے واقعات کا پتہ اس طرح پر چلا کہ ان کی سہیلی صاحبہ اپنے شوہر سے یہ ضد کر رہی تھیں کہ آپ مونچھ رکھ لیجئے ——— اور مثال میں میں پیش کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح بیچارے نے بدقت ناز برداری کر کے مونچھ رکھ لی ——— کام تو اچھا کیا مگر بیوی کے کہنے سے ——— آخر ہے نا اُلو قسم کا مولوی ——— "

اب روز میری بیوی اپنی سہیلی کے شوہر کا قصہ سناتی ہیں، کہ کس میری سہیلی نے اس طرح مولوی صاحب کو اُلو بنایا ——— میں اپنی مونچھ پر تاؤ دے کر سادی حکایتیں سنکر اس طرح مسکرا دیا کرتا ہوں جیسے کوئی فاتح ایک معمولی فتح کی خبر سن کر مسکرا دیتا ہے ———

سید ناظم ہاشمی

شیخ جی!

از جناب مولانا کوثر چاند پوری

ہم اپنے حلقہ احباب میں چپراسی کی ضرورت کا اعلان کرکے بالکل ایسے مطمئن ہوگئے، جیسے کوئی دیسی صاحب "پانیر" میں اشتہار دیکر بے فکر ہوجاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ پانیر کے صفحات میں "ضرورت" دیکھکر جو صاحب بھی خالی جگہ کے لئے درخواست بھیجیں گے وہ ہر لحاظ سے کمل اور جامع الشروط ہوں گے، اس اطمینان کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی ایک بے تکلف دوست شیخ جی کو لے کر ہمارے پاس پہنچ گئے، ٹھگنا قد، لمبی داڑھی، گھٹا ہوا سر، اور پائجامہ ٹخنوں سے کچھ اونچا آنکھیں ضرورت سے زیادہ چھوٹی جنہیں "سرمہ" کی تحریر کے علاوہ کچھ نظر ہی نہ آتا تھا، ہم نے شیخ جی کو دیکھکر خیال کیا کہ یہ کوئی "مولوی" ہیں جو کسی مسجد یا عرس کا چندہ وصول کرنے آگئے ہیں یا پھر ان کے چند جوان بیٹیاں ہوں گی، جن کی شادی کا مرحلہ مسلمانوں کے دست اعانت کا محتاج ہو۔ اور غالباً ہمارے عزیز دوست رشید کی معیت محض سفارش کی غرض سے حاصل کی گئی ہے، کیونکہ آجکل کے چندے باز مولویوں نے اس فلسفہ پر اچھی طرح غور کرلیا ہے کہ

چندہ وصول ہوتا ہے صاحب دباؤ سے!

اسی لئے وہ کسی صاحب اثر . . کی آڑ لے کر مسلمانوں کی جیبوں پر حملہ آور ہوتے ہیں مگر رشید نے آتے ہی کہا۔

لیجئے جناب! حضور صاحب چپراسی حاضر ہے، نہایت ایماندار، مستعد جفاکش اور خیرخواہ آدمی ہے۔ زمانہ کا انقلاب کہئے کہ ان کو بارہ روپیے کی ملازمت پر مجبور ہونا پڑتا ہے، ورنہ بہت شریف آدمی ہیں۔

رشید تم نے میری ضرورت کو بہت غلط احساس کیا، مجھے کسی مسجد کے لئے امام کی، یا بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کی غرض سے "ملا جی" کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے "چپراسی" چاہئے۔

جی ہاں! شیخ جی اسی کیلئے آپ کے یہاں حاضر ہوئے ہیں!

مگر تم نے یہ بھی کہدیا ہے شیخ جی سے اپنے، کہ اس نوکری میں ہر قسم کے کام کرنا پڑیں گے، حتیٰ کہ بازار سے سامان لانا، اور دوسرے کی حالت میں کبھی کبھی کھانا پکانا، غرض سب ہی کچھ کرنا پڑے گا اور "جبہ و دستار" کا احترام قطعاً نظر انداز کردیا جائے گا۔

رشید تو خاموش رہے، شیخ جی نے اپنے تازہ منڈے ہوئے سر پر آگے سے پیچھے کو ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔

سب کریں گے صاحب! نوکری چاکری میں تو یہی ہوتا ہے!

شیخ جی کو کسی کام کے کرنے میں عار نہیں ہے، رشید نے شیخ جی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

تنخواہ فی الحال بارہ روپیہ ماہوار ملیگی ترقی کے متعلق میں کوئی اطمینان دلانا نہیں چاہتا۔ ہم نے ذرا بلند آواز سے کہا۔

منظور ہے! پیٹ پالنا ہے، یہ بھی بہت ہیں، شیخ جی نے اپنی چھوٹی آنکھوں کو جلد جلد کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا۔

اگرچہ شیخ جی کی ایسی وضع قطع کے انسان کو جو ہمیں گھنٹے اپنے اوپر مسلط کرنا ہم پسند نہ کرتے تھے، لیکن اول تو رشید کی سفارش دوسرے خود شیخ جی کی پریشان حالی نے قلب پر ایسا اثر ہوا کہ صاف جواب دینے کی جگہ ہم نے ان کی تقرری کا پروانہ ان کو دیدیا، اور کام کے متعلق مختصر طور پر شیخ جی کو ہدایات کیں۔

شیخ جی کا تقرر کرنے کے بعد ہم نے اپنے اردلی "قاسم" کو بلا کر کہا دیکھو یہ نیا چپڑاسی رکھا ہے ذرا اسے اپنے یہاں کے آداب و قواعد سے مطلع کردو اور اچھی طرح سمجھادو، نیا آدمی ہے پہلے ہی سے درست کرلینا بہتر ہے، ہم تو یہ کہکر غسل خانہ میں چلے گئے اور قاسم اردلی نے اشارہ سے شیخ جی کو بلا کر باتیں کرنا شروع کیں۔

کیوں شیخ جی تم کو پڑھے لکھے آدمی ہوگے!

ابھی پڑھے وڑھے تو کہاں ہیں ہاں معمولی شد بد ہے، تمہیں ہر وقت بنگلہ پر

رہنا ہوگا، اور دیکھو صاحب جس وقت گھنٹی بجا یا کریں فوراً دروازے پر آ کر دیافت کر لیا کرو کیا کام [illegible]!

صاحب کے لفظ سے شیخ جی کے کان کھڑے ہوئے، اور انھوں نے تعجب سے پوچھا، صاحب کون؟

صاحب کو نہیں جانتے، جو ابھی تم سے باتیں کر رہے تھے، مالک اپنے!

قاسم نے جواب دیا۔

کیا کرشتان ہیں یہ! شیخ جی نے بڑی حیرتگی اور سادگی سے سوال کیا۔

نہیں جی کیسے بیوقوف آدمی ہو، ہیں تو مسلمان مگر بڑے آدمی ہیں۔ ان کو صاحب ہی کہنا چاہئے۔

اچھا بھائی ہم تو اور تمہارا در "کہہ دیا کریں گے"۔

ہم نے دوسرے دروازے سے نکل کر کپڑے پہنے اور شیخ جی کی فوقیت کا امتحان لینے کے لئے گھنٹی بجائی۔ شیخ جی دوڑ کر دروازے پر آئے اور سمجھے اس لئے کہ ہم سے کچھ پوچھتے آنکی اطلاع کے طور پر انھوں نے کھانسنا شروع کر دیا۔ کھوں۔ کھوں!

کون! ہم نے زور سے کہا۔

میں ہوں، شیخ جی۔ نرم آواز میں جواب دیا۔

کون میں؟

اجی میں ہوں صاحب شیخ جی

شیخ جی!

جی۔

چائے لاؤ۔ اور قاسم کو بھیجو۔

شیخ جی کے طور طریق سے جلدی ہی ظاہر ہو گیا کہ آدمی تو کام کے ہیں مگر مذہب کے بیحد دلدادہ ہیں، اور اپنے اوقات میں کسی قیمت پر بھی تغیر کرنے کو آمادہ نہیں چنانچہ جب نماز کا وقت ہوتا تو وہ سب کام چھوڑ کر اپنا مذہبی فرض ادا کرنے میں مشغول ہو جاتے اور ضروری سے ضروری کام کی بھی پرواہ نہ کرتے۔

٭

ہمیں دورے پر جانے کی ضرورت ہوئی تو ہم نے شیخ جی کو بلا کر کہا کہ سامان درست کر لو، دورے پر چلنا ہوگا اور ہمارا بڑا اور چھتری بھی رکھ لینا، شیخ جی بہت اچھا کہہ کر چلے گئے اور ہم اپنے کاغذات درست کرنے میں مشغول ہو گئے، ایک گھنٹہ کے بعد شیخ جی نے اطلاع دی کہ گاڑی کا وقت قریب ہے۔

سامان سب لے لیا!

جی سب رکھ لیا۔

بستر باندھ لیا۔ اور کمبل بھی لے لیا۔

سب لے لیا سرکار!

اور چھتری ہمارا بڑا!

رکھ لیا حضور وہ بھی!

جمعہ کا دن تھا شیخ جی نے حسب معمول خوب جی لگا کر سر گھٹایا تھا، اور داڑھی کے ساتھ سر پر بھی تیل چپڑ لیا تھا۔ تیل کی چکناہٹ سے ان کا سر مس خام کی طرح چمک رہا تھا، ہم دو بجے اسٹیشن پر پہنچے، گاڑی آنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے اس لئے شیخ جی کو سامان کے متعلق ہدایت کر دی گئی کہ گاڑی آتے ہی سکنڈ کلاس میں رکھ دیں، اور خود سرونٹ کلاس میں رونق افروز ہوں، اتفاق سے گاڑی بالکل خالی تھی شیخ جی نے اطمینان سے سامان رکھ دیا اور خود بھی سوار ہو گئے، لیکن بجائے سرونٹ کلاس کے وہ قریب کے کمرہ میں بیٹھے ہمارے معترض ہونے پر انہوں نے نہایت صفائی سے کہہ دیا کہ صاحب لوگوں کے بھرے آئیں گے ہم ان کے پاس بیٹھنا پسند نہیں کرتے آپ جس وقت بلائیں گے ہم وہیں سے آجائیں گے، اور اپنی نگاہ ہر وقت آپ کی طرف رکھیں گے۔

دو تین اسٹیشن چلنے کے بعد گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر رکی اور دیر تک کھڑی رہی ایک خوش پوشش اور خوبصورت نوجوان شیخ جی کے پاس ٹہل رہے تھے اور بہت غور سے ان کو دیکھ رہے تھے۔

شیخ جی کی یہ کیفیت تھی کہ ننگے سر بیٹھے ہوئے تھے اور کھڑکی سے سر نکال کر ہمیں بار بار دیکھتے جا رہے تھے اور بعض وقت تو آدھا جسم کھڑکی سے نکال کر جھانکنے لگتے تھے گاڑی جس وقت اسٹیشن سے روانہ ہوئی ہم بھی اپنے ڈبے سے جھانک رہے تھے، اور اسٹیشن کے منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، وہ نوجوان بڑے ستم ظریف نکلے انھوں نے یہ حرکت کی کہ شیخ جی کے ڈبے سے بیس پچیس قدم کے فاصلہ پر گاڑی چھوٹنے سے پہلے ہی کھڑے ہوئے، اور جب شیخ جی قریب پہنچے تو بیر سہارے ہاتھ بڑھا کر شیخ جی کے گھٹے ہوئے سر پر چوا ایک چپت رسید کیا ہے اسٹیشن قہقہوں سے گونج اٹھا، ہم

کمال پر کیا کر چیت لگاتے ہی فوراً اپنا ہاتھ چوم لیا اور بلند آواز سے کہا معاف کیا خدا نے بڑی مدد کی نے آپ کی چندیا کو دیکھ کر ہاتھ میں خارش آرہی تھی، شیخ جی کی اس حادثہ کے بعد یہ کیفیت تھی کہ گاڑی سے باہر نکلے پڑ رہے تھے، اور اپنا آدھا دھڑ کھڑکی سے نکال نکال کر گریبان کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے اور مٹھیاں باندھ باندھ کر دانت پیکچا رہے تھے، ہمارے اعصاب پر اتنا اثر تھا کہ مارے ہنسی کے ہم گر گر پڑتے تھے اور بجائے اس کے کہ ہمیں شیخ جی کے فرق مبارک سے اس حادثہ میں کوئی ہمدردی ہوتی ہم بار بار اس نوجوان کی ذہانت، زندہ دلی، اور چابک دستی کی داد دے رہے تھے، اگلے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیرتے ہی شیخ جی نے ہماری خدمت میں استغاثہ پیش کیا، اور خواہش کی کہ جلد تار دیدیا جائے ابھی وہ بدمعاش اسٹیشن پر ہی موجود ہوگا، اور گرفتاری میں آسانی ہوگی، ہمیں شیخ جی کی صورت دیکھتے ہی اپنی متانت اور سنجیدگی کی حفاظت دشوار ہوگئی کیونکہ ان کو دیکھتے ہی ہمارے عصبی نظام میں پھر تحریک ہوگئی تھی، اور ہماری ہنسی خاموشی و ضبط کی حدود سے نکل کر قہقہہ کی صداؤں میں تبدیل ہوگئی تھی، باوجودیکہ ہم نے اپنے منھ کو دستی سے بند کر رکھا تھا، مگر ہنسی ضبط ہونے میں نہ آتی تھی۔

شیخ جی نے کہا صاحب آپ تو ہنس رہے ہیں اور ہمارے ہی ساتھ الٹی مخول کرنے لگے خدا پاک کی قسم میرا سر بھنّا گیا، اتنے زور سے چپت لگایا تھا کمینے نے!

اب سر چھپا کر بیٹھو، بڑی مشکل سے ہم نے یہ جملہ ادا کیا، منزل مقصود پر پہنچکر ہم نے "ڈاک بنگلہ" میں قیام کیا، سردی زیادہ تھی، اور ہمیں تھوڑی دیر بیٹھکر کام کرنا تھا، ہم نے شیخ جی سے کہا۔

شیخ جی چیسٹر لاؤ

بہت بہتر ابھی لایا۔

یہ کہکر شیخ جی نے شلوں کا بستہ میز سے اٹھاکر دھڑ سے زمین پر دے پٹکا اور لگے جلدی جلدی اسے کھولنے، ہم حیران تھے کہ چیسٹر انھوں نے بستہ میں کیوں باندھا!

شیخ جی ایک بہت بڑا رجسٹر بستر سے نکال لائے اور ہمارے سامنے ڈالدیا۔ یہ لیجئے سرکار!

کیا ہے بھائی! میں اس کو کیا کروں گا، چیسٹر لاؤ، چیسٹر!

—— چیسٹر ہی تو ہے سرکار یہ بڑا!!

—— جزاک اللہ! مار دیا شیخ جی تم نے!

—— کیوں سرکار!

تم آج تک یہی نہیں جانتے کہ چیسٹر کس جانور کا نام ہے۔ میں نے رجسٹر نہیں کہا تھا۔ چیسٹر کہا تھا، کوٹ کو کہتے ہیں چیسٹر کوٹ کو! اب بتاؤ میں کیا پہنوں۔

—— غلطی ہوئی سرکار! میں تو اسی کو سمجھا تھا۔

—— بہت مناسب ہے جناب! شامت اعمال ہماری کیا کریں۔

٭

ہم جس بنگلہ میں رہتے تھے اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، شیخ جی چونکہ بڑے پکے نمازی تھے اور پانچوں وقت کی نماز ٹھیک وقت پر ادا کرتے تھے، اس لئے وہاں کی امامت قدرتاً آپ کے سپرد ہوگئی، اور سنا ہے کہ آپ بڑے شوق سے نماز پڑھاتے تھے۔

ایک دن ہم نے شیخ جی کو بلاکر پوچھا، تمہیں قرآن شریف کی کچھ سورتیں بھی یاد ہیں، انھوں نے کہا پہلا سپارہ تو پورا یاد ہے، اس کے علاوہ کچھ رکوع بھی حفظ کرلئے ہیں، ہم نے کہا کوئی سورت سناؤ، شیخ جی نے قرأت اور خوش آوازی پیدا کرنے کی اتنی کوشش کی کہ "الف" کو ہر جگہ "ع" کے تلفظ سے اور "ہ" کو "ح" کے تلفظ سے ادا کیا، ہم نے کہا خیر یہ تو معمولی بات ہے ممکن ہے ہمیں مرعوب کرنے کی نیت سے انھوں نے ایسی قرأت سے کام لیا ہو، اور مسجد میں اصل تلفظ ادا کرتے ہوں، اتفاق سے اسی روز شام کو قاسم اردلی نے ہم سے کہا۔

صاحب! مسہل کی دو تین گولیاں دیدیجئے۔

—کیوں کیا کرےگا۔

شیخ جی کو کئی دن سے قبض کی شکایت ہے میں نے کہا صاحب کے پاس مسہل کی دوا ہے میں لائے دیتا ہوں، الماری میں قریب ہی "قرص ملین" رکھے ہوئے تھے ہم نے تین ٹکیاں قاسم کو دیدیں اور کہدیا کہ رات کو سوتے وقت پانی سے کھلا دینا

قاسم کو بھی شیخ جی سے عقیدت ہوگئی تھی اور وہ بھی ان کے ساتھ نماز کو جایا کرتا تھا، صبح کو اس نے آکر کہا کہ شیخ جی بہت سویرے اٹھکر حسب معمول رفع حاجت کو گئے تھے پھر مجھے ساتھ لے کر نماز کو چلے گئے شیخ جی نماز پڑھانے کھڑے ہوئے اور اچھی طرح نماز پڑھاتے رہے لیکن رکوع کے بعد جب سجدہ میں گئے تو پھر ان کا پتہ نہ چلا، دیر تک سب کے سب سجدے میں پڑے رہے جب بہت دیر ہوگئی تو کسی نے دیکھا کہ شیخ جی غائب ہیں خیر نماز تو دوسرے نے پڑھادی، مگر مجھے شیخ جی کی تلاش ہوئی دوڑا ہوا بنگلہ پر آیا، یہاں بھی شیخ جی نہ

ملے بہت تحقیق کیا کہیں پتہ نہ چلا، آخر سورج نکلنے کے گھنٹہ بھر بعد ندی کی طرف سے آتے ہوئے دکھائی دیئے، کہنے لگے نہ معلوم تم نے کیسی گولیاں کھلا دیں کہ پچھلے نماز چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد شیخ جی عرصہ تک مسجد نہ گئے گھر پر ہی نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔

اب تک شیخ جی کی ذات بابرکات سے اس قدر دلچسپ واقعات ظہور میں آچکے تھے کہ ان کی شخصیت حقیقۃً ایک تفریح تسلیم کر لی گئی تھی، اور ہمارے احباب نے متفقہ کہدیا تھا کہ شیخ جی: بیچارے بدنصیب ہیں جو اس صدی میں پیدا ہوئے، وہ تو بدقسمتی سے ہندوستان میں پیدا ہوئے اگر یورپ میں ایسا شخص پیدا ہوتا تو اس کی بڑی توقیر ہوتی، یہاں غریب جلیں بھرتے پھرتے ہیں ہم نے یہ واقعہ سنا تو ٹیلیفون سے رشید کو سب حال سنایا وہ بھی بہت محظوظ ہوئے فرمانے لگے بھائی اگلے وقتوں کے لوگ ہیں ان کے کام پر نظر کرو ان باتوں کو مت دیکھو، بہرحال ان کی زندگی کا دلچسپ پہلو حقیقتاً یہی تھا، اور اگر اس میں یہ اوصاف نہ ہوتے تو غالباً ہمیں جلد ہی ان کی علیحدگی پر مجبور ہونا پڑتا۔

دیکھے دن ہمارے ہاں ایک معزز دوست آئے ہوئے تھے اور ہم دونوں بیٹھے سگرٹ پی رہے تھے، قاسم بازار گیا ہوا تھا، شیخ جی سے کہدیا گیا تھا کہ ماہر حقہ درہیں، ہمارے دوست نے سگرٹ پھینکتے ہوئے کہا۔

——— بھائی حقہ منگواؤ نا! تمہارے یہاں تو دلیسی چیزیں بھی موجود رہتی ہیں۔

ہم نے گھنٹی بجائی، اور کئی بار بجائی مگر شیخ جی تشریف نہ لائے۔ بہت غصہ آیا، اور خود ہی اٹھکر کھڑکی کے قریب آئے دیکھا تو شیخ جی استنجے میں مصروف ہیں اور چونکہ گھنٹی بج چکی تھی اس لئے اضطراب کیساتھ احکام کو جلد ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے مہمان کو بھی اس دلچسپ تماشہ میں شریک کر لیا، ان کی تو یہ حالت ہوئی کہ آپے سے باہر ہوگئے اور ہنستے ہنستے فرش پر گر پڑے۔

شیخ جی سے جب کہا گیا کہ اتنی دیر کیوں ہوئی ہم نے متعدد گھنٹیاں بجائیں، مگر جواب ہی نہ ملا، شیخ جی نے کہا کیا بتاؤں صاحب "میں تو جلدی ہی کیا جلدی آگیا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو، پندرہ بیس منٹ ہوگئے گھنٹی بجاتے ہوئے اور کہتے ہو جلدی آگیا۔

——— صاحب ڈھیلا لے رہا تھا، ڈھیلا!

شیخ جی نے کچھ اس انداز سے جواب دیا، اور استنجے کا ایسا مہذب جبہ پہنا کہ ہمارے دوست پھر بیتاب ہوگئے اور ان پر ہنسی کا ایسا سخت دورہ پڑا کہ وہ بالکل از خود رفتہ ہوگئے۔

شیخ جی تو حقہ لینے چلے گئے، اور انھوں نے ہوش میں آتے ہی ہم سے کہا، میاں بڑا دلچسپ آدمی ہے، ہمارے اور ول سے بدل لو خدا کی قسم تم بڑے بد دل آدمی ہو، اس سے لطف نہ اٹھا سکوگے یہ تو میرے لائق ہے۔

ہم نے اسی سلسلہ میں ان کو چپت اور مسجد کا واقعہ سنایا، تو وہ اور زیادہ لطف اندوز ہوئے، اور جب شیخ جی حقہ لے کر آئے تو انھوں نے سرقد کھڑے ہوکر شیخ جی سے مصافحہ کیا، ان کے ہاتھ پر بوسہ دیا، اور عقیدتمندانہ لہجہ میں کہا بھلا ایسے آدمی کہاں ملتے ہیں چودھویں صدی میں!

شیخ جی کو قطعاً یقین آگیا کہ ان کی بزرگی سے ہمارے مہمان متاثر ہوئے ہیں چنانچہ انھوں نے پیشانی پر شکن ڈال کر کہا ناکارہ بندہ ہوں صاحب! خدا کا شکر ہے وہ پیٹ بھر رہا ہے۔

سبحان اللہ کیا انکسار ہے، قطب اور ابدال آج کل اسی بھیس میں رہتے ہیں، محنت کر کے کھاتے ہیں، مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

پیشہ حبیب اللہ ہے شیخ جی نے عارفانہ انداز میں کہا، اب شیخ جی اپنے تازہ عقیدتمند کی طرف بہت خلوص سے متوجہ ہوئے اور جب تک وہ ہمارے یہاں مقیم رہے بڑی دلسوزی سے ان کی خدمت کرتے رہے، چلتے انھوں نے ہم سے کہا، دیکھو ہم نے اس "بزاخفش" کو کیسا شیشہ میں اتارا ہے کہو تو لے جاؤں ساتھ! خدا کی قسم بغیر ٹکٹ جائے گا۔

واقعہ بھی اس کے خلاف نہ تھا اس لئے ہم ہنسکر خاموش ہوگئے۔

❊

شیخ جی حقہ نوشی کے بڑے شائق تھے اور نہایت اہتمام کے ساتھ حقہ پیتے تھے خصوصاً صبح کو ناشتہ کے بعد اور دونوں وقت کھانے سے فارغ ہوکر وہ حقہ کا بہت ہی اہتمام کرتے تھے، سویرے اٹھکر حقہ تازہ کرتے، اور پھر آگ سلگا کر کوئلے تیار کرتے اور چلم بھر کر اپنے پلنگ کے سرہانے پیر لٹکا کر بیٹھ جاتے، اور آہستہ آہستہ اطمینان سے حقہ پینا شروع کر دیتے۔

ہندوستان کے دستور کے مطابق ان کے اکثر احباب اوقات حقہ نوشی میں جمع ہو جاتے تھے مگر شیخ جی جب تک جی بھر کر نہ پی لیتے حقہ کا رخ کسی طرف نہ پھیرتے، بعض بے تکلف دوست ہاتھ بڑھا کر حقہ کی طرف دست درازی کرتے، تو شیخ جی تیور بدل کر فوراً بول اٹھتے۔

بس جی بس! میں باز آیا ایسی دوستی سے گھنٹہ بھر سے بیٹھا ہے تب

جن کے حقہ پینے کے لائق ہوا ہے، آ گئے کہیں سے تیار مال پہ دانت لگانے چلو الگ ہٹو بڑے شوقین ہو حقے کے تو پیسے خرچ کرو پیسے، میاں یہاں تو اسی منہ کے ذائقہ میں گھر برباد کر دیا، قسم ایمان کی آدھی تنخواہ دھڑ سے میں اڑا دیتا ہوں آدھی!

رفتہ رفتہ شیخ جی کی اس عادت سے لوگ واقف ہو گئے اور ان اوقات خاص میں بعض تو واقعی حقے کے لالچ میں اور بعض صرف شیخ جی کو بنانے کی نیت سے ان کے پاس جمع ہو جاتے شیخ جی لوگوں کی اس حرکت سے زچ تھے مگر کرتے کیا کسی کو زبردستی تو روک نہ سکتے تھے اور کوئی ایسی پناہ کی جگہ تھی نہیں جہاں بیٹھ کر دم لگاتے۔ دو چار دفعہ غسل خانہ وغیرہ میں جا کر ایسا کیا بھی تو مزہ نہ آیا، ایک دن شیخ جی خاص طور پر تو کیمپور کا تما کو خرید کر لائے بڑے اشتیاق سے انھوں نے صبح سویرے ہی اٹھ کر ڈہائے کے کوئلوں کی آگ تیار کی حقہ تازہ کیا، پانی بدلا، فرشی کو بھی ذرا صابن کرکے چمکایا، اور پلنگ پہ پیر پہ پیر رکھ کر بڑی شان سے ڈٹ گئے۔

اتفاق سے ہمارے محکمہ کا ایک امیدوار کم بختی کا مارا ہمارے بنگلہ کے چکر کاٹ رہا تھا، اس نے جو دور سے شیخ جی کو اس تزک و احتشام سے رونق فروز دیکھا، بس وہ لپکا کہ ان سے کچھ اور نہیں تو ہمارا پتہ ہی معلوم ہو جائے شیخ جی کے قریب آکر اس نے بلند آواز سے کہا۔

السلام علیکم۔

شیخ جی نے سلام کا جواب دینے کی بجائے تیز تیز نگاہوں سے نووارد کو دیکھا وہ غریب ان کا مطلب نہ سمجھ سکا، اور ان کی پائینتی بیٹھ گیا۔ شیخ جی نے خیال کیا کہ بیٹھنے کے بعد حقہ ہی کا نمبر ہے، اب تک تو خیر جان پہچان ہی کے لوگ آتے تھے اب اجنبیوں کا حملہ بھی ہونے لگا، حقہ نہ ہوا، ایک تماشہ ہو گیا، یہ سوچ کر شیخ جی کچھ ایسے غضبناک ہوئے کہ انھوں نے چلم اٹھا کر تڑ سے زمین پر دے پٹکی اور نیچا نکال کر زور سے گھما کر سڑک کی طرف پھینک دیا اور نووارد کی طرف دیکھ کر غصہ سے کہنا شروع کیا۔

پیو، پیو اب پیو بھتیجے حقہ! تمہارے ہی لئے تو بھرا تھا۔ میں نے بڑے آئے بڑے وہاں سے حقہ پینے والے!

نووارد۔ کیا فرمایا جناب! حقہ، حقہ تو کبھی میرے باپ نے بھی نہیں پیا۔

شیخ جی۔ باپ نے نہیں پیا۔ تو کیا ہوا، تمہیں تو دوسروں کو دیکھ کر شوق چرایا حقہ کا —— !

نووارد۔ جناب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا واللہ مجھے حقہ کی بالکل عادت نہیں اتنی عمر ہو گئی، مگر میں نے حقہ نہیں پیا۔

شیخ جی۔ (خفیف ہو کر) پھر کیوں آئے یہاں آپ! پہلے کہہ دیا ہوتا چلے آئے!

نووارد۔ صاحب کے پاس آیا تھا، امیدوار ہوں، انجینیری کے دفتر میں۔

شیخ جی۔ امیدوار دفتر میں ہو یا گھر پہ۔

نووارد۔ دفتر میں ہوں۔

شیخ جی۔ پھر یہاں آنے کا کیا مطلب ہے۔

نووارد۔ ذرا تنہائی میں صاحب سے مل کر عرض معروض کر لیتا، آجکل ایک جگہ خالی ہے۔

شیخ جی۔ چلو ہو چکی عرض معروض، دو ڈیڑھ روپے پر پانی پھیر دیا، تم نے صبح ہی صبح۔ سنیچر کہیں کا!

شیخ جی امیدوار کا لفظ سنکر بہت تیز ہو گئے تھے اور جو کچھ ان کے منہ میں آرہا تھا، غریب امیدوار کو کہہ رہے تھے وہ بھی انھیں دسگ بیلی سمجھ کر ان کی سخت کلامی کو برداشت کر رہا تھا بالآخر تنگ آکر اس نے کہا۔

جناب آپ نے خود ہی تو عقلمندی کی اور حقہ توڑ ڈالا اب غصہ آتا ہے مجھ پر آپ کو!

ہاں جی، اس میں کیا شک ہے ہم تو بالکل گدھے ہیں گدھے، اچھا آپ جائیے یہاں سے دفتر میں آئیے، یہاں کسی کے آنے کا حکم نہیں ہے ——

امیدوار شیخ جی کی اس بات سے ناامید ہو کر طیش میں آ گیا، اور اس نے شیخ جی کو ڈانٹ کر کہا —— نہ معلوم گدھے ہو یا الّو! کون ہو، مگر آدمی تو نہیں معلوم ہوتے۔

شیخ جی کو ایک امیدوار کی زبان سے ایسے الفاظ سننے کی کب تاب تھی وہ آستین چڑھا کر اس کے قریب پہنچے، اس بیچارے نے خیال کیا کہ آدمی بے چلا ہے، نہ معلوم کیا کر بیٹھے پہلے ہی سے انتظام کر لو، شیخ جی جیسے ہی اس کے پاس پہنچے، اس نے ہاتھ بڑھا کر ان کی ڈاڑھی پکڑ لی —— شیخ جی! بہت گھبرائے اور بدلگام گھوڑے کی طرح انھوں نے کودنا اچھلنا شروع کر دیا، مگر امیدوار بھی غضب کا تھا اس نے جب دیکھا کہ شیخ جی زیادہ بیتاب ہیں تو ڈاڑھی کی گرفت کو ذرا سخت کر دیا اور ایک دو جھٹکے بھی دیدئے، اسی دوران میں ہم نے گھنٹی بجا دی، شیخ جی گھنٹی کو سنکر بہت سٹ پٹائے امیدوار نے سمجھا کہ چھوٹتے ہی حملہ کریگا، اس نے پھر زور سے ایک جھٹکا دیا ۔ جب کہ گھنٹی بجائی، شیخ جی بہت گھبرائی ہوئی آواز میں چلائے —— نہیں چھوڑ تا م

ہم نے دریچہ سے سر نکال کر دیکھا تو واقعی شیخ جی، محترم امیدوار کے ہاتھ میں گرفتار تھے، دوسری طرف سے قائم ہو رہا تھا، اس نے بڑی خوشی سے [illegible] صاحب معاف!

فلمی ڈراموں کے تین نادر نمونے

(۱) انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری۔
(۲) خانصاحب حکیم احمد شجاع بی اے۔ اسسٹنٹ سیکرٹری پنجاب کونسل۔
(۳) حکیم محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر نیرنگ خیال

۱۔ عورت کا پیار ۲۔ گناہ کی رات

۳۔ دودھاری تلوار

عورت کا پیار

از قلم انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری

پہلا سین

آرمینا کے ایک گاؤں کے قریب جلال پاشا کی چھاؤنی

(منظر۔ آرمینا کا گورنر جلال پاشا حسن، شراب، اور رقص سے لذت اندوز ہو رہا ہے)

جلال پاشا۔ پلائے جا۔ گائے جا، ناچے جا ——— تیرے گلاس دنیا کی بہار تیرے باجے میں زندگی کی میٹھی راگنی، اور تیرے ناچ کے ساتھ ستاروں کی مسکراہٹ ناچ رہی ہے ———

(جلال کے مصاحب کا داخلہ)

شیطان تو بغیر اجازت میری عیش کی جنت میں کیوں آیا ؟ —

حارث۔ خداوند شاہی فوج کے دو نوجوانوں نے ایک بوڑھے پھل بیچنے والے کے ساتھ بد سلوکی کی ——— اس بد سلوکی سے ناراض ہو کر اس گاؤں کی ایک کمسن نازنین نے انہیں کے کوڑے سے ان کی مردانگی کے دعوے، اور شاہی ملازم ہونے کے غرور کو چور چور کر دیا ——— میں حضور میں پیش کرنے کے لئے اسے گرفتار کر کے [illegible]

جلال۔ بیوقوف اس لڑکی نے جرم کیا ہے تو [illegible] میرے پاس اس وقت رعیت کی فریاد [illegible] کرنے کیلئے

وقت نہیں ہے۔

حارث۔ ولی نعمت، قانون کی نظر میں وہ مجرم نہیں، لیکن اگر میں انصاف کا فریب نہ دیتا تو وہ خوشی سے یہاں کبھی نہ آتی ـــــ میں آج آپ کو اس ملک کی سب سے زیادہ حسین عورت دکھانا چاہتا ہوں ـــــ آپ نے ایسا عجیب و غریب حسن کبھی نہ دیکھا ہوگا ـــــ"

جلال (خوشی سے اچھل کر) تو وہ حسین ہے ـــــ اور تم اسے انصاف کیلئے نہیں میرے لئے لائے ہو ـــــ شاباش ـــ فخریہ ـــ بلاؤ۔ (حارث جاتا ہے)۔

کہتا ہے کہ خوبصورت ہے! ـــــ بیحد خوبصورت ہے!! ـــــ

اُوہ! عورت کی خوبصورتی بھی کیا چیز ہے۔ حسن کے ہزاروں گلاس پی چکا۔ پھر بھی آنکھوں کی پیاس نہیں بجھتی۔

(حارث اور جابر کے ساتھ فریدہ کا داخلہ)

فریدہ کیا اس ملک کے بادشاہ نے تمہیں کو اپنی رعیت کی قسمت کا مالک اور اس صوبے کا حاکم مقرر کیا ہے ـــــ اگر تمہیں حاکم ہو تو تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہارے نوکر، انصاف اور قانون کو کیوں ذلیل کر رہے ہیں ـــــ یاد رکھو، ایک ڈاکو کی بیرحمی صرف ایک گھر کو غارت کرتی ہے۔ لیکن ایک فرض سے بے پرواہ حاکم کی غفلت، پورے ملک کو تباہ کر دیتی ہے، ڈاکو کے لئے معافی کی امید ہے، لیکن ظالم حاکم کو نہ رعیت معاف کرتی ہے ـــــ نہ خدا معاف کرتا ہے۔

جلال لڑکی شاہی ملازموں پر حملہ تیرا پہلا جرم تھا، اور حاکم کے روبرو گستاخانہ گفتگو، یہ تیرا دوسرا جرم ہے ـــــ لیکن اپنی خوبصورتی کا شکریہ ادا کر جو مجھے سزا دینے سے روک رہی ہے ـــــ تیرے حسن کی سفارش پر میں تیرا قصور معاف کرتا ہوں۔

فریدہ اگر نا انصافی پر لعنت بھیجنا اور مظلوموں کی طرفداری کرنا قصور ہے تو میں ایکبار نہیں لاکھ بار قصور کروں گی، قید اور پھانسی کے ڈر سے میرا ایمان تمہارے ظلم کی کبھی خوشامد نہیں کرے گا۔

جلال خوبصورت تیتری اِدھر آ ـــــ عشق کی سلطنت کی ملکہ بنکر یہاں بیٹھ ـــــ میں چاہتا ہوں کہ غصہ کروں، لیکن نہیں کر سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ تو صرف پیار کرنے کی چیز ہے۔

فریدہ خبردار ـــــ میرا ہاتھ چھوڑ دو ـــــ حاکم رعیت کا باپ ہوتا ہے۔ اس رشتہ سے میں تمہاری بیٹی ہوں ـــــ لعنت ہے تم پر کہ باپ ہو کر بیٹی پر بری نظر ڈالتے ہو۔

جلال بیوقوف نہ بن ـــــ تیری قسمت بدل جائے گی، میری محبت قبول کر ـــــ"

فریدہ ان لفظوں سے میرے کانوں کو زخمی نہ کر۔ میں ایک شریف نوجوان کو شادی کا قول دے چکی ہوں، میں بازاری عورت نہیں ہوں، جو اپنا پیار۔ اور اپنا جسم دوسروں کو بانٹتی پھرتی ہے۔

جلال تیری شادی ہونے والی ہے۔ کس سے؟ وہ کون ہے۔؟

فریدہ تمہاری فوج کا سردار۔ نوجوان عزیز ـــــ۔

جلال عزیز میرا ملازم ہے۔ انعام سے، منت سے، زبردستی سے، تیرا خیال چھوڑنے کے لئے اسے مجبور کروں گا۔ ہاں، بول، ابھی تیرے لئے دنیا میں سب کچھ موجود ہو جائیگا، آرام بھی، دولت بھی، اور شاہی محل کی حکومت بھی۔

فریدہ ہوس کے غلام! میرا ایمان، میری دولت، اور میرے ہونیوالے شوہر کا دل، میرا محل ہے۔ میں تیرے محل کو بدکاری کا دوزخ، اور تیری دولت کو کتے کی قے سمجھکر، اس پر تھوکتی ہوں ـــــ"

جلال ہوا سے ہلتی ہوئی گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح، غصے سے کانپتے ہوئے ہونٹ کیسے خوبصورت معلوم ہو رہے ہیں! خوبصورت عورت کا غصہ بھی خوبصورت ہوتا ہے۔

(جلال فریدہ کو جبراً گلے لگا کر پیار کرنا چاہتا ہے)

فریدہ شیطان مجھے چھوڑ دے، میں اپنی عزت تجھے نہیں دے سکتی۔

جلال سب کچھ دینا ہوگا، عزت بھی، محبت بھی، پیار بھی۔

دوسرا سین

"قید خانہ"

(سلاخدار کوٹھری کے اندر عزیز۔ اور کوٹھری کے باہر ایک کاغذ ہاتھ میں لئے جلال کھڑا ہے)

جلال پاشا۔ اس کاغذ کو دیکھ ـــــ یہ عدالت کی مہر ہے یہ منصفوں کا حکم ہے اور یہ میری منظوری کے دستخط ہیں۔ جن انگلیوں نے تیرے لئے

موت کی سزا لکھی تھی، انہیں نے میرے اشارے پر یہ رہائی کا حکمنامہ بھی لکھا ہے، بول رہائی اور موت، دونوں میں سے کیا پسند ہے؟ عورت مل سکتی ہے، عورت کا حسن اور عورت کا پیار مل سکتا ہے، لیکن تجھے زندگی دوبارہ نہیں ملیگی۔

عزیز اگر انسان کو اپنی زندگی کی قدر کرنی چاہئے۔ تو سن، میری زندگی فریدہ ہے اور اس نے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ میں فریدہ کو پیار کرتا ہوں۔

جلال اگر تو فریدہ سے محبت کرتا ہے تو اس کے سکھ کے لئے اپنے ارمانوں کی قربانی کر۔ اسے جگمگاتی ہوئی قسمت کی طرف جانے کا راستہ بتا، اُسے بھکارنی سے بیگم بننے دے، اگر تو یہ نہیں کر سکتا، تو تیری محبت، محبت نہیں، سنہری دھوکا، اور خوبصورت خود غرضی ہے۔

ایک سپاہی کا داخلہ

سپاہی مجرم کی منگیتر فریدہ، آخری ملاقات کے لئے آئی ہے، کیا حکم ہے؟

جلال آنے دو۔ (سپاہی واپس جاتا ہے)

عزیز روک دے . . . . . "

عزیز روک دے! روک دے!! فریدہ کو یہاں نہ آنے دے، اسکا رونا اور تڑپنا دیکھکر میرا صبر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔

(فریدہ رنج و یاس کی تصویر بنی ہوئی داخل ہوتی ہے)

فریدہ (عزیز سے) آہ میرے پیارے مجھے تم سے یہ امید نہ تھی، تم نے دل کو دل سے باندھتے وقت محبت کے رشتے کے نہ ٹوٹنے کا یقین دلایا تھا، زندگی بھر ساتھ دینے کا قول دیا تھا، نہ بھولنے کی قسم کھائی تھی آج اس یقین کو ٹھکرا کر اس وعدے کو بھول کر، اس قسم کو توڑ کر کیوں چلے جاتے ہو؟ ——— میں دنیا کے طوفانی سمندر میں اپنی قسمت کی کشتی کس طرح کھے سکوں گی۔ بچاؤ۔ مجھے منجدھار میں چھوڑ کر نہ جاؤ۔ جانا ہے تو زندگی کے ساتھی کو بھی موت کے سفر میں ساتھ لو، میں تمہارے ساتھ مر سکتی ہوں، لیکن تمہارے بغیر جی نہیں سکتی ———"

عزیز فریدہ تم قسمت کا ستم دیکھنے کے لئے یہاں کیوں آئی ہو، نہ دیکھ سکو گی لوٹ جاؤ اور مجھے میرے ارمانوں کے ساتھ مرنے دو۔

فریدہ میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے نہ مرنے دوں گی، تم کسی قصور کے لئے نہیں، میری محبت کے لئے قتل کئے جاتے ہو، اور تمہارا قاتل عدالت نہیں (جلال کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہے۔ میں، رو رو کے ہاتھ جوڑ کے، پیروں پر سر رکھ کے تمہارے قاتل سے ایک بار پھر رحم کی بھیک مانگوں گی (جلال سے) دیدے، دیدے، خدا کے نام پر، حکومت کے صدقے میں، میرے پیارے کی زندگی مجھے دیدے،

جلال تو میرے پیار کو ٹھکرا کر چلی گئی تھی، لیکن میں جانتا تھا کہ تیرا غرور آخر میرے قدموں پر جھکیگا، یہ دیکھ، میں نے عدالت سے اس کی رہائی کا حکمنامہ لکھوا رکھا ہے اس کی زندگی چاہتی ہے تو اپنی خوبصورتی اور جوانی میرے حوالے کر۔

فریدہ میرا دل، میری خوبصورتی، میری جوانی، اب میری کوئی چیز میری نہیں ہے پھر میں تجھے کس طرح دے سکتی ہوں؛ اگر تو بھکارنی کو بھیک میں رحم نہیں دے سکتا، رحم کی قیمت چاہتا ہے، تو اچھا قیمت ہی لے۔ میں اس کی زندگی خریدنے کے لئے اپنی زندگی دینے کو تیار ہوں۔

جلال رحم اتنے حقیر دام پر نہیں بکتا۔

سپاہیوں کا داخلہ

سپاہی وقت ہو چکا۔ مجرم کو قتل گاہ لیجانے کی اجازت دیجئے۔

جلال لے جاؤ ——— (سپاہی تالا کھول کر عزیز کو باہر نکالتے ہیں)

فریدہ (گھبرا کر) ارے۔ نہیں نہیں، میری زندگی کے باغ کی بہار نہ لوٹ میرا سہاگ نہ چھین، مجھے شادی سے پہلے بیوہ نہ بنا، اسے جینے دے نہیں تو میرے قتل کا بھی حکم دے دے، تو نے رحم کی بھیک نہ دی، تو کیا موت کی بھیک بھی نہ دیگا۔

جلال فریدہ اسے چھوڑ دے، اس سے اپنی محبت لے کر میرے حوالے کر، یہ ڈوبتا ہوا تارا ہے اور میں دوپہر کا سورج ہوں، میری روشنی میں آ تیری قسمت چمک اٹھے گی۔

فریدہ مجھے میری غریبی کے اندھیرے میں رہنے دے، جبتک اس اندھیرے میں محبت کا چراغ جل رہا ہے، مجھے تیری روشنی کی ضرورت نہیں ہے میں چمکتی ہوئی قسمت نہیں چاہتی، اس سکھ دکھ سے بنی ہوئی دنیا میں اپنے پیارے ہی کے ساتھ جینا اور پیارے ہی کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔

جلال میں چاہتا تھا کہ یہ جئے۔ لیکن دیکھتا ہوں کہ تو ہی اس کا جینا نہیں چاہتی موت انتظار کر رہی ہو گی، لیجاؤ مجرم کو۔

(سپاہی عزیز کو لے کر چلتے ہیں۔ فریدہ گھبرا کر پھر روکتی ہے)

فریدہ (سپاہیوں سے) ٹھیرو۔ ایک بیگناہ کے قتل میں جلدی نہ کرو (جلال سے) معاف کر۔ معاف کر۔ تو ایک بے قصور کو نہیں انسانیت اور انصاف کو قتل کر رہا ہے۔

عزیز بس فریدہ خاموش۔ اگر آخری وقت میں تیری فریاد کانوں میں گونجتی رہی تو موت کے کڑوے پیالے کو ایک بہادر سپاہی کی طرح ہنس کر نہ پی سکوں گا۔

جلال فریدہ یہ انسانیت کا قتل ہو یا انصاف کا۔ لیکن یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں۔

فریدہ لیکن ایک عورت جس کے دل میں تیری محبت اور عزت نہیں ہے، اسے کیوں چاہتا ہے، خوشبو سے خالی پھول، اور محبت سے خالی دل، کس کام کی چیز ہے، میں تجھ سے نفرت کرتی ہوں۔ اور ہمیشہ نفرت کرتی رہوں گی۔

جلال عورت بھی دھوپ چھاؤں ہے یہ جو آج ہے کل نہیں رہتی۔ دولت اور آرام کی گود میں پہنچکر تو بھی بدل جائے گی، دل نہ دے ——— لا ——— صرف ہاتھ دیدے، میں چند ہی دن میں تیری نفرت کو محبت کرنا سکھا دونگا۔

فریدہ بس منھ بند کر، عورت کی وفاداری پہ بیحیائی کی باتیں نہیں سُن سکتی۔

جلال نہیں ——— اچھا لیجاؤ۔ یہ میرا آخری حکم ہے۔

(سپاہی عزیز کو لیجانا چاہتے ہیں۔ فریدہ پھر روکتی ہے)

فریدہ آہ۔ نہیں، نہیں ٹھیرو! مجھے سوچنے دے (غور کرتی ہے) میرے پاس بچانے کی طاقت نہیں، اور اس کے پاس رحم نہیں، میں اس سے پیارے کی زندگی مانگتی ہوں، اور یہ مجھ سے میری خوبصورتی اور جوانی مانگتا ہے ——— کیا کروں؟ ——— نہیں۔ اور کوئی راستہ نہیں، میری خوبصورتی مرجائے، میرے ارمان مرجائیں۔ میری دنیا کی ہر ایک خوشی مرجائے لیکن میرا پیارا زندہ رہے، اس کی زندگی بچانا، یہی میری وفاداری کا آخری فرض ہے (جلال سے) جلاد ظالم۔ لا۔ رہائی کا حکمنامہ دے۔ بیکس، مجبور فریدہ تیری ہوس کا کھلونا بننا منظور کرتی ہے۔

(جلال حکمنامہ دیتا ہے)

عزیز فریدہ! فریدہ!!

فریدہ میرے پیارے تم کس فریدہ کو پکار رہے ہو، تم نے جس فریدہ کو محبت کی دنیا میں دیکھا تھا وہ فریدہ چرالی گئی، کھو گئی۔ [illegible] اب میں تمہاری وفادار فریدہ نہیں، ایک بے وفا عورت ہوں، اس بیوفا کو بھول جاؤ، اسے دل سے نکال کر پھینک دو، تم شریف اور بہادر ہو تمہیں فریدہ سے زیادہ وفادار اور خوبصورت بیوی مل سکتی ہے ——— یہ رہائی کا حکمنامہ، جاؤ جیو، خوش ہو اور ہو سکے تو اس بدنصیب کو جو بیوفا بننے کے لئے مجبور کی گئی ہے معاف کردو۔

عزیز فریدہ محبت کے جنون میں اپنے کو تباہ نہ کر، میں اس رہائی کے حکمنامہ کو ٹھوکر مارتا ہوں۔

(زمین پر پھینک کر ٹھکرا دیتا ہے)

جلال (فریدہ سے) میں نے تمہاری تمنا پوری کردی۔ اب چلو ——— میں اسی وقت تمہیں دلہن کے لباس میں دیکھنا چاہتا ہوں ——— پھر سوچ رہی ہو۔ کیا اب یہ رہائی کا حکمنامہ واپس لے لوں۔

فریدہ لے چل ——— لے چل ——— اس سانس لیتی ہوئی لاش کو۔ دکھ کے قیدخانے میں، مایوسی کی قبر میں، شادی کے دوزخ میں، جہاں چاہے لے چل ——— یا خدا۔ جس آسمان کے نیچے میں دلہن بنکر کھڑی ہوں گی میرے سر پر ٹوٹ پڑے میرے بیاہ کے زیور، مجھے سانپ اور بچھو بنکر ڈس لیں، میری شادی کا لباس میرا کفن ہو جائے (عزیز سے) میرے دل کے تنہا مالک فریدہ کی تقدیر میں تمہاری محبت اور خدمت کا سکھ نہ تھا۔ ——— جاتی ہوں ——— امیدوں کی سرزمین، اور محبت کے بہشت سے آنسوؤں کی دنیا میں جاتی ہوں۔ میری آخری التجا ہے، مجھے بھول جانا ——— مگر۔ آہ . . . . . میں تمہیں نہ بھول سکوں گی ———

آغا حشر کاشمیری

گناہ کی رات

ایک فلمی ڈرامہ کا ابتدائی منظر

از جناب خانصاحب حکیم احمد شجاع صاحب بی ۔ اے علیگ، اسسٹنٹ سکرٹری لیجسلیٹو کونسل پنجاب

حکیم احمد شجاع صاحب پنجاب کے مشہور ڈرامہ نویس ہیں، آپ نے اوائل عمر میں چند ڈرامے سٹیج کے لئے لکھے، جن میں سے بعض سٹیج پر کھیلے گئے اور کامیاب ہوئے، بعض کتابی صورت میں شائع ہوئے اور ملک کے علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہوئے، آپ نے حال ہی میں چند فلمی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ جن میں سے دو ڈراموں کی نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ والے فلمیں بنا رہے ہیں، ایک ڈرامہ گناہ کی رات سلور ٹون ٹاکیز لمیٹڈ نے خریدا ہے جسے کو ئی پکچرز کے اشتراک عمل سے پنجاب فلم کمپنی عنقریب تیار کرنے والی ہے، گناہ کی ایک رات کا ایک ابتدائی منظر ہم آپ کے مطالعہ کے لئے درج ذیل کر رہے ہیں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ یہ سوشیل ڈرامہ ملک کے لئے کس قدر مفید ثابت ہوگا! ۔ (ایڈیٹر)

گناہ کی رات

ایک تھیٹر ہال کا بیرونی منظر:۔ سڑک پر موٹروں اور گاڑیوں کی کثرت، تھیٹر ہال کے باہر بکنگ آفس پر خلقت کا ہجوم، بے پناہ شور و غل، تھیٹر ہال کے اندر باہر تل دھرنے کو جگہ نہیں، چاروں طرف "ہوش ربا کا آخری گانا" کے پوسٹر اور جھنڈیوں کی آرائش، ٹکٹ خریدنے والوں کے درمیان کشمکش، ان کے درمیان کیمرہ میں ہال کے مخصوص کریکٹروں کو بعض خصوصیات کی وجہ سے نمایاں کر رہا ہے، منصور ایک کامیاب نوجوان بیرسٹر، عظمت پرانی وضع کا ایک نواب اور اس کا مصاحب وغیرہ گذرتے ہیں، منظر، وقت پر پردہ اٹھتا ہے، ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے دو درجن حسین رقاصہ لڑکیاں اپنے رقص اور گانے سے حاضرین کے سامعین کی تواضع کرتی ہیں۔ اس کے بعد ہوش ربا ایک بلا کی حسین، شوخ و شنگ نوجوان لڑکی نقرئی سیڑھیوں سے گاتی ہوئی اترتی ہے اور اپنے رقص اور گانے سے حاضرین کو محو حیرت بنا دیتی ہے کھیل ختم ہوتا ہے اور منصور بیرسٹر ہوش ربا کے ساتھ اس کے پرائیوٹ کمرہ میں بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہے۔ ایڈیٹر

ہوش ربا (منصور کو پرے ہٹاتے ہوئے) میں ڈائن ہوں منصور ایک ڈسنے والی ناگن جس کے کاٹے کا منتر نہیں، میرے ہونٹوں میں موت کا رس میری آغوش میں جہنم کے شعلے ہیں۔

منصور تم کیا کہہ رہی ہو ہوش ربا! تم عورت ہو کائنات کی سب سے قیمتی دولت، فطرت کی سب سے حسین صنعت، جس کا حسن دنیا کی رونق جس کا نظارہ آنکھوں کی جنت ہے۔

ہوش ربا اس وقت میری زبان سے وہی عورت بول رہی ہے منصور۔ اگر اپنی زندگی کو پشیمانی کے آنسوؤں میں بہانا نہیں چاہتے تو مجھکو نہ چھوؤ۔

منصور ہوش ربا۔ ہوش ربا تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو!

ہوش ربا (زہر آمیز تمسخر سے) ایک بازاری عورت، ایک تجارتی جنس جسے ہر شخص چاندی کے چند ٹکڑوں کے عوض خرید سکتا ہے، جس کے دل کو ہر شخص جھوٹی تعریفوں سے خوش کرنا چاہتا ہے۔

منصور زندگی کی مسرتیں کھو گئی تھیں، تمہیں دیکھ کر سب کی سب مل گئیں ہیں۔ ہوش ربا میں تمہارے بغیر نامکمل تھا۔ کچھ بھی نہ تھا، اب بہت کچھ ہوں، اب میں تمہارے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم آج سے میری ہو صرف میری ہوشربا۔

ہوشربا: ایک بازاری عورت کسی کی نہیں ہو سکتی، وہ اگر خود چاہے بھی تو کسی کی نہیں ہو سکتی۔

منصور: کیوں نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شخص تمہاری محبت حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ دے دے۔

ہوشربا: (بات کاٹ کر) میرے کان ایسی باتیں بہت مرتبہ سن چکے ہیں۔

منصور: میں سچ کہہ رہا ہوں ہوشربا۔

ہوشربا: (ہنس کر) وہ بھی یہی بکتے تھے۔ سب مرد ایک ہی بات بکتے ہیں، معصوم عورتوں کے اعتقاد کو جھوٹی قسموں سے ٹھگنا تم مرد خوب جانتے ہو۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ فطرت کے قوانین اپنے مجرموں کو سزا دینا بھی جانتے ہیں بازاری عورت فطرت کی سب سے بڑی تحریر ہے منصور خداوند عدل کی تجویز کی ہوئی بدکار مردوں کے لئے سب سے مہیب سزا! اگر تم نے کسی معصوم عورت کی عصمت کو دولت کا لالچ دے کر جھوٹے وعدوں سے نہیں لوٹا تو مجھ سے بچو، میرا خیال چھوڑ دو۔

منصور: عمر بھر میں پہلی مرتبہ میری روح کو زندگی کی حرارت میرے دل کو زندہ رہنے کی تمنا تو نے بخشی ہے ہوشربا۔ میں تجھے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔

ہوشربا: اگر دل میں زندہ رہنے کی تمنا پیدا ہو گئی ہے تو مجھے چھوڑنا ہوگا، اگر اپنے آباد گھر کو برباد اپنی بیوی کی گود کو بچوں سے خالی نہیں دیکھنا چاہتے ہو۔

(فلم کی سب سے بڑی واقعات میں بغیر کسی رکاوٹ کے تسلسل کو قائم رکھنا ہوتا ہے جیسے ماہرین ہوشمند ---- کہتے ہیں۔ فلمی ایڈیٹر فلم کے تیار ہو جانے کے بعد مختلف ٹکڑوں کو جوڑ کر ان میں تسلسل پیدا کرتا ہے چنانچہ جتنا اچھا ایڈیٹر ہو اتنی اچھی فلم تیار ہوتی ہے لیکن حکیم احمد شجاع صاحب نے اپنے اس فلمی ڈرامہ میں اس تسلسل کو پیدا کرنے کے لئے جدید ترین طریقوں کو مرلود کیا ہے، اور یہ کام فلمی ایڈیٹر کے سپرد کرنے کی جگہ اُسے خود ہی انجام دیدیا ہے اس قدرتی ایڈیٹنگ میں سب سے بڑی خوبی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ فلم دیکھنے والا سوچنے والے ایکٹر کے ساتھ ساتھ ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگتا ہے، ہوشربا جب منصور کے آباد گھر اور بیوی کا ذکر کرتی ہے تو فلم میں منصور اور ہوشربا کا سین نابود ہو جاتا، اور منصور کے گھر کا سین نظر آنے لگتا ہے)

ایڈیٹر

منصور کے بنگلے میں بانو کا کمرہ

(بانو منصور کی بیوی پیانو پر گا رہی ہے۔ حسنا اپنی ماں کرین کی گود میں ہے اور پیانو سن کر خوش ہو رہی ہے اکبر اور رشیدہ ایک طرف بیٹھے ہیں، اکبر کاپی میں کچھ لکھ رہا ہے۔ سعیدہ رومال میں پھول کاڑھ رہی ہے)

بانو: (ملازمہ سے) کرین دیکھنا حسنا کے ابا آئے ہیں یا نہیں؟ (بچوں سے) آؤ بچو چائے پیو۔

(کچھ بے چین ہو کر کھڑکی کی طرف جاتی ہے)

(سعیدہ اور اکبر ہلکی ہلکی آواز میں جھگڑتے نظر آتے ہیں)

اکبر: غلط ہے۔

سعیدہ: درست ہے۔

اکبر: غلط ہے

سعیدہ: درست۔

(منشی کلیان رائے بیرسٹر صاحب کا پرانا خاندانی منشی داخل ہوتا ہے، اکبر اور سعیدہ بھاگ کر اس کے پاس جاتے ہیں)

سعیدہ: منشی دادا۔ دیکھئے اماں کہہ رہی ہیں آؤ بچو چائے پیو۔ اکبر بھائی کہتے ہیں چائے پیو غلط ہے۔ کہنا چاہئے چائے کو پیو۔

کلیان رائے: اور تم کیا کہتی ہو بیٹا؟

سعیدہ: چائے پیو درست ہے۔

اکبر: (جلدی سے) غلط ہے۔

سعیدہ: درست ہے۔

اکبر: غلط ہے۔

سعیدہ: درست

کلیان رائے: اچھا سعیدہ بی بی اماں کیا کہتی ہیں۔

سعیدہ: آؤ بچو چائے پیو۔

کلیان رائے: (پیار سے) تو بیٹی تم جاؤ چائے پیو۔

(بانو واپس آ جاتی ہے)

اور اکبر میاں درست کیا ہے۔

اکبر: چائے کو پیو۔

کلیان رائے: ٹھیک۔ تو جاؤ تم چائے کو پیو۔

(سب ہنس دیتے ہیں)

بانو حسنا کے ابا ابھی تک کچہری سے واپس نہیں آئے منشی جی!

کلیان رائے بی بی آج ایک قتل کے مقدمے کی اپیل تھی کچہری میں دیر ہو گئی۔

(بانو کا دل بہلانے کی غرض سے)

آج تو بی بی آپ کے میاں نے مجرم کی صفائی میں وہ تقریر کی کہ بڑے بڑے جغادری وکیلوں کے چھکے چھڑا دیئے۔

بانو مگر وہ اب تک کچہری سے کیوں نہیں آئے۔

کلیان بس جج صاحب کے تو ہوش کے طوطے ہی اڑ گئے حیرت سے قلم کو دانتوں میں چبا چبا کر قلم کا کچومر نکال دیا۔

بانو یہ تو سب کچھ ہوا مگر وہ ہیں کہاں۔

کلیان عظمت پور کے نواب نے چائے پر بلایا تھا، کچہری سے سیدھے وہیں چلے گئے۔

بانو یہ ہر روز اسی نواب کے ہاں دعوت کے کیا معنی ہیں، مجھے تو یہ نواب کوئی شریف آدمی معلوم نہیں ہوتا، ایک ناچنے والی بیسوا کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔

کلیان رائے ان نوابوں اور رئیسوں کو اور کام ہی کیا ہوتا ہے بی بی۔

بانو تو ایسے لوگوں کی صحبت بھی اچھی نہیں، حسنا کے ابا بھی اب اسی رنڈی کی تعریف کرتے رہتے ہیں جب دیکھو ہوش ربا ایسی ہے ہوشربا ویسی ہے ہوشربا ایسی ہے۔

کلیان رائے اجی ہوشربا کی ایسی تیسی، ہمارے بیرسٹر صاحب کچھ ایسے ویسے ہیں کیا آپ تو ناحق شک کرتی ہیں، اب کوئی دن میں ہائی کورٹ کے جج ہو جائیں گے، آپ کے میاں

سعیدہ ہائی کورٹ کے جج؟ کون ابا

اکبر اور میں پھر ہائیکورٹ کے جج کا بیٹا کہلاؤں گا۔ ہوں (اکڑتا ہے)

سب ہنستے ہیں۔

{ پھر وہی پہلا منظر جہاں منصور اور ہوشربا باتیں کر رہے تھے شروع ہوتا ہے، ہوشربا نے منصور کے گھر اور بیوی کا جو تذکرہ کیا تھا اور منصور کے دماغ میں جو گھر کا خیال آیا وہ مندرجہ بالا منظر سے پورا ہو جاتا ہے منصور کا گھر ایک آباد گھر ہے، سلیقہ شعار حسین بیوی، پیارے بچوں اور وفادار ملازموں کے درمیان عزت و وقار اور امن و سکون کی زندگی بسر کر رہی ہے، اس امن و سکون کی زندگی پر ہوشربا کے امن سوز اثرات نمایاں ہو سکتے ہیں۔ ایڈیٹر }

ہوشربا اگر اپنے گھر کو برباد اپنی بیوی کی گود کو بچوں سے خالی نہیں دیکھنا چاہتے ہو، اگر اپنے نام کو نیک نامی سے معرا، دنیا کو اپنی صحبت سے بیزار، زندگی کو دولت، عزت اور نیکی سے عاری نہیں دیکھنا چاہتے تو میرا خیال چھوڑ دو، منصور میں ایک بازاری عورت ہوں۔

منصور پھر کیا ہوا، کیا ایک بازاری عورت، عورت نہیں ہوتی، کیا بازار کی عارضی زندگی اس کی فطرت کو تبدیل کر دیتی ہے۔

ہوشربا (بڑی تکلیف سے) ہاں بازاری عورت عورت نہیں ہوتی، بازار کی زندگی نہیں، اس کے ماں باپ اور تم لوگ اس کی فطرت کو تبدیل کر دیتے ہو (قریباً روتے ہوئے) وہ عورت ہو کر پیسے کے لالچ میں بدمعاشوں کے سڑے ہوئے بدبودار ہونٹوں کو چوم سکتی ہے، اسے دولت کے عوض کریہ منظر کوڑھیوں اور مردود خلائق بدکاروں کی آغوش میں بیٹھنا سکھایا جاتا ہے وہ انہیں گلفام اور یوسف ثانی بھی کہتی ہے، اور پھر ہر روز ایک نئے چاہنے والے کو خوش کرنا، ہر روز آنکھوں سے، ہونٹوں سے، ہاتھوں سے جھوٹ بولنا۔ آہ قیامت ہے منصور۔ قیامت

منصور بس بس ہوشربا۔ میرے کان اس سے زیادہ نہیں سن سکتے، میرا دل اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا، میں تمہارے ساتھ چلوں گا آج شب ہی کو اور تمہیں ضرورت نہ ہوگی، کہ تم اس ناپاک دنیا میں ایک سانس لو، اس ذلیل زندگی کا ایک لمحہ بسر کرو۔

ہوشربا نہیں منصور یہ نہیں ہو سکتا، میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتی کہ تم میرے ساتھ رہو، ہم لوگوں کی دنیا وہ دنیا ہے منصور جس میں حسن کی عزت نہیں، لیاقت کی قدر نہیں، شرافت کی پرکھ نہیں، اس دنیا میں ایک ہی چیز کسوٹی پر پوری اترتی ہے اور وہ دولت ہے منصور

{ لفظ دولت پر اب یہ منظر پھر کٹ ہو کر معلوم ہوتا ہے کیمرہ جلدی سے گھوم کر ساتھ والے کمرہ میں ایک چمکتے ہوئے ہیروں سے مرصع کنگن پر ٹھیرتا ہے، ہیرے جگمگا کر آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہے ہیں، سین کشادہ ہوتا ہے عظمت پور کا نواب ہوشربا کے ملاقاتی کمرہ میں کلن کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ نواب کے ہاتھ میں ہیروں کے کنگن ہیں۔ ایڈیٹر }

نواب دیکھو میاں کلن کیسے کنگن ہیں، ایسے ہیرے مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں

مصاحب۔ (دیکھتے ہوئے) ہوگا کوئی بیس پچیس ہزار کا مال سرکار

نواب - پندرہ ہزار دیئے ہیں۔

کلن - واہ واہ تو مفت ہی ہاتھ آ گئے۔

نواب - تمہاری ہوشربا کے لئے لایا ہوں۔

کلن - خدا سلامت رکھے سرکار کو آپ ہی کا کھاتے ہیں، ہوشربا نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے سرکار ہی کے ٹکڑوں پر پلی ہے۔

ہوشربا اندر کے کمرہ سے نکل کر داخل ہوتی ہے۔

نواب یہاں تو آؤ گڑو۔ کیوں پسند ہیں یہ کنگن، ذرا پہنو تو انہیں۔

ہوشربا (خوش ہو کر) واہ آپ کی پسند کچھ ایسی ویسی ہے کیا۔ تسلیم

نواب شکریہ۔

منصور جو اب تک شرم کے احساس سے پردے کے پیچھے کھڑا تھا اندر کے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آتا ہے۔

منصور آداب عرض۔

نواب (شکل سے الجھتے ہوئے) اخاہ بیرسٹر صاحب ہیں۔ آداب! آداب!!

مزاج تو اچھے ہیں بھئے یہ آپ کہاں آ نکلے یہاں۔

منصور بس یونہی، فقط آپ کی ہوشربا کو دیکھنے آیا تھا۔

نواب خوب۔ خوب۔ یہ ہماری ہوشربا اچھی رہی، اجی حضور، یہ لوگ کسی کے نہیں ہوتے۔ اس کمرے میں ہوشربا آپ کی، اور اس کمرے میں ہوشربا ہماری!!!

ہوشربا (بگڑ کر) واہ نواب صاحب یہ فقرے، ہم ہی پر کس رہے ہو۔

نواب (خوشامد سے ہوشربا کے گال پر ہلکا سا تھپڑ مار کر) کیوں بگڑ گئیں اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں۔

منصور میں اجازت چاہتا ہوں۔ نوابصاحب۔

نواب خوب۔ خوب اجازت ہم سے یا ہوشربا سے۔

(منصور کے جانے کے بعد)

نواب یہ بیا اُلو تو تم نے خوب پھانسا ہوشربا۔

ہوشربا اگر کوئی شخص خود ہی بے وقوف بنے تو اس میں میرا کیا قصور۔

نواب بہت قابل آدمی ہے، بیرسٹری میں بڑا نام پایا ہے اس نے، مگر یہ تم لوگوں کے گھروں میں آ کر انسان کی عقل و فہم سب غارت کیوں ہو جاتی ہے؟

ہوشربا آپ کی عقل تو سلامت ہے نا سرکار

نواب اجی ہم تو جنم کے بیوقوف ہیں۔ ہمارا پیشہ ہی بیوقوف بننا ہے۔

ہوشربا جان بوجھ کر بے وقوف کیوں بنتے ہیں آپ۔

نواب نواب جو ٹھیرے ہا ہا ہا۔ ریاست کا ٹھاٹھ اسی گدھے پن پر ہے!!!

ہوشربا اجی توبہ توبہ کرو سرکار آپ سے بڑھ کر کون دانا ہے

نواب اب بنانے لگی ہو، ہیں اور بھی بے وقوف۔ اچھا۔ یہ تو کہو تم اتنی کٹو کیوں ہو۔ ہاں۔

کلن خدا سلامت رکھے حضور کو۔

مصاحب بڑے قدردان اور جوہر شناس ہیں سرکار۔

(نواب ہوشربا کو پیار کئے جا رہا ہے)

(کاپی رائٹ) حکیم احمد شجاع

نیرنگ خیال کا عید نمبر

جنوری ۱۹۳۵ء میں ملاحظہ فرمائیے

حجم ۱۰۰ صفحہ۔ متعدد تصاویر اور مشہور اہل قلم کے مضامین

قیمت آٹھ آنے مستقل خریداروں کو مفت ملتا ہے۔ منیجر نیرنگ خیال، لاہور

دو دھاری تلوار

حکیم یوسف حسن چیف ایڈیٹر نیرنگ خیال کے قلم سے

(نقل و ترجمہ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں)

نیرنگ خیال قبلہ حکیم یوسف حسن صاحب کا ذاتی پرچہ ہے۔ اس لئے اس میں اس ڈرامہ کی یا حکیم صاحب موصوف کے دوسرے ڈراموں کی تعریف لکھنا کچھ غیر موزوں سا معلوم ہوتا ہے ہم صرف اس قدر لکھتے ہیں کہ حکیم صاحب مدت سے ڈراموں اور افسانوں میں گہری دلچسپی لے رہے ہیں آپ نے آج تک کم و بیش پچاس افسانے لکھے ہوں گے جو مخزن، توحید، ہمایوں، تازیانہ اور نیرنگ خیال میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے پانچ افسانے خاص طور پر فلمبندی کے لئے موزوں ہیں مثلاً خواجہ سرا، ہوس پوش، الحمرا، جوڑی سرولو اور دو دھاری تلوار۔ آپ فلم کے لئے ہزار پانچسو میں ایک افسانہ تو دے سکتے ہیں مگر افسانہ کا مکالمہ اور سینریو مکمل تیار کر کے دینا دس ہزار سے کم کا کام نہیں اور ہماری فلم کمپنیاں ابھی اتنی رقم خرچ کرنے پر تیار نہیں ہیں قبلہ حکیم صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستانی فلم سازی کا بنیادی پتھر یعنی افسانہ ہی ہمیشہ کمزور ہوتا ہے۔ ہمارے فلمی افسانوں میں نہ رومانیت ہوتی ہے، نہ مقصد نہ نتیجہ نہ جدت نہ پلاٹ کی خوبی نہ واقعات کا تسلسل، الغرض وہ جملہ خوبیوں سے خالی ہوتے ہیں اسی لئے ہندوستانی فلمیں اپنے اندر کوئی افسانوی خوبی نہیں رکھتیں۔

دو دھاری تلوار ایک افسانہ ہے جو اپنے اندر دو دوستوں کی لازوال اور سچی محبت پر عشق اور رقابت کے ہتھیاروں سے حملہ آور ہوتا ہے۔ بن ننست سوز دشمنوں کے مقابلہ میں دو دوستوں کی سچی محبت کا پروان چڑھنا اور اس کے ساتھ جملہ افسانوی کشمکش اور دلچسپیوں کا قائم رہنا ایک قابل تعریف کارنامہ ہے

اسسٹنٹ ایڈیٹر

افسانہ کا خلاصہ

ایک حسین عورت (حور بانو) کے لئے دو نوجوان اسمعیل اور غیاث ایک جنگل میں تلواریں میان سے نکال لیتے ہیں اور ایک دوسرے کا خون پینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ حور بانو اس ڈوئیل کی خبر پا کر بے تابی سے موقعہ پر پہنچتی ہے اس سڑک پر ایک مسافر ملتا ہے جس سے وہ طالب امداد ہوتی ہے (یہ مسافر ایک گھوڑے پر سوار وہاں سے گذر رہا تھا) مسافر کا نام مسعود تھا وہ فوراً موقع پر پہنچ کر اسمعیل اور غیاث کو جنگ سے روک دیتا اور حور بانو کو دونوں میں سے ایک کو پسند کرنے پر مجبور کرتا ہے، حور بانو تنگ آکر اسمعیل کی طرف اشارہ کرتی ہے، غیاث اسی وقت انتقام کی قسم کھا کر ایک طرف چل دیتا ہے۔ مگر اسمعیل اور مسعود حور بانو سمیت واپس آتے ہیں۔ حور بانو اپنے مکان پر چلی جاتی ہے اور اسمعیل مسعود کو اپنے مکان پر مہمان ٹھہراتا ہے اور پھر اس کی آمد کو مبارک تصور کر کے اسے اپنا دوست اور بھائی بنا لیتا ہے اور دونوں یکجا رہنا شروع کر دیتے ہیں۔

اب اسمعیل حور بانو سے وقتاً فوقتاً ملتا اور شادی کا طلبگار ہوتا ہے۔ لیکن ان کی محبت پر مسعود کا حسن اور جواں مردی غالب آجاتی ہے، حور بانو بجائے اسمعیل کے نووارد مسعود سے محبت کرنے لگتی ہے مسعود کے دل میں بھی حور بانو کی محبت کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ مگر وہ اسے دبائے رکھتا ہے کوشش کرتا ہے حور بانو کے سامنے نہ جائے مگر ایک دن ــــــ

حور بانو کا مکان { حور بانو تنہا بیٹھی ہوئی ایک راگ گاتی ہے۔ گانے کے خاتمہ پر مسعود داخل ہوتا ہے }

(مسعود کے ساتھ دو غلام ہیں جو تحائف برتنوں میں رکھ کر ہمراہ لائے ہیں۔ غلام برتن فرش پر رکھ دیتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ حور بانو ساز ایک طرف رکھ دیتی ہے

وہ مسعود کی طرف متوجہ ہو کر کہتی ہے)۔

حوربانو خدا کی سو سو رحمتیں ہوں اس شکار پر اور شکار کے بھیجنے والے پر، جس کی وجہ سے آج آپ کی صورت دیکھنے کا موقعہ ملا!
کہئے آپ کی معشوقہ تو خوش ہیں۔

مسعود بہت خوش۔ اور آپ کی خدمت میں سلام کرتی ہیں۔

حوربانو (کھڑی ہو کر) کون ہے وہ!!

مسعود۔

حوربانو تم جو ایک علانفروش بہادر ہو، ایک عورت کے سامنے یوں ہتھیار ڈال دیتے ہو، اور اس کی خاطر اپنے دوستوں تک کو بھلا دیتے ہو!

مسعود میرا بار بار آپ کے سامنے نہ آنا ہم سب کے لئے یکساں مفید تھا۔
(ایک تپائی پر بیٹھ جاتا ہے اور گہری سوچ میں چلا جاتا ہے)

حوربانو جب تک آپ صاف صاف نہ کہیں گے، میں یہ پہیلیاں نہیں بوجھ سکتی۔

مسعود اگر آپ کے اصرار پر میں کوئی ایسی بات کہدوں جس سے آپ کو رنج اور صدمہ پہنچے تو کیا آپ مجھے معاف کر دیں گی؟

حوربانو فرمائیے، فرمائیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔

مسعود میرے فرار کی داستان تم اپنے چاہنے والے اسمعیل سے سن چکی ہو، میں بڑی پریشانی کی حالت میں اپنے وطن سے بھاگ نکلا تھا اور یقیناً اس وقت میرے دل میں دنیاوی لذتوں کے لئے کوئی خواہش باقی نہ رہی تھی، کہ سڑک کے کنارے تم سراسیمگی کی حالت میں مجھے ملیں اور تم نے اس انداز میں مجھ سے اعانت طلب کی کہ آنکھیں چار ہوتے ہی تیر نگاہ نے مجھے گھائل کر دیا۔!!!

(حوربانو ایک ستون سے سہارا لیتی ہے، اس کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں اور جسم لرز رہا ہے۔
مسعود اٹھکر ٹہلنے لگتا ہے)۔

مسعود مجھے خود تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح سے میرے دل میں تمہاری محبت اتنی جلدی پیدا ہو گئی، کیا اس کے بعد بھی مجھے بار بار آپ کے سامنے آنا چاہئے تھا؟

{ مسعود رک کر حوربانو سے آنکھیں چار کرتا ہے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب چاہتا ہے۔ }

حوربانو (جوش مسرت کو دباتے ہوئے) مگر تم نے اسمعیل سے اپنی محبت کا کوئی اور بھی قصہ کہا تھا۔

مسعود وہ ایک فریب تھا، اسمعیل جب کبھی مجھے آپ کے پاس آنے کے لئے مجبور کرتا تو میں اپنی فرضی محبوبہ سے ملنے کا بہانہ کر کے ٹال دیتا تھا۔
حوربانو! کیا میری غیر حاضری حق بجانب نہ تھی! مجھے معاف کرنا

حوربانو معاف کر دوں! (جوش مسرت سے دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی ہے۔
(مسعود حیران اور خشمگین ہو کر اسے پرے ہٹا دیتا ہے)

حوربانو (تعجب سے) مسعود جو تمہارے دل کا راز ہے وہی میرے دل کا راز ہے، تمہیں کیا معلوم کہ جس تیر نے بے خبری کی حالت میں تمہیں زخمی بنا دیا تھا وہی تیر میرے دل میں بھی اتر چکا ہے، تم نے جس شجاعانہ انداز میں اسمعیل اور خیاث کو جنگ سے روکا تھا اس سے تمہاری محبت اور عزت میرے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نقش ہو گئی ہے، میں دنیا میں صرف ایک شخص سے محبت کرتی ہوں اور وہ تم ہو۔

(مسعود پرے ہٹ جاتا ہے اور کمرہ کے کونہ میں رکھی ہوئی ایک تپائی پر بیٹھ جاتا ہے وہ سرنگوں ہے اور تاثرات سے جنگ کرتا معلوم ہوتا ہے۔ حوربانو اس کے قریب جاتی ہے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھکر محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے)

مسعود نہیں! نہیں!! کیا تم فراموش کر گئیں کہ تم نے اس دن اسمعیل کو انتخاب کیا تھا؟

حوربانو مجھے اس سے کب انکار ہے تم دو مرد تھے اور تمہارے حکم کے مطابق ان حالات میں دونوں میں سے ایک کو انتخاب کرنا تھا، اس وقت بھی میں نے اسمعیل سے نہ شادی کا وعدہ کیا نہ محبت کا، مجھے دو آدمیوں سے اسمعیل کو انتخاب کرنا پڑا نہ کہ تین آدمیوں میں سے۔

(مسعود پژمردہ حالت میں اٹھتا ہے، اونچے چینے کے ساتھ دوسری طرف ٹہلنے لگتا ہے اور حوربانو کی طرف دیکھتا بھی نہیں)۔

حوربانو مگر یہ کیا! اس وقت جب میں اپنی بے پایاں محبت کا راز تمہارے قدموں پر نچھاور کر رہی ہوں، تمہارے چہرے پر رنج و فکر کے جذبات ظاہر ہو رہے ہیں، میرا اقرار محبت تمہاری آنکھوں میں وحشیانہ جوش و مسرت کی آگ پیدا کرنے سے کیوں قاصر رہا ہے؟
آہ! میں ایک کمزور عورت ہوں اور عورت اپنے دل کا راز ظاہر کر کے ہمیشہ پچھتاتی ہے!

مسعود تم جس قدر زیادہ اظہار محبت کرو گی، اس سے زیادہ میں اپنے آپ کو

بدقسمت سمجھوں گا۔ تم نہیں جانتیں کہ مجھے اسمٰعیل سے کس قدر محبت ہے، کیا تم خیال کرسکتی ہوں کہ میں اپنے دوست کی پیاری امیدوں کے کھنڈر پر اپنی مسرتوں کا محل تعمیر کروں گا۔

(منہ پھیر کر بیٹھ جاتا ہے۔ حوربانو اس کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ جاتی ہے اور اس کی گود میں سر رکھکر مضطربانہ انداز میں کہتی ہے)

حوربانو نہیں نہیں۔ یہ ظلم ہوگا، ذہبے انصافی، میں نے اس سے شادی کا کبھی وعدہ نہیں کیا، اور نہ اس کا دل بڑھایا، نہ اقرار محبت کیا، تمہارے دوست کو تھوڑا سا رنج ضرور ہوگا، مگر اس بے پایان مسرت کا خیال کرو جو ہم دونوں دائمی اتحاد سے پیدا ہوگی!

مسعود (حوربانو کو آہستگی سے پرے ہٹاتے ہوئے کھڑے ہوکر)
نہیں تمہارا خیال غلط ہے، اگر تم اس گہری محبت کا اندازہ کرسکو جو میرے دل میں اسمٰعیل کے لئے ہے تو تم مجھپر رحم کرنے کے لئے مجبور ہوجاؤ گی، اگر مجھے تمہاری اس محبت کا پیشتر علم ہوتا تو میں اسے دوست بنانے سے پہلے اپنا رقیب بنالیتا۔ آہ۔ اب میں اس کا خادم ہوں۔

حوربانو فیصلہ کرنے سے قبل ایک بار پھر سوچ لو، میرے پاس لاکھوں رُپے زر و جواہر ہیں، اگر ہم چاہیں تو کل صبح ہماری آنکھ کسی آزاد سرزمین پر محبت کی پرامن فضا اور دولت کے انباروں میں کھل سکتی ہے وہاں دوسری دنیا ہوگی جہاں آرام ہوگا، اور عیش، تم ہونگے، اور میں۔

مسعود نہیں ہوسکتا، مسعود سے ایک دوست کی محبت یوں نہیں چھینی جاسکتی، رخصت حوربانو۔ رخصت۔

حوربانو ٹھیرو۔ ٹھیرو۔!!

{روتی ہوئی اس سے لپٹ جاتی ہے، آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگتے ہیں، اور مسعود کے استقلال میں تزلزل پیدا ہونے لگتا ہے}

مسعود میرے استقلال کو اپنے آنسوؤں سے شکست نہ دو، میں ان آنسوؤں کے حملوں کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کرسکتا، مجھے اپنے دوست کی عزت بچانے کے لئے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔

(جلدی سے باہر نکل جاتا ہے اور حوربانو حسرت سے دیکھتی رہجاتی ہے)

منظر چہاردہم:۔ اسمٰعیل کا مکان

(مسعود علالت طبع کا بہانہ کئے بستر پر پڑا ہے۔ اسمٰعیل عیادت کے لئے آتا ہے)

اسمٰعیل اب طبیعت کیسی ہے، تین دن سے تم کمرہ سے باہر ہی نہیں نکلے۔
(بیٹھ جاتا ہے)

مسعود طبیعت خراب رہتی ہے، سر میں درد ہے اور ہلکی ہلکی حرارت۔

اسمٰعیل تم نے مجھے بالکل اطلاع نہیں دی، حکیم کو بلوایا ہوتا (جسم کو ہاتھ لگاکر) پنڈا بالکل ٹھنڈا ہورہا ہے، اب بالکل بخار نہیں، چلو۔ اٹھو۔ دل بہلاؤ۔

مسعود (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے) ابھی کمزوری باقی ہے۔

(ایک خادم داخل ہوکر ایک وحشت ناک خبر سناتا ہے)

خادم اعلیحضرت۔ ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ بیگم حوربانو اپنے دیہاتی محل کو چلی گئی ہیں۔

اسمٰعیل (کھڑے ہوکر حیرت سے) دیہاتی محل کو۔ وہ تو یہاں سے ساٹھ کوس کے فاصلہ پر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں غلط اطلاع ملی ہے۔

خادم نہیں حضور یہ بالکل صحیح ہے، مجھے بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی کے دونوں خادموں نے بتایا ہے، بیگم صاحبہ تنہا نہیں گئیں بلکہ بہت سی لونڈیاں اور ضروری سامان بھی ساتھ گیا ہے۔

اسمٰعیل حوربانو کا اس طرح سے بغیر اطلاع چلے جانا، میں فال بد سمجھتا ہوں۔
(خادم سے مخاطب ہوکر) تم جاؤ اور بیگم کے مکان پر جاکر صحیح حالات معلوم کرو۔

اسمٰعیل (مسعود سے مخاطب ہوکر) ہمیں چلنا ہوگا۔

مسعود کہاں؟

اسمٰعیل حوربانو کے پاس

مسعود جب وہ بغیر اطلاع کے چلی گئی ہے تو اس کے تعاقب میں جانا اپنا وقت ضائع کرنے کے برابر ہے۔

اسمٰعیل میں ایک لحہ بھی توقف نہیں کرسکتا۔

مسعود تو آپ کو اختیار ہے۔

(اسمٰعیل حیرت زدہ رہ جاتا ہے، مسعود کا بازو پکڑ کر اُسے اٹھاتا ہے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے)

اسمٰعیل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

مسعود ناممکن۔ میں نہیں جاسکتا۔

اسمٰعیل تمہیں چلنا پڑے گا۔

مسعود معاف کیجئے، میں ایک عورت کے پیچھے نہیں جاسکتا۔

اسمٰعیل تم میرے دوست ہو مسعود، تمہارا اس طرح سے انکار کرنا، میں کسی صورت برداشت نہیں کرسکتا۔

مسعود دیہاتی محل میں بیٹھکر جو گفتگو تم دونوں کے درمیان ہوگی اس کے سننے کے لئے کسی تیسرے آدمی کی موجودگی یقیناً مضر ہوگی۔

اسمٰعیل مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے اور حور بانو کے درمیان کسی بات پر اختلاف ہے۔ کیا وہ راز تم مجھپر ظاہر نہ کروگے۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

مسعود (ہاتھ ملتے ہوئے) یہ ناممکن ہے۔

اسمٰعیل (نرمی سے) میرے بھائی، میری جان۔ تم سب سچ سچ کہدو۔

مسعود کیا آپ اسے سن سکیں گے؟

اسمٰعیل ہاں، ہاں۔ میں بری سے بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں۔

مسعود آپ سنناچاہتے ہیں تو سنئے، جس عورت سے آپ کو محبت ہے۔ وہی عورت میرے دلپر بھی قابض ہے۔

(اسمٰعیل غصے سے لرزنے لگتا ہے اور کھڑا ہو جاتا ہے)

اسمٰعیل تم میرے رقیب ہو۔ کیا یہ ممکن ہے۔

مسعود (اسی طرح اپنے خیال میں بیٹھا ہوا اپنے خیال میں کہے جاتا ہے) اس وقت سے میں برابر کوشش کرتا رہا ہوں کہ اس جذبہ کو دباؤں مٹادوں۔ (اسمٰعیل کی طرف مخاطب ہوکر) تم کو معلوم ہے کہ میں حور بانو کے سامنے جانے اور اس سے ملاقات کرنے سے ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں لیکن مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اپنے جذبات کو پوری طرح تباہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ گذشتہ ملاقات کے موقعہ پر حور بانو کے سامنے اقرار محبت بھی کرچکا ہوں، اس لئے اب میں اس کے سامنے جانا گناہ سمجھتا ہوں۔

اسمٰعیل حور بانو نے تمہارے اقرار محبت کے بعد کیا کیا۔

مسعود وہی جس کی امید نہ تھی، میرا خیال تھا کہ وہ مجھسے نفرت کرے گی اور میرا تمسخر اڑائے گی، لیکن آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس نے بڑی گرمجوشی سے اظہار محبت کیا۔

اسمٰعیل (غصہ سے) رک جاؤ۔ ایک حرف نہیں، تمہارے الفاظ نہیں خنجر کی دھاریں ہیں جن سے میرا دل پارہ پارہ ہوگیا ہے۔ (سینہ کھول دیتا ہے اور مسعود کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے) آہ۔ تم میرے دوست ہوکر اپنی فتحمندی کی داستان سنانے کی جراءت کرتے ہو، اس سے بہتر ہے کہ تم اپنا خنجر میرے سینہ میں بھونک دو۔

(سر جھکا دیتا ہے اور آنسو بہنے لگتے ہیں)

مسعود ٹھیرئیے پہلے میری بات سن لیجئے، میں جو کچھ بھی ہوں مگر جھوٹا اور مکار نہیں ہوں، ایک حسین عورت کے اقرار محبت کے بعد جس کی بلوریں باہیں میری گردن میں حمایل تھیں، جبکہ اس کے سرخ سرخ ہونٹ لمسوں کے لئے میرے قریب ہی تھے جبکہ ایک دھڑکتا ہوا دل گرم جوش آغوش میں جانے کے لئے تڑپ رہا تھا جبکہ مجھ سا خطاکار انسان محبت کے جوش میں اپنا ایمان تک نچھاور کرنے والا تھا، دوستی نے محبت پر فتح حاصل کرلی۔

(اسمٰعیل کو پکڑ کر پاس بٹھا لیتا ہے)

مسعود میرے دوست یقین کرو کہ میری لرزتی ہوئی کمزور انگلیاں جو اس کے شانوں کو تھامے ہوئے تھیں فولاد کی طرح سخت ہوگئیں، میری آنکھیں جن سے محبت کا جوش ٹپک رہا تھا، نفرت وحقارت سے بدل گئیں، میرا خون جو جوش سے رگوں میں تڑپ رہا تھا یکسر سرد اور زرد ہوگیا، میں نے اسے بے جان لاش کی طرح اٹھاکر پرے پھینک دیا محبت پر فتح پالینے کے بعد میرا سر بلند تھا اور فتح ونصرت کا پھریرا دوستی کی مضبوط چٹان پر پوری شان سے لہرا رہا تھا۔

اسمٰعیل کیا میں یقین کرسکتا ہوں کہ میرے کانوں نے غلط سنا، اور تمہاری زبان نے غلط کہا تھا؟

مسعود ہاں ہاں، سنو۔ اس حسین ساحرہ کا آخری حربہ اس کے آنسو تھے، تمام دنیا کی قیمت محبت کے ایک آنسو سے کم ہے، مگر میں نے اپنے آپ کو زیادہ امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا، اس لئے جلدی سے نکل آیا اس کے بعد میں اپنے کمرہ میں بیمار بن کر پڑا رہا، لیکن درحقیقت میں سفر کی تیاری میں مصروف تھا، اب میں بالکل تیار ہوں اور کل صبح یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے چلا جاؤں گا۔

اسمٰعیل نہیں میرے دوست مجھے معاف کردو۔ (مسعود کو گلے لگا لیتا ہے) میرے پیارے دوست! تم بے قصور ہو۔ وہ دودھاری تلوار ہے جس نے دو دوستوں کو کاٹنے کی کوشش کی تھی، میرے بھائی کوشش

رقابت میں میرے منہ سے کئی ایسے الفاظ نکل گئے ہیں جن پر مجھے افسوس ہے، واقعی تم وفادار دوست ہو۔ حور بانو کی ہے تو یہی میری بدقسمتی کی علامت ہے۔

مسعود نہیں میرے دوست، اب مجھے جانا ہوگا۔

اسمٰعیل سنو۔ کیا اب میرا فرض نہیں ہے کہ میں اپنے جذبات محبت کو فنا کر دوں، میں اپنی محبت کو فراموش کر دوں گا۔ میرا دل تنہائی میں شاید کسی وقت افسردہ ہو لیکن وہ تم دونوں کو مسرور و شادماں دیکھ کر مسرت سے لبریز رہیگا، صرف تم ہو جو حور بانو کو خوش رکھ سکتے ہو۔

مسعود نہیں نہیں، حور بانو تمہاری ہے اور تمہارے لئے ہی وقف رہے گی میں تمہاری عیش و مسرت کی دنیا پر ایک وبا کی طرح نازل ہوا ہوں آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات اس طرح بدل سکتے ہیں۔

اسمٰعیل مسعود تمہیں میرا کہا ماننا پڑیگا۔

مسعود اسمٰعیل تمہیں میرا کہا ماننا پڑے گا۔

(حکیم) یوسف حسنؔ

افسانہ

مُنّی

میں نے اُسے دیکھا جب وہ صرف چھوٹی سی مُنّی تھی۔
خوبصورت اور بھولی . . . . "
آفتاب کی شعاعوں کی طرح منوّر
موسم بہار کی اوس کی طرح چمکیلی !!
پھول اور چڑیاں اس کی سہیلیاں تھیں
دن بھر ان کے ساتھ کھیلتی . . . . "
آہ وہ پھول ہی کی طرح خوش اور معصوم تھی۔
میں نے اُسے پھر دیکھا . . . .
سولہ برس کی ایک خوبصورت دوشیزہ
اس میں ایک نیا انداز تھا
شرم و حیا کی تھی ایک مجسم مورت
اس کی آواز ایک دلکش تان تھی
اور چاندنی کی سی تھی اس میں چمک
بہتوں کے لئے باعث رشک تھی
اور — ہاں — کسی ایک کے لئے تھی وہ سبب حیات
کئی برس گذر گئے۔
میں اس کے پاس پھر کھڑا تھا
کلی اب ایک پھول بن چکی تھی
اور پھول —————— ایک پھل
اب وہ ایک باعظمت ماں تھی۔
گودی میں اس کے ایک بچہ تھا
میں نے خیال کیا . . . .
اب وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت تھی

میں نے اسے ایک بار پھر دیکھا
اس دن جب وہ اس دنیا کو چھوڑ رہی تھی
بہشت کی روشنی اس کے چاروں طرف تھی
نہ اسے کسی چیز کی ضرورت تھی
نہ کسی کا خوف تھا
آہ! میں نے دیکھا . . . .
اس وقت وہ سب سے زیادہ حسین تھیں۔

پرتھو دیال
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ل احمد

بغداد کی ایک رات

ادیب سحر نگار جناب لطیف الدین احمد صاحب کے قلم سے

کارہا مطربہ زہرہ نہادم و ارم
گر لبم نالہ بہ ہنجار سرآید چہ عجب! (اقبال)

میں اپنی زندگی میں، ایک واردات کے بعد سے اپنے شاعر نہ ہونے پر ہمیشہ حسرت کش رہا ہوں، اور اس آرزو میں جتنی کوشش وکاوش کی اس پر خوب ہنسا ہوں دوسروں کے عوض بھی ہنس لیا ہوں! لیکن آپ تعجب کریں گے، میری اس آرزو میں کوئی کمی نہ آئی! شہرزاد اور بغداد! میرے لئے یہ دونوں لازم وملزوم ہیں، مترادف ہیں! ان میں سے کسی ایک کا خیال دوسرے کی یاد کے معنی ہیں، ہاں، تو جب میں شہرزاد کا خیال کرتا ہوں اور خیال ہمیشہ کرتا ہوں، تو یہ آرزو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ کاش میں شاعر ہوتا! اور یہ آرزو اس لئے تھی کہ میں ایک نغمہ سنانا چاہتا ہوں — آپ کو نہیں بلکہ اپنے دل کو! وہ نغمہ جو وہ ایک نغمہ شہرزاد کی صورت میں سن چکا ہے — ایک ایسا ریان محرور کیسا؟ آہ جیسا میرا دل چاہتا ہے!

ہاں تو اگر میں شاعر ہوتا تو الفاظ شرار سے ایک تصویر بناتا اور وہ تصویر رنگینی ملتہب اور موسیقی شباب کی تصویر ہوتی، کہ شہرزاد اس سے بھی کچھ زیادہ تھی! میں اپنے الفاظ سے اس پیکر نزہت کی فوارہ نور گردن میں شعلوں کی نو سمو دیتا، اس کے گدرائے ہوئے بدن کے نازک حدودی خطوں کو نغموں کی قلم سے کھینچ کر دکھاتا کہ قدرت پر جب شاعرانہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو شہرزاد کی صورت کا شاہ بیت پیکر عالم کے افکار شعری کو ادنیٰ ترین نقالی بنا چھوڑتی ہے! میں اس کے باریک ترستے ہوئے بشرے کی دل نشینی، اس کو غزال دیدۂ ناتواں کی طرح روح آویزی، اس کو جہاں ریز تبسم استہام کی جانفزائی کی غزل خوانی نہ کرتا بلکہ میں ایک تنک انداز شرر فشاں اور شوق پاش مجسمہ بناتا ——— تشبیب شعلہ کا پیکر!

وہ الفاظ ومعانی کونسے ہیں جو یہ ظاہر کر سکیں کہ جب وہ اپنی چین جبین سے خمیدہ ابروؤں کو زیروزبر کرتی تو کس پر اسرار طریق سے ایک ایسا راز حسین برملا ہو جاتا جس کو وہ کائنات سے مخفی کئے ہوئے تھی! اس کی فطرت کی دوشیزگی کے اس نازک بیان پنہاں کی کیفیت میرے بساط نفس کا ابھرا ہوا نقش ہے ——— مگر میں آپ کو نہیں دکھا سکتا!

(۲)

میرے علیگڈھ کے پرانے دوست، عبدالاحد بغداد میں برٹش ہائی کمشنر کے مددگار تھے اور صلہ خدمات میں خان بہادر اور او بی ای بھی بنائے جا چکے تھے، ہرچند وہ مجھ سے دو سال آگے تھے لیکن ہمارے درمیان خلوص و رفاقت کی طرح پڑ گئی تھی! بی اے کرنے کے بعد سرکاری نوکری کے سلسلے میں ان کو عراق جانے کا موقع مل گیا تھا، میں نے بی اے کیا اور پھر ایم ایس سی کرنے کے بعد اب پانچ سال انگلستان وجرمنی میں تعلیم مکمل کرکے واپس ہو رہا تھا۔

آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ نو سال کی مفارقت کے بعد دو دوستوں اور خاصکر کالج کے دوستوں کو ملاقات کی کتنی آرزو ہو سکتی ہے؟ ان کا اصرار تھا کہ میں بغداد سے گذرتا ہوا ہندوستان واپس جاؤں اور میرا دل بھی یہی چاہتا تھا، کیونکہ اس سلسلے میں جتنی سیر وسیاحت ہو جائے میں اسے غنیمت سمجھتا تھا، ورنہ ایک مرتبہ زندگی کی ذمہ داریاں سر لے لینے کے بعد انسان کو بہت سے نادر وذریں موقعے کھو دینا پڑتے ہیں، میری شوریدہ بختی سے (اس کا مفہوم آخر میں آپ خود بخود سمجھ لیں گے) حکومت ہند نے میری لندن کی موجودگی ہی میں میری خدمات منظور کرکے محکمہ تعلیم میں ایک منصب پر میرا تقرر کر دیا تھا۔

چنانچہ وقت کی تنگی کے باوجود میں نے سفر کا پروگرام اس طرح ترتیب دیا کہ جتنی زیادہ ممکن ہو سیاحت کر سکوں، اور اسی لئے میں نے طے کیا تھا کہ ہوائی جہاز سے اسکندریہ پہنچوں اور مصر کی قلو بطرائیت کے سم شیریں سے اپنی نظروں کو ہلاک کروں اور بحری راستے سے بیروت ودمشق میں زہرہ وشان شام کے جادوئے بابل

اور جاہ و عجب میں غوطے کھاؤں۔ وہاں سے موٹر سروس کے ذریعہ صحرا کی خاک پھانکتا خجستہ حال شہرزاد کے شہر میں پہنچوں اور ان گلیوں میں آوارہ گرد ہو جاؤں۔ جن کے ذرات کو ہارون، جعفر اور مسعودی کی قدمبوسی کا شرف حاصل ہے! آپ کو حق حاصل ہے کہ آپ میری غائت سفر پر تبسم فرمائیں، میں اس کا کوئی مداوا نہیں چاہتا، میرے یہاں تو سیر و سفر کا کوئی بہتر مفہوم ہی نہیں سکتا! اس دستور العمل کے تحت میں مجھے بغداد پہنچکر چالیس گھنٹے کی مہلت ملی تھی، جس کے بعد میں پھر ہوائی جہاز سے ہندوستان روانہ ہو جانے والا تھا۔

اس وقت میں آپ کو اپنے سفر کی تمام واردات تو سنانے سے رہا کہ قاہرہ میں میں نے کیسے زہر آلود جاموں کو لذت کام و دہن بنایا، اور بیروت و دمشق میں کس کس زہرہ جمال نے مجھے کنوئیں جھنکائے، کیونکہ میرا مقصود تو آپ کو کچھ بھی سنانا نہیں میں تو اپنی اس حسرت و تمنا کا اظہار کر رہا تھا کہ اگر میں شاعر ہوتا تو اپنے الفاظ و لغات سے ایک مرقع طیار کرتا! اس لئے سمجھ لیجئے کہ میں کیپنا پروگرام حسب مرضی اور تا بہ تسکین دل پورا کیا اور صحرا کی طویل مسافت طے کر کے میں قدیم و جدید دار السلطنت بغداد میں پہنچا، ہمارا موٹر کار وہاں کسی سبب سے دو گھنٹے دیر کر کے پہنچا، میں نے اپنے دوست سے قبل روانگی بذریعہ خط و کتابت طے کر لیا تھا کہ اس مختصر قیام کے لئے سہولت اسی میں ہے کہ میں ہوائی کمپنی کے ہوٹل میں ٹھہر جاؤں، غرض جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا میرے دوست وقت مقررہ پر موٹر اسٹیشن پر آئے تھے، اگر دیر ہونے کے باعث واپس چلے گئے تھے کیونکہ عبد الاحد بغداد میں نہایت مصروف آدمیوں میں سے ایک تھے اور جب وہ دوبارہ آئے تو میں ہوٹل میں پہنچکر گہری نیند کے مزے لے رہا تھا، کیونکہ میں اتنا خستہ و مضمحل پہنچا کہ غسل کر کے پلنگ پر پڑ جانے کے سوا کوئی اور علاج سوجھ ہی نہ سکا، میں جس وقت لیٹا تھا تیسرا پہر تھا۔ کہیں دور دف بج رہا تھا اور نے بج رہا تھا، مگر میں اس کی آواز منٹ دو منٹ سے زیادہ نہ سن سکا اور غافل سو گیا، جب میں بیدار ہوا، تو رات کا آغاز تھا چاندنی کھلی ہوئی تھی، اور ہوٹل کے مختصر باغیچہ میں گل مہتاب بکھرے ہوئے تھے، کمرے کے باہر، کسی کنج میں ایک بلبل نغمہ ریز ہو رہی۔ یا مصروف شیون تھی، میں اس کا فیصلہ کبھی نہ کر سکا کہ بلبل گاتی ہے یا روتی ہے! اس لئے میں اس کی صدا کو اپنی حالت سے مطابق کر لیتا ہوں، اگر میں خوش ہوں تو وہ نغمۂ موسیقی کی بہجت معلوم ہوتی ہے، اور اگر میں ملول ہوں تو نالہ و بکا محسوس ہوتی ہے! غرض اس رات نقرئی ماہتاب اور چند جھلکے اور ماند ستاروں کی رات میں، میں اس بدیعہ تخلیق شہرزاد کو دیکھنے والا تھا، اس کی الف لیلائیت میں گم ہو جانے والا تھا۔ اور وہ بلبل واقعی شادمانی کا ترانہ الاپ رہی تھی! میں جب بھی خیال کرتا ہوں کہ اس رات مجھے کیا پیش آیا تو یہ بات طرفہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مجھے سان گمان بھی نہ تھا! حالانکہ ایسی رات کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہونا تھا؟

(۳)

کم و بیش چار گھنٹے کی گہری نیند لینے کے بعد جب کسی کی دستک نے مجھے جگایا تو میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کر رہا تھا، میری میز پر عبد الاحد کا خط رکھا تھا، وہ آئے تھے مگر میرے آرام میں مخل نہ ہونا چاہا، خط چھوڑ گئے تھے کہ آٹھ بجے یا اس سے پہلے وہ میرا انتظار کریں گے۔ اور یہ کہ ہوٹل کے خدمتگار کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ اگر میں نہ جاگوں تو ساڑھے سات بجے مجھے جگا دے کیونکہ ایک صحبت جشن سرانجام دی گئی ہے جس میں بعض مقامی احباب و عمائد بھی شریک ہوں گے، شام و عرب کی لیلیٰ وش و عذرا عذار رقاصائیں، ایران کی شیریں جمال مطربائیں اور زرین کمر مغبچے اپنے کمال فن کی نمائش کریں گے، گویا رقص و سرود و لہو نغمہ و طرب کا انتظام سب سے بالاتر تھا! اور یہ کہ ان کا خادم مع موٹر کار موجود رہیگا۔

میں منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہن رہا تھا کہ باہر بلبل پھر زمزمہ نواز ہونے لگی، شہد کے سنہرے قطروں کی طرح شاخ میں سے اس کے نقرئی نغمے ٹپک رہے اور نقرئی چاندنی کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہوتے محسوس ہوئے جس کی لذت و حلاوت سے لبریز کیفیت کا اندازہ صرف روح کو ہو رہا تھا جو اس کے بس کی بات نہ تھی! رات کسی قدر گرم تھی، گرم سے میرا مطلب موسم کی گرمی نہیں بلکہ خاصہ و کیفیت کا اظہار مقصود ہے پورے چاندنے چھوٹے ستاروں کو خوفزدہ کر رکھا تھا! باغیچے میں سے پر اسرار طریق پر بےچین کر دینے والی تیز و شیریں خوشبو کمرے کے اندر داخل ہو رہی تھی، جس نے میرے مشام جان کو ذیحیات کر دیا تھا! میں نے اپنے آپ سے کہا:-

"یہ شہر ہے جہاں ہر ہر قدم پر روحانی واردات نصیب ہو سکتی ہیں! معلوم ہوتا ہے بغداد کی فضا آج بھی وہی ہے جو تقریباً ایکہزار سال پہلے تھی!"

موٹر اور نوکر میرے لیجانے کے لئے حاضر تھے، خادم کا نام حسن تھا یہ ایک نوعمر، خوشرو اور ذہین ایرانی لڑکا تھا، اور شاید یہ مقدر ہو چکا تھا کہ میں اس کو ایک خادم ہونے کی حیثیت سے بہتر سمجھوں، اور زیادہ جانوں۔

مختصر یہ کہ ہم روانہ ہو گئے۔ گو اب کہ چاندنی کی ضرورت تھی، چاندنے ایک سحاب آوارہ کی نقاب نازک اپنے عارض سیمین و منور پر لے لی تھی، اس طرح گویا وہ مجھے اپنی جنسیت شناخت کرا رہا تھا ——— آپ نہ مانیں، مگر مجھے تو چاند کی تانیث کے خیال سے مزہ آتا ہے، چاند اگر شمائل محبوب کی تشبیہ تام ہو سکتا ہے تو مجھے حیرت ہے کہ ہمارے شعرا و ادبا اس کی تانیث کے لطف و نزاکت کی طرف

سے اتنے مجھیں کیوں ہیں؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ نورانی چاند کو تانیث سے ضمیر کرنا اس کے حسن کو زیادہ شاعرانہ بنا دیتا ہے اور اس تشبیہ کو فطری طور پر ہی مکمل کر دیتا ہے۔ اس لئے جب کبھی آپ کی کوئی انجمن صحیح طور پر زبان کی خدمت کرنے پر آمادہ ہو اور شستگی و شائستگی پر بحث مباحثہ کرے تو میرا ووٹ ہمیشہ اس بات کے لئے سمجھئے کہ خواہ اور دس چیزیں تذکیر سے خردم کر دی جائیں مگر چاند کی تانیث قائم ہو جائے!

سڑکوں اور بازاروں کی روشنی میں نگاران ارمنی و یہودی برملا شیر بیا طرازیاں بھی نظر پڑیں اور برقع پوشان فارس و عرب کی دزدیدہ نگاہیں رہی بچیں راستہ گھوم پھیر کا اور طویل تھا شہر کے، امن میں چند جماعتیں یا کھٹے شہری قافلے لالٹین لئے دکھائی دیئے۔ جن چند معراشے تک وجود سیاہ چادروں میں ملفوف اور سفید دو بند ڈالے تھے۔

ان نقابوں کے پردۂ غیب میں کیا ہو سکتا تھا؟ ان کے اندر جلوۂ جمال بھی مستور ہو سکتا تھا جس کو چھونے کی ہمت نہ پڑے اور جوں کو توں رکھنے کی آرزو ہو اور اس کے بالکل متضاد اور برخلاف بھی! بہرحال چادر دار بند کے پردے میں ہر غیر دلکش عورت کو بھی موقع مل سکتا ہے، کیونکہ ——— عورت اگر عورت یعنی ہوشیار ہے تو ——— بعض وقت ایک مرد کے لئے رجعت دشوار ہو جاتی ہے!

بعض مکانوں کی رازدار دیواروں کے اندر سے بلند ہو کر منتشر ہونے والے نغمے اور ساز کی صدائیں اب سنے جانے سے زیادہ محسوس ہوتی معلوم ہوتی تھیں کبھی کبھی نغمہ ہزار کے ساتھ کوئی آواز شامل ہو کر معلوم نہیں کیا کہہ جاتی اور کیا کر جاتی تھی! لیکن یہ غنا و زمزمہ خواب کی آوازوں کی طرح بعید ہی تھے ایک لمحہ کے لئے گراموفون کی مشین ساختہ موسیقی بھی سامعہ خراش ہوتی معلوم ہوئی!

کسی طرف سے دائرے کی صدا آتی اور تاریکی میں اضافہ کرتی محسوس ہوتی، ایک کتے کا بھونک بھونک کر بھونکنا سنگت معلوم ہوا۔ مشرق میں دیہاتی سکون کے برخلاف ہمارے شہروں کا ——— شہروں کا کیا معنی ہماری زندگی کا ——— خاصہ شور و غل ہے، جو رات کو جس کا دوسرا نام سکون ہے شدید تر ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں کتے بھی حصہ لینے لگ جاتے ہیں یہ شور و شغب یہاں بغداد میں بھی اسی طرح موجود تھا جیسے اور کہیں، لیکن آبادی کی حدود سے باہر کی خموشی نظروں کو محسوس ہونے والی تھی ——— وہ اپنے تئیں محسوس کراتی معلوم ہوتی تھی! خیال ہوتا تھا کہ دائرہ و بربط کی صدائیں، عربی نغموں کے بول اور ان کے ساتھ مختلف قسم کی نامشخص آوازیں اس خموشی میں پہنچ کر فنا ہو جاتی تھیں، سکوت کو اس وسیع اور تیز رو دریا کی سطح پر جو کسی نامعلوم منبع سے نکل کر کسی نامعلوم مخزن کی طرف بہ رہا تھا، سارضی وآنی بلبلے بجاتی تھیں۔

یہی سکوت تو ہے جو در اصل مشرقی استغراق و تامل، گیان اور دھیان کی ناقابل توضیح خصوصیت اور جو فی الواقع مستقبل میں ظہور پانے والے فعل و عمل کے بیان ناکردہ اذکار ہیں، جو اس کی نوابیدگی میں خوابیدہ رہتے ہیں!

اب ہم شہر سے بالکل باہر ہو گئے اور دیہاتی مناظر سامنے آ گئے تھے۔ چاند نے بھی اپنی سحابی نقاب الٹ دی تھی، کہیں قریب سے مینڈ باجے کی موسیقی سنائی دینے لگی، دا ہنے مڑ کے پھر بائیں کو چلے۔ سنتری کی ڈانٹ اور ڈرائیور کی ڈپٹ سنی اور ایک بڑے پھاٹک میں داخل ہو گئے، میں ایک بستان کے اندر تھا ——— زندہ جادو آنکھوں کو دیکھ رہا تھا، شہرزاد کی آنکھوں کو! شہرزاد سواری سے اتری تھی کہ میری موٹر جا کر رکی۔

(۴)

جہاں ہم اپنی موٹر سے اترا، وہ وہیں کھڑی تھی ——— کیا واقعی وہ کھڑی تھی؟

ہاں الف لیلہ کی ایک کی رات کو اپنا پس منظر بنائے شہرزاد کھڑی تھی ایسے اپنے طلسمی بند دلبست کا جس میں اس کی خود ذات شامل تھی اور اس کے فسوں کا اثر پورا پورا احساس تھا ——— ایسا احساس جو صرف ایک عورت ہی کو ہو سکتا ہے ——— اور شہرزاد نے اس سے پورا پورا کام لیا۔

باغ میں چراغاں تھا، درختوں اور کنجوں میں قمقمے روشن کیے، فوارے موتیوں کے جال بنا بنا کر پھیلا رہے تھے، وسیع باغ کے ایک حصے میں بنگلے کی حسین عمارت تھی، اس کی پشت پر ایک پہاڑی تھی، مکان کی ہر منزل میں جداگانہ رنگ کی روشنی ہو رہی تھی اور ہر حصے کی مختلف روشنیاں بعد نفاست ہم آہنگ ہو رہی تھیں، متعدد رنگین سائے چلتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے فضائے بالا میں بغداد کا چاند جو کہیں اور کے چاند سے مختلف ہوتا ہے دریائے ابر میں حریفانہ شناوری کر رہا تھا، سطح زمین پر حوض اور چشمے اپنے اندر باغ، قمقموں، چاند اور آسمان کو منعکس کر رہے تھے، بڑا مرمریں حوض پگھلے ہوئے سونے سے لبریز معلوم ہوتا تھا

کسی کنج میں پوشیدہ مینڈ باجہ بج رہا تھا، اور اس کی موسیقی کی موجیں جا کر پہاڑی سے ٹکرا رہی تھیں، جو کچھ نظر آ رہا تھا یکسر توہم اور غیر وجودی معلوم ہوتا تھا! خیال ہوتا تھا کہ یہ سارا منظر خوابوں کے مسالے سے بنایا گیا ہے، تخیل نے جسم

اختیار کرلیا ہے، میرے ہونٹ کھل کر رہ گئے اور بس ایک چیخ نکل گئی ـــــ ایک چیخ جس میں کوئی آواز نہ تھی! میرا گلا گھٹ کر رہ گیا ـــــ اس طرح کہ کوئی ہاتھ استعمال نہیں کیا گیا تھا!

میرے موٹر سے اترتے ہی شہرزاد نے دونوں ہاتھ اپنے سنگستانِ سینہ پر رکھ کر ـــــ آہ، وہ انداز ِ سلام! ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کو ایک طویل لمحے تک تکتے رہے، لیکن میرا دل سینے کے اندر سر پٹک رہا تھا!

نا نینی در طلسم آن شبے
آن شبے بے کوکبے را کوکبے! (اقبال)

اس طلسم آگیں رات کی روح رواں تھی، حرکت قلب تھی! اس کی سیاہ پلکوں کی دراز جھالر کے اندر دو بالہ دار بادامی آنکھیں شبتابوں کے دلپسند تیر چلا رہی تھیں اور ستواں ناک کے اوپر ابروؤں کے دلپذیر خنجر دلوں میں ڈوبے جاتے تھے اس کا عنابی تنگ دہانہ نغومت و حرارت کا خزانہ تھا اور اس کے چسپیدہ لبوں کا مستقل انداز بریں ہمہ کہربائیت کا عمل اور رد عمل تھا! اس کا نچلا رس بھرا ہونٹ سر چکرا دینے والا افسانہ بیان کر رہا تھا! اس کی قرمزی شرخت (رقص کا لباس جو سر پر ڈالا جاتا ہے) کے نیچے سے اس کی خودسر زلف کالے سانپوں کی طرح نکلی پڑتی تھیں یہ سارا منظر وادی جنت کے منکر کی نفی کا مطالبہ کر رہا تھا!

"بسم اللہ!" میں نے قصداً کہا۔

اس نے ایک سانس لیا جسے میں نے سنا، اور اس کے نازک تبسم کی لہر ہمارے درمیانی فاصلے کے اندر بجلی کی طرح کوندی اور میرے اندر احساس بیداری کا طوفان بپا ہو گیا۔

"آقائے من، سایہ شما کم نگردد! ماشاءاللہ!" اس ہلکی آواز میں جو چشمے کے پانی ابلنے سے پیدا ہوتی ہے، اس نے کہا نہیں بلکہ گائی۔

حسن نے تو ہنستی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور لیجلا، وہ خفا ہو کر دوسری طرف دیکھنے لگی، میں نے محسوس کیا کہ نوجوان ایرانی نے جانکر اسے کبیدہ کیا ہے۔

"آقائے من، عورت ایک بلا ہے، لیکن ہر آدمی کے سر پڑتی ہے اور آقا تو تنہا بھی ہیں!" حسن نے اپنی دھیمی آواز میں کہا۔

وہ پھر اپنے سامنے دیکھنے لگا، اور میں اس کے ساتھ جانے پر مجبور تھا، ہرچند میں ایک قدم بڑھانا نہ چاہتا تھا"

"الحمد اللہ ہم آپہنچے!" حسن نے ایک خاص انداز میں کہا۔

مرمر کی چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایک گلفشاں روش پر ہو لئے، جس پر روشن قمقمے لٹک رہے تھے، میں نے واقعی چاہا کہ مڑکر نہ دیکھوں، مگر کیا کرتا، دیکھتے ہی بنی! شہرزاد بت بنی کھڑی تھی! اس کا ایک ہاتھ دل پر رکھا تھا، اس کی سرخ شرخت روشن رات کے بالمقابل ایک موج رنگین معلوم ہوتی تھی، اس نے کوئی حرکت نہ کی، اس نے کوئی تبسم نہ کیا، بس اس کی خوش نگاہیں میرے ساتھ چلتی رہیں یہاں تک کہ ایک ستون حائل ہو گیا۔

"یا اللہ!" حسن نے یونہی کہا، اور پھر ایک لمحہ کے بعد میرے برابر ہو گیا میں نے قیاس کر لیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اس نے شوق فزا نظروں سے بہتے ہوئے چاند کو دیکھا اور زیر لب تملقانہ آواز میں کچھ بڑبڑایا بھی تاہم اس کے خوبصورت چہرے پر طفلانہ مسکراہٹ چھا گئی اور یکایک مجھے دیکھنے لگا، اس کی آنکھوں میں چمک تھی اس نے کہا:۔

"وہ ابھی کمسن ہے، نورس ہے! پنیاروں کی طرح تازہ اور اچھوتی ہے لیکن ان کی طرح سرد نہیں، آقا نے دیکھا کتنی حسین صورت اور کتنا تُند رنگ قیافہ ہے! وہ ایک رقاصہ ہے اور رکنا باد کے ساحلی کشت زاروں کی پروردہ ہے، اس کی ماں بھی رقاصہ تھی اور اس کا باپ ـــــ عیب ندارد!"

"خموش رہو!" میں نے قدم کو ذرا تیز کر کے کہا، کیونکہ میں ہیجان میں مبتلا تھا اور ساتھ ہی اتنی جلدی اسے رازدار بنا لینا قرین مصلحت نہ سمجھتا تھا۔

"وہ غزالہ چشم ہے اور اس کا جسم نازنین ایک سرو خرامندہ ہے جو نسیم کے جھونکوں سے جھومنے لگتا ہے۔

جب ـــــ"

"حسن، بکرم کردار چپ رہو!" میں نے اس کی بات کاٹ کر اس سے درخواست کی ـــــ"

وہ دلپسند طریق پر مسکرایا:

"اس کا خرام ناز غزالہ سبزخوار کی رفتار ہے اور اس کا لہجہ گل کے حضور عندلیب کا پیشکش نغمہ ہے! اس کا مزاج گلاب کی پنکھڑیوں پر نمود شبنم سے زیادہ لطیف ہے! اس کی شکل چودھویں کا ـــــ آج کا چاند ہے!

وہ ـــــ"

"غلط ہے" میں نے اس کا قطع کلام کر کے درشت آواز میں کہا۔

"یا اللہ!" اس نے استعجاباً کہا اور ہلکی ہنسی ہنسا، مگر میں تو حقیقت

کا اظہار کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ ماہ دوہفتہ کی طرح روشن ہے! اس کے ہونٹ رشک انار ہیں جن کی قرمزیت عقیق کو شرماتی ہے۔ اس کا ــــــــــ "

"بسم اللہ! خوش رہو! حسن!" میں نے پھر اس کی بات کاٹ دی اور وہ مجھے ایک لمحہ تک گھورتا رہا۔

اب ہم ایک اونچے اور وسیع مرمریں زینے پر چڑھ رہے۔ بینڈ کی صدائیں خوش ہو گئی تھیں، دور سے آنیوالی دھیمے کی صدا سکوت سے ہم نوا ہو کر قلب کائنات کی دھڑکن بنگئی تھی، پھر باغ کے ایک گوشے سے فواروں کے ختم نہ ہونے والے گیتوں کے ساتھ کسی کا خندۂ زرنگار و موسیقی فروش نشاط گوش بنگیا۔ شاخ بلند پر ایک بلبل کی غزل سرائی ولولہ خیز ہو گئی، قرص ماہ درختوں کے اندر نور کی قلمیں بناتا نظر آیا۔ حسن پھر میرے نزدیک ہو گیا اور التجا پروراز لہجے میں کہنے لگا۔

اس کا نام قرۃ العین ہے اور وہ پچھرہ ایک مرد خوب علی نامی کے اختیار واثر میں ہے، علی ایک دلال ہے اور قابل اعتماد آدمی ہے اس سے میری دوستی ہے معمولی صرف سے معاملات سرانجام پا سکتے ہیں۔" وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ایک لمحے کے بعد پھر بولا "آقائے من، نہایت معمولی صرف سے! علی ایک معقولیت پسند آدمی ہے۔

ہم ایک وسیع چبوترے پر پہنچکر اس سفید بنگلے کی عمارت کے قریب آ گئے تھے جو سایہ دار درختوں کے بیچ میں اور پہاڑی کے دامن میں بنا تھا، جہاں جو موجود تھے اکثر مغربی لباس میں تھے اور ادہر ادہر پھر رہے یا باہم گفتگو میں مصروف تھے اس وقت مجھے اپنے اور ان کے لباس کی غیر ہمرنگیت بہت کھٹکی اور سخت کوفت ہوئی۔

"آقائے من، موقع نکلا جا رہا ہے ــــــــــ ہر وقت نہیں ملا کرتا!" حسن نے پھر دبی آواز میں کہا۔

اس مرتبہ میں خاموش رہا اور وہ میری رہبری کرتا رہا، ایک تیز روشنی کے اندر میں نے اپنے میزبان دوست کو پہچانا، وہ میرے انتظار میں کھڑے تھے میں لپکا، وہ بڑھے، گلے ملے اور پرجوش ملاقات ہوئی تھوڑی دیر میں بہت سی باتیں ہو گئیں مگر پھر بھی کچھ نہیں ہوئیں، حاضرین سے تعارف ہوا، حسن قابل تعریف زیرکی و دانائی کے ساتھ اپنے آقا کے پس پشت مودب کھڑا ہو گیا، اور میری طرف پر معنی نگاہ سے دیکھنے لگا، اس نے آہستہ سے گردن اٹھائی، اسکی نگاہ میں جنونی تھی، اس کا انداز ہمیشہ عجیب و تعجب ہوتا تھا۔

"آؤ حضرات! پرسی کو بھر لگی اور باتیں تو ابھی بہت ہونی ہیں، کھانے سے فارغ ہولیں، تو رقص و سرود شروع ہو۔ میں نے کوشش کی ہے، کہ تمہیں سعدی و حافظ کے عہد کا کچھ اندازہ ہو سکے!" میرے میزبان نے ہنسکر کہا۔

حسن نے ایکبار پھر بڑی احتیاط سے سر کا اشارہ کیا، اس نے اپنے برنما ہونٹوں پر انگلی رکھکر دائمی رازداری کا وعدہ بھی کیا، ایک لمحہ یا اس کے کسی جزو کے لئے میں نے اپنی آنکھیں بند کیں، اور شہرزاد کا ــــــــــ میں نے اس کا اصلی نام منظور نہیں کیا اور ہمیشہ اسی نام سے یاد کیا ــــــــــ تصور کیا۔ وہ آنکھیں جو چشم غزالاں تھیں میری آنکھوں کے راستے دل میں ڈوب گئیں، اس کے بیٹھنے کے انداز اور لبوں کی حرارت انتہائی نے میرے قلب کو گرما دیا، اس کے سانس میرے چہرے پر نسیم سمن بار کے جھونکوں کی طرح محسوس ہوئے وہ نواس تھی اور آرزو طلب! اس کا ہاتھ دل پر رکھا تھا اور اس کا تیز تنفس ایک تیتری کی طرح پھڑ پھڑاتا معلوم ہوتا تھا . . . . . . میں نے باہستگی نظر اٹھائی اور پھر سر کو جھکا لیا، حسن نے میرا اشارہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ کی، وہ آنکھ جھپکاتے غائب ہو گیا ــــــــــ روش پر اس کے قدم کی چاپ تو سنائی دی!

(۵)

"آئیے" میرے دوست نے میرے شانے پر ہاتھ رکھکر کہا۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سفید بنگلے میں پہنچے، اس بلندی سے چراغاں گلشن کا تماشا بائیں ہمہ ماحول ایک تماشائے طلسم تھا، ایک سیر بازار بھی! کھانا پرتکلف تھا اور سب بالکل ایرانی، مشروبات مختلف تھے اور تمامتر ایرانی خدام بھی سب ایرانی تھے، معلوم ہوا کہ میرے دوست فدائے ایران تھے لیکن اس ماحول میں جو گفتگوئیں ہو رہی تھیں وہ شاید لندن و پیرس کے لئے زیادہ مناسب نہیں، یہ دوسرا موقع تھا کہ نہایت مکدر ہوا، لیکن اس کوفت کی حالت میں شہرزاد نے میری مدد کی، اس کے خیال نے میرے رگ و پے پر قبضہ کر لیا تھا!

میز سے اٹھکر ہم لوگ اس نور سیال مرمریں حوض کی طرف گئے جہاں محفل طرب کا سامان تھا اور بینڈ نے ابھی ابھی ایک نئی گت چھیڑی تھی۔

اس بلوریں چشمے کے کنارے فارس کی نازک بدن مطربائیں، شام کی حیوان چشم رقاصائیں طرح طرح سے اپنے فن و صناعت کی نمائش کرنے لگیں مغبچگان ایران کی کج کلہی و چست قبائی، زریں کمری و زلف بدوشی نے پانچ چھ صدیوں کی مدت کو سحر و بہر سے محو کر دیا، خالص مشرقی ساز و موسیقی اور خالص ایرانی نغمات پسندیدہ! لیکن میں آپ کی دلچسپی کے لئے کوئی قصہ تو کہہ نہیں رہا ہوں کہ ان کی لطافت انداز شرافت ادا، ان کے حسن رقص و کمال نغمہ کی

دلکشیاں اور ہوش ربائیاں بھی بیان کروں! مجھے تو اپنی نارسائی بخت و کم نصیبی کا گلہ مقصود ہے کہ ایک مرقع الفاظ بنا سکنے کی حسرت ہے جو پوری نہیں ہوتی!

آخر میں عبید "سادگی" و "پرکاری" رقاصۂ محشر بپا اور مطربۂ جنت در گوش شہرزاد نے بساطِ رقص پر قدم رکھا اور میرے اندر سو حشر جاگ اٹھے۔ سرسے پاؤں تک اور اس کا آتشیں سراپا! معاذ اللہ! گت چھڑی، اور بجلیاں سی چکا چوند منتشر ہو گئیں! قدم کو حرکت ہوئی اور فتنے تھے کہ فضا میں بکھر گئے! رقص کی گردش تھی کہ کائنات کا سکون! جسم کی حرکت تھی کہ لمحہ الست کی بارش بیخودی! وہ حرکاتِ رقصیہ ایک قوت اگر روح کی راحت اور بہشت تو دوسرے وقت نظارہ و تخیل کو آتش بجاں کر رہی تھیں! اس کے ہر انداز میں کوثر و تسنیم کا مفہوم تھا اور اس کی ہر ادا شعلے کی لپک کی مترادف تھی ——— !"

جب اس نے گانے کو گرمایا تو اس کے لحن میں صرف مخمل کی نرمی ہی نہ تھی بلکہ اس کا رنگ بھی تھا اور وہ رنگ ارغوانی تھا! اس کے نشید نغمہ کے ساتھ معلوم ہوا کہ:

این صورت دلاویزی در زخمۂ مطرب نیست
مہجور جہاں حورے نالاں بہ رباب اندر! (اقبال)

اس نے میری طرف دیکھا، ہماری نگاہیں ملیں اور اس کا لحن کیف پرور موتی رولنے لگا:

بہائے اوج سعادت بدام ما افتد   اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

اس بشارت جمیل نے، میں سمجھتا ہوں، میرے جذبات کو میرے چہرہ پر شگفتگی شوق کی شکل میں ظاہر کر دیا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ایک حسین تبسم دیکھا:

حباب وار بر اندازم از نشاط کلاہ   اگر ز روئے تو عکسے بجام ما افتد!

اس کا صہبائی نغمہ مجھے مست و بیخود کرتا معلوم ہوا، خیال ہوتا تھا کہ یہ جوش سرور اس سارے منظر کو، شہرزاد کو اور مجھے لیکر اڑا جا رہا ہے:

شبے کہ ماہ مراد از افق طلوع کند   بود کہ پر تو نورے بہ بام ما افتد!

اب میں اس کا گانا نہیں سن رہا تھا ——— محبت کی پنہاں قوتیں میرے کانوں کے راستے پہنچ رہی تھیں اور میں جوشِ طرب سے کپڑے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا۔

زخاک کوئے تو ہر گہ کہ دم زند حافظ   نسیم گلشن جاں در مشام ما افتد!

نغمات حسین پھر ساروں کے اندر سو گئے   نوا ہائے رنگین پھر خواب آلود ہو گئی

لیکن میں . . . . . . اس کے بعد کا مجھے خواب یاد نہیں! میں اپنی اس وقت کی کیفیات قلب و دماغ کو خود نہ سمجھ سکا کہ کیا تھیں اور کیسی تھیں!

بہر نوع بہشت سے آدم کو نکالا جانا مقدر تھا، اسی طرح میرا اخراج بھی لابدی تھا، لیکن آدم اپنے گناہ کے ساتھ اپنے باعث گناہ کو بھی ساتھ لے کر نکلے اور میں بیگناہ تو گناہ کی حسرت ہی میں رہ گیا!

غرض جب میں اس "جنت نظر" اور "فردوس سماعت" ہستی سے اور اس مقام سے بھی ——— رخصت ہوا تو میں اپنے جذبات کی کوئی تشریح کرنے کے قابل نہ تھا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ پہلو میں دل نہیں سیسے کا ٹکڑا تھا اور مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کے بوجھ سے دب کر بیٹھ جاؤں گا۔

میں نے اپنے دوست سے عارضی رخصت حاصل کی جن مجھے ہوٹل تک پہنچانے آیا، راستے میں اس نے ایک حرف منہ سے نہیں نکالا، بس میں خاموش تھا اور کسی کی دلنوازیاد۔ رستے اور شاہراہیں پرانے قبرستان سے زیادہ شدید سکوت موت میں مبتلا معلوم ہوتی تھیں۔ . . . ! ہوٹل کے دروازے پر حسن نے رخصتی سلام کیا اور جیسے اچانک یاد آ گیا ہو، مجھے بتایا کہ انتظام ہو گیا ہے۔

"وہ غزالہ مہ پارہ، آقا کو خدایگان کی طرح سمجھتی ہے! علی نے معقولیت کے ساتھ کام کیا" حسن نے کہا۔

میں نے اسے علی کا حق دیا کہ بحفاظت پہنچائے اور خود اسے بھی انعام دیا۔

"جس باغ میں وہ بچہ حور بہشت ہے، باغ عدن ہے! آسمان میں قندیل نا روشن ہے ——— اور یہ مہتاب ہی تو ہے جو محبت کی وارفتگی کو جنوں سے ملاتا ہے۔ دریائے محبت کو جوش میں لے آتا ہے۔ اسی باغ میں کل ساڑھے دس بجے شب کو!" اس نے جاتے جاتے کہا۔

میں بس مسکرا دیا ——— خود نہیں مسکرایا بلکہ خود بخود باچھیں کھل گئیں!

"مرزا! انشاء اللہ لطف شما زیاد!" حسن نے مخصوص ایرانی لہجے میں پر معنی تبسم کے ساتھ کہا اور رخصت ہو گیا۔

(۶)

اس رات اور دوسرے دن میں جہاں جاتا تھا، شہرزاد میرے ساتھ تھی، لیکن اسے میں ہی دیکھ سکتا تھا، غیر کی آنکھوں کے لئے مرئی نہ تھی۔ میرے دوست کو میرے حال پر حیرت ہوئی۔ اور چند روز وہ میرے اس حال کو میری مستقل طبیعت خیال کرتے رہے اور اس انقلاب پر متحیر تھے۔ میں بازاروں کی سیر کو گیا، وہ نازنین میرے ساتھ تھی، میں موٹر میں ہوا خوری کو گیا وہ مطربہ سا میرے ساتھ تھی، میں



آپ کے پہننے کے لائق

کرنال شاپ کے بہترین شوز

جو ہر طرح سے تسلی بخش ثابت ہوئے ہیں

کرنال اسپیشل شوز۔ کوالٹی نمبر ۰۰۰



ڈبل گل چمڑے کا بنا ہوا۔ سیاہ و براؤن

قیمت 5/8

بیمہ برانڈ شوز۔ کوالٹی نمبر ۳۰



مردانہ شوز کروم لیدر سیاہ و براؤن قیمت -/4

بیمہ برانڈ پمپ شوز

سیاہ براؤن کروم لیدر سائز مردانہ۔ قیمت 3/12

بذریعہ پارسل منگوائیے

آپ ہمیں اپنے پاؤں کا خاکہ یا انگلش سائز اور جو قسم آپ کو پسند ہو۔ اس کی قیمت۔ ڈیزائن۔ نمبر اور پورا پتہ لکھ دیں۔ ہم آپ کو آپ کی فرمائش کے مطابق نہایت اچھا مال بذریعہ وی پی پارسل روانہ کر دیں گے۔ ناپسند ہونے کی صورت میں واپس ہو سکتا ہے فرمائش کی تعمیل نہایت احتیاط سے کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ہاں ہر قسم کے بوٹ۔ شوز ولایتی، دیسی، چپلی وغیرہ نہایت اعلیٰ قسم کے موجود ہیں محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔

فہرست مفت طلب فرمائیے

بیمہ برانڈ



لیڈی شوز کروم لیدر سیاہ و براؤن

قیمت 3/12

لیڈی ریڈیم پیٹنٹ لیدر زلفوں والی



ڈیزائن نمبر ۱۵۰۲۔ قیمت 6/8

لیڈی ریڈیم پیٹنٹ لیدر



ڈیزائن نمبر ۱۵۰۳۔ قیمت 5/8

آج ہی ضرور خریدیئے۔ روپیہ میں سولہ آنہ کا مال ملتا ہے۔

کرنال شاپ انارکلی۔ لاہور

دجلہ کے پل پر گیا، جو قسطنطنیہ کے پل غلطہ، لندن کے پکیڈلی اور پیرس کی گراں ہوا کا مجموعہ ہے، شہرزاد میری تفریح میں شریک تھی!

لیکن دن تھا کہ ختم ہونے ہی کو نہ آتا تھا، خدا خدا کر کے شام ہوئی تو پہلے بچے۔ تاڑنے لگا تھا، اس کا شور و ہنگامہ اجیرن ہو گیا تھا، میں بمشکل اس سے خلاصی حاصل کر شام کے قریب ہوٹل میں جا کر پڑ گیا، اور کھڑکی میں سے بادلوں کا اجتماع دیکھتا رہا، ان کے اندر شہرزاد کی تصویریں بناتا رہا ـــــــ الف لیلیٰ کی ایک رات کو نقش کرتا رہا، اور جب میں سو گیا تو اپنے ہی نقوش مصورہ کے اندر شہرزاد کے ساتھ عیش ابد کے لطف لے رہا تھا!

میری آنکھ کھلی تو بارش ہو رہی تھی اور آٹھ بجے تھے، بھوک تو کسے تھی مگر وقت گذارنے کیلئے یہ بھی کیا کہ کھانا کھایا، پھر لباس بدلا اور سے برساتی پہنی، جوتوں پر ربڑ کے بوٹ چڑھائے اور مجھ پہاڑ سا لنگر چل پڑا، کرایہ کا موٹر لیا اور اسے بھی پھاٹک پر چھوڑ دیا، اس وقت میں سوچتا ہوں تو یہ حد سے بڑھی ہوئی احتیاطیں بالکل غیر ضروری معلوم ہوتی ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت میں غیر ارادی طور پر اس قدر محتاط ہو گیا تھا کہ گویا میں خلوت عرش پر ڈاکہ مار رہا تھا، غرض باغ کے اندر داخل ہو گیا اور وقت سے پہلے! آپ مجھے احمق کہیں گے، کہئے! عشق میں اور ہوتا کیا ہے؟ عاشق کوئی بقراط تو ہوتا نہیں! لیکن آج میں خیال کرتا ہوں کہ اتنے بڑے باغ میں وعدہ کا مقررہ مخصوص کر لینا ضرور تھا اور مجھے حسن سے پوچھنا چاہئے تھا مگر یاد رکھئے کہ میرا ذہن اس طرف منتقل ہو ہی نہ سکتا تھا۔ اور چونکہ افشائے راز کا خیال سخت نازک تھا، اس لئے اس عمارت کے قریب ہی نہ پھٹکا کہ مبادا کوئی چوکیدار ہی موجود ہو! بہرحال بارش بھیگے جا رہا تھا اور جہاں پانی بھرا نہ تھا وہاں کیچڑ تھی، میرا حال اگر وہ نہ ہوتا جو تھا تو واقعی موسم سخت پراگندہ تھا!

باغ اور مکان میں نہ تو کل کی طرح روشنی تھی اور نہ برگزاروں میں کوئی جگنو ہی چمکتا تھا، فضا میں نہ تو چاند کی مسکراہٹ تھی اور نہ کوئی بلبل نوا پرداز محبت تھی، ہر چیز بھیگی ہوئی اور ہر جگہ ایک چشمہ جاری نظر آتا تھا، میں باغ میں اور اس کے کنجوں میں ادھر ادھر کیچڑ میں مارا مارا پھرا، اور جب تھک گیا تو ایک فوارے کو درخت سمجھ کر دیر تک اس کے نیچے کھڑا رہا، میں نے آپ کو اجازت دی ہے آپ میری حماقت پر ہنسیں، لیکن یقین فرمائیے کہ میری جگہ آپ ہوتے تو ان سے بھی بڑھ کر حماقتیں فرماتے!

وقت مقررہ کے بعد بھی بہت دیر تک میں شدت انتظار میں بے چین رہا۔ اور وہ سب حرکتیں جو ایسے موقع کے لئے آپ کے قیاس میں آسکتی ہیں مجھ سے سرزد ہوئیں، لیکن شہرزاد کا عزیز و شیریں وجود کہیں نظر نہ آیا، اس وقت نہ تو کوئی خواب بھی دکھائی دیا اور نہ خیال ہی نے کوئی کرشمہ سازی کی، وہاں نے اتنی مدد بھی تو نہ کی کہ دور سے کسی ہولے کو اس کا ہیولا باور کر لیتا، اور اس تک لپک کر پہنچنے کی وہ آنی لذت تو حاصل کر سکتا! مختصر یہ کہ اب پانی کالر سے گھس کر کمر تک اور ٹخنے سے داخل ہو کر تلووں تک جا پہنچا تھا!

جب مجھے فطری طور پر یعنی خود بخود یہ یقین ہو گیا کہ شہرزاد کو جس کی آواز مجسم گل نغمۂ عندلیب کی مانند ہے کوئی کشش دستیاب نہ ہو سکی اس لئے وہ وعدہ وفا کرنے سے قاصر رہی تو چشم انتظار سے خون برساتا ہوا واپس پہنچا اور رات بھر بخار میں ہلہلایا کیا۔

بہرحال زکام اچھا ہو جاتا ہے الامرض ہے۔ اور میں نے آپ سے یہ تو کہیں کہا نہیں کہ پھر کسی رات چاندنی چھٹکی ہی نہیں، بلبل گائی ہی نہیں اور شہرزاد کا ہیولا محبوب سرو کے سایوں میں متحرک ہوا ہی نہیں! اس سے آپ کو سروکار؟ آپ کو اس سے بھی واسطہ نہیں کہ میری بیماری بہت طویل ہو گئی، حکومت ہند کو ڈاکٹری سرٹیفکٹ بھیجکر با عصمت جہلت حاصل کر لی گئی!

آپ ضرور فرمائیں گے میں نے تصویر بنائی تو مگر بہت ناقص بنی، میں عرض کروں گا کہ غلط! میں نے تصویر کہاں بنائی؟ میں نے تو اس حسرت و تمنا کا اظہار کیا ہے کہ کاش میں ایک مرقع طیار کر سکتا! اس سلسلے میں اگر ناگزیر طور پر بغداد کی ایک رات کا ماجرا بھی بیان ہو گیا ـــــــ حالانکہ میرا یہ مقصود ہرگز نہ تھا۔ اس لئے آپ کو اتنا سننے کا حق ضرور حاصل ہو جاتا ہے کہ الف لیلیٰ میں اس ایک رات کے اضافہ کا خاتمہ آپ کے حسب منشا ہوا۔ یعنی نیکی بقدر یک زکام ظفر مند تھی ـــــــ کیونکہ شہرزاد اس مکان کے اندر شب بھر میری منتظر رہی! اس اطلاع کے بغیر آپ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکتے تھے!

آپ ایک ضمنی فائدہ اور بھی اٹھا سکتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر خود آپ کو ذاتی طور پر تجربہ نہیں ہو سکا ہے تو اس شعر کو اس واقعہ سے مطابق کر کے سمجھئے:۔

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گزرد

ل۔ احمد

افسانہ

حق بحقدار

از قلم محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ

ہیسٹن لاج کے باورچی خانہ سے دھواں نکل رہا ہے اس وقت باورچی خانہ میں کوئی ملازم تو نظر نہیں آتا شاید گھر کی کوئی لڑکی کھانا پکانے کے انتظام میں مصروف ہے۔ برسات میں شملہ پر آگ جلانا کوئی آسان کام نہیں، لڑکی نے پہلے لکڑی اور پتھر کا کوئلہ چولھے میں ڈال کر بہت سلگایا، مگر جب آگ نہ جلی اور وہ تھک گئی تو کوئلوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر خود مچھلی صاف کرنے لگی، اس کے بعد چاول بھگوئے، اور بیسن پھینٹا ترکاری بنائی، اتنے میں باورچی خانہ دھوئیں سے بھر گیا، پھر بیچاری کوٹلے دھونکنے لگی، اب تو اس کی آنکھوں سے پانی جاری تھا اور سخت پریشان تھی کسی طرح آگ نہ جلی اور وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو رہی تھی باورچی خانہ چونکہ کوٹھی کے پچھلے برآمدہ سے ملا ہوا تھا اندر سے گانے باجے کی سریلی آوازیں آرہی تھیں اور دوسری طرف بیڈمنٹن ہو رہا تھا، ادھر سے ہنسی اور قہقہوں کا شور سن رہی تھی، یہ بھی آخر نوعمر لڑکی تھی، پہلو میں شوق اور تمناؤں بھرا دل رکھتی تھی، آج گھر میں ایک بڑی پارٹی تھی گھر کے اور سب لوگ خوشیوں اور دلچسپیوں میں مصروف تھے اور وہ اس عذاب میں مبتلا تھی اس کا خیال بار بار اسی طرف جاتا تھا اور اپنے حال زار پر رونا آتا تھا بہ دقت تمام ایک گھنٹے میں چولھے تیار ہوئے اور اس نے ترکاری و چاول چڑھائے مچھلی تل رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا ہاتھ میں بلا لئے دوڑتا ہوا باورچی خانے میں آیا "اوہ ریحانہ تم اس وقت بھی چولھے میں گھسی ہوئی ہو ذرا چل کر دیکھو تو ادھر کیا ہو رہا ہے جلدی سے منہ دھو کر کپڑے بدل ڈالو اور چلو" "بھیا ہمیں کیا دنیا میں کچھ ہوا کرے" ریحانہ نے نہایت افسردگی سے جواب دیا۔ "کیوں تم ابھی دنیا سے ایسی الگ کیوں ہو گئیں، آج گھر میں پارٹی ہے دیکھو کیسے اچھے اچھے لوگ آئے ہیں اور تم بیماری سے اٹھکر یہاں صحت حاصل کرنے آئی تھیں میں دیکھتا ہوں کہ ہر وقت باورچی خانہ میں گھسی رہتی ہو" ریحانہ نے سر جھکا کر مچھلی کے ٹکڑے کو فرائی پان میں الٹتے ہوئے جواب دیا "اتفاق ہے کہ جس دن میں شملہ پہنچی، اسی دن آپ کی خالہ جان کا خانساماں چلا گیا اب میں نہ کروں تو کھانا کون پکائے" "بڑے تعجب کی بات ہے تم نہ کرو تو کون کرے؟ خانساماں چلا گیا ہے تو گھر کے دوسرے نوکر تو موجود ہیں وہ کام چلا سکتے ہیں، اس کے علاوہ خالہ جان کی تینوں لڑکیاں بھی مدد دے سکتی ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ ہماری وہ بہنیں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتیں تم تو ہماری مہمان ہو اور اپنی تندرستی کے لئے یہاں آئی ہو کسی وقت باہر ٹہلنے کو نہیں جاتیں" "کام سے فرصت ہو تو کہیں جاؤں۔ جائیے باہر آپ کو بلایا جا رہا ہے" "میں جاتا ہوں مگر تم بھی تو چلو بڑا مزیدار مجمع ہے" "مگر آپ کی خالہ جان کا حکم ہے کہ ساڑھے چھ بجے کھانا تیار ہو جائے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارٹی کے کسی مہمان کو کھانا کھلا کر رخصت کریں گی، وقت بہت کم ہے اور ابھی اور چیزیں پکانی ہیں، یہ سن کر افسوس کے لہجہ میں لڑکے نے کہا۔ "حیرت ہے خالہ جان پر کہ سارا کام تم پر ہی ڈال رکھا ہے آخر وہ اپنی لڑکیوں کو کیوں نہیں ادھر بھیجتی ہیں وہ تو تینوں شہزادیاں بنی ہوئی اس مجمع میں لطف اٹھا رہی ہیں اور ایک مہمان بیچاری چولھا جھونک رہی ہے سخت افسوس ہے تم یہاں سے نکلو میں انہیں میں سے کسی کو ادھر بھیجتا ہوں" "نہیں بھیا خدا کیلئے ایسا نہ کیجئے، وہ خیال کریں گی کہ میں نے شکایت کی ہے اور خدا کے فضل سے وہ ہیں ہی شہزادیاں اپنے والدین کے گھر میں" "اور بڑی تو دراصل شہزادی بیگم ہے" ریحانہ کے آخری فقرے پر لڑکے کو ہنسی آگئی مگر ٹال کر اس نے جواب دیا "شہزادی ہوں یا شہزادی بیگم اس سے کیا غرض؟ ان کا گھر ہے انہیں کو کام کرنا چاہئے اچھا میں اپنے خدمتگار کو بھیجتا ہوں، پڈنگ وغیرہ خوب بنا سکتا ہے باقی جو رہ گیا ہے وہ کرلیگا" نہایت متشکر نگاہوں سے دیکھکر ریحانہ نے لڑکے سے کہا "میرے اچھے بھائی آپ مجھ بدبخت کا اتنا خیال نہ کریں آپ کی خالہ کو نہایت

ناگوار گذرتا ہے پرسوں ہی آپ سب کے اصرار سے باہر ٹہلنے چلی گئی تھی واپس آئی تو بہت ناراض ہوئیں، اب ان کا حکم ہے کہ تم باہر نہ نکلو گھر بھر میں آپ اور آپ کی شہزادی بیگم ہی مجھ پر رحم کر کے محبت کی نظر رکھتے ہیں، ورنہ تو کوئی مجھ سے خوش نہیں ہے، میں آپ کو حقیقی بھائی خیال کر کے آج آپ سے یہ کہہ رہی ہوں کسی سے ذکر نہ ہو میں نے اپنی بھاوج یعنی آپ کی بڑی خالہ جان کو لکھا تھا کہ مجھ کو بلا لیں مگر انہوں نے ابھی بلایا نہیں۔

مسٹر شہزاد نے ادھر پر بیٹھے ہوئے کہا سخت افسوس ہے کہ باوجود اس قدر تعلیم یافتہ اور رشتہ دار ہونے کے ایسے خیالات ہیں خود دیکھ رہا ہوں، آپ ان کی بہن کے شوہر کی بہن ہیں مگر ان کا ایسا قابل افسوس سلوک ہے بہت صبر سے آپ برداشت کر رہی ہیں " ریحانہ نے بچشم نم جواب دیا " میں بدنصیب ہوں والدین کے بعد بھاوج خدا نے ایسے سخت دل کی دی اسی کا یہ سب نتیجہ ہے مجھکو یہاں سے ملاقات بھی نہیں اچھا آپ اٹھئے یہاں کہاں بیٹھ گئے کپڑے میلے ہوں گے " باہر سے پھر آواز آئی اور شہزاد صاحب چلے گئے، ریحانہ غریب نے جلدی جلدی کھانا تیار کیا، مہمانوں کو کھلوایا اور شب کے ۱۱ بجے فراغت پا کر اپنے کمرے میں آئی تو بجائے لیٹنے کے میز پر یہ خط لکھنا شروع کیا۔

" میری پیاری سلیمہ "

آپ کا خط ملا، جواب میں دیر ہوئی کہ میں بہت مصروف تھی اکثر کا خانساماں چلا گیا ہے اور کچن کا تمام کام مجھکو تنہا کرنا پڑتا ہے، کسی وقت شہزادی بیگم صاحبہ یا ان کا منگیتر (جو آج کل آیا ہوا ہے) کچھ ہمدردی کر لیتے ہیں۔

سلیمہ، میری سنو۔ تم نے جو حالات دریافت کئے ہیں کیا بتاؤں اس دن سے ملاقات ہی نہ ہو سکی، آپ کے کنوتلی چلے جانے کے بعد میں باہر نہیں نکلی، نہ ان سے ملی، خدا جانے ہیں بھی کہ چلے گئے؟ ایک بار آپ کے ہاں چاء پر اور ایک بار سینما میں ملے تھے، آپ میری رائے دریافت کرتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ نہایت قابل قدر شریف و نیکدل نوجوان ہے صورت شکل کے علاوہ پوزیشن بھی اچھی، مگر سلیمہ میں تو گرفتار بلا ہوں، شاید آپ سے ذکر نہیں کر سکی، کئی سال ہوئے میرا نکاح ایک بہت اچھی جگہ ہو چکا ہے وہ شخص بھی " انگلینڈ ریٹرن " اور مالدار سنا ہے۔ مگر میرے بھائی بھاوج میری رخصتی نہیں کرتے، گذشتہ ۲ سال سے ان لوگوں کا بہت تقاضا تھا، مگر کسی طرح بھائی جان نے میری شادی کرانی منظور نہ کی، آخر بار کر اب وہ خاموش ہو گئے میری رخصتی نہ کرنے کی وجہ بھی سن لو، میرے والدین نے کوئی ڈیڑھ لاکھ کی جائیداد چھوڑی ہے جس میں سے ایک لاکھ آبائی جائداد کا مالک واحد میرا بھائی ہے اور جو پچاس ہزار کی میری والدہ کی ہے، اس کی مالک میں ہوں، والدہ مرحومہ وصیت میں اپنے جہیز کی جائیداد میرے نام کر گئی ہیں وہ آج کل سب بھائی جان کے تصرف و اختیار میں ہے بس وہ اس لئے میری شادی نہیں کرتے کہ پچاس ہزار نقد جائے گا۔ بھاوج صاحبہ کا مجھ پر یہ تشدد ہے کہ اگر شادی کرانا چاہتی ہو تو سب جو تمہارے نام ہے اپنے بھتیجے کے نام لکھ دو، ورنہ عمر بھر یوں ہی بیٹھی رہو گی۔

سلیمہ پیاری!! سوچو تو ایک ہندوستانی ناکتخدا لڑکی کس طرح ایسا کر سکتی ہے؟ جائداد اس لئے ان کو لکھ دے کہ میری شادی کر دو، سسرال والوں کو بھی یہ خبر ہے وہ میری کس قدر ذلت کریں گے، دنیا بے شرم کہیگی، اور پھر سسرال والوں سے نہ بنی تو میرا کوئی سہارا نہ رہیگا، اسی پریشانی میں گھلتے گھلتے آخر مجھکو حرارت رہنے لگی، تو بھاوج صاحبہ نے شملہ اپنی ہمشیرہ کے گھر تبدیل آب و ہوا کے لئے بھیجدیا، اس میں بھی ان کا مقصد ہے۔ خیر!

اب بتاؤ اس حالت پابندی میں کوئی فیصلہ آئندہ زندگی کے بابت کیسے کر سکتی ہوں؟ جبراً شادی نہیں کرا سکتی، اپنے شوہر کو نہیں بلا سکتی، اس سے رہائی بھی نہیں ہو سکتی، اب سنا ہے کہ والدین میرے شوہر کی شادی کرنے والے ہیں آخر وہ کہاں تک انتظار کریں، انہوں نے کبھی میری صورت بھی نہیں دیکھی، میرے شوہر کو میرا خیال ہی کیا ہو سکتا ہے اگر کسی طرح ادھر سے فیصلہ شرعی ہو جائے تو پھر میں ضرور اسی شخص سے شادی کر لوں جو اس قدر قدردان ہے۔ تمہارے خیال کا شکریہ، ایک دو دن کو اگر آ جاؤ ایک اور اہم معاملہ جو زبانی ہی سنانا ہے لکھ نہیں سکتی، آپ نہیں جانتیں کہ میں شملہ کیوں بھیجی گئی ہوں؟ اس کا مطلب زبانی بتاؤں گی، خدا آپ کو خوش رکھے چند ہی ملاقاتوں میں اس قدر ہمدرد ہو گئیں، مجھ بدبخت کا اس وسیع دنیا میں کوئی نہیں ہے ایک بھائی ہے وہ بھاوج کے کہنے سننے سے لالچ زر میں میرا مخالف ہو گیا ہے، اب ختم کرتی ہوں، اور آرام کروں گی، بارش ہونے لگی سردی بھی بڑھ گئی، خدا حافظ تمہارا

" ریحانہ "

(۲)

ریحانہ خط بند کر کے مسہری کی طرف چلی تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی ۱۲ بج گئے تھے اس وقت کون آیا وہ حیران ہوئی، پھر کواڑ کھول کر دیکھا ایں شمشاد بھائی اس وقت کیا کام ہے کیسے تشریف لائے؟" دروازہ کھلتے

ہی برساتی پہنے ہوئے پانی میں تر اور ایک نوجوان اندر داخل ہوا، اور ریحانہ کا ہاتھ تھام کر کرسی کے قریب آ کے بیٹھ گیا وہ ششدر رہ گئی، پھر سوال کیا، "بھائی شمشاد کیا کام ہے، آپ پانی میں ڈوب رہے ہیں کپڑے اتاریں اور بتائیں کیوں اس وقت تشریف لائے؟ تب شمشاد نے جواب دیا، پیاری ریحانہ میں تم کو تکلیف دے رہا ہوں بے وقت آیا مگر ضروری بات تھی، اچھا میں برساتی اتارتا ہوں، ذرا اطمینان سے بیٹھ کر سن لو۔" ریحانہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "کہئے کہئے میں حاضر ہوں؟"

غالباً آپ کو اپنی بھاوج اور میری والدہ صاحبہ کے ارادوں سے آگاہی ہو گئی؟ اور کچھ نہ کچھ میرے طرز طریق سے بھی پتہ چلا ہوگا، آپ ہیں بہت ذہین آج میں اسی امر کی بابت آپ کے خیالات وضاحت سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ کے طرز عمل یعنی میرے ساتھ جس طریق سے آپ اس ۲ ماہ میں پیش آتی ہیں میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکتا، آپ کو اپنی بھاوج اور میری والدہ کی تجویز سے اتفاق ہے یا اختلاف؟ اس لئے دریافت کرنا پڑا معاف کرنا۔ ریحانہ جو پہلے ہی کچھ سہم کر سہم گئی تھی، ہمت کر کے شمشاد کے قریب فرش پر بیٹھ گئی اور بے اختیار زار و قطار روتے ہوئے جواب دیا۔ بھائی شمشاد! میں جس قدر بدنصیب اور پریشان حال ہوں آپ کو علم ہے۔ مجھ پر کیا کیا گذر گئی اور کیا گذر رہی ہے اس کا اندازہ ہے؟ آپ کو یقیناً مجھ سے ہمدردی اور والدہ و خالہ سے اختلاف ہوگا؟

شمشاد نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نیچی نگاہ کر کے جواب دیا۔

"ریحانہ! آپ نے اس وقت مجھ کو سخت پریشانی میں ڈال دیا، میں اب کیا کہہ سکتا ہوں کہ والدہ سے اختلاف ہے یا نہیں؟ اختلاف ہو اس کی تو کوئی وجہ بھی نہیں، جبکہ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا رشتہ وہاں سے چھڑایا جا رہا ہے، خالہ جان کو شام ہی خط آیا ہے وہ جلدی ادھر سے قطعی فیصلہ کرا لیں گی، اس کے بعد آپ کی آئندہ زندگی ضرور تبدیل کی جائے گی آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ اس قدر رنج نہ کریں، میں اس وقت خلاف مزاج کچھ نہ کہوں گا، اٹھئے کرسی پر بیٹھیں نہیں تو میں نیچے بیٹھتا ہوں ناراض نہ ہونا۔" وہ شمشاد بھی قالین پر ریحانہ کے قریب بیٹھ گئے اس کا سر ہاتھوں سے اٹھا آنسو خشک کئے ذرا سنبھلنے پر ریحانہ نے جواب دیا!

میرے مہربان بھائی خدا آپ کو خوش رکھے یہ خبر آپ سے لے تازہ سنائی کہ وہاں سے قطع تعلق کرایا جا رہا ہے، یہ ذرا مشکل ہے میرے شوہر کے والد صاحب کسی طرح قطع تعلق پر رضامند نہ ہوتے تھے آخر وہ بھی دنیا دار ہیں لیکن اب بیٹے کا دوسرا بیاہ کرنا ہے شاید مان گئے ہوں۔ ابھی بیٹا ہی انہیں مجبور کر رہا ہے کہ طلاق دیدیں، وہ خود تیار ہے اس رشتہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جلدی شادی کرنا چاہتا ہے، اس کے بعد بھی شادی لازمی ہے، تو میں یہ مناسب و ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ کی رائے بغیر فیصلہ نہ ہو"۔ یہ سنکر ریحانہ نے بنہایت بیکسی و منت کیساتھ شمشاد کی طرف سر جھکا دیا، وہ تو قدموں پر رکھنا چاہتی تھی، مگر شمشاد نے اپنے سینہ سے لگا لیا اور کہا کہ "بہن جو کچھ کہنا چاہتی ہو بلا کسی خیال کے کہہ ڈالو میں ہر حالت میں آپ کا ہمدرد و متفق ہوں، خواہ اس میں میری بدقسمتی ہی ہو۔" "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ آپ کا اپنا خیال کیا ہے آپ کو مجھ سے انتہائی محبت ہے؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ بغیر میرے آپ کی زندگی ناخوشگوار ہوگی، اور اگر میری جائداد مجھ سے لے لی گئی تو اس حالت میں بھی آپ میری قدر کریں گے؟

سچائی کے ساتھ ان سوالات کا جواب دیدیں"۔ سر اٹھا کر یہ ریحانہ نے پوچھا۔ "ریحانہ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ آپ ایسی فرشتہ خصال لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنا دنیا میں جنت ہے رہا یہ کہ میں کتنی محبت کرتا ہوں؟ افسوس کہ میں بے ایمانی سے یہ نہیں کہہ سکتا انتہائی محبت کرتا ہوں۔ لیکن جائیداد اگر چھین لی جائے اور تم مل جاؤ تو مجھ کو اس کی ذرا پرواہ نہیں مگر بدقسمتی سے شاید میرے ساتھ ایسا نہ ہو کیونکہ وہ میری خالہ ہیں اور بیٹے کی طرح مجھ کو چاہتی ہیں، غالباً جائداد بھی نہ چھینیں، ویسے میں آپ کا دل سے قدردان ہوں اور ایک حد تک محبت بھی کرتا ہوں،، تب ریحانہ نے کہا، "شکریہ شکریہ خدا آپ کو دنیا کی نعمتیں بخشے کیسے اچھے اور سچے انسان ہو، مگر بھائی شادی تو ایسی حالت میں ہونی چاہئے نہ جبکہ ایک دوسرے کے بے انتہا دلدادہ ہوں؟ یا میرا خیال غلط ہے اور ناول بینی کا نتیجہ ہے؟" "یہ بالکل صحیح ہے میرا خود یہی خیال ہے، مگر آپ کی موجودہ حالت دوسری ہے، اگر بدقسمتی سے آپ کی خودداری و سنجیدگی نے پروانہ وار نثار ہونے کا موقعہ اس وقت تک مجھ کو نہیں دیا، لیکن دوسرا بھی کوئی مجھ سے زیادہ قدردان نہیں ہے، واللہ اگر آپ کا شوہر چاہتا ہوتا تو میں ہرگز قطع تعلق نہ ہونے دیتا۔

"بیشک شوہر چاہنے والے ابھی نظر نہیں آتا، لیکن اگر میری شادی ہو جاتی دیہاتی تو ضرور وہ چاہتا، اور اگر اب قطع تعلق ہی کرانا ہے تو شاید کوئی اور چاہنے والا مل جائے، جو بے جائداد کے ہی مجھے پسند کرے"۔ یہ سنکر شمشاد نے ریحانہ کی طرف سر جھکا کر کہا۔ "تو کیا انتہائی مہربانی سے وہ چاہنے والا

یہی ظاہر نہیں خیال کیا جاسکتا، جائیداد میری رائے میں فوراً خالہ صاحبہ کے بیٹے کے نام لکھدینی چاہئے۔" ریحانہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، خیال کیا جانا اور چیز ہے اور حقیقت اور ہے، اگر آپ کو میں ناپسند نہیں یعنی مجھے آپ کو نفرت نہیں تو آپ دیکھ سکتی ہیں کہ آپ کی ذرا سی نظر عنایت سے شمشاد ناراض کی کس قدر خدمتگذار اور جان نثار ثابت ہو سکتی ہے، ریحانہ مجھ سے اس قدر غیریت و تکلف کا برتاؤ روا نہ رکھو، مجھے زیادہ تو میں دیکھتا ہوں آپ میرے بہنوئی شہزادے سے زیادہ بیگانگت سے پیش آتی ہیں، بس آپ کی اس بے رخی و انتہائی سنجیدگی کی وجہ سے میری ہمت نہ ہوئی کہ ذرا بھی بے تکلفی بڑھانیکی کوشش کروں، حالانکہ میں سن چکا تھا کہ آپ کا شملہ بھیجا جانا اسی غرض سے تھا کہ ہم دونوں کچھ دن ساتھ رہ لیں، تو میں سچ سچ بیان کرتا ہوں۔ میری خالہ صاحبہ یعنی آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کی تاکید تھی، کہ میری نند آرہی ہے شمشاد بیٹا اس کو خوب خوش رکھنا بہلانا اور اس امر پر تیار کرلینا کہ وہ قطع تعلق پر راضی ہو جائے۔ جائداد سے دست برداری کرے۔" مگر میں نے کبھی ظاہر نہیں کیا، ریحانہ نے شمشاد کے سینے سے سر لگا کر کہا بھائی جان خدا کو حاضر و ناظر جانکر کہتی ہوں۔ آج سے عمر بھر کے لئے شمشاد کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گی اسے اپنا حقیقی بھائی خیال کروں گی کیونکہ میرا حقیقی بھائی اب میرا نہیں رہا، پس مجھ بیکس پر اتنی مہربانی کرو بہن کی طرح میری مدد کو تیار رہو، بھائی میں اپنے شوہر سے قطع تعلق نہیں چاہتی"

"او شوہر پرست ضدی لڑکی! یہ درست ہے لیکن وہ بھی تو اب چھوڑ رہا ہے، نیز تمہارے سرپرست بھائی نے طلاق لینے کی درخواست کر دی ہے اب میں کیا کرسکتا ہوں؟ ویسے میں حاضر ہوں جان بھی کام آئے تو انکار نہیں اچھا اب آرام کرو اور ذرا پھر سوچو، ناشاد شمشاد اس قابل نہ سہی کوئی اور انتظام کر لیا جائے گا، مگر وہاں سے تو طلاق بہت جلد ہونیوالی ہے" یہ کہتے ہوئے بوساتی اٹھا کر شمشاد کمرے سے باہر چلا گیا، ریحانہ برآمدے تک دیکھتی رہی، اور وہ شب کی سیاہی میں غائب ہو گیا، رات کے ۲ بج رہے تھے اور بارش بھی تھی۔

"رائل ہوٹل" کے کمرہ ۳ میں صوفے پر عجب پریشانی میں ریحانہ کسی شخص سے باتوں میں مصروف ہے، لباس بہت معمولی اور بال بکھرے ہوئے مقابل کے جنٹلمین نے نہایت قیمتی بھورے رنگ کا سوٹ پہنا ہوا ہے ریحانہ کا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے جس کو دبا دبا کر اس کی باتوں کا جواب دے رہا ہے،

"جیسے ہی تار ملا فوراً تیار ہو گیا ٹائم ٹیبل دیکھا تو ٹرین کے وقت میں صرف ۲۰ منٹ باقی تھے اندر جا کر والدہ سے صرف اتنا کہا کہ نہایت ضروری کام ہے ابھی باہر جا رہا ہوں، ابا جان سے کہدینا، اور سٹیشن آگیا۔ میں خود یہی سمجھ رہا تھا کہ ضرور کوئی مشکل ہی ہے ورنہ مجھے تار دیکر نہ بلاتیں، اب مفصل بتاؤ میری ریحانہ میں تو دیوانہ ہو ہی رہا تھا، آپ کی حالت دیکھ کر اور پریشان ہوں۔ میرے کامران، میں بہت مشکور ہوں، کہ آپ اس قدر جلدی آگئے، میں بیان نہیں کرسکتی، کہ آپکے جانے کے بعد یہ ۳ ہفتے کس مشکل سے بسر کئے ہیں مجھکو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب چلے گئے۔ اس دن سینما میں ملے پھر خدا جانے کب چلدئے، اس کے تیسرے دن سلیمہ کسولی چلی گئیں، پتہ کس سے لیتی؟ مگر یہ ثابت ہو گیا کہ آپ سے علیحدہ زندگی گذارنا میرے لئے ناممکن ہے، یہاں کچھ واقعات ایسے پیش آئے کہ مجھکو جلدی جانا پڑ جاتا پھر ملنا مشکل تھا، کسولی سے پتہ منگوا کر تار دیا۔ یہ ۲۰ دن بہت ہی بےچینی سے گذر رہے ہیں، اتنا کہکر ریحانہ نے صوفے سے سر لگا دیا، اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا جس کی آواز مقابل کا جنٹلمین بخوبی سن سکتا تھا، وہ فکرمند ہو کر اور قریب ہو بیٹھا۔ ریحانہ پیاری کیا بتاؤں میں یہاں سے کیوں اور کیسے گیا؟ میں نے ۳ ہی ملاقاتوں میں اپنے دل کی یہ حالت پائی کہ یہاں ٹھہرا تو آپسے نہ ملنا ناممکن ہے، صبر نہ ہوگا، اور آپ نے بتا دیا تھا کہ اب ملنا بار بار مشکل ہے گھر کے لوگ اعتراض کرتے ہیں تنہا جانے پر، یہی سوچا کہ چلا جاؤں تو بھول جاؤں گا، وہ بھی نہ ہو سکا، آج سب بیان کئے دیتا ہوں، میں اسی درمیان میں ایک بار اور آیا، صرف آپ کو دیکھنے مگر کسولی ٹھہر کر چلا گیا، مسز ریاض (سلیمہ) نے بھی منع کیا کہ شملہ نہ جاؤ میرے بغیر کوئی ملانے والا نہ ہوگا، خدا ہی جانتا ہے مجھکو سے کسولی تک آکر ناکام واپس جانا کیا حالت تھی، میں بالکل دیوانہ تھا، سلیمہ بہت سمجھاتی تھیں کہ اتنے سمجھدار ہو کر یوں بچہ نہ بنیں۔ ۲-۳ ملاقاتوں کا کیا خیال ہے" مگر میرا دل میرے بس سے باہر تھا۔ میں جس وقت کسولی سے واپس چلا ہوں ضبط کا یارا نہ تھا ریاض سنبھال کر ٹرین میں بٹھا گئے تھے میرے گھر پہنچنے کے تیسرے دن سلیمہ کا خط پہنچا۔ کہ آپ اس طرح تکلیف نہ اٹھائیں اور اس جگہ رشتے کی کوشش کریں میں مدد دوں گی، سلیمہ کو علم تھا کہ میری نسبت ہو چکی ہے، اس وجہ سے انہوں نے لکھا میں نے جان توڑ کوشش کرکے اپنی پہلی نسبت چھڑالی۔ والدین کو مجبور کرایا، سنو ریحانہ میری جان اور دل کی مالک ریحانہ میری پہلی منسوبہ صاحب جائیداد ہے اس وجہ سے وہ رشتہ چھوڑنا مشکل تھا تاہم والد صاحب کو رضامند کرلیا، اب اسی فکر میں تھا کہ ادھر سے کچھ خلاصی ہو جائے تو سلیمہ کی

منت کروں کہ وہ آپ سے ملا دے، یہ تو مجھے امید تھی کہ میری رحم دل ریحانہ انکار نہ کریں گی۔ ۲-۳ ملاقاتوں میں آپ بہت محبت سے پیش آئیں، لیکن یہ خیال تھا کہ شاید سرپرست لوگ کچھ انکار کریں، یا کہیں اور نسبت ٹھیک رہی ہو، آپ نے تو مجھکو کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ ریحانہ نے گھبراہٹ سے کہا، تو کیا آپ کی پہلی نسبت چھوٹ گئی بالکل فیصلہ ہو گیا؟

نہیں ابھی قطعی فیصلہ نہیں ہوا مگر ہونیوالا ہی ہے آپ کہئے اس کے بعد آپ کی طرف سے تو کوئی عذر نہ ہوگا؟ یہاں شملہ میں آپ کے والدین ہیں یا کوئی اور عزیز، مسز ریاض کہتی تھیں کہ کسی عزیز کے ہاں مہمان ہو، ریحانہ نے جنٹلمین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا، میرے والدین نہیں ہیں، آہ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے سوا آپ کے، اب میں آپ کی ہوں اور ہمیشہ کو آپ کو قبول کرتی ہیں؟" ایک معزز اور حسین عورت کی زبان سے یہ الفاظ پھر عورت بھی وہ کہ جس پر اپنا بھی دل فدا ہوتا ہو، جنٹلمین پر عجیب اثر ہوا وہ سکتہ کے عالم میں رہ گئے چند منٹ کے بعد حواس بجا کر کے اٹھے اور حسین و جمیل ریحانہ کے قدموں پر سر رکھ دیا، وہ جلدی سے صوفے سے اٹھکر نیچے بیٹھ گئی اور ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر سر اٹھا لیا، یہ کیا کرتے ہیں مجھ عاجز گنہگار کو اور گنہگار بناتے ہیں آپ میرے سر تاج ہیں میں ہمیشہ کیلئے کنیز، یہ کہتے ہوئے ریحانہ نے ان کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگائے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ کیا وقت ہے عالم خواب ہے یا صحیح واقعہ، آہ میں جس کے لئے اتنے دن سے بیقرار، زندگی سے بیزار تھا وہ ایسی آسانی سے حاصل ہو گئی، ریحانہ اب ہم قیامت تک جدا نہ ہوں گے خواہ دنیا کتنی ہی مخالفت کرے، "اٹھو چاء تو پلواؤ کب سے آیا ہوں"، ریحانہ نے گھنٹی بجائی اور چاء کا حکم دیا دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے، بیرا چاء لایا، پھر ریحانہ بولی اب جلدی یہاں سے مجھکو لے چلئے خدا جانے دیر لگنے سے کیا کیا واقعات پیش آئیں۔ "ابھی کیسے لیچلوں؟ میں فوراً جا کر والدین سے ذکر کرتا ہوں کہ شملہ پر نسبت کر آیا ہوں آپ چلکر شادی کرا لائیں"۔ گھبرا کر ریحانہ نے کہا، نہیں نہیں ایسا نہ کیجئے، پھر کچھ نہ بنے گا، میرے گھر والے آپ کے سخت مخالف ہیں، میں جس عزیز کے پاس ہوں وہ اپنے لڑکے سے کرنا چاہتے ہیں میں تو خیر ایسا بھی کر گذروں گی، پھر والدین رضامند ہو ہی جائیں گے، مگر ایک ہندوستانی لڑکی کے لئے اس طریق سے شادی اچھی طرح نہ دیکھی جائے گی، میں اب یہاں ایک رات نہیں ٹھہرنا چاہتی، اسی وجہ سے آپ کو تار دیکر بلایا ہے ورنہ

اگلے ہفتے میرا عقد ان کے لڑکے سے ہو جائے گا، اگر مجھکو اپنی خدمت و رفاقت کے قابل خیال کر لیا ہے تو بس شب کی ٹرین سے لیچلئے میں ہندی رسوم اور جھوٹی شرم کی پرواہ نہیں کرتی، آپ کی خدمت جائز طریق سے میرے لئے ثواب ہے، میرا تو یہی خیال ہے۔" بہت اچھا میں ہر طرح تیار ہوں مگر آپ کو ہی دنیا کچھ کہے گی تو کیا سیدھی میرے گھر چلنا چاہتی ہو؟

جی ہاں والدین کی خدمت میں۔" میں قربان ہو جاؤں ایسی اچھی بیوی کی عزت پر لیکن پہلے کہیں اور ٹھہر جائیں، پھر وہ شادی کر کے لیجائیں۔

ان باتوں کی پرواہ نہیں جب آپ میرے سر پر ہیں تو آپ کے قدموں میں میری عزت ہی عزت ہے وہ بھی امید ہے بخوشی قبول کریں گے، کھانا بھی منگوا دیا جاء؟ کیک کافی ہوگی، ریحانہ نے دریافت کیا،

بس اب کچھ نہیں چاہئے، ٹرین کا کیا وقت ہے؟ شاید ۱۰ بجے یا کچھ بعد سٹیشن تو قریب ہے ابھی وہیں بیٹھیں گے، آپ اس وقت گھر سے کس طرح آسکیں؟ کامران نے پوچھا ریحانہ نے جواب دیا، کسوٹی سلیمہ سے ملنے کے لئے دو دن کی اجازت لے کر ۵ بجے شام گھر سے چلی آئی تھی، آپ میرے بوجھ سے بہت پریشان ہیں، اس فکر کو جانے دیں یہ وقت اچھی طرح گذرنا چاہئے مدت بعد ملے ہیں!

میں بہت خوش ہوں ایسا خوش کہ زندگی بھر نہیں ہوا، آہ وہ دن کہ سلیمہ کے گھر پہلی بار چاء پر دیکھا تھا، پھر اتفاقیہ وائٹ اوے میں وہ رومال جو آپ نے نشانی دیا تھا دیکھو یہ ہے ہر وقت جیب میں، مائی بھی اس دن سے ہی بند ہی ہے ڈیڑھ ماہ گذرا، اور پھر سینما میں آخری ملاقات ان تینوں خوشگوار وقتوں کے بعد سے میری زندگی بری طرح سے گذر رہی ہے آپ کی تصویر تنہائی میں اور تصور ہر وقت تھا۔

اب تو میں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ جس جگہ نسبت ہو چکی ہے دشمنی ہو گی اس بیچاری کی زندگی کو برباد کرنا ہو کہ دیکر جگہ میں کسی اور کا ہو چکا" ریحانہ نے سوال کیا، آپ نے اپنی منسوبہ کو دیکھا بھی ہے کیسی ہیں؟ ان کو رنج ہوگا" میں نے کبھی نہیں دیکھا، بچپن کی نسبت تھی، سنا ہے کہ خوبصورت ہے میٹرک تک پڑھی ہے، مگر مجھکو کچھ خبر نہیں اور اب تو کچھ بھی ہو اس کی زندگی تباہ نہیں کرنی چاہئے

آپ ذرا آرام کریں دور سے آئے ہیں، ٹرین کے وقت میں اٹھا دوں گی "بس آرام ہی آرام ہے" کامران نے کہا، ریحانہ نے زبردستی اٹھا کر مسکرا کر ان کو

صوفے پر لٹا دیا اور خود بھی پاس بیٹھ گئی ان کے سر کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر کھیلنے لگی کامراں صاحب کے بال بہت گھنے سیاہ اور گھونگریالے تھے جو اس وقت ان کی چمکیلی پیشانی پر بکھرے ہوئے بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے کمرہ بجلی کے قمقمے سے بقعۂ نور ہو رہا تھا سبز مخملی صوفے پر ہلکی گلابی ساڑھی میں ریحانہ تھی اور سفید قمیص جس پر عنابی ٹائی لہرا رہی تھی لیٹے ہوئے کامراں کیسے اچھے لگ رہے تھے علاوہ ریحانہ کے کوئی اور دیکھنے والا بھی بغیر تعریف کئے نہ رہ سکتا تھا ہاں دونوں کے اس وقت پریشان تھے یعنی پیشانی پر بے ترتیب بکھرے ہوئے کامراں دل میں بہت خوش تھے مگر حیران بھی کہ ایک غیر لڑکی اس قدر جلدی کیسے اتنی مہربان اور ایسی بے تکلف ہو گئی اور پھر اس کی شرافت اور نیکدلی کا بھی دل پر گہرا اثر تھا۔ ریحانہ کی اس انتہائی مہربانی اور محبت سے متاثر ہو کر کامراں نے بھی ہمت کی اور اس کا سر اپنے بازو پر رکھ لیا جو بجائے ہٹانے جھکنے کے اور جھکا دیا گیا ایک عرصہ تک دونوں یونہی عالم بیخودی و عجیب قسم کی سرشاری میں مدہوش بے حس و حرکت پڑے رہے انگیٹھی کے کلاک نے شب کے ۹ بجا دئیے تو دونوں اٹھے اور اپنے اچانک پیش آجانے والے عجیب سفر کا انتظام کرنے لگے۔

(۴)

مسٹر کامراں کو معہ اپنی محبوبہ ریحانہ کے شملہ سے آئے ۲ ہفتے گذر چکے ہیں اب وہ ان کی محبوبہ ہی نہیں بلکہ بیوی ہو چکی ہے ساس سسر سب نہایت خوش ہیں کامراں کے والد کی شاندار کوٹھی "سلطان منزل" کا وہ حصہ ان کو رہنے کو دیا گیا ہے جو باغ میں تھا یعنی اس کے ہر کمرے باغیچہ میں کھلتے تھے۔ صبح ہی مسٹر و مسز کامراں ٹہلنے کو باغ میں آجاتے تھے پھر دونوں والدین کے پاس سلام کو جاتے ہر روز یہ معمول تھا۔ اکتوبر کی ایک خوشگوار صبح کا ذکر ہے کہ کامراں کو سوتا چھوڑ کر مسز کامراں قلم کاغذ لیکر باغیچہ میں آگئیں اور ایک بنچ پر بیٹھکر مفصلہ ذیل ۲ خط لکھے

جناب بھائی جان۔

پس از آداب عرض ہے کہ ۲ ہفتے گذرے میں اپنے اصلی وارث (والدین جن کے سپرد کر گئے تھے) کے گھر لکھنؤ آگئی ہوں، آپ کو قبلہ والد صاحب (خسر) نے اطلاع دیدی تھی، مجھپر بیحد ظلم کئے گئے تو میں نے اتنی ہمت کی، اگر صرف مجھ سے جائیداد ہی چھین لی جاتی تو بھی اتنی جرات نہ کرتی مگر بھابی صاحبہ نے یہ ظلم کیا میرے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کیا جس پر دنیا نفریں کرے گی، میرے شوہر سے ملکر اپنے بھانجے شمشاد سے میرے نکاح کی ٹھہرائی اور مجھکو تبدیل آب و ہوا کے نام سے شملہ بھیجا، مجھے طلاق دلا لینے پر آپ کو تیار کر لیا، اگر میں شمشاد سے نکاح کر لوں تو جائیداد میرے نام رہے گی، اور کوئی زبردستی لکھوا لی جائے گی، اول طلاق پھر جائیداد سے دست برداری، بھلا میرا ٹھکانا کہاں تھا، اتنے ظلم و ستم پر مجھ میں ہمت آگئی، اور میں نے سوائے اسکے کوئی راہ نہ پائی کہ اپنے شوہر کے قدموں میں آپڑوں، جن کو والدین اور آپ سب بخوشی دیکھ چکے ہیں، اب میں اور میرا شوہر کسی روز اس جائیداد اور نقد روپیہ کو منتقل کرانے حاضر خدمت ہوں گے، کوٹھی کا کرایہ نامہ میرے نام تبدیل کرا دیں، روپیہ جو امپیریل بنک سے الہ آباد بنک میں منتقل کرا دیں گی جس میں میرے شوہر کا حساب رہتا ہے۔ والادب

آپ کی "ریحانہ"

"سلطان منزل" لکھنؤ

میری پیاری سلیمہ!

مجھکو لکھنؤ آئے اور اپنے پیارے کامراں کی بیوی کہلاتے ۱۵ دن گذر گئے یہ ۱۵ دن خواب کی طرح گذرے ۱۵ منٹ معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کی راحت اور حقیقی راحت والدین کے انتقال کے بعد سے مجھکو اب نصیب ہوئی ہے، شملہ آہ شملہ کی ذلت و ستم کی کلفت عذاب قبر سے بدتر تھی، خدا آپ کو خوش رکھے میرے حق میں فرشتہ رحمت ثابت ہوئیں آپسے ملاقات نہ ہوتی تو آج میں اپنے سرتاج کے گھر راج نہ کر سکتی غالباً بھاوج کی بہن کی کنیزی میں عمر کٹتی! پیاری سلیمہ زبانی بھی سب بتا دوں گی مگر مختصر اب بھی سُنلو کہ تم ہی مجھے راحت و عزت دلانے کی باعث ہوئیں، ایک پارٹی میں آپ سے ملاقات ہوئی طبعیتیں مل گئیں، پھر میں آپ سے ملنے گئی اتفاق سے پہلے ہی دن آپ کی ریڈنگ روم کی میز پر ایک تصویر دیکھکر آپ سے پوچھا کہ یہ کس کی ہے اور گھر جا کر اپنے پاس والی تصویر دیکھی جو بھائی جان کے میز پر سے چرا کر اپنے ساتھ لے آئی تھی، دونوں کو ایک پایا دونوں کے نیچے نام بھی ایک ہی لکھا تھا، باتوں باتوں میں معلوم کر لیا کہ یہ تصویر جن بیرسٹر صاحب کی ہے وہ لکھنؤ کے رہنے والے اور مسٹر ریاض کے بہت دوست ہیں، بیرسٹری اختیار کی ہے اتفاقیہ ریاض صاحب سے کہدیا کہ ان کو بلا کر دکھائے، انھوں نے پرچ کر دکھایا اسکے بعد وہ صاحب تصویر آپ کے ہاں موجود تھے، آپنے پارٹی پر بلا کر ملوا دیا، قربان جاؤں خدا کی عنایت پر کہ وہ پہلی ہی نظر میں مجھکو

پسند کرکے چاہنے لگے، آپ کو تو معلوم ہی ہے اسی دن آپ دونوں بھاگ گئے تھے مگر آپ کو حقیقت کی خبر نہ تھی جو مصلحتاً میں نے چھپا رکھی تھی، آخر ہماری محبت بڑھتی گئی، آپ نے مدد کی اور میں لکھنؤ پہنچ گئی، سلیمہ یہی شخص ہیں بیرسٹر کامراں میرا شوہر ہے جس سے آٹھ سال گذرے عقد ہو چکا تھا، میں نے جاوج کے ہتھکنڈوں سے تنگ آکر ایسا کیا، اگر وہ میرا شوہر نہ ہوتا تو میں ہرگز ایسی جرأت نہ کر سکتی، اس میں ایک آزمائش بھی ہو گئی کہ اس کو مجھ سے نفرت نہیں محبت ہے، گر اس طرح ملتی شادی ہو کر ملتی تب بھی وہ مجھکو چاہتا، بڑا مزہ آیا سلیمہ جس دن میرے سسر صاحب قاضی صاحب کو بلا کر میرا عقد پڑھوانے لگے، میں نے سوچا یہ تو برا ہوا نکاح پر نکاح، تیسرے دن لکھنؤ پہنچ گئے میں نے اپنے شوہر سے ظاہر کر دیا کہ میں کوئی نئی آپ کے ساتھ بھاگی ہوئی عورت نہیں بلکہ وہی ہوں جس کے ساتھ آج سے ۸ سال پہلے عقد ہو چکا ہے میرے اور آپ کے والدین کی رضامندی سے وہ حیرت میں رہ گئے اور یقین نہ کرتے مشکل سے یقین دلایا ہے کیا بتاؤں یہ حال سنکر میرے خسر کو کس قدر خوشی ہوئی، بے انتہا، مجھے سینہ سے لگا کر کہا "بیٹی آج میرے سینہ سے ایک بھاری سل ہٹ گئی، گو میں کامراں کی شادی کر رہا تھا، مگر دل خوش نہ تھا کہ ایک نہایت آزاد عورت ہے جو قبل نکاح میرے بیٹے کے ساتھ بھاگی ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم میری وہی بہو نکلیں میرے مرحوم دوست کی نشانی، اب میری آنکھوں کا تارا ہو" پس سلیمہ ہمارا نکاح دوبارہ ہوا، اچھا اب خدا حافظ میرے کامراں جاگ گئے ان کے پاس جاتی ہوں۔

تمہاری
"ریحانہ"

دونوں خطوں کے کاغذ بیچ پر بکھرے پڑے تھے، اور ریحانہ لفافے لکھ رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے آکر خطوط اٹھا لئے مڑ کر دیکھا تو اس کا پیارا شوہر کامراں تھا سبز دھاری دار ریشمی سلیپنگ سوٹ میں پلنگ سے اٹھتے ہی بیوی کو کمرے میں نہ پا کر سیدھا باغ میں چلا آیا اور خلاف معمول اس قدر سویرے اس جگہ خطوط لکھتے دیکھکر خیال کیا کہ ضرور کوئی ایسی اہم تحریر ہے کہ کاغذات اٹھا لئے، ابھی بہت کم دن چڑھا تھا، سورج نکل ہی رہا تھا باغ کا برقی لیمپ بھی روشن تھا چڑیاں چہچہانے لگی تھیں، صبح کے پھول کھل رہے تھے نسیم چل رہی تھی ریحانہ دھانی رنگ کے جاپانی پھولدار "سلیپنگ ڈریس" میں اس وقت بہت خوبصورت معلوم ہو رہی تھی، اس کے بال ابھی کمر تک بکھرے ہوئے تھے کیونکہ بغیر درستی کئے وہ خط لکھنے کو یہاں چلی آئی تھی، کامراں کو خط اٹھاتے دیکھکر فوراً کھڑی ہو گئی، کاغذات چھیننے لگی، تو کامراں نے کہا "کیا مجھ سے کوئی پوشیدہ تحریریں ہیں؟ تب تو میں نہیں دیکھتا" سچ کہدو، مگر میرا خیال ہے کہ بھائی جان کو لکھا ہوگا جس کا کئی دن سے ارادہ کر رہی ہو، میں نہیں چاہتا کہ ذرا سی چیز کے لئے ان کو تکلیف دو، بخدا اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ مالیت کی جائداد میں اپنے حصہ میں سے آپ پر نثار کر دینے کو تیار ہوں، ان کو نہ لکھو" "خوب مجھے اسی لئے تو میں آپ کو سوتا چھوڑ کر لکھنے آگئی کہ پھر نہ لکھنے دیں گے۔ اچھا میں دونوں خط پڑھتا ہوں معاف کرنا، میں بھائی جان کو تنگ کرنا پسند نہیں کرتا، پھر ریحانہ نے کہا، مجھکو واللہ جائداد کی پرواہ نہیں ہے، مگر جس چیز کے لئے انھوں نے مجھکو اس حد تک دکھ دیا اور ذلیل کرنا چاہا تھے کہ میرے شوہر سے ہمیشہ کو جدا کر رہے تھے وہ میں ان کے تصرف میں نہ آنے دونگی بخدا ان سے لے کر خیرات کر دوں گی اپنے کامراں کا صدقہ دیدوں گی مجھکو جب کامراں ایسی دولت ملگئی تو اب کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، کامراں نے پہلے سلیمہ کے نام کا خط پڑھا اور آگے بڑھ کر بیچ پر بیٹھتے ہوئے بیوی سے کہنے لگا، اوہو یہ حالات تو اب اس وقت معلوم ہوئے آپ نے مجھ سے اب تک کیوں چھپایا اب ہم میں کیا تکلف و غیریت باقی ہے؟

ریحانہ نے جھینپ کر کہا "کیا چھپایا؟ یہی کہ آپ نے خود ہی میرا فوٹو دیکھکر ریاض صاحب سے کہکر مجھکو بلوایا تھا" شوہر سے یہ سنکر ریحانہ نے مسکراتے ہوئے عجیب اداے شرمگین سے اس کی گود میں سر رکھدیا اور باہیں گلے میں ڈال کر آنکھیں بند کر لیں، دونوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے کامراں بھی اس کی اس بیمثال غائبانہ محبت معلوم ہونے سے بہت متاثر ہوئے، دل چاہتا تھا کہ اپنے تئیں ریحانہ پر نثار کر ڈالے، منھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان میں طاقت گویائی نہ تھی تمام جسم میں لرزش تھی، اس نے بھی خاموشی سے آنکھیں بند کرکے بیوی کی طرف سر جھکا دیا، اور کئی منٹ اسی حالت بیخودی میں گذر گئے، اب سورج اوپر کو آگیا اور نارنگی کے درخت پر کرنیں چمکنے لگیں روشنی زیادہ ہو گئی پلنگ پر صبح ہی جو چاء جاتی تھی وہ رکھی ہوئی ٹھنڈی ہو گئی، اس کو اٹھا کر آیا دوسری چاء کے لئے حکم لینے کہ باغ ہی میں لائی جائے، اس طرف آئی، اس کے پیروں کی آہٹ پا کر ریحانہ اٹھی ابھی کہ آیا گلاب کے درختوں کے پیچھے ہی تھی، انہوں نے کہدیا آیا اس وقت چاء یہیں لے آؤ ہم ابھی یہیں ہیں ادھر نہیں جائیں گے۔

ہم چائے والے کہہ دیں گے سب حرام ہے جس وقت تک کل

حالات نہ سن لیں گے، سلیمہ ہم سے بہتر ہے؟ اتنا کہکر کامران صاحب پھر پلنگ پر لیٹ گئے، آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے، ان کے روٹھ جانے سے بیوی بہت گھبرائیں۔ قریب آ کر بیٹھ گئیں، ان کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا، اور کہنے لگیں، پیارے کامران مصیبت کے دن گذر گئے اب ؎

سرگذشت بلاکشاں نہ سنو
نہ سنو میری داستاں نہ سنو
ضرور سنیں گے، آخر مجھ سے تکلف کیا؟
اچھا جی سنو مگر روٹھو نہیں خوش ہو کر بیٹھو چاہ پیو تو سناؤں ؎
آپ خوش ہو گئے تو پھر سب کچھ سن تو
کہ میں فرصت میں حدیث دل دیوانہ کہوں

اس شعر کی حسب ضرورت ترمیم پر بہت محظوظ ہو کر کامران ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھے چاہ کی پیالی اٹھالی اور سننے کے لئے ہمہ تن گوش تھے۔

ریحانہ نے کہا "آپ کو یاد ہے بچپن سے ہمارا عقد ہو چکا تھا، سالہا سال سے یہاں سے عید بقرعید، شبرات پر برابر نئے رسمی تحفے جاتے تھے۔ آپ کا ذکر ہوتا تھا، لندن گئے واپس آئے تصویر اخبارات میں دیکھیں، گھر میں دیکھکر آپ تو بالکل اپنا ہی پتا شیر ہو گیا کرتی تھی جیسے کہ بھابی بانو کے بھائی جان تھے اور اب دو سال سے یہ غضب ہوا کہ سننے لگی کہ جائداد ان کو دیدوں ورنہ عمر بھر رخصتی نہ ہوگی" فوراً جائداد لکھ دیتیں۔ مگر میرا خیال تھا، کامران نے بات کاٹ کر کہا "جائداد تو لکھ دیجاتی مگر ۲ خیال مانع تھے ایک تو کنوارے پن کی شرم دوسرے جائداد سے دست بردار ہو گویا شوہر طلبی تھی" اچھا تو جس وقت مجھکو بلایا تھا ظاہر کر دیتیں کہ یہ معاملات ہیں تو میں جلدی جائداد سے دست بردار کرا کے تمہیں حاصل کر لیتا"

ریحانہ نے جواب دیا اس وقت بھی اسی ذلت کا خیال تھا کہ عورت کی طرف سے قبل از شادی یہ سوال کیا جائے، آپ کی نگاہوں میں ذلت تھی، دوسرے اس وقت ایک اور دقت پیش آ چکی بھابی صاحبہ نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اگر آپ سے قطع تعلق کراؤں تو مع جائداد کے شمشاد کے سپرد کر دیجاؤں گی، ان وجوہ سے حیران تھی، لیکن خدا کا شکر ہے، جب آپ کو بلا کر دیکھا، آپ کے دل میں محبت دیکھی تو یہی سوچا کہ ایسی حالت میں چلنا چاہیئے، جائداد بھی رہ جائیگی آپ بھی ملجائیں گے، ورنہ شمشاد سے بچنا ناممکن تھا، اب یہ کنیز ہمیشہ کو آپ کی ہے

کامران نے کہا، اف بڑا بھاری دھوکہ دیا کس قدر خفا میں رہیں، میں بیوی سے ملتا تھا اور شبہ بھی نہ ہوتا تھا، یہی خرابیاں پردہ داری کی، آٹھ سال سے عقد، اور ایک دوسرے کی شکل نہ دیکھی تھی، میں نے تصویر تک نہ دیکھی تھی، اگر میں تصویر نہ دیکھ لیتی تو مجھکو بھی کچھ پتہ نہ چلتا تصویر پہچان کر سلیمہ سے دریافت کیا تو ان کے دوست معلوم ہونیکا علم ہوا تب ہمت کر کے بلوانے کی موہوم کوشش کی مگر مسٹر ریاض نے بلا دیا، میں اکثر شملہ ان سے ملنے جایا کرتا ہوں، لیکن بڑے دل والی ہو تم سے تو اتنا صبر ہو، ریحانہ نے اعتراضاً کہا، آپ نے بھی تو اتنا پردہ رکھا عقد کو مجھ سے نسبت کہا۔

کامران نے ریحانہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا کر جواب دیا، یہ اس لئے کہ آپ بھی منسوبہ کو طلاق دینا پسند نہ کریں گی، اور مجھکو بھی بدترین شخص خیال کریں گی پھر اعتبار نہ رہے گا، پیاری آخر انسان کمزور انسان ہے خود غرضی کے وقت جھوٹ بول جاتا ہے۔ مگر میں تو ہر حال میں یہ دعائیں کرتی تھی کہ خدایا طلاق نہ ہونے پائے، اگر جلدبازی میں خدانخواستہ آپ ایسا کر بیٹھتے تو بس میں گئی تھی، میری بجائے تم نے تار دیکر بلا لیا ورنہ میں کمبخت فیصلہ کر کے جاتا، شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی بیوی دی جو کسی کو نہ ملے گی اس زمانہ میں۔

شادیاں کر کے کامیابی حاصل کرنا بہت دشوار ہے شادی بالکل لاٹری ہے جو اندھا دھند والدین ڈالتے ہیں، اور اولاد کی قسمت کا فیصلہ ہو جاتا ہے بچپن میں میرا عقد ہو گیا کچھ خبر نہ تھی ۱۶ سال کی عمر بیوی کی شکل تک نہ دیکھی، اور قطع تعلق بھی ہونے لگا مجھکو کوئی تعلق ہی نہیں، میں نے بھی اسی وجہ سے اصرار نہ کیا کہ مجھکو تم سے کیا تعلق کیا ہمدردی دلبستگی تھی؟ ہاں شملہ والی ریحانہ کو دیکھکر خوش تھا کہ قطع تعلق ہو جانے سے آزاد ہو جاؤں گا۔

آزادی کہاں پیارے یہ زنجیر تو ہمیشہ گلے میں رہے گی۔ یہ کہتے ہوئے ریحانہ نے کامران کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔

نذر سجاد حیدر

تبرکاتِ ریاض

حضرت ریاض خیر آبادی مدظلہ العالی (خلد آشیاں) کی ایک غیر مطبوعہ غزل

---

1 ابر بہار میں نہ تو شام بہار میں
کھلتے ہیں پھول جا کے حسینوں کے ہار میں

2 ہم جا کے پھول اڑاتے ہیں جس سبزہ زار میں
وہ لہلہاتے سایۂ ابر بہار میں

3 آتشکدے ہیں کتنے دلِ داغدار میں
لالے کے پھول جتنے کھلے لالہ زار میں

4 اس وقت دیکھے روح کی بالیدگی کوئی
آتی ہے غم سے جب قدح بادہ خوار میں

5 میں کاٹتا پہاڑ سے دن ہجر کے وہیں
بے کوہکن کے لطف نہیں کوہسار میں

6 پلکوں کے اٹھتے ہی صفِ عشاق بچھ گئی
ناوک فگن نے سب کو لیا ایک وار میں

7 گھبرا کے جا چکی تھی تڑپ دل سے آنکھ یاد
الٹی پھری تھی آ کے دلِ بیقرار میں

8 غنچے لباسِ گل میں ہم اپنے لباس میں
پھولے نہیں سماتے ہیں فصلِ بہار میں

9 لیتی ہے سانس ایک جہاں تمام خلق
جتنے ہیں سب بندھے ہوئے ہیں ایک تار میں

10 ہیں سو دکانیں چار سو منہ چور بھی سہی
ملتی ہے اگر تو مزا ہے ادھار میں

11 ہے میفروشوں میں بھی میری بزرگ داشت
پروا نہیں جو آئے بھی فرق اعتبار میں

12 صیاد موجیں سب پر پروانہ بن گئیں
لے اڑ چلا قفس بھی ہوائے بہار میں

13 جاں بخش جھوٹے وعدے نے مرنے دیا نہ رات
سو بار موت آئی ترے انتظار میں

14 ٹوٹا سا تار اشک چھپائیگا کیا گناہ
یہ کس شمار میں ہے یہ ہے کس قطار میں

15 حاصل ہزار خم کا ہے انکی نگاہ مست
رہتے ہیں بے پیے جو ہمیشہ خمار میں

16 لیتی ہیں کام دور سے مژگاں درازیاں
لیتی ہیں چٹکیاں یہ دلِ بیقرار میں

17 سن کا یہ اقتضا نہ سہی دل تو ہیں ریاض
تم صبح و شام پھول اڑاؤ بہار میں

غزلیات

رشحاتِ عالیہ

ازجناب خان بہادر پروفیسر مولانا رضا علی صاحب وحشتؔ کلکتہ

ہو وقت کی خلش مجھے جس جو کر گئی
ہے ہے وہ دلخراشی زخمِ جگر گئی

دو دن رہی بہارِ چمن، پھر گزر گئی
شورش تری نہ بلبلِ شوریدہ سر گئی

منظور تھا مشاہدۂ شاہدِ جمال
دیکھا اسی کو اپنی جہاں تک نظر گئی

حسرت گناہ کی بھی تو پوری نہ ہو سکی
دو دن کی زندگی مجھے بدنام کر گئی

کیا یاس نے علاج کیا اضطراب کا
شکر خدا کہ اپنی طبیعت ٹھہر گئی

ٹوٹا شبابِ توبۂ رنداں غرورِ شیخ
تیری نگاہِ ناز بھی کیا سحر کر گئی

پیغامِ گل یہ تھی اسیرِ قفس کی روح
بلبل چمن میں بے مدد بال و پر گئی

اتنی ہی ہے اگر سبب خبر کچھ بہار کی
آئی تھی بوئے گل مجھے بیہوش کر گئی

اہلِ خرد نے بھی اب اڑائی جنوں کی چال
قدرِ کمالِ وحشتِ شوریدہ سر گئی

شائستۂ زنجیر نہیں

حضرت پنڈت امرناتھ صاحب ساحرؔ دہلوی

ہے یہ تحریرِ قضا آپکی تحریر نہیں
جو مٹائے سے مٹے وہ مری تقدیر نہیں

مو نظارۂ معنی ہوں خدا شاہد ہے
سجدہ شانِ خدا ہے، تری تصویر نہیں

نہیں دیوانہ، گنہگارِ محبت ہوں میں
قابلِ دار ہوں، شائستۂ زنجیر نہیں

عشق کامل کی بدولت ہے جو دل مستغنی
وصل میں شاد نہیں ہجر میں دلگیر نہیں

غمِ موجود غلط اور غمِ فردا باطل
راحت اک خواب ہے جسکی کوئی تعبیر نہیں

دل میں باقی یہ تصور ہے نہ اب ذوقِ گناہ
ذوقِ مستی ہے اگر عالمِ تنویر نہیں

قادر انداز قضا ہے نگہِ ناز تری
تیر جو دل میں ترازو نہ ہوا تیر نہیں

منزلِ اہلِ فنا ہے دمِ تسلیم و رضا
جادۂ راہِ فنا جز دمِ شمشیر نہیں

نازِ اغیار اٹھاتا ہوں کسی کی خاطر
جبرِ تقدیر ہے ساحرؔ مری تقصیر نہیں

طرزِ یگانہ

ازجناب میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی

خدا کہاں ہے کسے درمیان دے کوئی
بتوں کے نام پہ شاید امان دے کوئی

مزہ ستانے کا جب ہے کہ دل ٹھکانے ہو
حواس گم ہوں تو کیا امتحان دے کوئی؟

نگاہِ حسن کا حسنِ طلب ہے جانِ امید
امید ایسی تو پھر کیوں نہ جان دے کوئی؟

کدھر سے آتی ہے مستانہ لیجے پیراہن
کہاں ہے کون ہے کس کا نشان دے کوئی؟

ادھر وہ سوز و گداز اور ادھر یہ شعلہ دراز
بجائے بانسری کوئی، اذان دے کوئی؟

اسے وہ پنچ بتاؤں کہ روح وجد کرے
شکستہ ساز پہ میرے جو دھیان دے کوئی؟

خودی کا نشہ نہ چڑھ جائے مت پلٹ جائے
خدا کرے وہ یگانہ کو تان دے کوئی

چمن آرائی عشق

کلام مولانا جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی ڈپٹی کلکٹر

اب خموشی بھی ہے گویائی عشق
تیرا احسان، شکیبائی عشق

عشق ہی عشق نظر آئے گا
کچھ بڑھی اور جو بینائی عشق

اب یہ نقشہ ہے دلِ حیراں کا
کہ ہے خود عشق تماشائی عشق

منھ نہ کہلوائے، شرمائے گا
شہرۂ حسن ہے۔ رسوائی عشق

کوئی محفل ہو کہ ہنگامہ ہو
ہے وہی عالمِ تنہائی عشق

ہے ازل سے یہی دورِ مستی
آج سے میں نہیں صہبائی عشق

حسن بھی ایک ادا ہے جسکی
اللہ اللہ یہ گیرائی عشق

کہہ گیا راز یہ اک دیوانہ
تشنہ کامی سے ہے رعنائی عشق

کوئی پرساں جو نہیں ہے تو نہ ہو — عشق کرتا ہے پذیرائی عشق
آبلے خار سے نا آشنا ہوئے — ختم ہے بادیہ پیمائی عشق
رونے دو اب ہے مجھے درپیش اثر — خون دل سے چمن آرائی عشق

عجب کیا رہ شوق کا طے نہ ہونا — کہ دشوار ہے سرخوشی سے نہ ہونا
وہ گھبرانا ان کا، وہ شرمانا اُن کا — وہ جرم وفا کی سزا کے لئے نہ ہونا
وہ کافر جو دل لے کے تسکین یوں دے — بڑی عافیت ہے غم سے نہ ہونا
یہ ہستی بھی اک شکل ہے نیستی کی — یہ ہونا بھی اسے بےخبر ہے نہ ہونا
کسی اور عالم میں وحشی اثر ہے — کہا مانو اس وقت در پے نہ ہونا

مختلف مطلع

آنکھ جھپکے نہ دم جلوہ یہ تاکید ہے آج — نگہ شوق مبارک ہو تری عید ہے آج

❊

اب یہ نوبت ہے محبت کی ستم رانی سے — دل کو ہوتی ہے خوشی غم کی فراوانی سے

❊

مسلماں کو بے عشق سلیقا نہیں آتا — جینا تو بڑی چیز ہے مرنا نہیں آتا

❊

وہ رند پیئے جو ساغر سے حرم کے دکھے — باہر قدم اس میکدے سے حرم کے رکھے

❊

بس اب تو شاد ہو لے دل وہ بے نقاب ملا — ہوس نگاہ کی تھی تیرے جواب ملا

رنگ شفق

از حضرت مولانا شفق رضوی عماد پوری

شرمندۂ احسان مسیحا نہیں ہوتا — اچھا ہے وہ بیمار جو اچھا نہیں ہوتا
بےحس پہ اثر درد و الم کا نہیں ہوتا — تصویر کے سینے میں کلیجا نہیں ہوتا
ہر شمع کی لو برق تجلی نہیں ہوتی — ہر داغ جگر داغ ید بیضا نہیں ہوتا
ہر ذرہ چمک جانے سے سورج نہیں ہوتا — ہر قطرہ ڈھلک کے دُر یکتا نہیں ہوتا
وہ برگ ہوں جو بار نہ ہو دامن گل پر — وہ پھول ہوں جس پھول میں کانٹا نہیں ہوتا
تم جیسے جو ایسے بھی ستمگر نہیں ہوتے — ہوتا ہے ستم بھی مگر ایسا نہیں ہوتا
دو باتوں میں مرتے ہوئے عاشق کو جلا لیں — عیسیٰ ہیں مگر آپ سے اتنا نہیں ہوتا

کھلتے ہیں شفق پھول بھی پھلتے ہیں شجر بھی
ہاں! بار ور اک نخل تمنا نہیں ہوتا

تجلی تری شمشیر سے

ہائے وہ بھی ہٹ گئیں پامالی تقدیر سے — بکھر لکیریں ہی کچھ تھیں ناخن تدبیر سے
واقفیت دل کو تھی اس خواب کی تعبیر سے — تیر اب آیا نظر آئی تھی پہلے تیر سے
بےوجود شمع ثابت شمع کی تنویر سے — خیر ایک پردہ تو اٹھا چہرۂ تصویر سے
رہ گیا سادہ ورق رنگ اُڑ گیا تصویر سے — آپ زحمت کر کے تھے تو گرا تا خیر سے
ہیں محبت کی نگاہیں کس قدر حسن آفریں — رنگ پیدا ہوئے جاتے ہیں کسی تصویر سے
کیا ترے رنگیں مزاجوں کے کفن سادہ رہیں — آج تو قاتل لہو برسے تری شمشیر سے
آہ جب بند ہو کر لگی پانی میں بھی جوش آ گیا — دل کے چھالے پھوٹ نکلے ضبط کی تاثیر سے
داد کس سے لیجئے جذب نگاہ و شوق کی — خون چہرے پر چھلک آیا تری تصویر سے
آنکھ ادھر جھپکی ادھر ہستی کا خرمن جل گیا — جب گری یوں ہی گری بجلی تری شمشیر سے
زلف کے سودائیوں پر یہ سراسر ظلم ہے — بال کے باندھے ہوئے رونے گئے زنجیر سے
اف یہ چنگاری ابھی تک دل کے کس گوشے میں تھی — جل اٹھیں خاموش شمعیں نالۂ شبگیر سے
ان معانی آفریں خاموشیوں پر دل نثار — اک کہانی روز سنتا ہوں تری تصویر سے

مٹ نہیں سکتی کبھی تحریر پیشانی سراج
شک اگر ہو جنگ کر کے دیکھ لو تقدیر سے

سراج لکھنوی

لذت غم

اب اس خیال سے غم میرے واسطے غم ہے — کہ تیرے غم کے لئے عمر جاوداں کم ہے
زمیں خلاف ہے مانا کہ چرخ برہم ہے — مگر حضور ہیں میرے تو کیا مجھے غم ہے
مرے خیال کی منزل سے پست عالم ہے — وہ بیخودی جو تماشہ ہے بہت کم ہے
وہ دل کہ جس میں کبھی حسرتوں کا جھرمٹ تھا — اُسی میں آج میری بیکسی کا ماتم ہے
بنا زعشق نے طے عشق کی حدیں کر لیں — نہ اب خوشی ہے نہ احساس لذت غم ہے
ملا ہے مرگ جوانی ہوئی نصیب مجھے — مگر وہ چشم ستم آشنا بھی پرنم ہے
یہ راز تو کوئی فطرت شناس ہی سمجھے — فلک کے اشک ندامت ہیں یہ شبنم ہے
نگاہ ناز یونہیں زہر تار کے چھینٹے — جہاں تک اس دل خانہ خراب میں غم ہے
وہ سر خدا کے لئے بھی جو بانکپن سے جھکے — کسی کی لاش پہ کس انکسار سے خم ہے
سوال قتل پہ پیدا ہے اک تبسم ناز — ترے نثار ابھی یہ جواب مبہم ہے
یہی اک آہ تھی سرمایہ حیات جنوں — اسی پہ ختم مری کائنات عالم ہے

بجھا ہی جائیگی شمع حیات آشفتہ
کہ آج شام سے تا صبح ہوا تیز ہے

آشفتہ لکھنوی

جذبات عالیہ

مزا جب ہے وفا پر دل سے وہ تیار ہو جائے
گلے پر وہ اگر رکھ دیں گلے کا ہار ہو جائے

عجب کیا فرط رنج و غم سے دل بیکار ہو جائے
نفس چلتا ہوا چلتی ہوئی تلوار ہو جائے

وہ جو دل کی ٹھنڈی سانس کھینچا کیا قہر ڈھائیگی
جو لب تک آتے آتے آہ آتش بار ہو جائے

معاذ اللہ یہ گردش تمہاری شوخ آنکھوں کی
زمانہ ہو جسے بیمار وہ بیمار ہو جائے

زباں تک آہ دل پہنچے کہ بدلے رنگ رخ یارا
کسی صورت سے ان پر عشق کا اظہار ہو جائے

خم و ساغر خم و ساغر ہیں انکا ذکر کیا ساقی
نظر جس سے تری مل جائے وہ مے خوار ہو جائے

وفا کے جوش میں کیا پوچھنا اس کی جسارت کا
جو قبل از وقت مرنے کے لئے تیار ہو جائے

کہاں قسمت یہ خنجر کی کہاں رتبہ یہ ناوک کا
نگاہ ناز جس جائے نگاہ یار رہ جائے

اثر پیدا ہے یا نک انتہائے بادہ خواری کا
جو مجھکو دیکھ لے وہ بے پئے سرشار ہو جائے

دل مضطر کو اپنے ہم تو جب سمجھیں دل مضطر
ترقی کر کے یہ برق نگاہ یار ہو جائے

جناب نوح سے کہنا یہ طوفان محبت کا
اگر تم غرق ہو جاؤ تو بیڑا پار ہو جائے

نوح ناروی

محبت دل سے ہوتی ہے

نمائش داغ الفت کی بہار دل سے ہوتی ہے
نمود اس ماہ کامل کی اسی منزل سے ہوتی ہے

چھپانے جلوۂ محبوب ظاہر دل سے ہوتی ہے
زیارت حسن لیلیٰ کی اسی محمل سے ہوتی ہے

عجب دریا ہے، تر میں ہے کنارہ بحر الفت کا
ادھر ڈوبے، ہم آغوشی ادھر ساحل سے ہوتی ہے

بچا لیتا ہے مرنے والوں کو بے موت مرنے سے
مسیحائی عجب یہ خنجر قاتل سے ہوتی ہے

حقیقی ہو تو آفت ہے۔ مرض عشق مجازی کا
وہ ہوگی جان لیوا۔ جو محبت دل سے ہوتی ہے

غنیمت ہے یہ ظالم جان لیکر بھی جدا اچھی ہیں
دل آزاروں کی دل داری بڑی مشکل سے ہوتی ہے

یکایک پہنچتے ہیں ڈوبے نشان و گمان تک
کرامت ایسی اکثر جذبۂ کامل سے ہوتی ہے

وہ تیر ناز سینے سے نکل کر آیا گاہ پہلو میں
لگاوٹ کس غضب کی عاشق بسمل سے ہوتی ہے

فراق یار میں جینا کہیں ہے موت سے بدتر
ہماری زندگی مر مر کے اب مشکل سے ہوتی ہے

جدا ہوتا ہے سر کیا غم ہے مجھکو رنج ہے اسکا
جدائی اب ہمیشہ کے لئے قاتل سے ہوتی ہے

متین آخر لگا لایا مجھے دل کوئے قاتل تک
بھلا کب رہنمائی رہزن منزل سے ہوتی ہے

متین مچھلی شہری

نوائے فراق

خیال ہجر کب تک؟ زندگی کا درد سر کب تک؟
یہ مانا صبر کرتے ہیں محبت میں مگر کب تک

نگاہ شوق کا ہوتا ہے خود ہم پر اثر کب تک
اترتا ہے جگر میں دیکھئے یہ نشتر کب تک

کسی کا حسن رسوا ہو گیا پہلے ہی پردے میں
نہ لائے رنگ آخر کار تاثیر نظر کب تک

یہ دور آسماں ہے تو محبت لاکھ بڑھ جائے
مگر یہ چشم تر یہ شدت سوز جگر کب تک

مٹا تا جائیگا دل کوئی کب تک نیچی نظروں سے
چلا تا جائیگا کوئی یہ تیر بے خبر کب تک

عنایت کیا کرم کیا لطف کیا آخر محبت ہے
کوئی کرتا رہیگا چارۂ درد جگر کب تک

گریباں چاک کر کے منہ موڑ لے حسن گلستاں سے
کہ زیر آسماں یہ منظر رقص شرر کب تک

بھری آواز سے دشمن کے شکوے تیر پہلو میں
یہ جور دل شکن تا کے یہ لطف مختصر کب تک

نگاہ لطف سے تو بڑھتی ہی جاتی ہے بیتابی
علاج درد دل ہوتا ہے دیکھیں کارگر کب تک

جفائے بے نہایت منتہائے ہجر نکلی
ستم تیرے اٹھائے کوئی قصہ مختصر کب تک

کسی پر مہرباں ہوتے ہیں لیکن یوں نہیں ہوتے
سراپا لطف کے پردے میں جور مختصر کب تک

خیال زلف و رخ ہجر میں نصیب دشمن میں آئے تو
دیار حسن کی یہ شام کب تک یہ سحر کب تک

فراق آئیں گی کیا کام ایسی تدبیریں محبت میں
کسی کو ہجر میں بھولے رہیں گے ہم مگر کب تک

فراق

غزل

غنچوں کو تبسم ہے موجوں کا ترانہ ہے
اے جلوۂ گم گشتہ کچھ تیرا ٹھکانا ہے

دنیا شب غفلت ہے غم اسکا فسانا ہے
کتنوں کو یہ سنتا ہے کتنوں کو سنانا ہے

مجبور الم ہو کر گرد رہ غم ہو کر
وادی محبت کو ہموار بنانا ہے

خود کام کے بھی مجھ سے کچھ کام ہیں البتہ
نظروں سے گرانا ہے محفل سے اٹھانا ہے

اب رونق محفل ہے اجڑی ہوئی محفل سے
ہم ہیں غم ماضی ہے موجودہ زمانا ہے

یہ شورش بدمستی یہ زمزمۂ مستی
دو طرح کے ہوں میں اک دل کا فسانا ہے

ناصح ہمیں بہنے دے آنسو یہ نہیں بہتے
موتی ہیں گراں ان کو مٹی میں ملانا ہے

عالم کے بیانوں میں دنیا کی زبانوں میں
یا میرا فسانا ہے یا ان کا فسانا ہے

واعظ ہمیں مت چھیڑے ساقی ہمیں دیتا ہے
کم کم وہ پیے جس کو پھر ہوش میں آنا ہے

ہیں مصطلحات غم دنیا سے جدا آسی
بیکس جسے کہتے ہیں در اصل یگانا ہے

عبدالباری آسی

ایک شراب دو پیمانوں میں

سن کر جسے اے منظر آزردہ زمانہ ہے — وہ میری محبت کا دلدوز فسانہ ہے
رونا بھی ہے ہنسنا بھی کیا رنگ زمانہ ہے — جینا بھی فسانہ تھا مرنا بھی فسانہ ہے
نالوں سے فضاؤں میں اک حشر اٹھانا ہے — دل کو بھی جگانا ہے انکو بھی بلانا ہے
لانا ہے تصور میں محبوب نظر ان کو — بھولا ہوا اک عہد پھر یاد دلانا ہے
کیا چیز محبت ہے یہ ان کو بتانا ہے — اے جذبہ دل اب تو کچھ کر کے دکھانا ہے
تحقیق طلب نظریں پیدا چمنستاں میں — پھر دیکھ کہ ہر غنچہ پر پھول فسانا ہے
شاید کوئی راہ تو جینے کی نکل آئے — سوز غم باطن کو اب حد سے بڑھانا ہے
برباد نہ کر دل کے اجزائے پریشاں کو — اس ظرف شکستہ سے پیمانہ بنانا ہے
یہ چاند جو رہتا ہے کچھ دور مرے دل سے — اک روز اسے اپنی خلوت میں بلانا ہے
پھر سینے میں آنسو گہرائی سے آنکھوں تک — پھر سوز تمنا کو رو رو کے بجھانا ہے

تا حشر جو گونجے گا دنیائے محبت میں
منظر وہ مرے دل کا رنگین ترانہ ہے

منظر اکبر آبادی

عشق کی مہمان نوازیاں

کیسی بہار زیب گلستاں کے سامنے — کلیاں کھلیں نہ اس گل خنداں کے سامنے
تصویر شیشہ دار کا سب کو گماں ہے — وہ آ گئے ہیں دیدۂ حیراں کے سامنے
لاکھوں عذاب اک تری دوری کا مرحلہ — دوزخ بھی گرد ہے غم ہجراں کے سامنے
زردی گھٹتی ہوئی ہے رخ آفتاب پر — آیا تھا میرے کلبۂ احزاں کے سامنے
ہم کو بتا تو دیجئے کتنے چلیں گے تیر — کب تک جگر ہے صف مژگاں کے سامنے
بعد مرگ محمل تمنا ہرے ہوئے — کوئی کھڑا ہے گور غریباں کے سامنے
دیکھیں یہ تو نے عشق کی مہمان نوازیاں — بجھ بجھ گیا ہے دل ترے پیکاں کے سامنے
مجھکو پناہ ساری بلاؤں سے مل گئی — کوئی نہ آ سکی شب ہجراں کے سامنے

بیخود کا آپ کشش محل ہم سے پوچھئے
ہے وہ شراب خانۂ عرفاں کے سامنے

وحید الدین بیخود دہلوی

غزل

گاہ گاہے در سر زلف پریشاں میشوم — عکس حسنت دیدہ ام آئینہ حیراں میشوم
بیش ازیں بیہودہ عشق من بیاد مرگ ہا بکش — روز و شب از کردہ ہائے خود پشیماں میشوم
گاہ مستم پائے در زنجیر میدارد جنوں — چوں بجوریم خواب آں زلف پریشاں میشوم
می نمایم لالہ زار سینہ ام در شعر من — ہم بلبل شیراز آمدم باب گلستاں میشوم
شاعرم ہیں در طلسم نکتہ سنجیہائے من — می نہ بینی ساحرم در شعر پنہاں میشوم
بادۂ صافیستم تا شد صراحی جائے من — می نہم از چشم مردم آب حیواں میشوم
کسوت خاکی نشد بر من بایں عافیت — بر کنم ایں جامۂ پارینہ عریاں میشوم
می نگنجد در چمن مستی ہائے و ہائے من — بہ نظم روزے دو در جنت غزل خواں میشوم

رندم و آوارہ ام آزادہ دانے برجگر
داغ چوں تابد ضیائے نور عرفاں میشوم

ظہیر علی آزاد

نوائے شوکت

دیکھنا آپ کو اپنے کو حیراں کرنا — رفتہ رفتہ یونہی آجاتا ہے ارماں کرنا
بعد مرنے کے غریبوں پہ یہ احساں کرنا — کہ جلانے کو شمعیں نہ فروزاں کرنا
کشتۂ ناز کئی حسن پشیماں گلشن میں — گل سکھلاتے ہیں مجھے چاک گریباں کرنا
توبہ بے کیف ہوئی جاتی ہے اے شیخ حرم — سلسلے کیلئے لازم ہوا عصیاں کرنا
دردمندان محبت کی یہ ہمت دیکھو — درد سے چاہتے ہیں درد کا درماں کرنا
ظلم اور ظلم بھی وہ ظلم جو کچھ ظلم نہیں — اور کیا ہے جو نہیں ہے یہ پریشاں کرنا
ایک دن یہ ہے کہ ارمان سراپا ہوں میں — ایک دن وہ تھا جو آتا نہ تھا ارماں کرنا
آج تک یاد ہے وہ بزم وہ میخانہ میں — آئینہ دیکھتے جانا مجھے حیراں کرنا
حسن ہر حال میں ہے حسن وہ ظالم ہی سہی — حسن کے واسطے لازم نہیں احساں کرنا
تشنۂ جس شان سے آئے یہ ہو تیار بہار — ہمکو منظور ہے دامن کو گریباں کرنا

حاصل عمر محبت ہے یہی اے شوکت
کبھی نالہ کبھی حسرت کبھی حرماں کرنا

شوکت تھانوی

نوائے حسرت

اک عشق کا غم آفت اور اس پہ یہ دل آفت — یا دل نہ دیا ہوتا یا غم نہ دیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی — وعدہ نہ وفا کرتے وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے — کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

چراغ حسن حسرت

ادبیات عالیہ

ڈراما

ازجناب سبحان الہند علامہ کیفی اردو اسکالر ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد

انسان کا امتیاز، ادراک کی وجہ سے قائم ہے، یہ چیز جس قدر بلند، جتنی لطیف ہوگی، اسی قدر اس کا امتیاز نمایاں ہوگا۔

یہ امتیاز کبھی تقریر سے سمجھا جاتا ہے، کبھی تحریر سے۔ تحریر کی بھی دو قسمیں ہیں نظم اور نثر۔

نظم، خیالات (ادراک اور احساس) کی مخصوص پابندی کا نام ہے اور نثر محدود آزادی کی صورت ہے۔

نظم اور نثر اپنی تمام قسموں کے ساتھ ادبیات کے نام سے مشہور ہے قوموں کی معاشرت، ملکوں کا تمدن، افراد انسانی کا کیرکٹر "ادبیات" سے معلوم ہوتا ہے۔ ادبیات کی ایک قسم ڈراما ہے جو ہمارے بحث کا موضوع ہے

اس میں شبہہ نہیں کہ ڈراما، ادبیات میں مشکل ترین صنف کا نام ہے، ڈراما دراصل نظم اور نثر کا درمیانی برزخ کہا جاتا ہے، اس لئے اس کا توازن قائم رکھنا عام طور پر بہت مشکل ہے۔

ڈراما معنوی حیثیت سے بہتر سے بہتر جذبات کے مظاہر اور کیفیات کا نام ہے اور لفظی حیثیت سے ایسے الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں فطرت انسانی کا اصلی راز بے نقاب رہتا ہے

ڈراما نگار حقیقۃً فطرت کا حکیم اور اصلی نبض شناس ہوتا ہے جو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ خیالات اور جذبات کے اظہار میں کیسے الفاظ، کس قسم کے لہجے، کس طرح کی عبارت سامنے رکھنا چاہئے؟ کہاں اختصار کی ضرورت ہے! کہاں تفصیل ناگزیر ہے، زبان کیسی ہونا چاہئے، کون خیال کس طرح ادا ہونا چاہئے۔ جو لوگ ان چیزوں کو سامنے نہیں رکھتے نہیں رکھ سکتے وہ ڈراموں کے حدود سے باہر ہوتے ہیں۔

"ڈراما" دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔

(۱) ایک قسم تو یہ ہے کہ معنوی خوبیاں پیش نظر رکھی جائیں اور الفاظ کی پابندی، قوافی، سجع کی پروا نہ کی جائے جیسا کہ ممالک یورپ میں رائج ہے یہی صورت عام بھی ہے اور محفوظ بھی۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ان پابندیوں کا بھی لحاظ رکھا جائے یہ شکل بہت مشکل ہے، اس شکل میں ان پابندیوں کا جاننا بہت ضروری ہے ہندوستان میں اکثر قوافی، اور سجع کی پابندی کا نام ڈراما سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ معنوی خوبیاں رخصت ہو جاتی ہیں اور ڈراما بالکل کھیل تماشا بن جاتا ہے حالانکہ ڈراما بڑے سے بڑے مقاصد کی تکمیل کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اسی پابندی پر بحث کر کے، اس کی پوری تشریح کر دی جائے۔

اس کے لئے ہم کو عربی زبان سے خوشہ چینی کرنا چاہئے

عربی اور سجع

"سجع" کبوتر کی آواز کا نام ہے، لغت میں یہ استقامت کلام کی اور وزن کی برابری ہے، اصطلاح میں حسب تشریح کتاب "مواد البیان" کلام کے ٹکڑوں کی پابندی، قافیہ، بغیر وزن کا نام ہے نظم میں یہی چیز وزن کے ساتھ ہوتی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱)

"صناعتین" کا مولف کہتا ہے کہ نثر میں اس وقت تک شیرینی اور خوبی نہیں آتی جب تک اس میں جوڑے جوڑے الفاظ نہ رکھے جائیں، قرآن میں اس کا اہتمام کمال کے مرتبہ پر ہے

سورہ النجم، اقتربت، الرحمن میں اس اہتمام کی شان دیکھئے ایک اور صورت میں ارشاد ہوتا ہے۔

نونشاء اصبناھم بذنوبھم ونطبع علی قلوبھم دوسری جگہ فرمایا گیا ہے ولستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ پہلی آیت میں ذنوبھم اور قلوبھم کو دیکھئے اور دوسری میں اخذیہ اور فیہ کو پیش نظر رکھئے، حدیث میں اس کا اہتمام اس سے بھی زیادہ ہے، بعض جگہ قافیہ کے خیال سے اصلی الفاظ میں تصرف جائز رکھا گیا ہے مثلاً

اجنبۃ من الهامۃ والسامۃ والعین اللامۃ لغت میں ملمۃ ہے مگر سامۃ کی وجہ سے لامۃ فرمایا گیا۔

(۲)

۔ رعانی ۔ نے اس سجع کی چند شکلیں قائم کی ہیں۔

(۱) وزن میں مساوات اور اجزا میں اعتدال ہو سجع کی یہ بہترین قسم ہے قرآن میں جا بجا اس کی مثالیں ہیں مثلاً ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم اس میں الینا اور علینا، ایابھم اور حسابھم پر نظر رکھئے اس سے بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوتا ہے اللھم اقبل توبتی واغسل حوبتی اس میں اقبل اور توبتی اور اغسل اور حوبتی قابل لحاظ ہیں۔

اس کی بھی کئی نوعیتیں ہیں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اب ۱۔ تمام کلمات میں ہو ۲۔ زیادہ میں ہو ۳۔ آخر میں ہو

۳

سجع میں اختصار اور تطویل کا مدنظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے یعنی اگر تطویل رہو جاتا) ہے تو بقول مصنف کتاب "حسن التوسل" دس الفاظ سے زیادہ اور دو سے کم نہ ہوں اس کی مثالیں بھی قرآن میں بہت ہیں۔ اختصار کی مثال:۔

یا ایھا المدثر قم فانذر و ربک فکبر و ثیابک فطھر

طویل کی مثال:۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم . . . . العظیم

۴

سجع کی ترکیب کیونکر ہونا چاہئے اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ کلمے برابر ہوں، مثلاً فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر

۲۔ دوسرا بہ نسبت پہلے کے بڑا ہو مثلاً بل کذبوا بالساعۃ زفیرا۔

۳۔ دوسرا پہلے سے چھوٹا ہو۔ "المثل السائر" کا مصنف اس کو عیب سمجھتا ہے اس کی اور صورتیں بھی ہیں، ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔

۵

سجع کے حسن و عیب کے مواقع ان کا بیان بہت ضروری ہے حسن کے مواقع حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ سجع تکلف اور آورد کی نامناسبت سے خالی ہو۔ الفاظ معانی کے تابع ہوں، یعنی ان میں بے ڈھنگا پن اور بھرتی نہ ہو، اگر الفاظ معنی کے تابع نہ ہوں گے تو سجع میں نقص آجائے گا۔

(۲) سجع کے الفاظ شیریں اور فصیح ہوں ترکیب چست اور بے عیب ہو

(۳) سجع کے فقرے ایسے نہ ہو کہ ان میں باہم اختلاف معنوی ہو۔

(۴) ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ہو۔

(۵) طویل سجع میں قرائن معنوی مختصر ہوں اس کا کوئی ہرج نہیں کہ دو سجعوں کے درمیان یہ غرض کسی دوسرے سجع سے پوری ہو جائے۔

مواقع عیب:۔

(۱) دو یا کئی سجعوں کے درمیان ناگوار فاصلہ ہونا۔

(۲) دو یا کئی سجعوں کو بہت قریب کر دینا۔

عام طور پر ان واجبات اور مواقع کا خیال رکھا نہیں جاتا، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر اہل قلم ناواقف ہوتے ہیں، صرف ان کی طبیعت ان کا علم اور فن ہوتی ہے۔

فارسی

فارسی میں ان بندشوں کا حتی الوسع خیال رکھا جاتا ہے مثلاً گلستان میں ہے

(۱) ہر کہ بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر۔

(۲) توانگری بہ دل است نہ بہ مال، بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔

(۳) ہر کہ دست از جاں بشوید، ہر چہ در دل دارد بگوید۔

(۴) ایں فرومایہ دہ من سنگ بردارد و تاب یکے سخنے نمی آرد۔

دیکھو ان مثالوں میں قافئے اور سجع کے الفاظ بے تکلفی سے آتے ہیں اس لئے معنی میں خاص خوبیاں پیدا کر رہے ہیں۔

اردو: اُردو میں سجع کی مٹی آورد اور اہتمام تکلف کی وجہ سے اکثر پلید ہوتی ہے فسانہ عجائب اور سرور سخن کی بعض عبارتیں طبیعت کو گراں اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں، اس کی وجہ اردو زبان میں الفاظ کی کمی بھی ہو سکتی ہے یہی سبب ہے کہ محتاط اور متین لکھنے والے انگریزی لکھنے والوں کی طرح الفاظ کے پھیر میں پڑنے کو ثقاہت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔

تاہم اس کا خیال رکھا گیا ہے، عبارت میں خوبی پیدا ہو گئی ہے، مثلاً ڈراما، سفید خون اردو ترجمۂ کنگ لیر میں ایک جگہ یہ عبارت ہے۔

وہ عیش و آرام کی شریک اور تو غم و آفت کی ساتھی ہے وہ میرے جسم کا پھوڑا ہے اور تو مرہم لگاتی ہے وہ آنکھیں پھوڑتی ہے اور تو آنکھیں بچھاتی ہے۔

اگرچہ وہ آنکھیں پھوڑتی ہے بالکل بھرتی کا جملہ ہے تاہم مجموعی حیثیت سے عبارت ناقص نہیں بلکہ خوشگوار ہے۔

حشر محشر میں ایک جگہ ہے۔

"نیکوں کی کونسی چادر تیرے نامۂ اعمال کو چھپائے گی، تجھے آتش غضب سے بچائے گی۔

اگرچہ یہ عبارت چست نہیں تاہم قابل اعتراض نہیں، اسی ڈرامے کی ایک عبارت قابل اعتراض ہے مثلاً

"یہ سب تیری مہربانی ہے جس سے وبال زندگانی ہے" وبال زندگانی ہے" میں قافیہ اور سجع کی وجہ سے تصرف کیا ہے حالانکہ صحیح ترکیب یہ ہے "زندگانی وبال ہے" سفید خون" میں یہ جملے تطویل نادرست کی مثال ہیں۔

"اے خلعت عمر تو؛ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ظالم مظلوم کو ستا کر چین پاتا ہے نہیں نہیں، دھوکا نہ کھاؤ خدا کے گھروں میں اڑایا نہیں جاتا ہے۔

اس عبارت میں سجع اور قافیہ میں باہم اتنا بعد ہے۔ کہ بجائے لطف طبع، ناگوار ہو گیا ہے۔

اختصار مناسب کی مثال یہ ہے:۔

"وہ بولیگا، میں بلاؤں گا، وہ سنیگا میں سناؤں گا" سفید خون صفحہ ۳۵

سجع اور قافیہ کے علاوہ بھی تشبیہ اور استعارہ کی خوبیوں کے ساتھ ایجاز اطناب مساوات کا خیال عبارت میں بہت ضروری ہے، الفاظ اگر مدعا کے برابر ہیں تو اس کا نام مساوات ہے۔

کم اور ناقص الفاظ سے مدعا بخوبی ادا ہو جاتا ہے تو اس کو ایجاز کہتے ہیں اگر الفاظ بڑھ جائیں، لیکن بے فائدہ نہ ہوں تو اطناب ہے۔

یہ دو چیزیں عبارت کی جان سمجھی جاتی ہیں، غالب اور آزاد نے اپنی تحریروں میں ان کا بہت خیال رکھا ہے۔

فارسی میں گلستان، بہارستان، مقامات حمیدی وغیرہ میں یہ تمام امور بدرجۂ اتم ہیں۔

ڈرامے کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے تاریخ عالم پر نظر ڈالنا چاہئے

ڈراما اور اس کی تاریخ

ڈرامے کی ابتداء کب سے ہوئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جب سے فطرت انسانی کی ابتداء ہے لیکن اس کی تدوین اور ترتیب مغربی نقطۂ خیال سے یونان میں ہوئی ہے ڈرامے کا مقصد شروع سے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح تھا کہا جاتا ہے کہ مسیح سے ۵۳۵ سال پہلے یونانی شاعر "تھس پس" نے ڈرامے کا سنگ بنیاد رکھا ہے اس کے بعد یورپ کے اور ممالک بھی ان کے خوشہ چین ہوئے۔

علمائے ہنود، ڈرامے کو اپنے دیوتاؤں کی ایجاد یا خلق کہتے ہیں۔ اور سبب ایجاد کے متعلق عجیب و غریب روایتیں بیان کرتے ہیں، اسکی تفصیل انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں موجود ہے۔

جس طرح ادبیات کی اور شاخیں بالعموم، ملک، فضا، ماحول معاشرت سے متاثر ہوتی ہیں ڈرامے کا بالخصوص متاثر ہونا آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈراما اور ہندوستان

ہندوستان:۔ ڈرامے کو جذبات فطرت جذبات حسن، و عشق اصلاح، اخلاق رزم، بزم، تشویق مذہب، مکمل فن، اور علم کی صورت میں پیش کرنے والا سب سے قدیم ملک ہندوستان ہے۔

ہندوستان کی ان خصوصیات کو چاہے ہندوستان والے نہ مانیں، لیکن خود یورپ والے تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ گوئٹے مشہور جرمن ڈرامہ نگار "کالیداس" کے ڈرامے "شکنتلا" کے متعلق ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

"جو چیزیں روح کو بے چین کر سکتی ہیں، اس پر لذت اور الم طاری کر سکتی ہیں وہ تنہا "شکنتلا" میں موجود ہیں۔

ان ممالک کے علاوہ اور ممالک میں ڈراموں کو کوئی تاریخی اور فنی عظمت حاصل نہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا گیا اس کی تفصیل انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں موجود ہے اس کے بعد اصلی بحث السنۂ عالم اور ڈرامے کے سلسلے میں آتی ہے۔

السنۂ عالم اور ڈراما

ڈراموں کی کامیابی زبان کی خوبی، شیرینی اور وسعت پر بھی موقوف ہے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو زبان جس قدر جذبات فطرت کے بیان پر قابو رکھتی ہے اسی قدر اس کی شاعری اور اس کا ڈراما مقبول اور پسند ہوتا ہے۔

سنسکرت دنیا کی تمام زبانوں میں بیان زبان فطرت واردات حسن و عشق جذبات کی خوبی اور لطافت کے لحاظ سے سنسکرت کو خاص

امتیاز ہے اسی لئے اس زبان کے ڈرامے بہت بلند مرتبہ ہیں۔

اس زبان نے ڈرامے اور شاعری کو مکمل فن بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اپنا امتیاز نمایاں رکھا ہے اس کے علاوہ جذبات کی تقسیم نے بھی اظہار مدعا اور بیان خیالات میں خاص خوبی پیدا کر دی ہے۔

راگ دراگنی، ترنم، نغمے، بیانک کو موسیقیت کے کمال میں بھی کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے وہ تمام خصوصیات یکجا طور پر سنسکرت اور ہندی ڈراموں میں اس طرح موجود ہیں کہ اس کا مقابلہ کوئی زبان نہیں کر سکتی۔

اتفاق سے ہندوستان کو فضا موسم، مناظر قدرت، پہاڑ دریا بھی قدرت کی طرف سے ڈراموں کے موید ملے ہیں۔

سنسکرت کے ڈراموں کی کامیابی کا فیصلہ کرنے کے لئے اسکے خصوصیات مجمل طور پر سامنے رکھ لینا چاہئیں، سب سے پہلے تقسیم جذبات پر نظر کیجئے:۔

جذبات کو سنسکرت میں "رس" کہتے ہیں۔ "رس" بھاؤ سے پیدا ہوتا ہے بھاؤ کی دو قسمیں ہیں، عارضی اور دائمی۔ دائمی کی حسب ذیل نو قسمیں ہیں۔

۱ - رتی۔ یہ کیفیت، دیکھنے، سننے، یا کسی چیز کی یاد سے پیدا ہوتی ہے۔
۲ - ہاس۔ ہنسی یا خوشی (تضحیک سے علیحدہ چیز) کا نام ہے۔
۳ - شوک۔ ہجر اور فراق کا غم۔
۴ - ہجر کی مدافعت کا خیال۔
۵ - اُتساہ۔ وہ خیال یا حس جو رحم اور فیاضی کو حرکت میں لائے۔
۶ - بھے، خوف سرزنش
۷ - جگپ ساہ۔ نفرت و حقارت کے جذبات۔
۸ - وسمے۔ حیرت کے جذبات
۹ - شانت۔ انسان کے تمام متعلقات کو فانی سمجھنے کے جذبات۔

عارضی کی ۳۲ قسمیں ہیں۔

ان میں نفرت، حسد، خلوت پسندی، کمینہ پن، غصے کے تیور، عیب جینی غم کو بھولنا، نشے کی کیفیت، تھکان، انہماک، پژمردگی، کبیدگی، بے پروائی نفرت وغیرہ تمام جذبات انسانی شامل ہیں۔

"بھرت" نے اس کو آٹھ قسموں پر تقسیم کیا ہے لیکن حقیقتاً نو ہیں۔

۱ - سرنگار۔ عشق۔
۲ - ہاسے - مسرت
۳ - کرونا۔ نرم دلی
۴ - رادور۔ غصہ
۵ - ویر۔ ہمت
۶ - بھیانک۔ خوف
۷ - بھیش۔ نفرت
۸ - ادبھت۔ تعجب
۹ - شانت۔ سکون۔

اسی طرح عشق کی تین قسمیں، ہمت کی تین صورتیں ہیں پھر ان کے علائم بتلائے ہیں یہ اجمالی اور مختصر بیان اس جگہ کافی ہے تفصیل کے لئے مفصل کتابیں دیکھئے۔

سنسکرت کے ڈراموں میں الفاظ اور زبان و سلاست کا خیال بہت رکھا جاتا ہے، مختلف طبقوں کے لئے مختلف لہجوں اور زبان کا بھی لحاظ پرانے ڈراموں میں کیا جاتا تھا ان کے علاوہ، اسٹیج وایکٹ، کو آرٹ کی صورت میں سنسکرت میں سب سے پہلے پیش کیا گیا ہے۔

"کالیداس" سنسکرت کے مشہور شاعر اور ڈراما نگار کے دو مشہور ڈراموں شکنتلا اور وکرم اروسی کو سامنے رکھکر خیالات و جذبات کی بلندی حسن و عشق کے واردات زبان کی خوبی، طرز ادا کی بیساختگی دیکھنا چاہئے۔

ایک موقع پر مناظر قدرت کا بیان، شکنتلا میں اس طرح ہے۔

شکنتلا - "اہا ہا! چو طرفہ سبزہ زار ہے پہاڑوں کے نیچے شفاف سطح میں پانی بھرا ہے، شاخیں اس میں ڈوبی ہوئی ہیں بادل دھوئیں کی طرح اٹھ رہے ہیں۔

شکنتلا کے سراپا کی تعریف دشینت کی زبان سے اپنے ہمراز سے "متھو! تم نے اس نور کے چاند! زمین کی بجلی کو نہیں دیکھا ہے میں سچ کہتا ہوں، جس وقت یہ سوچ لیا تھا کہ میں ایک سے ایک مجسم نور، زندہ خوبصورتی کی لیلا رچونگا جو پرتھوی اور اکاش پر اپنا جواب نہ رکھتی ہوگی"

شکنتلا ایک جگہ راجہ دشینت کو اس کی بیوفائی اور انکار عشق پر شرمندہ کرنا چاہتی ہے۔

"افسوس کیا جوانی میں جوش شباب کے ہاتھوں اندھی بنکر راجاؤں سے عشق کرنے کا یہی نتیجہ ہے راجہ سے کہتی ہے۔

اے زریں لباس پہنکر اترانے والے، کیا ابتدائے عشق کے میٹھے

ادب العالیہ

ڈراما

از جناب سحبان الہند علامہ کیفی اردو اسکالر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد

انسان کا امتیاز، ادراک کی وجہ سے قائم ہے، یہ چیز جس قدر بلند، جتنی لطیف ہوگی، اسی قدر اس کا امتیاز نمایاں ہوگا۔

یہ امتیاز کبھی تقریر سے سمجھا جاتا ہے، کبھی تحریر سے، تحریر کی بھی دو قسمیں ہیں نظم اور نثر۔

نظم، خیالات (ادراک اور احساس) کی مخصوص پابندی کا نام ہے اور نثر محدود آزادی کی صورت ہے۔

نظم اور نثر اپنی تمام قسموں کے ساتھ ادبیات کے نام سے مشہور ہے قوموں کی معاشرت، ملکوں کا تمدن، افراد انسانی کا کیرکٹر، ادبیات سے معلوم ہوتا ہے۔ ادبیات کی ایک قسم ڈراما ہے جو ہمارے بحث کا موضوع ہے

اس میں شبہ نہیں کہ ڈراما، ادبیات میں مشکل ترین صنف کا نام ہے، ڈراما در اصل نظم اور نثر کا درمیانی برزخ کہا جاتا ہے، اس لئے اس کا توازن قائم رکھنا عام طور پر بہت مشکل ہے۔

ڈراما معنوی حیثیت سے بہتر سے بہتر جذبات کے مظاہر اور کیفیات کا نام ہے اور لفظی حیثیت سے ایسے الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جن میں فطرت انسانی کا اصلی راز بے نقاب رہتا ہے

ڈراما نگار حقیقۃً فطرت کا حکیم اور اصلی نبض شناس ہوتا ہے جو یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ خیالات اور جذبات کے اظہار میں کیسے الفاظ، کس قسم کے ہیں، کس طرح کی عبارت سامنے رکھنا چاہئے؟ کہاں اختصار کی ضرورت ہے؟ کہاں تفصیل ناگزیر ہے، زبان کیسی ہونا چاہئے، کون خیال کس طرح ادا ہونا چاہئے۔

جو لوگ ان چیزوں کو سامنے نہیں رکھتے نہیں لکھ سکتے وہ ڈراموں کے مرد سے باہر ہوتے ہیں۔

ڈراما دو طرح سے لکھا جاتا ہے۔

(۱) ایک قسم تو یہ ہے کہ معنوی خوبیاں پیش نظر رکھی جائیں اور الفاظ کی پابندی، قوافی، سجع کی پروا نہ کی جائے جیسا کہ ممالک یورپ میں رائج ہے یہی صورت عام بھی ہے اور محفوظ بھی۔

(۲) دوسری قسم یہ ہے کہ معنوی خوبیوں کے ساتھ ان پابندیوں کا بھی لحاظ رکھا جائے یہ شکل بہت مشکل ہے، اس شکل میں ان پابندیوں کا جاتا بہت فروعی ہے ہندوستان میں اکثر قوافی، اور سجع کی پابندی کا نام ڈراما سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ معنوی خوبیاں رخصت ہو جاتی ہیں اور ڈراما بالکل کھیل تماشا بن جاتا ہے حالانکہ ڈراما بڑے سے بڑے مقاصد کی تکمیل کے لئے عالم وجود میں آیا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اسی پابندی پر بحث کر کے، اس کی پوری تشریح کر دی جائے۔

اس کے لئے ہم کو عربی زبان سے خوشہ چینی کرنا چاہئے

عربی اور سجع

"سجع" کبوتر کی آواز کا نام ہے۔ لغت میں یہ استقامت کلام کی اور وزن کی برابری ہے، اصطلاح میں حسب تشریح کتاب "مواد البیان"، کلام کے ٹکڑوں کی پابندی، قافیہ بغیر وزن کا نام ہے نظم میں یہی چیز وزن کے ساتھ ہوتی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں۔

(۱)

"صناعتین" کا مولف کہتا ہے کہ نثر میں اس وقت تک شیرینی اور خوبی نہیں آتی جب تک اس میں جوڑے جوڑے الفاظ نہ رکھے جائیں، قرآن میں اس کا اہتمام کمال کے مرتبہ پر ہے

سورہ النجم، اقتربت، الرحمٰن میں اس اہتمام کی شان دیکھئے ایک اور صورت میں ارشاد ہوتا ہے۔

نونشاء اصبنا ھم بذنوبھم و نطبع علیٰ قلوبھم دوسری جگہ فرمایا گیا ہے ولستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ پہلی آیت میں ذنوبھم اور قلوبھم کو دیکھئے اور دوسری میں اخذیہ اور فیہ کو پیش نظر رکھئے، حدیث میں اس کا اہتمام اس سے بھی زیادہ ہے بعض جگہ قافیہ کے خیال سے اصلی الفاظ میں تصرف جائز رکھا گیا ہے مثلاً

احیند من الصامتہ والسامۃ والعین اللامۃ لغت میں ملمۃ ہے مگر سامۃ کی وجہ سے لامۃ فرمایا گیا۔

(۲)

معانی نے اس سجع کی چند شکلیں قائم کی ہیں۔

(۱) وزن میں مساوات اور اجزا میں اعتدال ہو سجع کی یہ بہترین قسم ہے قرآن میں جا بجا اس کی مثالیں ہیں مثلاً ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم اس میں الینا اور علینا، ایابھم اور حسابھم پر نظر رکھئے اس سے بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔

حدیث میں ارشاد ہوتا ہے اللھم اقبل توبتی واغسل حوبتی اس میں اقبل اور توبتی اور اغسل اور حوبتی قابل لحاظ ہیں۔

اس کی بھی کئی نوعیتیں ہیں ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اب ۱۔ تمام کلمات میں ہو ۲۔ زیادہ میں ہو ۳۔ آخر میں ہو

۳

سجع میں اختصار اور تطویل کا مدنظر رکھنا بھی بہت ضروری ہے، یعنی اگر تطویل (بڑھانا) ہے تو بقول مصنف کتاب "حسن التوسل" دس الفاظ سے زیادہ اور دو سے کم نہ ہوں اس کی مثالیں بھی قرآن میں بہت ہیں۔ اختصار کی مثال:۔

یا ایھا المدثر قم فانذر وربک فکبر وثیابک فطھر

طویل کی مثال:۔

لقد جاءکم رسول من انفسکم . . . . العظیم

۴

سجع کی ترکیب کیونکر ہونا چاہئے اس کی بھی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ کلمے برابر ہوں مثلاً فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر

۲۔ دوسرا بہ نسبت پہلے کے بڑا ہو مثلاً بل کذبوا بالساعۃ زفیرا۔

۳۔ دوسرا پہلے سے چھوٹا ہو۔ "المثل السائر" کا مصنف اس کو عیب سمجھتا ہے اس کی اور صورتیں بھی ہیں، ان کے بیان کی ضرورت نہیں۔

۵

سجع کے حسن و عیب کے مواقع ان کا بیان بہت ضروری ہے احسن کے مواقع حسب ذیل ہیں:۔

ا۔ سجع تکلف اور آورد کی نامناسبت سے خالی ہو۔ الفاظ معانی کے تابع ہوں، یعنی ان میں بے ڈھنگا پن اور بھرتی نہ ہو، اگر الفاظ معنی کے تابع نہ ہوں گے تو سجع میں نقص آجائے گا۔

(۲) سجع کے الفاظ شیریں اور فصیح ہوں، ترکیب بہت صحیح ہو۔

(۳) سجع کے فقرے ایسے نہ ہوں کہ ان میں باہم اختلاف معنوی ہو۔

(۴) ان کے درمیان زیادہ فاصلہ نہ ہو۔

(۵) طویل سجع میں قرائن معنوی مختصر ہوں اس کا کوئی ہرج نہیں کہ دو سجعوں کے درمیان یہ غرض کسی دوسرے سجع سے پوری ہو جائے۔

مواقع عیب:۔

(۱) دو یا کئی سجعوں کے درمیان ناگوار فاصلہ ہونا۔

(۲) دو یا کئی سجعوں کو بہت قریب کر دینا۔

عام طور پر ان واجبات اور مواقع کا خیال رکھا نہیں جاتا، اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر اہل قلم ناواقف ہوتے ہیں، صرف ان کی طبیعت ان کا علم اور فن ہوتی ہے۔

فارسی

فارسی میں ان بندشوں کا حق الوسع خیال رکھا جاتا ہے مثلاً گلستان میں ہے

(۱) ہر کہ بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر۔

(۲) توانگری بہ دل است نہ بہ مال، بزرگی بہ عقل است نہ بہ سال۔

(۳) ہر کہ دست از جاں بشوید ہر چہ در دل دارد بگوید۔

(۴) ایں فرمایہ دہ من سنگ بردارد وتاب یکے سخنے حق آرد۔

دیکھو ان مثالوں میں قافیے اور سجع کے الفاظ بے تکلفی سے آئے ہیں اس لئے معنی میں خاص خوبیاں پیدا کر رہے ہیں۔

اردو

اُردو میں سجع کی مٹی آورد اور اہتمام تکلف کی وجہ سے اکثر پلید ہوتی ہے فسانۂ عجائب اور سرورش سخن کی بعض عبارتیں طبیعت کو گراں اور ناگوار معلوم ہوتی ہیں، اس کی وجہ اردو زبان میں الفاظ کی کمی بھی ہو سکتی ہے یہی سبب ہے کہ محتاط اور متین لکھنے والے انگریزی لکھنے والوں کی طرح الفاظ کے پھیر میں پڑنے کو فقاہت سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔

تاہم اس کا خیال رکھا گیا ہے، عبارت میں خوبی پیدا ہو گئی ہے، مثلاً ڈراما، سفید خون اردو ترجمۂ کنگ لیر میں ایک جگہ یہ عبارت ہے۔

وہ عیش و آرام کی شریک اور تو غم و آفت کی ساتھی ہے وہ میرے جسم کا پھوڑا ہے اور تو مرہم لگاتی ہے وہ آنکھیں پھوڑتی ہے اور تو آنکھیں بچھاتی ہے۔

اگرچہ وہ آنکھیں پھوڑتی ہے بالکل بھرتی کا جملہ ہے تاہم مجموعی اعتبار سے عبارت ناقص نہیں بلکہ خوشگوار ہے۔

حشر محشر میں ایک جگہ ہے۔

"نیکوں کی کونسی چادر تیرے نامۂ اعمال کو چھپائے گی، تجھے آتش غضب سے بچائے گی۔"

اگرچہ یہ عبارت چست نہیں تاہم قابل اعتراض نہیں۔ اسی ڈرامے کی ایک عبارت قابل اعتراض ہے مثلاً

"یہ سب تیری مہربانی ہے جس سے وبال زندگانی ہے" "وبال زندگانی ہے" میں قافیہ اور سجع کی وجہ سے تصرف کیا ہے حالانکہ صحیح ترکیب یہ ہے "زندگانی وبال ہے" "سفید خون" میں یہ جملے تطویل نا درست کی مثال ہیں۔

"افسوس تو کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ظالم مظلوم کو ستا کر پھل پاتا ہے نہیں نہیں، دھوکا نہ کھاؤ خدا مشخصوں میں اڑایا نہیں جاتا ہے۔"

اس عبارت میں سجع اور قافیہ میں باہم اتنا بعد ہے۔ کہ بجائے لطف طبع، ناگوار ہوگیا ہے۔

اختصار مناسب کی مثال یہ ہے:۔

"وہ بولیگا" میں بلاؤں گا، وہ سنیگا میں سناؤں گا "سفید خون ص۳۵"

سجع اور قافیہ کے علاوہ بھی تشبیہ اور استعارہ کی خوبیوں کے ساتھ ایجاز اطناب مساوات کا خیال عبارت میں بہت ضروری ہے، الفاظ اگر مدعا کے برابر ہیں تو اس کا نام مساوات ہے۔

کم اور ناقص الفاظ سے مدعا بخوبی ادا ہو جاتا ہے تو اس کو ایجاز کہتے ہیں اگر الفاظ بڑھ جائیں، لیکن بے فائدہ نہ ہوں تو اطناب ہے۔

یہ دو چیزیں عبارت کی جان سمجھی جاتی ہیں، غالب اور آزاد نے اپنی تحریروں میں ان کا بہت خیال رکھا ہے۔

فارسی میں گلستاں، بہارستان، مقامات حمیدی وغیرہ میں یہ تمام امور بدرجۂ اتم ہیں۔

ڈرامے کی اہمیت معلوم کرنے کے لئے تاریخ عالم پر نظر ڈالنا چاہئے

ڈراما اور اس کی تاریخ

ڈرامے کی ابتداء کب سے ہوئی ہے؟ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ جب سے فطرت انسانی کی ابتداء ہے لیکن اس کی تدوین اور ترتیب مغربی نقطۂ خیال سے یونان میں ہوئی ہے ڈرامے کا مقصد شروع سے مذہبی، معاشرتی، اقتصادی اصلاح تھا کہا جاتا ہے کہ مسیح سے ۵۳۵ سال پہلے یونانی شاعر "تھس پس" نے ڈرامے کا سنگ بنیاد رکھا ہے اس کے بعد یورپ کے اور ممالک ان کے خوشہ چین ہوئے۔

علمائے ہنود، ڈرامے کو اپنے دیوتاؤں کی ایجاد یا خلق کہتے ہیں۔ اور سبب ایجاد کے متعلق عجیب وغریب روایتیں بیان کرتے ہیں، اسکی تفصیل انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں موجود ہے۔

جس طرح ادبیات کی اور شاخیں بالعموم، ملک، فضاء، ماحول معاشرت سے متاثر ہوتی ہیں ڈرامے کا بالخصوص متاثر ہونا آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈراما اور ہندوستان

ہندوستان:۔ ڈرامے کو جذبات فطرت۔ جذبات حسن، وعشق، اصلاح، اخلاق رزم، بزم، فلسفہ، مذہب، کمل فن، اور علم کی صورت میں پیش کرنے والا سب سے قدیم ملک ہندوستان ہے۔

ہندوستان کی ان خصوصیات کو چاہے ہندوستان والے نہ مانیں لیکن خود یورپ والے تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ گوئٹے مشہور جرمن ڈرامہ نگار نے کالیداس کے ڈرامے "شکنتلا" کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"جو چیزیں روح کو بےچین کر سکتی ہیں، اس پر لذت اور الم طاری کر سکتی ہیں وہ تنہا "شکنتلا" میں موجود ہیں۔"

ان ممالک کے علاوہ اور ممالک میں ڈراموں کو کوئی تاریخی اور فنی عظمت حاصل نہیں اس لئے ان کا ذکر نہیں کیا گیا اس کی تفصیل انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں موجود ہے اس کے بعد اصلی بحث السنۂ عالم اور ڈرامے کے سلسلے میں آتی ہے۔

السنۂ عالم اور ڈراما

ڈراموں کی کامیابی زبان کی خوبی، شیرینی اور وسعت پر بھی موقوف ہے اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ جو زبان جس قدر جذبات فطرت کے بیان پر قابو رکھتی ہے اسی قدر اس کی شاعری اور اس کا ڈراما مقبول اور پسند ہوتا ہے۔

سنسکرت دنیا کی تمام زبانوں میں بیان زبان فطرت واردات حسن وعشق جذبات کی خوبی اور لطافت کے لحاظ سے سنسکرت کو خاص

امتیاز ہے اسی لئے اس زبان کے ڈرامے بہت بلند مرتبہ ہیں۔

اس زبان نے ڈرامے اور شاعری کو مکمل فن بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں اپنا امتیاز نمایاں رکھا ہے اس کے علاوہ جذبات کی تقسیم نے بھی اظہار مدعا اور بیان خیالات میں خاص خوبی پیدا کر دی ہے۔

راگ و راگنی، ترنم، نغمے، بیانک کو موسیقیت کے کمال میں بھی کوئی ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکا ہے وہ تمام خصوصیات یکجا طور پر سنسکرت اور ہندی ڈراموں میں اس طرح موجود ہیں کہ اس کا مقابلہ کوئی زبان نہیں کر سکتی۔

اتفاق سے ہندوستان کو فضا موسم، مناظر قدرت، پہاڑ دریا بھی قدرت کی طرف سے ڈراموں کے موید ملے ہیں۔

سنسکرت کے ڈراموں کی کامیابی کا فیصلہ کرنے کے لئے اسکے خصوصیات مجمل طور پر سامنے رکھ لینا چاہئیں سب سے پہلے تقسیم جذبات پر نظر کیجئے۔

جذبات کو سنسکرت میں "رس" کہتے ہیں "رس" بھاؤ سے پیدا ہوتا ہے بھاؤ کی دو قسمیں ہیں، عارضی اور دائمی، دائمی کی حسب ذیل نو قسمیں ہیں۔

۱ - رتی۔ یہ کیفیت، دیکھنے، سننے، یا کسی چیز کی یاد سے پیدا ہوتی ہے۔
۲- ہاس۔ ہنسی یا خوشی تضحیک سے علیحدہ چیز کا نام ہے۔
۳- شوک۔ ہجر اور فراق کا غم۔
۴۔ ہجر کی مدافعت کا خیال۔
۵- اُتساہ۔ وہ خیال یا حس جو رحم اور عیاشی کو حرکت میں لائے۔
۶- بھے، خوف سرزنش
۷- جگپ ساہ۔ نفرت و حقارت کے جذبات۔
۸- وسمے۔ حیرت کے جذبات
۹- شانت، انسان کے تمام متعلقات کو فانی سمجھنے کے جذبات۔

عارضی کی ۳۳ قسمیں ہیں۔

ان میں نفرت حسد، خلوت پسندی، کمینہ پن، غصے کے تیور، عیب چینی، غم کو بھولنا، نشے کی کیفیت تکان، اہانت، پژمردگی، کبیدگی، بے پروائی نفرت وغیرہ تمام جذبات انسانی شامل ہیں۔

"بھرت" نے اس کو آٹھ قسموں پر تقسیم کیا ہے لیکن حقیقتاً نو ہیں۔

۱- سرنگار، عشق۔
۲- ہاسے - مسرت
۳ - کرونا، رحم دلی
۴ - رادور، غصہ
۵- ویر - ہمت
۶ - بھیانک - خوف
۷ - بیبھتس - نفرت
۸ - ادبھت - تعجب
۹ - شانت - سکون۔

اسی طرح عشق کی تین قسمیں، ہمت کی تین صورتیں ہیں پھر ان کے علائم بتائے ہیں یہ اجمالی اور مختصر بیان اس جگہ کافی ہے تفصیل کے لئے مفصل کتابیں دیکھئے۔

سنسکرت کے ڈراموں میں انشا اور زبان و سلاست کا خیال بہت رکھا جاتا ہے، مختلف طبقوں کے لئے مختلف لہجوں اور زبان کا بھی لحاظ پرانے ڈراموں میں کیا جاتا تھا ان کے علاوہ، اسٹیج و ایکٹ، کو آرٹ کی صورت میں سنسکرت میں سب سے پہلے پیش کیا گیا ہے۔

کالیداس، سنسکرت کے مشہور شاعر اور ڈراما نگار کے دو مشہور ڈراموں شکنتلا اور وکرم اروسی کو سامنے رکھکر خیالات و جذبات کی بلندی حسن و عشق کے واردات زبان کی خوبی، طرز ادا کی بیساختگی دیکھنا چاہئے۔

ایک موقع پر مناظر قدرت کا بیان، شکنتلا میں اس طرح ہے۔

شکنتلا "اہا ہا! چوطرفہ سبزہ زار ہے پہاڑوں کے نیچے شفاف سطح میں پانی بھرا ہے، شاخیں اس میں ڈوبی ہوئی ہیں بادل دھوئیں کی طرح اٹھ رہے ہیں۔

شکنتلا کے سراپا کی تعریف دشینت کی زبان سے اپنے ہمراز سے "متھو! تم نے اس نور کے چاند! زمین کی بجلی کو نہیں دیکھا ہے میں سچ کہتا ہوں، جس وقت یہ سوچ لیا تھا کہ میں ایک سے ایک ایسا مجسم نور، زندہ خوبصورتی کی لیلا رچونگا جو پرتھوی اور آکاش پر اپنا جواب نہ رکھتی ہوگی"

شکنتلا ایک جگہ راجہ دشینت کو اس کی بیوفائی اور انکار عشق پر شرمندہ کرنا چاہتی ہے۔

"افسوس کیا جوانی میں جوش شباب کے اشتعال اندھی بنکر راجاؤں سے عشق کرنے کا یہی نتیجہ ہے راجہ سے کہتی ہے۔

اسے زرین لباس پہنکر اترانے والے کیا ابتدائے عشق کے وہ چکنے

اپنے سب خیالات خواب خیال ہو گئے۔ شاید وہ تمام باتیں زندہ جھوٹ تھیں۔

ایک اچھوت اور باختیار راجہ کے دربار میں ایک معمولی عورت جو جان پر کھیل چکی ہو عشق اور محبت کی مدافعت میں اس سے بہتر جذبات اور شیریں الفاظ اسنے پیدا نہیں ہو سکتی۔

راجہ کا ایک مصاحب جو اصلی واقعہ سے واقف نہیں، شکنتلا کو ڈانٹتا ہے وہ کہتی ہے۔

میں اپنا فرض ادا کر رہی ہوں جھوٹوں کے سامنے سچوں کو دینے کا ضرورت نہیں، انھوں نے مجھکو اپنی بیوی بنا کر طوطا چشمی اختیار کر لی، یہ مذہب صنم پرستی کے بالکل مہرنے ہیں۔

راجہ جواب دیتا ہے۔

اے عورت! تجھ پر ضرور کوئی جن سوار ہے، ذرا اپنی جوشیلی طبیعت تھام میں خوب جانتا ہوں کہ چڑھا ہوا پانی تنگ نالوں سے نکل کر اپنے گندے پانی کو بلور جیسے صاف سمندر میں ملانے کی کوشش کرتا ہے۔

اس میں خیالات اور اصلی جذبات کے ساتھ تشبیہ کی خوبیاں بھی اصلی پیمانے پر موجود ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ راجہ شکنتلا . . . شادی کے واقعہ کو بالکل بھول گیا ہے لیکن شکنتلا کی جسارت پر، اپنی بدنامی اور رسوائی سے ڈرتا ہے، اس لئے کوئی سخت حکم نہیں دیتا، اس کو مثالوں سے خاموش کرنے کے لئے کہتا ہے۔

"کوئل جو دنیا کو نہایت پیاری معلوم ہوتی ہے آسمان کی طرف اڑنے سے پہلے انڈوں کو دوسرے کے گھونسلے میں رکھ جاتی ہے۔

شکنتلا کی نفرت اور غصے کی دہکتی آگ کو مثال کے ہلکے چھینٹے دبا نہیں سکتے، وہ کہتی ہے۔

"آپ غیروں کی دغابازی سے فریب کاری کا سبق سیکھ سکتے ہیں چہرے پر تو ہی ٹیکا ہے مگر دل میں پوشیدہ داغ رکھتے ہیں۔ آپ اس گہرے پہاڑی غار کی طرح، جس پر تازہ پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوتی ہیں، لیکن اندر ہزاروں سانپ پھنکارتے ہیں۔"

یہ ڈراما منشی ابراہیم محشر نے اردو میں ڈھالا ہے، ترجمہ باوجودیکہ اچھا نہیں تاہم خیالات کی جھلک اس پردے سے بھی صاف نمایاں ہے۔

وکرم اروسی کالیداس کا دوسرا مشہور ڈراما "وکرم اروسی" مولوی عزیز مرزا نے اردو میں نہایت کامیابی سے ڈھالا ہے۔

راجہ اروسی (اپنی محبوبہ) کے خیال میں ڈوبا ہوا ہے ہر شے اور ہر چیز میں اس کی دلبری کی شان دیکھتا ہے ایک جگہ ہنس کو دیکھ کر کہتا ہے:۔

"اچھا! او راج ہنس! یہ تو بتا کہ اگر تو نے میری کمان ابرو سندری کو تالاب کے کنارے ٹہلتے ہوئے نہیں دیکھا ہے تو او ڈاکو! تو نے اس کی مستانہ چال کیسے اڑائی ہے!

"ہنس" ہندی اور سنسکرت کی شاعری میں اپنی مستانہ چال کی وجہ سے مشہور چڑیا ہے۔

راجہ سے اس کا ایک مصاحب کہتا ہے، کہ آپ تصور میں "اروسی" کا نقشہ کھینچ کر دل کو تسکین دے لیجئے راجہ کہتا ہے۔

جب اس مہ جبین دلربا کی تصویر کھینچنے بیٹھونگا تو اس کے حسن کے تصور سے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئیں گے، پھر تصویر کی تکمیل کیونکر ہو سکے گی؟

ان خیالات میں عالی خیالی کے ساتھ حقیقت کا حسن پورے انداز دلبری میں جلوہ گر ہے۔

ایک جگہ سائنس کا مسئلہ اس طرح راجا بیان کر رہا ہے۔

اس میں شک نہیں، لیکن اروسی دل کی عجیب کیفیت ہے جس طرح دریا کا بہاؤ ناہموار چٹانوں سے ٹکر کھا کر سیکڑوں نالوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اسیطرح دل کا دشمن عشق وصال میں رکاوٹیں پڑنے سے سوگنی قوت حاصل کر لیتا ہے۔

(راجہ "پرورداوس" مجنوں کے لباس میں آتا ہے)

پرورداوس او بدمعاش دیو ٹھہر تو کہاں میری دلربا کو لئے اڑا جاتا ہے ہا ہا وہ تو پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ گیا ہے اور وہاں سے مجھ پر تیر برسا رہا ہے (غور سے دیکھ) نہیں! نہیں!! یہ مغرور مسلح دیو نہیں بلکہ پانی سے بھرا ہوا بادل ہے اور یہ پوری کھینچی کمان نہیں، بلکہ دھنک ہے اور یہ تیر نہیں بلکہ تیز پھوار ہے اور یہ چیز جو اندھیرے میں ایسی چمک رہی ہے جیسے کسوٹی پر سونے کی لکیر، بجلی ہے نہ کہ میری پیاری اروسی"

عبارت میں جذبات کے حسن مبالغہ کے ساتھ تشبیہ اور استعارے کے نظر فریب بناؤ اور سنگار کا سامان بھی موجود ہے۔

سنسکرت کی جگہ اب ہندی نے لے لی ہے، بلکہ ہندی کی طرز ادا اور سادگی نے خیالات کی بلندی کو اپنے آغوش میں لیکر جاذب نظر بنا دیا ہے افسوس ہے کہ مسلمان ہندی کی طرف معمولی توجہ بھی نہیں کرتے ورنہ اُن کو محسوس ہوتا کہ ان کے لباس ادب کے لئے بہت سی زینتیں ابھی باقی ہیں، جو

ہندی ہو جاتے ہیں وہ نہ صرف مستعار بلکہ مستقل طور پر مل سکتی ہیں۔

انگریزی اور شکسپیر

انگریزی میں سب سے زیادہ جس شخص نے فطرت کے اصلی رازوں کا پتہ لگایا ہے وہ شکسپیر ہے اس کے ڈراموں میں جو امتیاز اور خصوصیت ہے وہ اب تک باقی ہے اور نہ معلوم کب تک باقی رہیگی، کہا جاتا ہے کہ موجودہ دور میں ڈرامے بہت آگے بڑھ گئے ہیں لیکن ان کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈرامے اگر شکسپیر کے راستے کو نہ چھوڑتے تو اچھا تھا۔

شکسپیر اپنے ڈراموں میں الفاظ، ترکیب اور طرزِ ادا کے ایسے تیر رکھتا ہے جو دل کے نشانے پر ٹھیک بیٹھتے ہیں کبھی خطا نہیں کرتے۔ پھر یہ کہ انکا زخم رس رس کر مدت تک مزے لے لے کر بہتا ہے۔

اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

شکسپیر کا مشہور ڈراما رومیو جولیٹ پیش نظر ہے، اس کا ترجمہ اردو میں فیروز گلنار ، کے نام سے ہو گیا ہے لیکن ہمارے خیال میں ترجمہ کامیاب نہیں ہے اس لئے ہم اپنا ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

رومیو جولیٹ رومیو (عاشق) جولیٹ (اپنی معشوقہ) کا نظارہ کرنے کیلئے دیوار پھاند کر گیا ہے۔ رومیو اور جولیٹ کے خاندانوں میں سخت جنگ اور عداوت ہے رومیو کو سامنے دیکھ کر جولیٹ حیرت میں آکر پوچھتی ہے تم کون ہو؟ رومیو جواب دیتا ہے۔

- میں نہیں جانتا کہ میں تمہیں کیونکر بتاؤں کہ میں کون ہوں؟ میرا نام! اے پاک فرشتے! میرے لئے خود قابلِ نفرت ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ تمہارا دشمن ہے کاش میں نے رکھا ہوتا تو اس کے ٹکڑے کر ڈالتا "

جولیٹ پوچھتی ہے:-

تم یہاں کیسے اور کس لئے آئے، فصیل کی دیواریں بلند، ان پر چڑھنا دشوار اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ تم کون ہو " قدم قدم پر موت کا خطرہ ہے۔

رومیو جواب دیتا ہے:-

محبت کے ہلکے پھلکے پروں نے مجھے اڑا کر یہاں پہنچا دیا ہے، پتھر اور چونے کی دیواریں محبت کو روک نہیں سکتیں، محبت وہ ہے کہ اس کے جی میں جو آجاتا ہے کر گزرتی ہے۔

اور قتل کا خوف! تمہارے عزیزوں کی تلواروں سے ۲۰ گنا زیادہ قاتل تو تمہاری آنکھیں ہیں تم میری طرف ایک نظر محبت بھری، میٹھی اور رسیلی نگاہوں سے دیکھ لو۔

رومیو کو اسی سلسلے میں ایک موقع پر قسم کھانے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ "چاند" کی قسم کھاتا ہے۔ "چاند" کی قسم کھانے کا خیال جولیٹ کے حسن و ادا کی مناسبت سے کتنا لطیف ہے جولیٹ کہتی ہے، تم اس چاند کی قسم کیا کھاتے ہو جو ہر مہینے بدل جایا کرتا ہے۔

رومیو۔ پھر میں کس کی قسم کھاؤں؟

جولیٹ۔ کسی کی نہیں، اور اگر تم قسم کھانا ہی چاہتے ہو تو اپنی، اپنے سراپائے خوبی ذات کی قسم کھاؤ، کیونکہ یہ میری محبت پرستی کا دیوتا ہے اور میں اس کی پجارن ہوں۔

اس موقع پر جو عبارت شکسپیر نے لکھی ہے اس کا ایک ایک لفظ بلاغت کا جادو ہے۔

"پرنس آف ٹائر" میں شاہزادی میرینا کو اس کی دائی اس کے باپ کی لاعلمی میں ایک شخص کے ذریعہ سے قتل کرانا چاہتی ہے وہ شخص نو عمر اور حسین شاہزادی کو باتوں میں لگا کر دریا کے کنارے لایا ہے اور یک بیک کہتا ہے:-

شاہزادی! تم کو اگر دعا مانگنا یا نماز پڑھنا ہو تو پڑھ اور مانگ لو!

شاہزادی۔ (حیرت سے) اس کا کیا مطلب ہے؟

شخص۔ یہی کہ اگر تمہیں یہ سب کرنا ہو تو اپنی طرف سے میں اتنا وقت عنایت کر سکتا ہوں، بشرطیکہ زیادہ وقت نہ لگے، میں نے تم کو قتل کرنے کی تمہاری دائی (اپنے مالک) سے قسم کھائی ہے، اچھا جلدی کرو۔

شاہزادی۔ وہ مجھے قتل کرنا کیوں چاہتی ہے؟ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے کبھی کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف کیا ہو؟ اس کی مرضی کے خلاف کیا، میں نے کبھی کسی چوہیا، کسی مکھی تک کو نہیں ستایا ہے ایک بار میں نے ایک کیڑا کچل دیا تھا اس پر میں گھنٹوں روئی تھی۔

"انطونی اور کلوپیٹرا" میں، کلوپیٹرا، انطونی کی موت کی خبر سنتی ہے۔ فرطِ غم سے خودکشی پر آمادہ ہو جاتی ہے ایک زہریلا سانپ ڈبے سے نکال کر

انتھونیو:۔

اے مہلک بدمعاش! آ میری زندگی کی گرہ جلد کو کھول دے۔ زندگی کی گرہیں کھولنے سے قتل کر، مار ڈال، یا زندگی ختم کر دینا مراد لینا اس قدر بلیغ ہے کہ اس کی تعریف مشکل ہے۔

ان مثالوں سے شکسپیر کا کمال اور زبان انگریزی کی طرز ادا، اور ڈرامے سے اس کی مناسبت کا پورا رنگ ظاہر ہو جاتا ہے

یورپین زبانوں میں نظم اور نثر کے اندر صنائع لفظی کی چند اں پروا نہیں کی جاتی نثر میں تو خصوصیت سے بچتے ہیں، شکسپیر نے THE TEMPEST ٹیمپسٹ میں ایک جگہ نظم میں لفظی صنعت کا اس طرح اہتمام کیا ہے۔

ایریل گا کر کہتا ہے:۔

FULL FATHOM FIVE THY FATHER LIES
OF HIS BONES ARE CORAL MADE.

فل، فیدم، فائیو، فادر، چاروں لفظوں کے شروع میں حرف "ایف" آیا ہے لیکن اس قسم کی مثالیں بالکل شاذ ہیں۔

انگریزی کے خیالات اور طرز ادا بہ نسبت اور ممالک و زبان یورپ کے ہندوستان سے قریب ہیں یہی وجہ ہے کہ انگریزی ڈرامے اور دوسرے ادبیات اردو اور ہندی زبانوں میں بہت جلد کثرت سے پھیلنے لگے

فرنچ اور ڈراما

فرنچ زبان میں ڈرامے کی تفصیل تو کہیں اور ملیگی اس جگہ ہم ایک ڈراما "آدم و حوا" کا نمونہ اس لئے پیش کرتے ہیں کہ اس زبان کے خیالات کسی شکل میں سامنے آجائیں۔

یہ ڈراما فرانس میں بہت مقبول ہوا، اور کثر اسٹیج ہوا ہے اس میں حضرت آدم اور حوا کے بہشت سے نکالے جانے دنیا میں آکر مصائب برداشت کرنے کا حال ہے شیطان نے کیونکر بہکایا باوجود ممانعت شدید حوا اور آدم نے درخت معرفت خیر و شر کا پھل کیونکر کھایا؟ خیر و شر کی معرفت اور وساوس شیطانی کی قلعی اس ڈرامے میں خوب کھولی گئی ہے اگرچہ اس موضوع پر ابن جوزی نے "تلبیس ابلیس" کے نام سے عربی میں مبسوط کتاب لکھی ہے، جو بہت دلچسپ ہے

فرانسیسی ڈراما کی نثر کا نمونہ

(ایک شیطان) حوا کو بہکانے کے لئے بھیس بدل کر جنت میں پہونچتا ہے۔ حوا اس کو دیکھکر متعجب ہوتی ہیں اس کے قریب میں آتی ہیں اور گفتگو کرتی ہیں۔

حوا۔ (تعجب سے) خدا کی شان! مجھکو جنت میں رہتے اتنے دن ہو گئے لیکن اس خوبصورت جانور کو صرف آج دیکھا ہے، اخاہ! معلوم نہیں اس کا نام کیا ہے۔

شیطان۔ میرا نام؟ میرا نام حیتہ ہے، اور آپ کا نام اے حسن کی دیوی!

حوا۔ میرا نام حوا ہے۔

حیتہ۔ اس حسن اتفاق کے قربان! حیتہ اور حوا دونوں قریب قریب ایک ہیں۔

حوا۔ اور میں پیارے آدم کی بیوی ہوں

حیتہ۔ بہت خوب! ماشاء اللہ خدا مبارک کرے۔

حوا۔ تم اتنے دنوں کہاں تھیں؟

حیتہ۔ بی بی کیا عرض کروں؟ میں برابر تنہائی میں خدا کی عبادت کرتی رہی

حوا۔ خدا کی عبادت! خلوت میں! آخر اس کی وجہ؟ اس نے آنکھیں دی ہیں تو اس کی قدرت کی بہار کیوں نہ لوٹی جائے، سبحان اللہ! جنت کا یہ سماں، یہ نہر، یہ باغ، یہ چہچہاتی چڑیاں، یہ میوہ دار درخت دیکھنے کے قابل ہیں۔

اس ڈرامے میں معاملات حسن و عشق نہیں ہیں بلکہ مذہبی جذبات کا بیان ہے، فرانسیسی ڈراموں میں یہ عنصر اکثر غالب ہے۔

جرمن زبان اور ڈراما

جرمن زبان میں ہر چیز پر فلسفہ اور مذہب کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے کہیں مذہب کی تعمیر ہے کہیں تخریب، بہر حال کسی نہ کسی طرح مذہب ضرور سامنے آجاتا ہے، اسی لئے اس کی ادبیات میں یہ چیز مشترک ہے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی ڈراما نگار گوئٹے نے "فاوسٹ" کے نام سے ایک ڈراما لکھا ہے، جو نہ صرف "گوئٹے" بلکہ جرمنی کا شاہکار سمجھا جاتا ہے، اس کا ترجمہ انگریزی، فارسی، اردو زبانوں میں ہو چکا ہے جاننے ایک دوست نے مجھکو

مصر سے خط لکھا ہے کہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہو رہا ہے اردو میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی نے ترجمہ کیا ہے۔

ڈرامے کا مقصد روحانی کشمکش کی فلسفیانہ تشریح ہے فاوسٹ شیطان کی مدد سے اس کے تمام راز معلوم کرنا چاہتا ہے، اسی لئے اس سے دوستی پیدا کر لی ہے ایک روز۔ فاوسٹ کے ریڈنگ روم میں شیطان آتا ہے اس سے یہ مکالمہ ہوتا ہے۔

فاوسٹ۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جو فاتح کی شان سے عزت کا سہرا سر پر باندھتا ہے اور مستانہ وار رقص سے چور ہو کر کسی حسینہ سے ہم آغوش ہوتا ہے، کاش میں بھی اس عالم میں روح پرور کی قوت سے مسرور اور بیجان ہو کر گر پڑتا۔

شیطان۔ مگر پھر بھی کوئی اس رات کو زعفرانی عرق پیتے پیتے رہ گیا۔

فاوسٹ۔ معلوم ہوتا ہے تجھے جاسوسی کا بھی شوق ہے

شیطان۔ عالم کل میں تو نہیں پھر بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔

فاوسٹ۔ مجھے اس خوفناک کشمکش سے ایک جانے بوجھے راگ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، اور بچپن کے جو جذبات دل میں باقی تھے انہیں گذرے ہوئے زمانہ کی یاد دلا کر دام فریب میں گرفتار کر لیا، اب میں ان چیزوں کو کوستا ہوں، جنہوں نے میری روح پر دلربا شعبدوں کا جال ڈال کر ایسا سبز باغ دکھلایا کہ وہ اب تک اس سیاہ خانہ میں گرفتار ہے لعنت ہو ان بلند خیالات پر جن سے ہمارا ذہن اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے لعنت ہو مظاہر کی نظر بندی پر جو ہمارے حواس پر قبضہ کر لیتی ہے . . . ."

(فاوسٹ ترجمہ سید عابد حسین صفحہ ۱۶۹-۱۷۰)

ان خیالات سے جرمنی کے مذاق عام کا پتہ چلتا ہے جو بذات خود ڈراموں کی سطح سے بلند ہے۔

فارسی زبان اور ڈراما

فارسی زبان میں باقاعدہ ڈراما تھوڑے دنوں سے رائج ہے اصلی ڈرامے کم اور ترجمے زیادہ ہیں، لیکن ڈرامے کے عناصر اس میں بہت دنوں سے ہیں۔

چنانچہ نظامی اور خسرو کی مثنویوں میں اس کا رنگ نمایاں ہے۔ نظامی اور خسرو کی مثنوی "لیلے مجنوں" "شیریں خسرو" میں اس کے نمونے موجود ہیں مثلاً مناظر قدرت کی صورتیں یہ ہیں۔

خزاں

مولانا نظامی

شرط است بوقت برگ ریزاں
خونابہ شود ز برگ ریزاں
خونے کہ بود درون ہر شاخ
بیرون دمد از مسام سوراخ
قارورہ ز آب سرد گردد
رخسارۂ باغ زرد گردد

امیر خسرو

آمد چوں خزاں بہ غارت باغ
بنشست بجائے بلبلان زاغ
رخسارۂ لالہ پر ز چین شد
آئینۂ آب آہنین شد
ہر غنچہ کہ جلوہ کرد گستاخ
در ریختن آمد از سر شاخ

خزاں کی شرط ہے کہ پت جھڑ کے وقت
پتیوں سے خون گرے
جو خون کہ ہر ڈالی میں بہتا ہے
وہ ڈالیوں سے نکل پڑتا ہے
شیشۂ سرد اور باغ کا
چہرہ زرد ہو جاتا ہے

خزاں جب باغ کو برباد کرنے آئی تو
بلبلوں کی جگہ کوے نے لی
لالہ کے گال پر جھریاں پڑ گئیں
پانی کا آئینہ لوہے کے رنگ کا
(سیاہ) ہو گیا جو کلی گستاخانہ
جلوہ دکھا رہی تھی وہ شاخ سے گر گئی

بہار

چوں پردہ کشید گل بہ صحرا
شد خاک بروئے گل مطرا
شد شگوفہ بر درختاں
چوں سکہ بروئے نیکبختاں
از لالۂ لعل واز گل زرد
گیتی علم دو رنگ برکرد
شیرابی سبزہائے نوخیز
از لولوئے تر زمرد انگیز

چوں نافہ کشاد باد نوروز
بشگفت بہار عالم افروز
ابر از صدف سپہر یکسر
در گوش بنفشہ ریخت گوہر
سر و از علم بلند پایہ
بر فرق چمن فگند سایہ
از شبنم گوہرین شمائل
آراست عروس گل حمائل

ترجمہ

جب پھولوں نے صحرا پر پردہ ڈال دیا

نوروز کی ہوا نے جب نافہ کھول دیا

کلی پھر خوبوں پر مسکرائی   آسمان کی سیپی سے بادل نے
جیسے نیک بختوں کے چہرے پر دولت ہو   بنفشہ کے کان میں موتی برسائے
سرخ لالہ اور زرد پھول سے   شمشاد نے اپنے علم کا سایہ
دنیا نے دو رنگ کا علم سنبھالا اور بلند کیا   سمن پر ڈالا، موتی کی ایسی
نئے سبزوں کی سیرابی اور شگفتگی   صورت والی شبنم سے پھول کی
تری کی وجہ سے زمرد انگیز ہو گئی   گردن آراستہ ہو گئی

یہ اشعار "لیلے مجنوں" اور "مجنوں لیلے" مثنویوں سے لئے گئے ہیں دیکھئے بیان کی قدرت نے بہار میں کیسے کیسے پھول کھلائے ہیں، اور خزاں کو کیسا نمونۂ دوزخ بنا دیا ہے۔

لیلیٰ کا حسن و جمال

بود از صدف دگر قبیلہ   بود از صف آں بتان دلخواہ
ناسفتہ دُریش ہم طویلہ   ماہے کہ زد آفتاب را راہ
آراستہ لعبتے چو ماہے   مشعل کش آفتاب و انجم
چوں سرو سہی نظارہ گاہے   دیوانہ کن پری و مردم
آہو چشمے کہ ہر زمانے   سلطان شکر لبان آفاق
کشتے بہ کرشمہ جہانے   لشکر شکن شکیب عشاق
ماہ عربی بہ رخ نمودن   گردن زن عافیت فروشاں
ترک عجمی بہ دل ربودن   تشویش دہ صلاح کوشاں
زلفش چو شبے رخش چراغے   سرتا بہ قدم کرشمہ و ناز
یا مشعلۂ بہ چنگ زاغے   ہم سرکش حسن و ہم سرافراز

دوسرے قبیلے کے سیپی سے   بتانِ دلخواہ کے صف میں
بے بیدھا ہوا موتی   ایسا چاند جو آفتاب کی راہ روک لیا کرے
چاند کی طرح آراستہ   آفتاب اور ستارے کی روشنی ماند کر دینے والی
سرو کی طرح نظروں پر چڑھنے کی چیز   آدمی اور پری کو دیوانہ بنا دینے والی
ایسی ہرنی کہ ہر وقت   دنیا کے شکر لب معشوقوں کی بادشاہ
اپنی ادا سے دنیا کو قتل کرے   عاشقوں کے نوع صبر کو شکست دینے والی
صورت دکھانے میں عربی چاند   عافیت فروشوں کی قاتل
دل لینے میں ترک عجمی، زلف   صلاح کی کوششوں کو حیران کرنے والی
رات کی طرح اور چہرہ چراغ کے مانند   سر سے پاؤں تک ناز و کرشمہ
یا اس مشعل کی طرح جو کوے کے چنگل میں ہو   حسن کی سرکشی بھی اور سرفرازی بھی

اس بیان کا کمال اور تشبیہ و استعارے کی کرامت دیکھئے کہ وہم انسانی سے بالاتر چیزیں سامنے رکھ دی ہیں تسلسل نظم، اسی طرح بیان کا جادو، پازور کلام کا چڑھتا ہوا سمندر ہے۔

ملا مکتبی اور ہاتفی کی مثنویوں میں بھی اسی قسم کا زور ہے۔

واردات عشق

مجنوں جوش جنوں میں سرگرداں پھرا جا رہا ہے، انبوہ کثیر ساتھ ہے۔ کوئی اس کی حالت پر افسوس کر رہا ہے، کوئی رقیق القلب آنسوؤں کے ذریعہ سے ہمدردی کر رہا ہے لڑکے اور شہدے مشغول سنگ باری ہیں اس حالت کی تصویر حضرت امیر خسرو اس طرح کھینچتے ہیں۔

"ہوا کی طرح ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر رواں دواں ہے پیچھے خلقت کا ہجوم ہے، کوئی اس کی جوانی پر افسوس کر رہا ہے، کوئی نصیحت کرتا ہے کوئی سخت کلامی سے پیش آ رہا ہے، لڑکے ہیں کہ پتھروں سے دعوت کر رہے ہیں، کہیں ادھر پتھر لگا کہیں ادھر، کہیں اس جگہ چوٹ آ گئی، کہیں اس جگہ خون بہ رہا ہے، لیکن ان تمام ہنگاموں میں مجنوں بے کر بیخبر ہے، آنکھوں سے اگر آنسو جاری ہیں تو بلبلوں کی طرح نالہ مستانہ کر رہا ہے۔"

تیزی سے روانی کو "ہوا" سے تشبیہ دی ہے خلقت کی مختلف طبائع کا نقشہ کھینچا ہے، پھر مجنوں کی وارفتگی کی تصویر دکھائی ہے بیان کی قوت نے جذبات کے دریا کو کوزہ میں بھر دیا ہے۔

لیلیٰ بھی عشق کی چوٹ کھا چکی ہے، نسوانی شرم و حجاب میں اس کو چھپانا چاہتی ہے، لیکن تازہ گرفتاری اور بھولے پن کی وجہ سے چھپا نہیں سکتی ان واقعات کو امیر خسرو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"باوجودیکہ لیلےٰ چھپا رہی تھی لیکن دلی جذبات چہرے سے عیاں تھے دل کا خون سینے کی صفائی سے اس طرح جھلک رہا تھا جیسے شیشے سے شراب جھلکتی ہے، شرم چہرے پر پردہ بن کر پڑی ہوئی تھی، لیکن دل میں آگ رہ رہ کر بھڑک رہی تھی، کلی اگرچہ راز سربستہ تھی، لیکن اپنی خوشبو سے لوگوں کو مست کر رہی تھی۔"

نظارۂ حسن

"لیلیٰ مجنوں" نظامی، اور "مجنوں لیلیٰ" خسرو میں اس قسم کے واقعات بکثرت ہیں، لیکن ہم ایک ٹکڑا "شیریں خسرو" نظامی سے لے کر درج کرتے ہیں خسرو شیریں کو شاہی اقتدار دکھانا چاہتا ہے، شیریں انداز معشوقانہ سے اس کو رد کرتی ہوئی اقلیم حسن کی شہنشاہی کا زور دکھاتی ہے۔

تیرے سر میں ابھی بادشاہی کا غرور ہے، افسوس! غرور عشق سے دور رہا کرتا ہے یہاں (شاہانہ سطوت کی ضرورت نہیں بلکہ) آہ سرد کی حاجت ہے دل کا دعویٰ ہے تو اس میں درد پیدا کرنا چاہئے (دیکھو!) میرے لبوں میں اب بھی آب حیات ہے، ابھی تک میری جوانی میں دریا کا زور ہے اداو ناز کے اعتبار سے اگرچہ میں ترک دلستان ہوں، لیکن بوسے سے دل نوازی بھی کر سکتی ہوں سامنے سے ہٹ جا ایسا نہ ہو کہ تیرے خون میں اپنا ہاتھ بھر لوں کیونکہ میری اقلیم حسن میں ایسے بہت خون ہو چکے ہیں۔

ایسے خود مختار بادشاہ کے سامنے جس کے چشم و ابرو کا اشارہ حیات و ممات کا قانون ہے شیریں کا اس انداز میں گفتگو کرنا اور اپنے اقلیم کی فرماں روائی کا اظہار، شاعر کی شاعری نہیں بلکہ مضمون کی خلاقی ہے۔

اسی طرح تمام جذبات بہتر سے بہتر صورت میں موجود ہیں، محاکات فلسفہ فصاحت و بلاغت تمام خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

ان مثنویوں کے علاوہ جامی کی "یوسف زلیخا" خیام کی رباعیوں میں بھی یہ تمام عناصر موجود ہیں۔

اس جگہ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ فارسی زبان میں ادبیات کے لئے زیادہ تر نظم ہی مخصوص ہے نثر میں بیشتر علوم و فنون حکمت و فلسفہ سیاست و معاشرت کی خشک چیزیں ہوتی ہیں۔ اہل فارس نے شاید اسی لئے ابھی تک ڈرامے کی طرف خاص توجہ نہیں کی ہے، اس وقت ہمارے سامنے فارسی کا ایک ڈراما ناگزیری "مریض خیالی و عروس" "جباری" کے نام سے پیش نظر ہے مغرب کے مشہور ڈراما نویس "مولیر" کے ڈرامے سے میرزا جوردی نے فارسی میں ڈھالا ہے، تیمور کے وقت کا قصہ ہے، خود تیمور کی بیٹی ہیروئن ہے

پروین (تیمور کی بیٹی قصہ کی ہیروئن) مبتلائے عشق ہے آنکھوں سے عشق کے شرارے نکل رہے ہیں اپنی خادمہ سے جو محرم راز ہے گفتگو کر رہی ہے

پروین۔ شگوفہ! دیکھ میں اقرار کرتی ہوں کہ اگر تو مجھ سے تنگ برابر اس شخص کے سامنے ہے تو مجھے کچھ عذر نہیں البتہ میں اپنے دل کا درد تجھ سے کہنا چاہتی ہوں اچھا بتا! میرے دل میں جو عشق کا درد پیدا ہو گیا ہے، اس کی نسبت تیرا کیا خیال ہے؟

شگوفہ۔ میں آپ کی بدخواہ نہیں۔

اصل عبارت فارسی کا بھی لطف گوارا یا ناگوار اٹھا لیجئے۔

پروین۔ آیا من بد کردم کہ درمقابل این دل بستگی سر تسلیم و رضا پیش انداختم (کیا میں نے یہ برا کیا کہ اس دل بستگی کے مقابلہ میں سر تسلیم و رضا خم کر دیا ہے)

شگوفہ۔ من ہیچ چیزے نمی گویم (میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہتی)

پروین۔ شگوفہ آیا تو این طور میکنی کہ من در مقابل این شعلہ کہ در قلبم مشتعل شدہ و بہترین شاہدے براۓ محبت من است۔ بی حسی اختیار کنم (شگوفہ کیا تو یہ چاہتی ہے میں اس شعلے کے مقابلے میں جو میرے قلب میں بھڑک رہا ہے اور محبت کا بہترین گواہ ہے بے حسی اختیار کروں)

شگوفہ۔ نہ ہرگز (ہرگز نہیں)

پروین۔ شگوفہ آیا تصدیق میکنی کہ این جوان درمیان ہم قطاران خودش از ہر حیثیت ممتاز است (شگوفہ کیا تو اس کی تصدیق کرتی ہے کہ یہ جوان اپنے ہم رتبہ لوگوں میں ممتاز ہے۔

شگوفہ۔ مسلماً (اطمینان سے)

عبارت ترجمہ میں کوئی خاص بات نہیں، البتہ اصل ڈرامے کا خط و خال معلوم ہو جاتا ہے حالانکہ یہ وہی زبان ہے جو پہلی مثالوں میں ادبیات کا سحر حلال پیش کر چکی ہے۔

زبان ترکی اور ڈراما

ترکی زبان میں فارسی زبان کی طرح رزم اور بزم دونوں یکساں کامیاب نہیں بلکہ ترکوں کی عادات اور فطرت کے مطابق ان کی ادبیات میں رزم کا پہلو نمایاں ہے اس وقت جنگ روم و یونان کا ڈراما پیش نظر ہے، یہ جنگ ادہم بادشاہ کی قیادت میں ہوئی تھی اس میں ترکوں کو فتح اور یونانیوں کو شکست فاش نصیب ہوئی۔

لنڈ۔ جرمنی لفٹنٹ ترکی فوج کا ملازم ہیرو اور "لمبی" یونانی فوج کے لفٹنٹ کی لڑکی ہیروئن ہے۔

"لمبی" اپنے عاشق لنڈ کے انتظار میں پریشان ہے۔

آہ! میں کیا کروں؟ لنڈ ابھی تک نہیں آیا، مجھکو صبر کی طاقت نہیں، آخر دیر کی کیا وجہ ہے؟ اس نے صبح کو آنے کا وعدہ کیا تھا، یہ وقت ہو گیا، اے میرے دل! مژدہ ہو۔

(لنڈ آتا ہے)

لنڈ۔ پیاری لمبی! ایک اہم کام کی وجہ سے دیر ہو گئی ۔۔۔ وحشت ناک خبر

لمبی۔ خدارا جلد کہو، دل دھڑک رہا ہے۔

لنڈ سیاسیات کی نزاکت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ یونانیوں کے مقابلہ میں ترکوں نے اعلان جنگ کر دیا، ہماری فوجیں اور ہم پاشا کی قیادت میں یونانیوں کے مقابلے کے لئے عنقریب روانہ ہونے والی ہیں۔

لمبی ہاں! یہ مجھے بھی معلوم ہے۔

لنڈ میں تمہارے والد سے ملا تھا، انہوں نے صاف صاف کہدیا کہ یا تو میں تمہاری محبت سے باز آؤں یا یونانیوں کے مقابلے میں تلوار نہ اٹھاؤں، میرے لئے یہ دونوں ناممکن ہیں۔

لمبی ہائے! پھر کیا ہوگا؟

لنڈ کیا بتاؤں؟ میری کل تدبیریں ناکام ہو گئیں"

⁂

جنگ شروع ہو چکی ہے "ینی" یونانی، لمبی کا باپ ایک ترکی فوجی افسر کے مقابل ہے وار کرنے کے پہلے دونوں گفتگو کرتے ہیں۔

ینی۔ میں تجربہ کار جنگجو ہوں مجھکو دنیا جانتی ہے۔

ترکی افسر۔ میں نے بڑے بڑے تجربہ کاروں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا ہے۔

ینی تم ترک لڑکوں کی جماعت ہو۔

ترکی افسر لپک کر تلوار کا ایک ہاتھ مارتا ہے ینی گر پڑتا ہے، ترک چاہتا ہے قتل کر دے کہ ینی چلاتا ہے "لنڈ کی دوہائی"۔ لنڈ آجاتا ہے اور ترک افسر سے اس کا خون معاف کرالیتا ہے۔

⁂

ترکی زبان کا انداز بیان یورپ سے زیادہ ایشیا کے مذاق سے ملتا جلتا ہے، ترکی میں فرانسیسی ڈراموں کے ترجمے زیادہ ہوئے ہیں اور تخیل ڈرامے بھی ہیں لیکن کم۔

عربی زبان اور ڈراما

فارسی کی طرح عربی زبان میں بھی ڈرامے کے عناصر اس قدر ہیں کہ ان کا احصا بہت مشکل ہے بلکہ عربی زبان کی یہ فضیلت قابل ذکر ہے کہ اس میں نظم اور نثر دونوں ادبیات کے لئے استعمال ہوتی ہیں قرآن نثر کے ادبیات کی ایسی کتاب ہے، کہ وہ معجزہ بن گئی ہے اور اس آفتاب کے سامنے عرب میں کسی قسم کا چراغ جل نہ سکا، انشا اور معانی و بیان پر عربی میں جتنی کتابیں ہیں شاید ہی کسی زبان میں ہوں "صبح الاعشیٰ" علامہ قلقشندی کی نہایت ضخیم چودہ جلدوں میں انشاء پر" قابل دید کتاب ہے، اس کے علاوہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کتابیں ہیں۔ فہرست ابن ندیم سے اجمالی طور پر بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے "الف لیلہ" جو عام طور پر قصے کی کتاب کہی جاتی ہے، اس میں ڈرامے کے اتنے عناصر موجود ہیں کہ ان سے بہتر سے بہتر ڈرامے تیار ہو سکتے ہیں، چنانچہ نور الدین اور مریم زنار یہ کے قصے سے پلاٹ لیکر ہم نے اپنا ڈرامہ "نور و نار"، یا "وفا کی دیوی" تیار کیا ہے۔

ہم نے اس سے پہلے، اسی الف لیلہ سے پلاٹ لیکر عربی میں ایک ڈراما تیار کر کے مصر بھیجا تھا، یہ ڈرامہ جستہ جستہ ہمارے ماہانہ رسالہ "سبحان" میں کئی نمبروں میں شائع ہو چکا ہے۔

اردو زبان میں ڈراما

اردو زبان کی تنگی اور تنگدستی کے اعتبار سے جتنا سرمایہ اب تک اردو میں موجود ہے وہ قابل تحسین ہے، اردو ڈراما نگاروں سے یہ شکایت بیجا ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے مغرب کی تقلید کرنے کو اردو کی کامیابی سمجھتے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ گھر کی دولت چھوڑ کر اغیار کے ٹکڑوں سے اپنی روح کو خوش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنا نہیں سمجھتے کہ اردو میں اتنا دیر ہضم لقمہ تحلیل کرنے کی یک بیک قابلیت نہیں ہو سکتی، نتیجہ لازمی ہے کہ زبان اور لٹریچر دونوں خراب ہو جائیں گے رات دن اردو میں ثقیل الفاظ جگہ لے رہے ہیں نامانوس اور غلط ترکیبیں رائج ہو رہی ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض ارباب امتیاز اہل قلم کامیابی کے ساتھ اس میدان میں گامزن ہیں، ان کی اگر فہرست تیار کی جائے تو ہمارے محترم دوست آغا حشر صاحب کا نام سرورق پر لکھا جائے گا۔

اکثر ڈراما نگار پلاٹ لینے اور ترجمہ کرنے میں بہت کم فرق سمجھتے ہیں، پلاٹ بننے کے اصول سے ڈرامے کی خصوصیات سے بھی آگاہ نہیں، ہم نے جو نمونہ پیش کیا ہے اس میں حتی الوسع کوشش کی ہے کہ ڈرامے کی تمام خصوصیات پیش نظر رہیں، یہ فیصلہ ناظرین کی رائے پر ہے کہ ہم کو کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ان کے تفصیلی ذکر کا موقع آتا ہے اس سے رائے قائم کرنا آسان ہوگا۔

ڈراما اور دوسرے ادبیات میں فرق

قصہ اور ناول

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ہم اس کو بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ پہلے قصے اور ناول کا فرق بیان کر دینے سے ڈرامے سے ہم قریب تر ہو جائیں گے، عام طور پر قصے میں بیان کا انداز بالکل سادہ اور عام فہم ہوتا ہے غیر ضروری تفصیل اور ناگوار طوالت اس کا معیار ہے لیکن یہ متعین ہو جانے کے بعد کہ قصوں کے سامع اور مخاطب عوام ہوتے ہیں تو اعتراض کا رخ بدل جاتا ہے۔

عوام کی زبان، ایجاز، اطناب، مساوات، حذف، اضافہ اور تطویل سے آشنا نہیں ہوتی، وہ بال کی کھال نکالنا، اور ہندی کی چندی پسند کرتے ہیں، مثلاً ایران کے ملک میں ایک شہر ہے کسی زمانہ میں ایک بادشاہ فیروز نام کا اس پر حکومت کرتا تھا، اس نے اپنے وزیر سے کہا" یہ قصے کی زبان ہے جو بالکل عام فہم ہے اس کو ناول نویس اس طرح لکھے گا۔

- فیروز (شاہ خراساں) نے وزیر سے کہا" یہ صورت ضروری محذوفات کے بعد قائم ہوئی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ قصوں میں تشبیہات، نشست، الفاظ، انداز بیان کی پوری نگہداشت نہیں کی جاتی، ناولوں میں ان کا جس قدر اہتمام ہوتا ہے ناول کامیاب کہا جاتا ہے۔

مناظر کیرکٹر وغیرہ کے بیان میں ناولوں نے اپنے لئے نئی دنیا تیار کر لی ہے جو قصہ کی دنیا سے بالکل الگ ہے، اس کے علاوہ اور بھی جزئیات ہیں نظم میں بھی محاکات کا ایک پہلو ہے لیکن اس قدر کہ تفصیل کا طالب بالکل تشنہ رہ جاتا ہے، نظم کی یہی خوبی ہے کہ وہ طالب تفصیل کا شوق بھڑکا کر اس کو تشنہ رکھے ادبیات میں ایک درجہ یہ بھی ہے۔

ڈراما

نظم اور ناول کے درمیانی برزخ کا نام ڈرامہ ہے جس طرح ڈرامے اور قصوں کا درمیانی برزخ ناول ہے ان کے باہم فرق کو ہم چند مثالوں سے دکھانا چاہتے ہیں،

ڈراما اور ناول

جسم اور روح کے متعلق ناول "فردوس بریں" میں "مشہور مرحوم شیخ علی وجودی، فرقہ باطنیہ کے پیر کی زبان سے یہ ادا کرتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جسم میں آنے سے پیشتر روح مجرد میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ کسی مادی مسرت سے لطف اٹھا سکے اس وقت وہ محض مجرد ہوتی ہے اور حظوظ و لذائذ سے فائدہ یاب ہونے کے طریقوں سے بالکل بے خبر یہی مضمون ڈراما "سفید خون" کی عبارت میں "ارسلان" کی زبان سے اس طرح ادا ہوتا ہے۔

" انسان فانی ہے، جسم، سانس کی تیلیوں کا بنا ہوا پنجرہ ہے اور روح ایک چڑیا ہے جو اس میں قید ہے جس کے ہر نغمے کی صدا اندرون پردہ کہتی ہے کہ اے حرص کی بستی میں رہنے والی مغرور ہستی! تیری چیرہ دستی پر غفلت برستی ہے، ہر بلندی کا نتیجہ پستی ہے"

اگرچہ دونوں عبارتوں کے موضوع مختلف ہیں تاہم انداز بیان پر رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

ناول میں بیان کی سادگی تفصیل کے انداز میں ہے ڈرامے میں معنوی اثر کے علاوہ، طرز عبارت میں بیساختگی ہے، جا بجا سجع اور قافیے نے اس کو بہت زیادہ دلنشین اور اثر انداز بنا دیا ہے، تھوڑے الفاظ میں بہت معانی بھر دئے ہیں گویا ایک صورت کی تخیل ہے جو اثر بنکر دل میں اترتی ہے، اور طبیعت کو "ہل من مزید" کے لئے بیتاب کر دیتی ہے ڈرامے کی سب سے بڑی خصوصیت اور سب سے بڑی کامیابی یہی ہے۔

ڈرامے کی کامیابی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جو کمی تحریر میں رہ جاتی ہے جس کو طبیعتیں عبارت میں تلاش کرتی ہیں وہ انسان کا لب و لہجہ، حرکات اشارات بنکر ایکٹ کے ذریعہ سے بخوبی پوری ہو جاتی ہے اس لئے ڈرامے کا اصلی تکملہ اسٹیج پر ہو جاتا ہے۔

نظم اور ڈراما

ڈرامے کا نظم سے بھی موازنہ کر کے اس کی خصوصیت سمجھی جا سکتی ہے۔ مجنوں کی سرگشتگی کو لاعلاج سمجھکر مجنوں کا باپ بیٹے کے باپ سے

کیجئے۔ آپ نے عملی دنیا میں قدم رکھتے ہی جو میدان اپنے لئے منتخب کیا ہے اس میں باوجود انتہائی وسعتوں کے گنجائش نہایت ہی محدود ہیں اور ان ہی محدود گنجائشوں میں آپ کو کسی نہ کسی طرح اپنے لئے بھی گنجائش نکالنی ہے۔"

سید جالب صاحب نے یہ تقریر اس طرح فرمائی کہ سانس لینے کے لئے سلسلہ کہیں منقطع نہیں ہوا، ایک آدھ مرتبہ دوران تقریر میں ہم نے بھی کچھ بولنے کی کوشش کی مگر صرف منہ کھول کھول کر رہ گئے اس لئے کہ وہ ذرا ٹھہرتے تو ہم بولتے مگر وہ میل ٹرین کی طرح سٹیشن چھوڑتے ہوئے تقریر فرما رہے تھے، بہرحال ان کے رکتے ہی ہم نے کہا، "مجھکو صحافت سے فطری ذوق ہے اور میں اس کو اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھونگا اگر آپ سے استفادہ حاصل کر سکوں۔

سید جالب نے یہیں پر ہم کو چپ کرتے ہوئے فرمایا "جی ہاں" اگر آپ کو اخبار نویسی سے دلچسپی ہے اور آپ اس کو بحیثیت فن حاصل کرنا چاہتے ہیں تو میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہوگی اگر میں کچھ آپ کی امداد کر سکوں، آپ نے غالباً ابتک کسی اور اخبار میں کام نہیں کیا ہے۔

"ہم نے عرض کیا "جی نہیں۔ بالکل نہیں"

سید صاحب نے حقہ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا "میرا مقصد یہ ہے کہ کسی اخبار کے آپ نامہ نگار رہے ہیں یا نہیں، رسائل میں تو میں نے آپ کے مضامین دیکھے ہیں۔

ہم نے عرض کیا" اب تک میں کسی اخبار کا نامہ نگار نہیں رہا ہوں اس لئے کہ تعلیمی مشاغل سے اس کی فرصت ہی نہیں ملتی تھی البتہ اخبار بینی سے مجھکو ہمیشہ ذوق رہا ہے اور یہ ذوق اس حد تک رہا ہے کہ گویا اخبار بینی میرے ضروریات زندگی میں شامل ہو کر رہ گئی ہے"

سید صاحب نے قلم اٹھاتے ہوئے کاغذ پر جھک کر فرمایا۔ "جی ہاں" مگر اخبار بینی اور اخبار نویسی میں جو بعد المشرقین ہے اس کا اندازہ آپ کو ابھی نہیں ہے اب ہوگا بہرحال فی الحال آپ صرف یہی کام کیجئے کہ یہاں تشریف لا کر ہمدم کے پرانے فائل کم سے کم دو سال پہلے سے لے کر اب تک کے دیکھ جائیے خصوصاً ان دو سالوں کے فائلوں میں جس قدر ایڈیٹوریل ہیں ان کو پڑھ جائیے اس کے بعد کچھ اور کام کیجئے"

سید جالب کی اس گفتگو کے بعد ہم گویا وابستۂ ہمدم میں شامل ہو گئے اور ہمارے لئے ایک کرسی اس لمبی سی ینگ پانگ کی میز کے قریب ڈالدی گئی جس پر عملہ ادارت کے باقی تمام اراکین سید جالب صاحب کی میز کے سامنے

اس طرح بیٹھتے تھے گویا کلاس ٹیچر کی میز کے سامنے طلبا بیٹھے ہوئے املا لکھ رہے ہیں اب ہم روز صبح آٹھ بجے دفتر آتے تھے اور چار بجے سہ پہر تک ہمدم کے پرانے فائل چاٹا کرتے تھے البتہ اس کا ہم کو پورا اختیار تھا کہ خواہ ہمدم کے اڈیٹوریل ہم واقعی پڑھیں خواہ یوں ہی ورق گردانی کر کے وقت کاٹ دیں مگر یہ ناممکن تھا کہ ہمدم کے فائل پر سے ہماری نظر ہٹ سکے یا ہم کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو سکیں اس لئے کہ سید صاحب کی میز سامنے ہی تھی اور واللہ وہ رعب تھا اس بڈھے کا کہ خیر ہم تو ،،تازہ واردان بساطِ ہوائے دل،، میں سے تھے، لیکن اڈیٹوریل اسٹاف کے باقی ممبران جن میں سے ایک آعوذ باللہ خود بڈھے کھوسٹ خرانٹ تھے دم دبائے ہوئے اپنے کام میں مصروف رہتے تھے البتہ ساڑھے بارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک جبکہ سید صاحب دفتر سے اٹھکر کھانا کھانے جاتے تھے تمام عملہ اور اڈیٹ آزاد ہوتا تھا کہ خواہ سب لوگ آپس میں باتیں کریں یا گانا گائیں یا ناچیں یا قلابازیا کھائیں ،،اس وقت ہمدم کے اسٹاف میں قاضی حامد حسرت صاحب اسسٹنٹ اڈیٹر کے علاوہ یعقوب خاں صاحب کلام بی اے مسٹر امتیاز احمد اشرفی بی اے اور سید جالب صاحب کے نقش پروانہ سراج صاحب تھے چنانچہ اس لمبی سی میز کے ایک طرف یعقوب خانصاحب کلام اور سراج صاحب بیٹھے تھے دوسری طرف مسٹر اشرفی اور قاضی حسرت صاحب لیکن قاضی حسرت صاحب کے ذمہ چونکہ منیجری کی فرائض بھی تھے لہذا وہ تبرکاً ہی اسسٹنٹ اڈیٹر رہ گئے تھے اور ہمارے جانے کے بعد وہ مستقل ہی منیجر کے کمرے میں رہنے لگے، لہذا ہم کو ان کی کرسی مل گئی ہاں تو ان سب صاحبان کا یہ حال تھا کہ ہوتے تو سب تھے مگر کیا مجال کسی کی جو دم بھی مار سکے۔بس لکھ رہے ہیں اور چپراسی کے ہاتھ کاتبوں کو سلپ پر سلپ بھیجے جاتے ہیں مگر یہ سلپ صرف خبروں کے ہوتے تھے رہ گئے اڈیٹوریل مضامین وہ قاضی حامد صاحب اور اشرفی صاحب کبھی کبھی لکھتے تھے اور لکھکر سید صاحب کی میز پر چپکے سے رکھوا دیتے تھے جن کے متعلق دو تین روز کے بعد پتہ چلتا تھا کہ اخبار میں شائع ہوئے یا براہ ردی کی ٹوکری ٹھورسے پر پہونچ گئے، مگر ہم تھے کہ بس ہمدم کے فائل حفظ کرنے میں مصروف تھے اور بلا مبالغہ کوئی دو مہینہ تک صرف اسی بات کی تنخواہ پائی کہ ہمدم کے پرانے فائلوں کی ورق گردانی کی تھی، اس کے بعد ہم کو خبروں کے ترجمہ کی طرف متوجہ کیا گیا اور ہماری ترجمہ کی ہوئی خبروں پر یہ سنسر بٹھا دیا گیا کہ وہ پہلے سید صاحب کی نظر سے گذریں گی، اس کے بعد کاتبوں کے پاس جائیں گی مگر تیسرے ہی روز یہ سنسر اٹھا لیا گیا خبروں کے ترجمے کے ساتھ ہی ساتھ پروف ریڈنگ ہمارے سپرد ہوئی خصوصاً سید صاحب کے لکھے ہوئے اڈیٹوریل کی کاپی ہم کو ضرور دکھائی جاتی تھی اور اس کا پروف خود سید صاحب دیکھتے تھے مختصر یہ کہ تقریباً ایک سال تک ہماری زندگی دفتری یوں ہی گذری آخر ایک دن خود سید صاحب نے ہم پر مہربان ہو کر فرمایا کہ ہم چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھا کریں چنانچہ سب سے پہلے نوٹ جو ہم نے لکھا ہے وہ ہمارے پاس سے تو اچھا خاصا گیا تھا مگر جب سید صاحب کے پاس سے کاتب کے پاس روانہ ہوا تو بالکل پانی پت کا خونین میدان معلوم ہوتا تھا یعنی اس کو لال روشنائی سے اس قدر کاٹا چھانٹا گیا تھا کہ ہماری سیاہ روشنائی بغور ڈھونڈھنے سے صرف کہیں کہیں نظر آجاتی تھی مگر ہم اس نالائقی سے مایوس نہیں ہوئے اور برابر نوٹ لکھتے رہے حالانکہ سید صاحب بھی برابر ہمارے نوٹ کے خلاف اپنی لال روشنائی سے جہاد کرنے میں مصروف تھے اور کاتبوں کے پاس ہمارا نوٹ ہماری نیلی اور سید صاحب کی لال روشنائی سے یونین جیک بنا ہوا پہونچتا تھا مگر رفتہ رفتہ وہ دن بھی آیا سید صاحب کی لال روشنائی کی موسلا دھار بارش ہمارے نوٹوں پر بوندا باندی کی صورت میں منتقل ہو گئی اور اصلاحیں کم ہونے لگیں یوں تو اصلاح نہ کرنا سید صاحب کی عادت کے خلاف تھا ضرورت ہو یا نہ ہو وہ اصلاح ضرور کرتے تھے غالباً اس لئے کہ ہم اپنے کو اصلاح سے بے نیاز سمجھ کر قابل نہ سمجھنے لگیں چنانچہ ایک مرتبہ ایک سب لیڈر میں سید صاحب نے ایک چیز کاٹ کر ایک چیز لکھدی، جو چیز کاٹی تھی وہ تھا لفظ ،،نقطۂ نظر،، اور ،،نقطۂ نظر،، کاٹ کر آپنے لکھا تھا اپنی اسی سرخ روشنائی سے ،،زاویہ نظر،، مگر ہم اس زبردستی پر بھی چپ رہے اور چپ کی داد کاتب نے اس طرح دی، کہ کاپی جو ہم پڑھتے ہیں تو اس میں لکھا ہوا ہے ،،نقطۂ زاویۂ نظر،، چنانچہ اب ہم کو اپنے قلم سے اپنا لکھا ہوا لفظ ،،نقطۂ،، کاٹنا پڑا۔

اس دور کے بعد آخر وہ دور بھی آیا کہ ہمدم کا مزاحیہ کالم ،،دو دو باتیں،، مستقل طور پر ہمارے سپرد کر دیا گیا جس کے متعلق ہم کو اس کا اختیار دیدیا گیا کہ ہم براہ راست کاتبوں کے پاس بھیج سکتے ہیں مگر نوٹ ہمیشہ سید صاحب کی نظر گذر کر کتابت کے لئے جاتے تھے اور اڈیٹوریل لکھنے کی تو حسرت ہی رہ گئی مگر سید صاحب نے اپنے جیتے جی ہم کو کبھی اڈیٹوریل لکھنے کی اجازت نہیں دی بات یہ تھی کہ وہ اڈیٹوریل چاہتے تھے اپنا ایسا اور ان کا ایسا اڈیٹوریل ہم سات مرتبہ مر کر جنم لینے کے بعد بھی اس لئے نہیں لکھ سکتے تھے کہ ان کی معلومات اور یادداشت نے ان کو زندہ انسائیکلو پیڈیا بنا دیا تھا جس مسئلہ پر قلم اٹھاتے تھے اس پر اس طرح لکھتے تھے کہ بات کہتے تھے بات کی جڑ کہتے تھے یہانتک کہ بات کی پھننگی بھی کہہ جاتے تھے چنانچہ ان کے تمام اڈیٹوریل اسی قسم کی باتوں

سے بہرے رہتے تھے کہ فلاں معاہدہ فلاں سنہ میں فلاں مقام پر جب ہوا ہے تو فلاں صاحب نے فلاں صاحب سے اس کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے فلاں فلاں بات کہی تھی یا مسٹر چرچل کا ذکر کریں گے تو ان کی پیدائش سے بکر لڑکپن ان کی طالبِ علمی اور ان کی زندگی کے ہر دور کے متعلق اس طرح لکھیں گے کہ گویا مسٹر چرچل آپ ہی کے پروردہ اور گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ بلکہ اگر ضرورت پڑے گی تو مسٹر چرچل کے جدِ امجد کے متعلق بھی اسی عبور کے ساتھ لکھیں گے کہ گویا اس خاندان سے آپ کا تعلق نسلوں سے چلا آ رہا ہے اور اسی پر کیا منحصر ہے کوئی سیاسی۔ تاریخی۔ معاشرتی۔ تمدنی۔ علمی ادبی بحث دیکھئے اور پھر اس پر سید صاحب کا عبور ملاحظہ فرمایئے عرض تو کیا کہ ان کے انسائیکلو پیڈیا ہونے میں ذرا شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی اور ان کی معلومات کے سمندر کا عمق نامعلوم تھا۔

روزمرہ کی گفتگو میں ان سید انسائیکلوپیڈیا صاحب کا یہ حال تھا کہ کوئی ذکر کسی قسم کا چھڑ گیا بس پھر کیا تھا سید صاحب کی معلومات کا دریا جوش میں آ گیا اور پھر آپ اس مبحث پر وہ گفتگو فرماتے تھے کہ اگر کوئی محض اس گفتگو کو ضبطِ تحریر میں لے آتا تو وہی گفتگو اس مبحث کے متعلق ایک تحقیقی مقالہ ثابت ہوتی معمولی سے معمولی بات اور سید صاحب سے اسی بات کے متعلق ایک تفصیلی تقریر سن لیجئے ایک روز کا ذکر ہے کہ میر صاحب اپنے صاحبزادہ سید عشرت حسین صاحب کی صاحبزادی کو یعنی اپنی پوتی کو پرمبلیٹر پر گھماتے ہوئے حسبِ معمول امین آباد کی طرف تشریف لائے اور ایک صاحب کے یہاں بیٹھ کے حقہ سے شغل فرمانے لگے، اس حقہ کو پہلا ہی کش لیا معلوم تھا کہ مجھکو اس وقت وہ شخص استعمال کر رہا ہے جو حقوق کا نباض ہے چنانچہ چار ہی پانچ کش پینے کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ صاحب یہ تو بھڑک گیا ہے۔ صاحبِ خانہ نے فوراً دوسری چلم بھروائی مگر اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی حسبِ دلخواہ طریقہ پر سلگ نہ سکی یعنی۔ فنِ حقہ کشی سے بے بہرہ لوگوں کے نزدیک تو وہ سلگ گئی تھی اور حقہ خوب آ رہا تھا۔ مگر سید صاحب کو اس چلم میں بھی کوئی مزہ نہ آیا چنانچہ حقہ کی نے دوسری طرف بڑھاتے ہوئے بولے، صاحب حقہ کے واسطے تو کچھ کنڈے ہی کی آگ مناسب اور موزوں ہوتی ہے کہ اس کی ہلکی ہلکی آنچ سے تمباکو رفتہ رفتہ سلگتی ہے اور یہ بات پیدا نہیں ہونے پاتی کہ حقہ ایک دم سے سلگا اور سلگتے ہی بھڑک کر جل گیا کنڈے کی آگ سے سلگتا دیر میں ضرور ہے لیکن اول تو بھڑکنے نہیں پاتا دوسرے دیر تک سلگتا رہتا ہے اور اپنے پورے مزے پر ہو کر جلتا ہے میں نے تو جب سے حقہ شروع کیا ہے ہمیشہ حقہ کے لئے کنڈے ہی کی آگ کو بہتر پایا مگر نفاست کے خیال سے شہروں میں کنڈے کی آگ کا رواج چونکہ کم ہے لہٰذا یہاں بہت کم کنڈے کی آگ کے حقے ملتے ہیں۔

حالانکہ اگر لکھنؤ کا خمیرہ اس آگ پر پیا جائے تو اس کا لطف ہی کچھ اور رہے اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ کا خمیرہ بھی اب وہ خمیرہ نہیں رہا ہے جو کسی زمانہ میں تھا، یہاں خمیرہ کی دو دکانیں ایسی تھیں جو دور دور مشہور تھیں، ایک زمانہ تمباکو والے کی دکان اور دوسری چھوٹی شاہزادی کی ڈیوڑھی والی دکان ان دونوں دکانوں کا خمیرہ دور دور میں اکثر منگا کر استعمال کرتا تھا سبحان اللہ کیا کہنا ہے اس خمیرہ کا ایک عجیب خوشبو اور لطافت کے ساتھ تمباکو کا مزہ ملا ہوتا تھا ہر کش کے بعد انسان کو ایک خاص سرور حاصل ہوتا تھا اب زمانہ تمباکو والے کی دوکان تو گویا ہے ہی نہیں اور چھوٹی شاہزادی کی ڈیوڑھی والی دوکان میں بھی وہ بات نہیں رہی ہے، میں نے گورکھپور کا امتاس والا خمیرہ بھی استعمال کیا ہے مگر صاحب جو کیفیت اور لطافت لکھنؤ کے خمیرہ میں پائی وہ مجھکو کہیں نہیں ملی پھر اہلِ لکھنؤ جس خوش سلیقگی کے ساتھ حقہ پیتے ہیں اس کی مثال بھی نہیں اور نہ یہی حقہ کا لبا یا جانا خود ایک مستقل خصوصیت تھی اور اسی طرح کے سیکڑوں تکلفات حقہ کے سلسلہ میں برتے جاتے تھے۔ مثلاً گرمیوں کا زمانہ ہے خس پوش حقے جن کے دیکھنے ہی سے ایک عجیب تازگی محسوس ہوتی تھی یا فرشی رنگ یا پیچوان مختصر یہ کہ حقہ کو جو عروج لکھنؤ میں حاصل ہوا اس کا جواب کہیں اور نہیں ہے یوں تو پنجاب میں حقہ کا سب سے زیادہ رواج ہے مگر لکھنؤ کے حقوں کا تو یہ حال ہوتا تھا کہ ایک صاحب پی رہے ہیں باقی تمام حاضرین اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہے ہیں اور جو حقہ نہیں بھی پیتے ہیں، ان کا دل چاہتا ہے کہ پی کر دیکھیں ——— مختصر یہ کہ حقہ کے موضوع پر سید صاحب نے کوئی گھنٹہ بھر مسلسل تقریر تو ضرور کی ہو گی، اور پھر یہی نہیں کہ لکھنؤ کے حقوں کا ذکر ہو بلکہ ایران کے حقے، عرب کے حقے، چین کے حقے اور ممالکِ عالم کے حقوں کا تذکرہ حقے کی ایجاد کی تاریخ۔ اس کے موجد کا ذکر حقہ کی تدریجی ترقیاں اور خاندان اودھ کے بعد سے حقہ کا زوال وغیرہ سب ہی تو اس تقریر میں شامل تھے سننے والے سُن ہو رہے تھے، اور سید صاحب کی حقہ کے متعلق دھواں دھار تقریر جاری تھی۔

اسی طرح ایک مرتبہ اس خاکسار نے دیکھا کہ سید صاحب کی پوتی کا پرمبلیٹر سڑک کے کنارے کھڑا ہے اور خود سید صاحب حلوائی کی دوکان پر رومال پھیلائے ہوئے رونق افروز ہیں۔ نزدیک جا کر معلوم ہوا کہ حلوا سوہن خریدا جا رہا ہے ہم نے سلام علیک کے بعد مزاج پوچھا تو چونکہ یہ دفتر کا وقت نہیں تھا لہٰذا تفصیل کے ساتھ گفتگو چھڑ گئی کہ، میاں عشرت کی والدہ کو حلوا سوہن بہت مرغوب ہے حالانکہ دہلی کے بعد لکھنؤ کا حلوہ سوہن کھانے کو دل چاہتا نہیں چاہئے مگر ان کو تو گویا مٹھائیوں میں حلوا سوہن سے عشق ہے حالانکہ میں دراصل حلوا سوہن کو مٹھائی سمجھتا ہی نہیں ہوں بلکہ اس کو ابتدا ہی زمانے میں حکمانے صرف اس لئے تیار کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کم مقدار میں گھی

…دہ تک پہونچایا جاسکے اور معدہ اس کو قبول کرسکے چنانچہ پہلے حلوا سوہن اس صرف بنایا گیا تھا۔ اس کی صورت شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح ہوتی تھی جس کے سوراخوں میں گھی ہوتا تھا اور وہ گھی اس صورت میں کھلایا جاتا تھا۔ وہ خالص گھی اس مقدار میں کھانا دشوار تھا رفتہ رفتہ مکھیوں کے اس چھتے کی صورت موجودہ حلوا سوہن کی طرح ہوگئی اور اس میں علاوہ گھی کے میوہ کا اضافہ اور ہوگیا۔ حالانکہ میوہ باقاعدہ یہ لوگ نہیں ڈالتے صرف اخروٹ اور چرونجی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن خاص طور پر اگر حلوا سوہن بنوایا جائے اور اس میں تمام میوے ہوں۔ در عمدہ گھی تو لذیذ ہونے سے زیادہ مقوی اور مفید ہوتا ہے۔ میں نے اکثر دہلی میں خاص طور پر حلوا سوہن بنوایا ہے در اصل اس حلوہ سوہن سے اس حلوہ سوہن کو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اگر میاں عشرت کی والدہ کو اسی کا شوق ہے لہذا ان کے لئے جاتا ہوں السلام علیکم۔

مختصر یہ کہ سید جالب مرحوم یا تو بولتے ہی نہیں تھے اور اگر بولتے تھے تو پھر بولنے کی حد کو دیتے تھے اور جس مبحث پر گفتگو کرتے تھے اسی عبور کے ساتھ کرتے تھے۔ سید صاحب کو افیون، کتابوں، اور دعوتوں کا بیحد شوق تھا۔ افیون کا استعمال ان کے لئے ضروریات زندگی میں سے ہوگیا تھا۔ بلکہ آخری زمانہ میں تو گویا ان کی زندگی کا سہارا صرف افیون تھی۔ ان کے شوق کو لوگ مضحک سمجھتے تھے حالانکہ اس زمانہ میں شراب پینے والوں پر بھی لوگ نہیں ہنستے۔ افیون کے استعمال نے قدرتی طور پر ان کو مٹھائی کا دلدادہ بنادیا تھا۔ لیکن وہ اس سلسلہ میں دوسرے افیونیوں کی طرح بڑا میں نہیں ہوگئے تھے کہ کیتیاں جیب میں پڑی ہیں اور کھا رہے ہیں یا سڑک پر جارہے ہیں اور گنڈیریاں چوس رہے ہیں بلکہ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک دعوت کے موقع پر ایک صاحب نے محض اس خیال سے کہ سید صاحب کو پلاؤ سے زیادہ زردہ مرغوب ہوگا اپنی زردے کی پلیٹ بھی ان کے آگے بڑھادی مگر انھوں نے فوراً یہ کہکر واپس کردی کہ۔۔ اور حضرات کو بھی میرے متعلق یہی شبہ تھا۔ ہم نے سید صاحب کو پینک میں بھی کم دیکھا تھا البتہ دوپہر کا کھانا اور کھانے کے بعد افیون سے شغل فرمانے کے بعد جب وہ دفتر میں تشریف لاتے تھے تو اکثر بڑے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے اور خدا جانے کہاں کہاں کے قصے سنا جاتے تھے۔ لیکن وہ بھی روز نہیں کبھی کبھی اور جس روز ان کا یہ رنگ ہوتا تھا ہم لوگ بھی سمجھ لیتے تھے کہ آج کچھ مقدار بڑھ گئی ہے معلوم ہوتا ہے گولی ذرا بڑی بن گئی تھی۔

ان کا دعوتوں کا شوق بہت بدنام تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ایڈیٹروں کو یوں ہی دعوتوں سے کم فرصت ملتی ہے دوسرے لوگ ان کو زیادہ تر اس لئے اور بھی بلاتے تھے کہ وہ دعوت کھانے کے بعد اخبار میں دعوت کا ذکر ہمیشہ نہایت نمک حلالی کے ساتھ لکھتے تھے یہی وجہ ان کے دعوتوں کے شوق کی رسوائی کی تھی اور اسی وجہ سے ان کی دعوتیں عام ایڈیٹروں سے ذرا زیادہ ہوتی تھی۔ ان کا کتابوں کا شوق عشق کی حد تک پہونچا ہوا تھا چنانچہ نئی کتابوں کی خریداری سے لیکر نخاسی کرم خوردہ کتابوں تک کی فراہمی ان کا پسندیدہ مشغلہ تھی۔ اور مالکان ہمدم سے بھی یہ شرط طے تھی کہ ریویو کے لئے جس قدر کتابیں موصول ہونگی وہ سب ایڈیٹر کی ملکیت ہوں گی خیر یہ ریویو کی کتابیں تو گھر بیٹھے آجاتی تھیں اور نئی کتابیں بھی باقاعدہ دکانوں پر مل جاتی تھیں البتہ کرم خوردہ قلمی نسخے اور نایاب کتابیں جس شان سے نخاس کے کباڑیوں کے یہاں تلاش کی جاتی ہیں وہ شان لیلیٰ کے عشق میں مجنوں نے نجد کے جنگلوں میں بیٹھکر تو ضرور پیش کی تھی اس کے علاوہ اور کوئی مثال نہیں ملسکتی نخاس کا بازار لگا ہوا ہے پھٹے پرانے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے برتن نیلام ہورہے ہیں اور ان کو لوگ بولیاں بول کر خرید رہے ہیں ان ہی لوگوں میں ایک طرف یہ ابو الصحافت لب سڑک شیروانی کا دامن خاک اور دھول میں لٹائے ہوئے کسی کباڑیئے کی دکان پر بیٹھے ہوئے کسی چیتھڑا کتاب کی مرہم پٹی میں مصروف ہیں نہ اس کا ہوش کہ تمام سڑک کی گرد ہم پر آرہی ہے نہ اس کی خبر ہے کہ شیروانی کا دامن شاہراہ عام بنچکا ہے اور نہ اس کی پرواہ ہے کہ کون آپ کے سر پر سے پھاند کر ادھر گیا اور کون آپ کو نادانستہ طور پر ٹھوکر مارتا ہوا ادھر سے ادھر نکل گیا۔ اسی شوق کا یہ نتیجہ تھا کہ جس وقت سید جالب نے انتقال فرمایا ہے ان کی تنہا دولت ان کا بیش قیمت کتب خانہ تھا جس کا خدا جانے اب کیا حشر ہوا۔ مختصر یہ کہ ؏

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

اور خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم افیون کے علاوہ ان کے نقش قدم پر چل سکیں۔

شوکت تھانوی

افسانہ

مورتی

از جناب ایم ایم اسلم صاحب جرنلسٹ۔ لاہور

پہاڑی علاقوں میں جہاں دو چار جھونپڑے اکٹھے ہو گئے وہیں گاؤں بن گیا۔ بعض منچلے اور آسودہ حال زمیندار لکڑی کے مکان بھی بنا لیتے ہیں۔ اس قسم کے مکان صرف دو کوٹھریوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ایک لمبا سا دالان نیچے اور دو کوٹھریاں اوپر۔ اگر کسی نے بہت عقلمندی کی تو دالان میں بھی لکڑیوں کی ایک دیوار کھینچ کر اسے دو حصوں میں تقسیم کر لیا۔ گو یہ لوگ خود تو میلے کچیلے ہی رہتے ہیں۔ لیکن اپنے مکانوں کو خوب صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ مکی یا باجرے کی روٹی ان کی عام غذا ہے، اور پینے کے لئے چشمے یا ندی کا پانی۔ اور بعض مقامات پر تو ان لوگوں کو پانی کے لئے بھی دو ایک میل کا سفر کرنا پڑتا ہے عورتیں مردوں کی نسبت ذرا زیادہ با مذاق واقع ہوئی ہیں۔ اور اکثر شکل و صورت کے لحاظ سے بھی من موہنی ہوتی ہیں۔

مجھے بھی اکثر شکار کے لئے ایک پہاڑی علاقے میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ میں ہمیشہ ایک زمیندار کے ہاں جسے وہاں کے رہنے والے جمعدار کہتے تھے فروکش ہوا کرتا، جمعدار کا لڑکا بھی جس کا نام جیتو تھا شکاری تھا۔ اس کے پاس بندوق توڑے دار ہی تھی۔ لیکن نشانہ اچھا لگاتا تھا۔ اس کی میری بنتی بھی خوب تھی۔ وہی بات تھی کہ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ ہم صبح جو گھر سے نکلتے تو پھر شام ہی کو واپس لوٹتے۔

جمعدار کا مکان لکڑی کا دو منزلہ تھا، وہ اچھا آسودہ حال زمیندار تھا سرکاری سڑک کی دیکھ بھال کے لئے جو مددگار مقرر تھی یہ ان لوگوں کا جمعدار تھا پچیس سولہ روپے تنخواہ پاتا تھا اور بیٹا بھی خوب تھا۔ اور وہ بھی خانہ ساز کبھی کبھی گایا بھی کرتا، لیکن جب گانے پر آتا تو دنیا بھر کے گیت اسے سیدھے کا چھوڑتا، آواز ایسی سریلی کہ سونا حرام ہو جاتا، اور جو ذرا سرور میں آتا تو جوتا لے کر گھر والوں کی مرمت شروع کر دیتا۔ قریب قریب یہاں کا روز کا معمول سا ہو گیا تھا۔

اب کے سال جو میں گیا تو جیتو کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ یہ اس کا چوتھا بیاہ تھا۔ آج دن بھر بارش ہوتی رہی، اس لئے کہیں باہر نہ جا سکا، اگلے روز صبح صبح تو کچھ بوندا باندی سی رہی، لیکن دس بجے کے قریب ہوا چلنے لگی اور بادل پورب کی طرف ڈھلنے لگے، اس وقت جیتو اور میں شکار کے لئے نکلے، راستہ میں دم بھرتا ہوا آگے آگے ہو لیا۔ راہ چلتے سال کی باتیں جیتو نے سنا ڈالیں۔ پھر اس کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ میں نے کہا۔

بھئی جیتو! تم ہو تو بڑے خوش قسمت!

وہ کیسے؟ اس نے پوچھا۔

اب چوتھی جورو جو لاؤ گے۔"

یہ سن کر وہ ہنسنے لگا میں نے پوچھا۔

دلہن دیکھی ہے تم نے؟

بڑی سندر عورت ہے" جیتو نے ہنس کر کہا،

خیر! میں نے کہا۔ تمہارا بیاہ تو دیکھ لیں گے۔ ہاں! تمہارا سسرال کتنی دور ہے"

"کچھ دور نہیں!" اس نے جواب دیا۔ کوئی دو ایک کوس سمجھ لیجئے!"

پیدل ہی چلنا ہوگا میں نے پوچھا۔

ہاں چلنا تو پیدل ہی ہے۔ جیتو نے کہا" لیکن کچھ اور بھی آپ نے سنا! میرے دو بیاہ ہوں گے۔

دو بیاہ! یہ کیسے؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

پہلے ایک مورتی سے بیاہ ہوگا۔

"ارے!" میں نے کہا۔ مورتی سے؟ کیا مطلب؟"

جیتو بولا"

پروہت نے یہی کہا ہے، پہلے مورتی سے بیاہ ہوگا پھر برات دلہن کے گھر جائے گی

یہ مورتی بھی بڑی ہی سندر صورت ہے۔ دیکھیں اور جی نہ بھرے۔"

"چلو تو ذرا دیکھیں" میں نے کہا "کتنی دور ہے یہاں سے۔"

"راستے ہی میں تو مندر ہے۔" جیتو بولا "جنگلی مرغ بھی بہت ملیں گے۔"

"تو پھر چلو"

میں نے بندوق اٹھالی اور رابن کو ساتھ لے کر جیتو کے ہمراہ ہو لیا آپ جانتے پہاڑی راستہ کچھ ہوتا ہی بیڈھب سا ہے اور پھر جہاں جا بجا خاردار جھاڑیاں ہوں تو چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن رابن شکار کی بو پا کر برابر جھاڑیوں میں گھسا چلا جا رہا تھا، ادھر ادھر سے کوئی مرغ بھی اٹھتا، لیکن اس تیزی کے ساتھ کہ نشانہ لینے کی فرصت نہ ملتی تاہم میں نے دو چار مار ہی لئے، کوئی دو ڈیڑھ میل کی اترائی میں ساکنان کوہسار کے پانچ سات گھر تھے اور ان گھروں سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا مندر تھا عمارت قدیم زمانہ کی معلوم ہوتی تھی اس مندر کے دروازے پر تیوں کی سقف کے نیچے پیتل کی ایک مورتی رکھی تھی، تھی تو مورتی ہی لیکن معلوم یہی ہوتا تھا کہ کسی ساحر نے اپنی سحر کاری کے ثبوت میں کسی حسینہ پیکر میں ڈھالا ہے!

عضا بہت سڈول اور چہرہ بلا کا دلکش، مست آنکھیں، سینے کا ابھار اور چہرے کی مسکراہٹ دیکھنے والے کو محو حیرت بنائے دیتی تھی؛

یہی وہ مورتی تھی جس کی پروہت کے حکم سے جیتو کی شادی ہونی تھی۔

فرمایئے! جیتو نے مسکرا کر پوچھا "اب کیا خیال ہے آپ کا۔"

بھئی!" میں نے کہا، واقعی بہت خوبصورت ہے، بنانے والے کے فن کی داد نہیں دی جاتی۔"

"ہے نا سندر ناری" جیتو نے ہنسکر کہا۔

ہے تو سہی"

لیکن بڑی کینہ دوز ہے۔

کینہ دوز! کیوں؟

یہی مورتی۔

میں یہ سنکر مسکرانے لگا۔

آزما کر دیکھئے! جیتو نے کہا۔

کیا بیہودہ باتیں لے بیٹھے۔

میں جھوٹ نہیں کہتا، جیتو بولا، پانچ ایک دفعہ ہوئے، دو لڑکے پاس بیٹھے کھیل رہے تھے، آپ جانتے لڑکے تو شریر ہوتے ہی ہیں پجاری نے جو ڈانٹ بتائی تو دونوں بھاگ کر ذرا فاصلہ پر جا بیٹھے۔ لیکن جب پجاری کام دھندے میں لگ گیا تو ایک لڑکے نے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر مورتی کے دے مارا۔ لیکن وہی پتھر مورتی کو لگ کر زور سے پیچھے آیا اور جس لڑکے نے مارا تھا اس کی پیشانی میں اس شدت سے لگا کہ خون نکل آیا۔ اور مورتی کی آنکھوں سے شعلے نکلتے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ دونوں ڈر کر بھاگ گئے۔

میں نے ہنس کر کہا۔

کہانی تو واقعی اچھی ہے۔ لڑکے کے والدین نے پجاری کی مٹھی تو خوب گرم کردی ہوگی۔

"آپ مذاق سمجھتے ہوں گے۔

تو اور کیا؟"

نہیں!" جیتو بولا" اس قسم کے کئی ایک واقعات گذر چکے ہیں۔ آپ لوگوں سے پوچھ لیں"

میں چپکا ہو رہا"

جیتو کے بیاہ میں دو ایک دن باقی تھے، دن بھر ڈھولک بجتی رہی، رات کے وقت لڑکیاں وہ اودھم مچاتیں کہ بس توبہ ہی بھلی، دلہن کے جوڑے سے ملتا جلتا ایک جوڑا مورتی کے لئے بھی تیار کیا گیا، اور شادی کی رسوم پہلے مندر میں پھر لڑکی والوں کے ہاں ہونی قرار پائیں۔

شادی کے روز جیتو شادی کا جوڑا پہن کر باہر آیا، مجھے دیکھکر ہنسی آگئی بالکل رام لیلا کا سوانگ معلوم ہوتا تھا، جیتو کو پالکی میں سوار کیا گیا، براتی پیدل ساتھ ہوئے۔ براتیوں میں میں بھی تھا، برات گھر سے چل کر پہلے مورتی سے بیاہ کیا گیا، جمعدار نے پجاری کو دس بیس روپے "دشکنا" کے طور پر دیئے، پھر دلہن کے گھر پہنچے، وہاں براتیوں کی بہت آؤ بھگت ہوئی، حلوہ اور پوری کھانے کو ملا۔ شام سے پہلے دلہن سسرال آگئی۔

رات کو سونے سے پیشتر جیتو میرے پاس آیا۔ آج خلاف معمول کچھ پریشان سا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔

رسمات ختم ہو چکیں۔ جیتو بولا۔

"دیکھو بھیا" میں نے کہا "اب یہ چڑیل بھی ہضم کر جانا"

"رام جانے"

"کیا؟" میں نے پوچھا"

"میرا دل کچھ اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے" جیتو نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"آخر کچھ وجہ بھی" میں نے پوچھا۔ "زیادہ تو نہیں کھا لیا"

"مجھے تو اس مورتی کا خیال کچھ پریشان کر رہا ہے"

"کچھ پر دہشت نے تو نہیں ڈرا دیا" میں نے پوچھا۔

"ہاں! جیتو نے کہا" اس سے تو بات چیت ہوتی ہی نہیں۔

"چلو چھوڑو اس خیال کو" میں نے کہا "جمعدار کہاں ہے۔

"وہ اپنے شغل میں لگا ہے"

"کچھ دیر بعد دو چار عورتیں جیتو کو بلا کر لے گئیں۔

جیتو کے جانے سے تھوڑی دیر بعد عورتوں کے ڈھولک کے ساتھ گانے اور قہقہے لگانے کی آواز آنے لگی، غالباً کوئی رسم ادا ہو رہی تھی، میں چھت پر لیٹا تھا، رابن پلنگ کے نیچے بیٹھا تھا، جانے آج کیا بات تھی کہ نیند نہ آئی میں بہت دیر کروٹیں بدلتا رہا، اچانک مجھے چھت پر کسی کے بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دینے لگی، اوپر کی چھت پر گھر والوں کے چلنے پھرنے کی آواز تو پہلے بھی آیا کرتی تھی، لیکن یہ آواز بالکل غیر مانوس سی چیز تھی، ساتھ ہی ایک خوفناک چیخ سنائی دی، میں فوراً پلنگ سے اٹھا اور بندوق پکڑ کر باہر آگیا کچھ دیر بعد عورتوں کے رونے پیٹنے کی آواز آنے لگی۔

"میں نے جیتو کو آواز دی۔ ایک عورت بولی۔

"اوپر آئیے جلدی۔

"میں لپک کر اوپر گیا اور دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھا۔

"کیا ہے؟"

"جیتو کی ماں روتے ہوئے بولی"

"جیتو مر گیا، میرا لال مر گیا"

یہ سنتے ہی میرے بدن میں ایک خوفناک کپکپی دوڑ گئی، میں نے آگے بڑھ کر جیتو کی لاش پر سے لحاف اٹھایا، وہ مردہ صد سالہ معلوم ہوتا تھا۔

دلہن ایک طرف بے ہوش پڑی تھی اور عورتیں اس کے ارد گرد کھڑی پیٹ رہی تھیں، اگلے روز دوپہر سے پہلے غریب جیتو کی لاش جلا دی گئی۔

اس المناک واقعہ کے بعد میں نے یہاں رہنا مناسب نہ سمجھا، اور اسی روز عصر کے قریب بڑی سڑک پر سواری کے انتظار میں آ کھڑا ہوا، جمعدار بھی ساتھ آیا۔ اس کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، میں نے کہا۔

"جمعدار! اب صبر کرو . . . . . جیتو . . . . . غریب"

"اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہہ سکا، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیٹے کا نام سن کر جمعدار بھی رونے لگا۔ اور کہنے لگا۔

"وہ ظالم مورتی میرے بچے کو کھا گئی، ڈس لیا، ناگن نے میرے بچے کو ڈس لیا"

"مورتی کا نام سن کر میں تعجب سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جمعدار بولا"

"میری غریب بہو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"جمعدار کہنے لگا"

"بہو کہتی ہے کہ عورتوں کے چلے جانے کے بعد میں چارپائی پر جا بیٹھی جیتو بھی میرے پاس بیٹھا تھا۔ اچانک کوٹھڑی کا دروازہ جو جیتو نے بند کر لیا تھا خود بخود کھل گیا۔ اور وہی پیتل کی مورتی جس کے سر پر سرخ اوڑھنی تھی بھاری بھاری قدم رکھتی اندر آئی اور آتے ہی جیتو سے لپٹ گئی۔

"میں نے خوف سے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا، جیتو کے دو ایک بار کراہنے کی آواز آئی، مجھے غش آگیا، پھر معلوم نہیں کیا ہوا"

اتنا کہہ کر جمعدار پھر رونے لگا۔

میرے دل میں تو آئی کہ ایک بار پھر اس مورتی کو جا کر دیکھوں، لیکن اتنے میں لاری آگئی اور میں سوار ہو کر وہاں سے چل دیا۔

ایم ایم اسلم

سالنامہ ۳۵ء کی تصاویر

نیرنگ خیال کی تصاویر ہمیشہ بامعنی ہوتی ہیں۔ گذشتہ سال کے ٹائٹل کا عنوان تھا شکست محبت۔ مرد جو کہ جہان محبت کی نشانی ہے۔ ایک عورت پر ناچ رہا ہے مگر ملاقاتی ہونی ہے عورت بھی اس مالا کا ایک موتی تھی۔ مگر سو گوار۔ اس سال کا ٹائٹل جو ایک کمپنی نے تیار کیا ہے۔ تعمیر محبت ہے گویا ایک ہی خیال کا دوسرا رنگ یا ایک ہی تصویر کا دوسرا رخ۔ یہ ٹائٹل ہم نے آف سیٹ سسٹم کے مطابق تیار کرایا ہے جس پر گراں قدر رقم صرف ہوئی ہے۔ اردو زبان کے رسائل میں سب سے اول یہ اقدام نیرنگ خیال نے کیا ہے۔

ٹائٹل کے اندر دوسرا ٹائٹل ہے۔ جو اپنے اندر خاص کشش رکھتا ہے یہ ٹائٹل دو رنگ میں چھاپا گیا ہے۔

طلوع صبح ایک چہار رنگ کی تصویر ہے جسے ہم نے بمبئی کی نمائش میں خریدا تھا۔ یہ منشی دیو کی تیار کردہ ہے۔ مشرقی انداز میں یہ تصویر بے مثل ہے خلوط ہندوستانی اور جاپانی طرز کے ہیں۔ چغتائی آرٹ ترقی کے جو مدارج طے کر رہی ہے یہ ان کی انتہائی صورت ہے۔ ابھی یہاں تک پہونچنے میں چغتائی آرٹ بہت دیر لگائیگا۔

عمل بہزاد یہ ایرانی شاہکار ہے رنگوں کی ایسی شان و آمیزش بہت کم دیکھی گئی ہے مغربی تصویروں کے ساتھ مشرقی انداز کی تصویریں زیادہ دی گئی ہیں۔ یہ ... تھا۔

پنجاب کے دو رتن ڈاکٹر گوکل چند صاحب نارنگ پی ایچ ڈی۔ اور نواب احمد یار دولتانہ کی تصویریں ہیں۔

ہزاروں میں دو یہ مغربی تصویر ہے اس کا عنوان تھا۔ ٹو ان ملینز۔ Two in millions یہ تصویر تشریح سے بے نیاز ہے

مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا ایک نامدار راجہ تھا جس پر ایک تاریخی مضمون شائع کیا گیا ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اس شان کی دوسری تصویر کسی رسالہ میں آج تک شائع نہیں ہوئی صرف اس تصویر کے لئے ۲۵ روپیہ قیمت کی ایک کتاب خریدی گئی تھی

ادارہ نیرنگ خیال مدیر میں اور ایک جنرل منیجر یعنی غازی محمد اشتیاق صاحب انتظامی امور کو سنبھالتے ہیں اور حکیم محمد یوسف حسن اور سید فرید جعفری پچھلی شہری رسالہ کی ادارت کے فرائض بجا لاتے ہیں۔

لب ساحل ایک گجراتی مصور کا کارنامہ ہے تالاب کے کنارے ایک قدیم وضع کا درخت ایک نوجوان عورت پانی کا برتن لئے پانی پر کنول کے پھولوں کا تیرنا نہایت خوشنما منظر ہے ہندوستان کی دیہاتی زندگی کی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

اعلیحضرت میر عثمان علیخان شاہ دکن ہندوستان کے مسلمانوں کو فخر ہے کہ نظام ایک اسلامی ریاست کا تاجدار ہیں۔

معصوم :۔ یہ تصویر بھی مغربی ہے۔ دیہاتی معصوم لڑکی ؟ یہ بے حد مسکراتی ... معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی آنکھوں میں شہری لڑکیوں کی سی ... نہیں پائی جاتی۔

ہمیرا ایک سرزمین خیام میں فضاؤں میں بادل اور پہاڑوں کی وادی میں شیراز کا رنگ اور اس پر محبت کرنے والے ایک جوڑے کی بے فکری جلسی فضاؤں سے بے نیاز کئے ہوئے ہے۔

مسافر۔ ایک ہندوستانی مصور ایس ایم اڈیا صاحب کا کارنامہ ہے یہ تصویر لکھنؤ کی نمائش میں رکھی گئی تھی تصویر کے خطوط بے حد جاذب توجہ ہیں امید ہے کہ اڈیا صاحب مستقبل قریب میں بہت زیادہ مشہور ہو جائیں گے۔

فرشتے کی پرواز نمبر ۱ نمبر ۲ یہ تصویریں تانبے کی پلیٹوں سے لی گئی ہیں مصور نے پہلی تصویر میں بچہ کی پیدائش کا منظر پیش کیا ہے جبکہ روح لائی جا رہی ہے اور پھول برسائے جا رہے ہیں دوسری تصویر میں فرشتہ بچوں کو اٹھائے عالم بالا کو جا رہا ہے دونوں تصویریں مصوری اور صنعت کاری کے نادر نمونے ہیں۔

سلہوٹی :۔ یہ مصوری کی ایک جدید طرز ہے۔ اس نوع کی چار تصویریں ہم شائع کرتے ہیں جنہیں ایک کمپنی نے ہمارے لئے تیار کیا تھا۔ ستمبر ۳۴ء کے افسانہ نمبر کا ٹائٹل بھی اسی طرز کی مصوری کا تھا۔ مادر وطن کا عطیہ سپاہی کو اپنے تخیل میں مادر وطن تلوار پیش کر رہی ہے تاکہ وہ وطن کو غلامی سے بچائے۔

حسین ساحرہ یہ تصویر آئل پینٹنگ طرز کی ہے اس فن میں یہ ایک مشہور تصویر ہے اور حسین ساحرہ کا نام بالکل موزوں۔

راگنی :۔ یہ راجپوت مصوری کا ایک ایسا نمونہ ہے جسے کلکتہ کے میوزیم میں نہایت نمایاں جگہ دی گئی ہے اس کی کاپی برٹش میوزیم میں بھی محفوظ ہے ہندوستان کے وسطی عہد کی یہ بہترین یادگار ہے

بارہ تصویریں یہ ہندوستانی فلم ستاروں کی ہیں جن پر مختصر نوٹ علیحدہ درج ہے آئندہ سال بارہ مشہور ایکٹروں کا انتخاب عمل میں آئے گا۔

طلوع سحر یونانی علم الاصنام کی ان تصویروں میں سے ہے جو دنیا بھر میں یکتا تصور کی جاتی ہیں یہ بھی ایک طرح سورج کی سواری چلی جا رہی ہے اور کس شان سے۔

پہلی تصویر طلوع صبح تھی تو آخری طلوع سحر ہے یہ اتفاق ہے۔ جنوری ۳۵ء کے عید نمبر کی تصاویر بھی بہت نمایاں اور جاذب توجہ ہونگی۔ عید نمبر ضرور ملاحظہ فرمائیے۔

ادارہ۔